# آبِ حیات

(مشاہیر شعرائے اُردو کے سوانح عمری)

شمس العُلما مولانا مُحمد حُسین آزاد

سنگِ میل پبلی کیشنز ◉ لاہور

# آبِ حیات

(مشاہیر شعرائے اُردو کے سوانح عُمری)

زبانِ مذکور کی عہد بعہد کی
ترقیوں اور اصلاحوں کا بیان

حضرتِ شمس العلماء مولٰینا مولوی محمد حسین آزادؔ مرحوم

سنگِ میل پبلی کیشنز: چوکِ اُردو بازار لاہور

قیمت 25 روپے



نیاز احمد
سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور
نے منظور پرنٹنگ پریس سے چھپوا
کر شائع کی

# فہرست مطالب کتاب آبِ حیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# دیباچہ

آزادؔ ہندی نژاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے ہیں۔ تخمیناً سو برس سے کل خاندان کی زبان اردو ہے۔ بزرگوں سے لے کر آج تک زبانوں کی تحقیقات میں کمال سرگرمی اور جستجو رہی۔ اب چند سال سے معلوم ہوتا ہے۔ اس ملک کی زبان ترقی کے قدم برابر آگے بڑھا رہی ہے، یہاں تک کہ علمی زبان کے عمل میں دخل پیدا کر لیا۔ اور عنقریب بارگاہ علم میں کسی درجۂ خاص کی کرسی پر جلوس کیا چاہتی ہے۔ ایک دن اسی خیال میں تھا۔ اور دیکھ رہا تھا کہ کس طرح اس نے ظہور پکڑا، کس طرح قدم بہ قدم آگے بڑھی۔ کس طرح عہد بعہد اس درجے تک پہنچی تعجب ہوا کہ ایک بچّہ شاہجہانی بازار میں پھرتا ملے۔ شعرا اُسے اٹھا لیں اور ملک سخن میں پال کر پرورش کریں انجام کو یہاں تک نوبت پہنچے کہ وہی ملک کی تصنیف و تالیف پر قابض ہو جائے۔

اس حالت میں اس کے عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ہر عہد میں اس کے باکمالوں کی حالتیں نظر آئیں، جن کی وقت بوقت کی تربیت اور اصلاح نے اس بچے کو انگلی پکڑ کر قدم قدم آگے بڑھایا۔ اور رفتہ رفتہ اس درجے تک پہنچایا کہ جو آج حاصل ہے، صاف نظر آیا کہ ہر عہد میں وہ جُدا جُدا رنگ بدل رہا ہے اور اس کے باکمال تربیت کرنے والے وقت بوقت ترکیب اور الفاظ سے اس کے رفتار و اطوار میں اصلاحیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس لحاظ سے پانچ جلسے سامنے آئے کہ مسلسل اور متواتر قائم ہوتے اور برخاست ہوتے۔ ایک نے دوسرے کو رخصت کیا اور نیا رنگ جمایا۔ یہاں تک کہ پانچویں جلسے کا بھی دور آیا۔ جو کہ اب پیش نظر موجود ہے۔ ہر ایک جلسے میں صدر نشین اور ارکانِ انجمن نظر آئے۔ کہ جن میں عہد بعہد کے بزرگوں کی رفتار گفتار وضع لباس جُدا جُدا ہے۔ مگر اصلاح کے قلم سے کسی کا ہاتھ خالی نہیں اور اس کام کو ہر ایک اپنا فرض سمجھے ہوتے ہے۔ باوجود اس کے اہلِ مجلس بھی شوق کے دامن پھیلاتے ہیں۔ اور قبول کے ہاتھ سینوں پر رکھے ہیں۔ زبان مذکور کی ہر جلسے میں نئی صورت نظر آئی۔ کبھی بچّہ، کبھی لڑکا، کبھی نوجوان، مگر یہ معلوم ہوا کہ دیکھتا ہے تو انہیں کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور بولتا ہے تو انہیں کی زبان سے بولتا ہے۔

غرضیکہ اس زبان کے رنگ میں ان کے رفتار، گفتار، اوضاع، اطوار، بلکہ اس زمانے کے سامنے چال چلن پیش نظر تھے، جس میں انہوں نے زندگی بسر کی اور کیا کیا سبب ہوئے کہ اس طرح بسر کی۔ ان کے جلسوں کے ماجرے، اور حریفوں کے وہ معرکے جہاں طبیعتوں نے تکلف کے پردے اٹھا کر

اپنے اصلی جوہر دکھا دیئے۔ ان کے دلوں کی آزادیاں، وقتوں کی مجبوریاں، مزاجوں کی شوخیاں، طبیعتوں کی تیزیاں، کہیں گرمیاں، کہیں نرمیاں، کچھ خوش مزاجیاں، کچھ بے دماغیاں۔ غرض یہ سب باتیں میری آنکھوں میں اس طرح عبرت کا سرمہ دیتی تھیں، گویہ وہی زمانہ اور وہی اہلِ زمانہ موجود ہیں۔

چونکہ میں نے بلکہ میری زبان نے ایسے ہی اشخاص کی خدمتوں میں پرورش پائی تھی۔ اس لیے ان خیالات میں دل کی شگفتگی کا ایک عالم تھا، کہ جس کی کیفیت کو کسی بیان کی طاقت اور قلم کی زبان ادا نہیں کرسکتی۔ لیکن ساتھ ہی افسوس آیا کہ جن جوہریوں کے ذریعے سے یہ جواہرات مجھ تک پہنچے، وہ تو خاک میں مل گئے۔ جو لوگ باقی ہیں۔ وہ بجھے چراغوں کی طرح ایسے ویرانوں میں پڑے ہیں۔ کہ ان کے روشن کرنے کی یا ان سے روشنی لینے کی پرواہ نہیں پس یہ باتیں کہ حقیقت میں اثبات ان کے جوہر کمالات کے ہیں۔ اگر اسی طرح زبانوں کے حوالے رہیں تو چند روز میں صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے اور حقیقت میں یہ حالات نہ مٹیں گے۔ بلکہ بزرگانِ موصوف دُنیا میں فقط نام کے شاعر رہ جائیں گے۔ جن کے ساتھ کوئی بیان نہ ہوگا۔ جو ہمارے بعد آنے والوں کے دلوں میں یقین کا اثر پیدا کرسکے۔ ہرچند کلام ان کے کمال کی یادگار موجود ہیں، مگر فقط دیوان، جو بکتے پھرتے ہیں۔ بغیر ان کے تفصیل حالات کے، اس مقصود کا حق پورا پورا نہیں ادا کرسکتے۔ نہ اُس زمانے کا عالم اس زمانے میں دکھا سکتے ہیں اور یہ نہ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا۔

سوداؔ اور میرؔ وغیرہ بزرگانِ سلف کی جو عظمت ہمارے دلوں میں ہے وہ آج کل کے لوگوں کے دلوں میں نہیں۔ سبب پوچھئے تو جواب فقط یہی ہے کہ جس طرح ان کے کلاموں کو ان کے حالات اور وقتوں کے واردات نے خلعت اور لباس بن کر ہمارے سامنے جلوہ دیا ہوا ہے۔ اس سے اربابِ زمانہ کے دیدہ و دل بے خبر ہیں اور حق پوچھو تو انہی اوصاف سے سوداؔ، سوداؔ اور میرؔ تقی میرؔ صاحب ہیں۔ ورنہ جس کا جی چاہے، یہی تخلص رکھ دیکھے۔ خالی سودا ہے تو جنون ہے اور نرا میر ہے تو گنجفے کا ایک پتہ،

میرے دوستو! زندگی کے معنی کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سورہنا اور منہ سے بولے جانا نہیں ہے، زندگی کے معنے یہ ہیں کہ صفات خاص کے ساتھ نام کو شہرتِ عام ہو اور اسے بقائے دوام ہو۔ اب انصاف کرو کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہنچائیں۔ انہیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آئیں اور اس پر نام کی زندگی سے محروم رہیں۔ بزرگ بھی وہ بزرگ کہ جن کی کوششوں سے ہماری ملکی اور کتابی زبان کا لفظ لفظ اور حرف حرف گرانبارِ احسان ہو۔ ان کے کاموں کا اس گمنامی کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے۔ جس مرنے پر ان کے اہل و عیال روئے۔ وہ مرنا نہ تھا، مرنا حقیقت میں ان باتوں کا مٹنا ہے۔ جس سے ان کے کمال مرجائیں

گے اور یہ مرنا حقیقت میں سخت غمناک حادثہ ہے۔

ایسے بزرگانِ باکمال کے رویّے اور رفتاروں کا دیکھنا، انہیں ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ کر دکھاتا ہے اور ہمیں بھی دنیا کے پیچیدہ رستوں میں چلنا سکھاتا ہے اور بتاتا ہے کہ کیونکر ہم بھی اپنی زندگی کو اتنا طولانی اور ایسا گراں بہا بنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ نئے "تعلیم یافتہ" جن کے دماغوں میں انگریزی لالٹینوں سے روشنی پہنچتی ہے۔ وہ ہمارے تذکروں کے اس نقص پر حرف رکھتے ہیں۔ کہ ان سے نہ کسی شاعر کی زندگی کی سرگزشت کا حال معلوم ہوتا ہے، نہ اس کی طبیعت اور عادتات واطوار کا حال کھلتا ہے۔ نہ اس کے کلام کی خوبی اور صحت وسقم کی کیفیت کھلتی ہے۔ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا نسبت تھی۔ انتہا یہ ہے کہ سالِ ولادت اور سالِ وفات تک بھی نہیں کھلتا۔ اگرچہ اعتراض ان کا کچھ اصلیت سے خالی نہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی معلومات زیادہ تر خاندانوں اور خاندانی باکمالوں اور ان کے صحبت یافتہ لوگوں میں ہوتی ہیں۔ وہ لوگ کچھ تو انقلاب زمانہ سے دل شکستہ ہو کر تصنیف سے ہاتھ کھینچ بیٹھے کچھ یہ کہ علم اور اس کی تصنیفات کے اندر روز بروز کے تجربے سے رستے بدلتے ہیں۔ عربی فارسی میں اس ترقی اور اصلاح کے رستے سالہا سال سے مسدود ہو گئے۔ انگریزی زبان ترقی اور اصلاح کا طلسمات ہے، مگر خاندانی لوگوں نے اوّل اوّل اس کا پڑھانا اولاد کے لیے عیب سمجھا اور ہماری قدیمی تصنیفوں کا ڈھنگ ایسا واقع ہوا تھا۔ کہ وہ لوگ ایسی وارداتوں کو کتابوں میں لکھنا کچھ بات نہ سمجھتے تھے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو زبانی جمع خرچ سمجھ کر دوستانہ صحبتوں کے نقل مجلس جانتے تھے۔ اس لیے وہ ان رستوں سے اور ان کے فوائد سے آگاہ نہ ہوئے اور یہ انہیں کیا خبر تھی۔ کہ زمانے کا ورق الٹ جائے گا۔ پُرانے گھرانے تباہ ہو جائیں گے۔ ان کی اولاد ایسی جاہل رہے گی کہ اسے اپنے گھر کی باتوں کی بھی خبر نہ رہے گی اور اگر کوئی بات ان حالات میں سے بیان کرے گا تو لوگ اس سے سند مانگیں گے۔ غرض خیالاتِ مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا۔ کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں۔ یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں۔ انہیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو، اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، چلتی پھرتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو۔

الحمدللہ

کہ چند روز میں جس قدر پریشان خیالات تھے، بالترتیب جمع ہو گئے۔ اسی واسطے اس مجموعے کا نام "آبِ حیات" رکھا۔ اور زبانِ اردو کی عہد بعہد کی تبدیلی کے لحاظ سے پانچ دور پر تقسیم کیا۔ اس طرح کہ ہر ایک دور اپنے عہد کی زبان بلکہ اس زمانے کی شان دکھاتا ہے۔ خدا کی درگاہ میں دعا

ہے کہ بزرگوں کے ناموں اور کلاموں کی برکت سے مجھے اور میرے کلام کو بھی قبولِ عام اور بقائے دوام نصیب ہو۔

(آمین رب العالمین)

---

# فہرست مطالب



بندہ آزاد محمد حسین
عفی اللہ عنہ

# زبانِ اُردو کی تاریخ

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اُردو، برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دُنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے۔ اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے، تم خیال کرو گے۔ کہ شاید اس میراثِ قدیمی کی سند سنسکرت کے پاس ہو گی۔ اور وہ ایسا بیج ہو گا کہ یہیں پھوٹا ہو گا۔ اور یہیں پھلا پھولا ہو گا۔ لیکن نہیں، ابھی سُراغ آگے چلتا ہے سب جانتے ہیں کہ ہندوستان اگرچہ بے ہمتی اور آرام طلبی کے سبب سے بدنام رہا مگر باوجود اِس کے مہذّب قوموں کی آنکھوں میں ہمیشہ سے کُھبا رہا ہے، چنانچہ اس کی سرسبزی اور زرخیزی اور اعتدال ہوا نے بلا تے جان ہو کر ہمیشہ اسے غیر قوموں کی گھڑ دوڑ کا میدان بنا رکھا ہے۔ پس دانائے فرنگ کو ہر بات کا پتا پتال تک نکالنے والے ہیں، انہوں نے زبانوں اور قدیمی نشانوں سے ثابت کیا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے اور لوگ تھے۔ ایک زبردست قوم نے آکر آہستہ آہستہ کل ملک پر قبضہ کر لیا، یہ فتحیاب غالباً جیحوں سیحوں کے میدانوں سے اُٹھ کر اور ہمارے شمالی پہاڑ الٹ کر اس ملک میں آئے ہوں گے۔ اس زمانے کے گیت اور پرانی پرانی نشانیاں دیکھ کر یہ بھی معلوم کیا ہے کہ وہ لوگ دل کے بہادر، ہمت کے پورے، صورت کے وجیہہ، رنگ کے گورے ہوں گے۔ اور اس زمانے کی حیثیت کے بموجب تعلیم یافتہ بھی ہوں گے۔ موقع کا مقام اور سرزمین دیکھ کر یہیں زمین گیر ہوئے۔ اس قوم کا نام ایرین تھا اور عجب نہیں کہ ان کی زبان وہ ہو جو اپنے اصل سے کچھ کچھ بدل کر اب سنسکرت کہلاتی ہے، یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہندوستان میں آکر راجہ مہاراجہ کا خطاب لیا، ایران میں تاج کیانی پر درفش کاویانی لہرایا۔ اپنے مذہب کا نادر طریقہ لے کر چین کو نگار خانہ بنایا۔ یونان کا طبقہ حکمت سے الگ جمایا۔ روما کی عالمگیر سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اندلس پہنچ کر چاندی نکالی۔ یورپ سے خبر آئی، کہ کہیں دریا سے مچھلیاں نکالتے نکالتے گوہر سلطنت پلتے، کہیں پہاڑوں سے دھات کھودتے کھودتے لعل بے بہا نکال لائے تب اصلی رہنے والے کون تھے اور ان کی اصلی زبان کیا تھی؟ قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پنجاب میں اب قطعے قطعے کی زبان کہیں کچھ کچھ اور کہیں بالکل اختلاف رکھتی ہے اور ——

یہی حال اور اضلاع ہند میں ہے۔ اسی طرح اس عہد میں بھی اختلاف ہوگا۔ اور اس عہد کی نامی زبانیں وہ ہوں گی جن کی نشانی تامل، اوڑیا اور تلنگو وغیرہ اضلاع دکن اور مشرق میں اب تک یادگار موجود ہیں۔ بلکہ اس حالت میں بھی ان کی شاعری اور انشاء پردازی کہتی ہے کہ یہ گٹھلی کسی لذیذ میوے کی ہے اور سنسکرت سے اسے لگاؤ تک نہیں۔

فتحیابوں نے ہندوکش کے پہاڑ سے اتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے۔ اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہوں گے، کچھ بھاگے ہوں گے، وہ دکن اور مشرق کو ہٹتے گئے ہوں گے۔

کچھ فتحیابوں کی غلامی اور خدمت گاری میں کام آئے ہوں گے اور وہی شودر کہلائے ہوں گے۔ چنانچہ اب تک بھی ان کی صورتیں کہے دیتی ہیں کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں۔

مدت دراز تک ایران بھائیوں کے کاروبار ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ ملے جلے رہے ہوں گے۔ یہی سبب ہے کہ ایران کی تاریخ قدیم میں مہ آباد اور اس کے زمانے کی تقسیم برہما کے زمانے سے اور اس کے رسوم و قواعد سے مطابقت دکھاتی ہے اور چاروں برنوں کا برابر پتہ لگتا ہے۔ یہاں بدھ نے انہیں توڑا۔ وہاں زرتشت کے مذہب نے اسے جلا کر خاک کیا۔ مگر ہندوؤں نے بدھ کے بعد پھر اپنے حال کو سنبھال لیا۔ ایرانی اپنی بدحالی کو نہ سنبھال سکے۔

چاروں برنوں کی تقسیم اور ان کا الگ تھلگ رہنا دور کے دیکھنے والوں کو غرور کے لباس میں نظر آیا، مگر حق پوچھو تو یہ کچھ بری بات نہ تھی۔ اسی کی برکت ہے کہ آج تک چاروں سلسلے صاف الگ الگ چلے آتے ہیں۔ جو ہندو ہوگا، ماں باپ دونوں کی طرف سے خالص ہوگا۔ اور برابر اپنی قوم کا پتہ بتا سکے گا۔ جو دوغلا ہوگا۔ اس کا سلسلہ الگ ہو جائے گا۔ اگر یہ قیدیں اس سختی سے ساتھ نہ ہوتیں تو تمام نسلیں خلط ملط ہو جاتیں۔ نجیب الطرفین آدمی چاہتے تو ڈھونڈے سے نہ ملتا۔ فتحیابوں کی ان سخت قیدوں نے آپس کی بندشوں میں عجیب طرح کے پھندے ڈالے۔ چنانچہ سب نسلوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کر چکے تو خیال ہوا کہ شودروں کے ساتھ آٹھ پہر بات چیت، رہنے سہنے اور لین دین کرنے میں بزرگوں کی زبان دوغلی ہو جائے گی۔ اس واسطے کہا کہ ہماری زبان "زبانِ الٰہی" ہے۔ اور الٰہی عہد سے اسی طرح چلی آتی ہے۔

چنانچہ اس کے قواعد اور اصول باندھے اور ایسے جانچ کر باندھے، جن میں نقطے کا فرق

نہیں آسکتا۔ اس پاکیزگی نے غیر لفظ کو اپنے دامن پر ناپاک دھبّا سمجھا اور سوا برہمن کے دوسرے کی زبان، بلکہ کان تک گزرنا بھی ناجائز ہوا۔ اس سخت قانون نے بڑا فائدہ یہ دیا کہ زبان ہمیشہ اپنی اصلیت اور بزرگوں کی یادگار کا خالص نمونہ نمایاں کرتی رہے گی۔ برخلاف ایرانی بھائیوں کے ان کے پاس زبانی سند بھی نہ رہی۔

اسی بنیاد پر فتحیابوں کی بلند نظری نے اس کا نام سنسکرت رکھا، جس کے معنی آراستہ پیراستہ، منقّیٰ، منزہ، مصفا، مقدس، جو چاہے سمجھ لو۔ ان کے قواعدِ زبان بھی ایسے مقدس ہوئے کہ بزرگانِ دین ہی اسے پڑھائیں تو پڑھائیں، بلکہ اس طرح پکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا۔ کہ شودر کے کان میں آواز پڑے۔ اس زبان کا نام دیو بانی ہوا، یعنی زبانِ الٰہی، زبان شلوکی وید کے سنہ ترتیب، جس سے اس عہد کی زبان کا پتہ لگے۔ ۱۴ سو برس قبل سنہ عیسوی خیال کرتے ہیں۔ اس وقت ان فتحیابوں کی باتیں اس ملک اور ملک والوں کے ساتھ ایسی سمجھ لو جیسے ہندوستان میں پہلے پہلے مسلمانوں کی حالتیں، ان کے سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفّظ یہاں کے لوگوں میں آکر کچھ اور ہو گئے ہوں گے۔ اس لیے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعے قطعے میں پراکرت زبانیں خود بخود پیدا ہو گئی ہوں گی۔ جیسے اسلام کے بعد اردو، چنانچہ ماگدھی (پالی) سورسینی، مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی قدامت کا پتا بتاتی ہیں۔ ان کی سیاہی میں سینکڑوں لفظ سنسکرت کے چمکتے نظر آتے ہیں، گر بگڑے ہوئے ہیں۔

دیکھا! پرکت کے معنے ہیں، طبیعت اور جو طبیعت سے نکلے۔ چنانچہ ہیم چند لغات سنسکرت کا جامع بھی یہی کہتا ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت مہذب اور مقدس اور پراکرت غیر مہذب لوگوں کو کہتے ہیں۔ پس ایسی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فہمیدہ لوگ تھے۔ ہر بات کو خوب سمجھتے تھے اور جو کچھ انھوں نے کیا سمجھ کر کیا۔

راجہ بھوج کے عہد کی ناٹک پستکیں کہتی ہیں کہ ان عہدوں میں علمی، کتابی اور درباری زبان تو سنسکرت تھی، مگر چونکہ معاملہ خاص و عام سے پڑتا ہے، اس لیے گفتگو میں پنڈتوں کو بھی پراکرت ہی بولنی پڑتی ہے، پراکرت صاف سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں اور ویسے ہی قاعدے صرف و نحو کے بھی ہیں۔

سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی، پھر بھی منوسمرتی ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد لکھی گئی تھی۔ اس میں اور "وید" کی زبان میں صاف فرق ہے اور اب اور بھی زیادہ ہو گیا۔ لیکن چونکہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس لیے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا کہ دفعتاً ۵۴۳ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاکہ منی پیدا ہوئے۔ وہ

مگدھ دیس سے اٹھے تھے۔ اس لیے وہیں کی پراکرت میں وعظ شروع کیا۔ کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا۔ عورت مرد سے لے کر بچے اور بوڑھے تک یہی اس دیس کی زبان تھی۔ ان کی آتش بیانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا۔ جیسے بن میں آگ لگے۔ دیکھتے دیکھتے دھرم، حکومت رسم و رواج، دین آئین سب کو جلا کر خاک کر دیا اور مگدھ دیس کی پراکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہوگئی۔ اقبال کی یاوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اسی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے اور فنون کے کارخانے جاری ہوگئے۔ کہیں کہیں کونے گوشے میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے، وہاں ویدوں کا اثر رہا۔ باقی راج دربار اور علمی سرکار سب ماگدھی ہی ماگدھی ہوگئی۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر دعوے پڑھے۔ اور بآواز بلند کہہ دیا کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے۔ برہمن اور کل انسان بات کرنے کے لائق بھی نہ تھے۔ اصل میں ان کی بھی اور قادر مطلق بدھ کی زبان یہی ہے۔ اس کی صرف و نحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں۔ خدا کی قدرت دیکھو! جو لونڈی تھی، وہ رانی بن بیٹھی اور رانی منہ چھپا کر کونے میں بیٹھ گئی۔

زمانے نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً ۱۵سو برس بعد) بدھ مذہب کو بھی رخصت کیا اور اس کے ساتھ اس کی زبان بھی رخصت ہوئی۔ شنکر اچارج کی برکت سے برہمنوں کا ستارہ ڈوبا ہوا پھر ابھر کر چمکا اور سنسکرت کی آب و تاب بھی شروع ہوئی۔ راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اس کی فصاحت نے پائی، آج تک لوگوں کی آنکھوں کا اجالا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربار سلطنت اور اعلیٰ درجے کے لوگوں کو سنسکرت بولنا اعتبار و افتخار کی سند تھا اور پراکرت عوام کی زبان تھی۔ کیونکہ اس عہد میں جو کالی داس ملک الشعراء نے شکنتلا کا ناٹک لکھا ہے، سبھا میں دیکھ لو، بادشاہ، امراء اور پنڈت سنسکرت بول رہا ہے۔ کوئی عام آدمی کچھ کہتا ہے تو پراکرت میں کہتا ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعے کی وہ زبان تھی۔ جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت بھی ہر قطعے میں اپنی اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی اور سنسکرت تصنیفات اور خواص کی زبانوں کے لیے باعث برکت تھی کہ دفعتاً زمانے کے شعبدہ باز نے ایک اور رنگ بدلا یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا۔ اس نے پھر ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا۔ اور اسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہو گیا۔

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژند و استا کی زبان ایرین کے رشتے سے ایک دادا

کی اولاد ہیں۔ مگر زمانے کے اتفاق دیکھو کہ خدا جانے کے سو برس یا کے ہزار برس کی بچھڑی ہوئی بہنیں اس حالت سے آکر ملی ہیں کہ ایک دوسری کی شکل نہیں پہچان سکتی۔

ہندوستانی بہن کی کہانی تو سن چکے، اب ایرانی بہن کی داستان بھی سن لو، کہ اس پر وہاں کیا گزری۔ اوّل تو یہی قیاس کرو کہ اس ملک نے جو ایران نام پایا، شاید وہ لفظ ایرین ہی کی برکت ہو۔ پھر یہ بھی کچھ تھوڑے تعجب کا مقام نہیں کہ جس طرح ہندوستانی بہن پر وقت بوتت بُدھ مذہب وغیرہ کے حادثے گزرے، اسی طرح اس پر بھی وہاں انقلاب پڑتے رہے۔ باوجود اس کے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔

ایرانی بہن جب اس ملک میں جا کر بسی ہوگی، اوّل تو مدت تک ان کے مذہب، رسم و رواج اور زبان جیسے تھے۔ ویسے ہی رہے ہوں گے۔ مگر اس زمانے کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں آئی۔ کچھ ٹوٹا پھوٹا پتا ملتا ہے۔ تو زرتشت کے وقت سے ملتا ہے، جسے آج تخمیناً ۲۴ سو برس ہوئے۔ اس نورانی موحّد نے شعلۂ آتش کے پردے میں توحید کے مسئلے کو رواج دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے بازوؤں سے زور پکڑا۔ اور ایران سے نکل کر دو سو برس کے قریب اطراف و جوانب کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا اور ایشیا کے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔

جو مصیبت بدھ کے ہاتھ سے بید شاستر پر پڑی تھی، وہاں وہی مصیبت ژنداستا پر آئی۔ چنانچہ جس آگ نے زرتشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا۔ جس کے آگے گشتاسپ نے تاج اتار کر رکھا۔ جس کی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی وہ یونان کے آب شمشیر سے بجھائی گئی اور آتش خانے راکھ ہو کر اُڑ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ژند و پاژند کے ورق ورق برباد کیے گئے اور ہزاروں کتابیں فلسفۂ الٰہی اور علوم و فنون کی تھیں کہ نابود ہو گئیں۔ جب کہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے زبانوں پر بھی زور دکھایا ہوگا تھوڑے ہی دنوں میں پارتھیا والوں کا عمل دخل ہو گیا۔ وہ ایران جسے ہزاروں برس سے ملک گیری کے نشان سلامی اتارتے تھے اور تہذیب و شائستگی اس کے دربار میں سر جھکاتے تھے۔ پانچ سو برس تک ظفر یابوں کے قبضے میں دبا رہا، اور ژند کی کتب مقدسہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کی گئیں۔

سنہ ۲۰۰ء میں پھر تن بے جان میں سانس اور ساسانیوں کی تلواروں میں قدیمی اقبال نے چمک دکھائی۔ ان بادشاہوں نے ملک و مملکت کی قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کو بھی روشن کیا۔ گرے ہوئے آتش خانوں کو پھر اٹھایا اور جہاں جہاں سے پھٹے پُرانے اوراق پریشان ہاتھ آئے بہم پہنچائے۔ ان ہی کی کوششوں کی کمائی تھی، جو پھر ساڑھے چار سو برس بعد

'علم' اسلام کے قربان ہوئی، اس معاملے میں ہمیں نیک نیت پارسیوں کا شکریہ نہ بھولنا چاہیے۔ کیونکہ باوجود تباہی کے خانہ بربادی کے جو پرانا کاغذ کسی بااعتقاد کے ہاتھ آیا۔ وہ جان کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا کہ بندر سورت، گجرات وغیرہ ملکوں میں آج تک اسی نور سے آتش خانے روشن ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے۔ وہ ان تصنیفات کا بقیہ ہے جو ساسانیوں کے عہد میں ہوئیں۔ کتبِ مذکور دونوں زبانوں کا لفظی اتفاق ہی نہیں ثابت کرتیں۔ بلکہ ان کے اتحاد و اعتقاد پر بھی شہادت دیتی ہیں۔ جو چار برن ہندوؤں میں، وہی ایران میں تھے۔ اجرام آسمانی کی عظمت واجب تھی۔ حیواناتِ بے آزار کا مارنا گناہ عظیم تھا تناسخ کا مسئلہ دونوں میں یکساں تھا۔ آتش، آب، خاک، باد، ابر، بجلی، گرج، ہوا وغیرہ وغیرہ اشیا۔ کے لیے ایک ایک دیوتا مانا ہوا تھا۔ جس کے اظہار عظمت کے لیے خاص خاص طریقے تھے۔ یاد الٰہی کے زمزمے تھے جس کو وہ اپنی اصطلاح میں گاتھا کہتے تھے۔ یہ وہی لفظ ہے۔ جس کے نام پر یہاں گیتا کتاب ہے۔ کیونکہ اس میں بھی یاد الٰہی کے گیت ہیں۔ فارسی مروجہ کے چند الفاظ تمثیلاً لکھتا ہوں کہ سنسکرت سے ملتے ہوتے معلوم ہوتے ہیں۔

| فارسی | سنسکرت | فارسی | سنسکرات |
|---|---|---|---|
| پدر | پتر | برادر | بھراتر |
| پور | پتر | دختر | دوہتر |
| مادر | ماتر | انگشت | انگشٹ |
| زانو | جانو | پا | پاؤ |
| بار | بھار | بیم | بھئے |
| بوم | بھوم | خاشاک | کشیا |
| اسپ | اشو | خر | کھر |

ایرانی بھن پر ایران میں پہلے اسلام کے ہاتھ سے وہ صدمہ گزرا تھا۔ جو کہ یہاں دو سو برس کے بعد گزرا اور اس سے اس کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی۔ بہر حال یہاں وہ ایسی حالت کے ساتھ پہنچی کہ عربی اور ترکی الفاظ اور بہت سے لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب سے اس کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی۔ یہاں جو مسلمان آتے، وہ آپس میں وہی رائج الوقت فارسی بولتے تھے اور ہندوؤں سے ہندی کے الفاظ ملا جلا کر گزارہ کر لیتے تھے۔

ادھر سنسکرت تو دیوبانی یعنی زبانِ آسمانی تھی۔ اس میں ملکش کو دخل کہاں؟ البتہ برج بھاشا نے اس بن بلائے مہمان کو جگہ دی۔ دھرم دان ہندو سالہا سال تک ملیکش بھاشا سمجھ کر

غیر زبان سے متنفر رہے۔ مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے کیونکہ اسے گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں، جو کسی طرح بند نہیں ہوتیں، غرض آٹھ پہر ایک جگہ کا رہنا سہنا لین دین کرنا تھا، لفظوں کے بولے بغیر گزارہ نہ کر سکے، دو قوموں کے ارتباط میں ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے اور اس کے کئی سبب ہیں

اوّل تو یہ کہ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں۔

دوم۔ اکثر معانی ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں انہی کی زبان میں کہیں تو ایک لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں۔ ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے۔ پھر بھی نہ وہ مزا آتا ہے، نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہے اس صورت میں گویا قانون زبان اور آئینِ بیان مجبور کرتا ہے کہ یہاں وہی لفظ بولنا چاہیئے دوسرا لفظ بولنا جائز نہیں۔

سوم: جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے ہیں، وہ اس لطف کو جانتے ہیں کہ جب دو غیر زبان والے ایک جگہ رہتے سہتے ہیں۔ تو کبھی کام کاج کی شدت مصروفیت میں، کبھی اس عالم میں ضروری بات جلد ہی کہہ دینے کی غرض سے، کبھی آسانی سے مطلب سمجھانے کو ایک دوسرے کے لفظ خواہ مخواہ اس طرح بول جانے پڑتے ہیں۔ کہ بے اس کے گزارہ نہیں ہوتا۔

چہارم:۔ پھر جب ایک جگہ رہ کر شیر و شکر ہوتے ہیں۔ تو اکثر پیار اور محبت سے کبھی آپس میں دل لگی کے لیے ایک دوسرے کے لفظ بول کر جی خوش ہوتا ہے جس طرح دوست کو دوست پیارا ہوتا ہے، اسی طرح اس کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کے رہنے کو جگہ دیتے ہیں اسی طرح ان کی زبان مہمان لفظوں کو جگہ دیتی ہے۔

پنجم:۔ بڑی بات یہ ہے کہ فتحیابوں کے اقبال کی چمک ان کی بات بات کو، بلکہ لباس دستار، رفتار گفتار کو بھی ایسی آب و تاب سے جلوہ دیتی ہے۔ کہ وہی سب کی آنکھوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور لوگ اسے فقط اختیار ہی نہیں کرتے بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ پھر اس میں بہت سے فوائد بھی عقلی دلائل سے پیدا کرتے ہیں۔

اس زمانے کی عہد بعہد کی ہندی تصنیفیں آج نہیں ملتیں، جن سے وقت بوقت اس کی تبدیلیوں کا حال معلوم ہو، البتہ جب ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین غوری نے راے پتھورا پر فتح پائی تو چند کوی (ایک نامی شاعر) نے پرتھی راج راسا لکھا اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ زبان مذکور نے کتنا جلد عربی، فارسی کے اثر کو قبول کر لیا ہر صفحے میں کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں ساتھ ہی یہ معلوم ہوتا

ہے کہ اس وقت میں یہاں کی بھاشا بھی کچھ اور بھاشا تھی۔

ترجمے اور تصنیف کے تجربہ کار جانتے ہیں کہ ان کی عبارت میں کسی زبان کا اصل لفظ جو اپنا مطلب بتا جاتا ہے۔ سطر سطر بھر عبارت میں ترجمہ کریں تو بھی وہ بات حاصل نہیں ہوتی۔ جو مجموعہ خیالات کا اور اس کے صفات و لوازمات کا اُس ایک لفظ سے سننے والے کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے، وہ ہماری سطر بھر سے پورا نہیں ہوتا۔ مثلاً چند کوی اپنی نظم میں سلطان کی جگہ اگر راجہ بلکہ مہاراجہ لکھ دیتا۔ تو بھی جو صفات اور اس کے لوازمات نیک یا بد، رحم یا عدل، زور یا ظلم یہ لفظ اس کی نظم میں دکھا رہا ہے، وہ بات راجہ مہاراجہ سے ممکن نہیں۔ اسی طرح لفظ سلام کہ اس کے مطلب کا حق خواہ ڈنڈوت خواہ پرنام کوئی لفظ ادا نہیں کر سکتا۔ نظیر اس کی آج انگریزی کے لفظ سینکڑوں لفظ ہیں۔ اگر ترجمہ کریں تو سطروں میں بھی مطلب پورا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک ہندوستانی شخص اپنے دوست سے کہتا ہے۔ لاٹ صاحب چھ بجے سٹیشن پر پہنچیں گے۔ پروگرام کے بموجب شہر کی سیر کریں گے۔ ۵ بجے آنا۔ وہیں چل کر تماشا دیکھیں گے۔

اب خواہ صحیح، خواہ بگڑے، مگر جو اصلی لفظ اپنے آپ معنی سننے والے کو سمجھا رہے ہیں، کئی کئی سطروں میں ترجمہ کئے جائیں۔ تو بھی حق مطلب بجا نہ لا سکیں گے۔ آخر پندرہ صدی عیسوی میں کہ سکندر لودی کا زمانہ تھا۔ آنا ہوا کہ اوّل کایتھ فارسی پڑھ کر شاہی دفتر میں داخل ہوئے۔ اور اب ان لفظوں کو ان کی زبانوں پر آنے کا زیادہ موقع ملا۔ رفتہ رفتہ اکبر کے عہد سے کہ مسلمان شیر و شکر

دین گوا بُوُنی سے دُنی نہ آئیو ہاتھ پیر کہاڑی ماریو گا پھل اپنے ہاتھ
کبیر بریر سراسئے ہے کیوں سوتے سکھ چین کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

گرو نانک صاحب کی تصنیفات بہت کچھ ہیں۔ اگرچہ خاص قطعہ پنجاب کی زبان ہے۔ مگر جس بہتات سے ان کے کلام میں عربی فارسی کے لفظ ہیں۔ اتنے کسی کے کلام میں نہیں اور چونکہ ۹۰۰ھ کے بعد فوت ہوئے تو اس کے چار سو برس پہلے کی پنجابی کا نمونہ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

دوہرا۔

سانس ماس سب جیو تمہارا تو ہے کھرا پیارا
نانک شاعر ایو کہت ہے سچے پروردگارا،

بلکہ اکثر چیزیں وظیفہ عبادت کے طور پر ہیں۔ ان میں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے نظر آتے ہیں۔ جپ جی کے دو فقرے دیکھو

وارن جاؤں، ان ایک بار تو سدا سلامت جی نرنکار

مسلمان بھی اس زمانے میں یہاں کی زبان سے محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ سولہویں صدی عیسوی شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی ایک شاعر ہوا۔ اس نے پدماوت کی داستان نظم کی۔ اس سے عہد مذکور کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیار سے بولنے لگے تھے۔ اس کی بحر بھی ہندی رکھی ہے۔ اور ورق کے ورق الٹتے چلے جاؤ، فارسی عربی کا لفظ نہیں ملتا۔ مطلب اس کا آج مسلمان، بلکہ ہندو بھی نہیں سمجھتا۔ کتاب مذکور چھپ گئی ہے اور ہر جگہ مل سکتی ہے۔ اس لیے نمونہ نہیں لکھا۔

ہمایوں نے جب گجرات دکن پر فوج کشی کی تو سلطان بہادر وہاں کا بادشاہ تھا۔ اور جاپانیر کا قلعہ بڑا مستحکم تھا کہ سلطان خود بھی وہاں رہتا تھا اور تمام خزائن و دفائن وہیں رکھتا تھا محاصرے کے وقت رومی خاں میر آتش زباد جو دیکھ معتبر اور مصاحب منظور نظر سلطان کا، ہمایوں کے قبضے میں آیا۔ سلطان بہادر کے پاس ایک طوطا تھا کہ آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا تھا۔ سلطان اسے ایسا چاہتا تھا کہ سونے کے پنجرے میں رکھا تھا اور ایک دم جدا ہو گئے۔

یہ نوبت ہوئی کہ ادھر بادشاہ اور اس کے اعلیٰ درجے کے اہل دربار نے جبّہ و دستار کے ساتھ داڑھیوں کو خدا حافظ کہا اور جامے پہن کر کھڑکی دار پگڑیاں باندھ بیٹھے۔ اُدھر ہندو شرفا بلکہ راجہ مہاراجہ ایرانی لباس پہنے اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے۔ مرزا کے خطاب کو بڑے شوق سے لینے لگے۔

اب جس قدر ممکن ہے۔ عہد بعہد کی زبانوں کے نمونے دکھاتا ہوں امیر خسرو جو کہ ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں فوت ہوئے۔ ان کی ایک غزل نظم اردو کی تاریخ میں دیکھو۔ جس کا پہلا مصرع ہے۔

ز حال مسکیں مکن تغافل وراے نیناں بنائے بتیاں الخ

اس سے تمہیں کچھ کچھ حال اس وقت کی زبان کا بھی معلوم ہوگا۔ خالق باری بھی انہیں کے مخلوقات فکر سے ہے۔ باریک بین اشخاص اس سے بھی بہت سے الفاظ اور فقرے دیکھ کر یہ نکتے سمجھ سکتے ہیں

بیا برادر آؤ رے بھائی　　　　بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

ایک مجرب نسخہ آنکھوں کا دہروں کی بحر میں کہتے ہیں۔

لودھ پھٹکری مُردہ سنگ　　　　ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنگ
افیون چنا بھر مرچیں چار　　　　اُرد برابر تھوتھا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے　　　　تُرت پیڑ نینوں کی ہرے

نظم اردو کی تاریخ میں ان کی عمدہ پہیلیاں، مکرنیاں، دو سخنے، انمل میں نے لکھ دیئے ہیں۔ انہیں دیکھو۔ اور خیال کرو کہ بحریں دہروں کی ہیں، مگر فارسیت کس قدر اپنا زور دکھا رہی ہے۔

ہندو شاعروں کے دوہرے برج بھاشا میں ہیں۔ مگر عہد بعہد کی زبان کا پتا بتاتے ہیں۔ چنانچہ سکندر لودھی کے زمانے میں کبیر شاعر بنارس کے رہنے والے علم میں ان پڑھ تھے گرو رامانند کے چیلے ہو کر ایسے ہوئے کہ خود کبیر پنتھیوں کا مت نکالا۔ تصنیفات اگر جمع ہوں تو کتی جلدیں ہوں گی۔ ان کے دہروں میں فارسی عربی کے لفظوں کو دیکھو

نہ کرتا تھا۔ وہ بھی لوٹ میں آیا۔ جب دربار میں لائے، رومی خاں بھی موجود تھا طوطے نے دیکھ کر پہچانا اور کہا

"پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام"

سب کو تعجب ہوا اور ہمایوں نے کہا

"رومی خاں چکنم کہ جانور است ورنہ زبانش می بریدم"

اس نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

غرض اس نقل سے یہ ہے کہ اس وقت بھی لوگوں کی زبان پر عربی، فارسی کے لفظ

پڑھے ہوئے تھے۔ جب ہی طوطے کی زبان سے "نمک حرام" کا لفظ نکلا، جانور جو سنتا ہوگا، وہی بولتا ہوگا۔

سترہویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن ضلع باندہ کے رہنے والے کہ پنڈت بھی تھے، شاعر بھی تھے، فقیر بھی تھے۔ انہوں نے رامائن کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ وہ لاثانی کتاب مطبوع خاص و عام ہوئی۔ ان کے دوہروں میں بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں لفظ فارسی عربی کے موجود ہیں۔

دُہرا راماتن۔

| | |
|---|---|
| سنکارے سیوک سکل چلے سوامی رکھ پائے | گھر تر و ترد بن وباگ سر ڈیرا دیو لگائے |
| گھر بسواس بچن ہٹ بولے | کتنی بھنگ کلہ بھی کھوے |
| رام انیک گریب نواجے | لوک بید بربرو براجے |
| گنی گریب گرام نر ناگر | پنڈت موٹے ملیں ادجاگر |
| مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ | تلسی داس گریب کو کوئی نہ پوچھے بات |

انہی دنوں میں سورداس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص و عام کیا۔ ان کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا کہ فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔

| | |
|---|---|
| مایا دھام دھن دنتا | باندھیوں ہوں اس ساج (یعنی ساز) |
| سنت سبھی جانت ہوں | تو نہ آیو باج (یعنی باز نہ آیا) |
| کھیت بہت کا ہے تم تا نے | سبن سنی آواج (یعنی آواز) |
| دیو نہ جات پات پار اتر آتے | چاہٹ چڑھیں جہاج (یعنی جہاز) |
| لیجئے پار اتار سور کوں | مہاراج برج راج |
| تیئں کرت کہت پربھوں تم سوں | سدغریب نواج (غریب نواز) |

خیال کرو کہ جب یہ بزرگانِ مذہب اپنے دوہروں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے تو گفت گو میں عام ہندو لوگ کیا اس سے کچھ زیادہ نہ بولتے ہوں گے۔

اخیر میں حسن و خوبی برج بھاشا کی راجہ جے سنگھ سوائی کی قدر دانی سے ظاہر ہوئی۔ انہوں نے ایک ایک اشرفی دوہرہ کوئی اور گنواں پنڈتوں کو انعام دے کر دہلی اور نواح دہلی

میں شوق پھیلایا۔

اس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کئی سو برسوں سے اسلام آیا ہوا تھا۔ جن کے باپ دادا کئی پشت یہیں کی خاک سے اٹھے اور یہیں پیوند زمین ہوئے انہیں آپس کے رشتوں اور معاملات کے سررشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولنی ہوتی ہوگی۔ تازہ ولایت۔ آدھی اپنی آدھی ان کی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہوں گے۔ ان زبانوں کی کوئی نثر تصنیف نہیں وہی امیر خسرو کی ایک غزل اور پہیلیاں اور مکرنیاں اور گیت پتا بتاتے ہیں کہ ۱۳۰۰ء میں یہاں کے مسلمان خاصی بھاشا بولتے ہوں گے۔ بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی لفظ ان کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے۔

اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا، اتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔ رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانے میں کہ اقبال تیموری کا آفتاب عین اوج پر تھا۔ شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دارالخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکانِ دولت زیادہ وہاں رہنے لگے۔

اہل سیف، اہل قلم، اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اردو ئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اردو ہوگیا۔ اسے فقط شاہجہاں کا اقبال کہنا چاہیئے کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اردو کی طرف منسوب مشہور ہوگئی۔ ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں۔ ان سے خیال کو وسعت دے کر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہی ہندوستان میں آیا ہوگا۔ اسی وقت سے ان کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہوگا۔ چند کوی کا کلام مل گیا۔ اس میں الفاظ موجود ہیں۔ محمود کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اس میں بھی ضرور ہوں گے۔

بیان ہائے مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو کچھ اس میں ہوا، کسی تحریک یا ارادے سے نہیں ہوا، بلکہ زبان مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے۔ کہ ہر زبان سے مل جل جاتی ہے۔ سنسکرت آئی، اس سے مل گئی۔ عربی، فارسی آئی اسے بسم اللہ، خیر مقدم کہا اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں، کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے دیوار

کو اینٹ، مٹی، چونا، سفیدی وغیرہ۔ پختہ کرتے ہیں یا یہ کہ ریختہ کے معنے ہیں، گری پڑی، پریشان چیز، چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں، اس لیے اسے ریختہ کہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس میں عربی، فارسی، ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور اب انگریزی داخل ہوتی جاتی ہے اور ایک وقت ہوگا کہ عربی، فارسی کی طرح انگریزی زبان قابض ہو جائے گی۔ چنانچہ میں ایک نواب زادے کی گفت گو لکھتا ہوں، جس کی پرورش اور تعلیم گھر ملو ہے۔ یعنی نہ عربی فارسی کی لفاظی نے اس پر رنگ چڑھایا ہے، نہ انگریزی نے روغن پھیرا ہے، فقط دوستانہ بے تکلفانہ باتیں ہیں۔

"بڑے آکا کی پنشن لینے کل کچہری گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے کمرے کے آگے کچھ قرقی کا مال نیلام ہو رہا تھا۔ کمریاں، کوٹ اور واسکٹیں نئی تھیں، کنٹر اور گلاس بھی ولایتی تھے، کرسیاں، میزیں، چقیں باریک خوش رنگ تھیں، میں نے کہا، چلو کوئی ڈھب کی چیز ہو تو لے لیں۔ منجھے آکا بولے۔ جانے بھی دو، جس مال نے مالک سے وفا نہ کی، ہم سے کیا وفا کرے گا۔ آتے ہوئے ریل سٹیشن کے پاس دیکھتا ہوں۔ کھبے مرزا جان چلے آتے ہیں، شکرام ٹھیرا کر بڑے تپاک سے ملے، بڑھاپے نے بچارے کا رنگ و روپ سب کھو دیا۔ وہ شکل ہی نہیں، وہ صورت ہی نہیں، کیسے گورے چٹے سجیلے جوان تھے، لوگ تصویریں اترواتے تھے۔ میں نے کہا میاں ہم نے تو جانا تھا تم دکھن سے خوب چاق، چوبند، سرخ، سفید ہو کر آؤ گے، تم تو سوکھ کر قاق ہو گئے۔ غضب کیا، اگلا چین بھی گنوا آئے۔ ٹھنڈا سانس بھر کے بولے ہائے جوانی۔

فارسی عربی کے الفاظ تو ظاہر ہیں۔ مگر خیال کیجیے کہ قرق، چق، چاق، "قاق" آکا ترکی ہیں۔ میز، نامعلوم، نیلام پرتگالی ہے، کمرا اطالی ہے، ڈپٹی، ریل، اسٹیشن، کوٹ، واسکٹ، کنٹر، گلاس انگریزی ہیں، چٹا۔ کھبا پنجابی ہے۔ مگر اتنا ہے کہ ہم چٹا بغیر گورے کے اور اسی طرح چنگا بغیر بھلے کے نہیں بولتے، وہ اکیلا ہی بولتے ہیں۔ کھبا پنجابی میں عام ہے۔ خاص صفت کے ساتھ بولتے ہیں۔ بھانڈا پھوڑنا اردو میں کسی بات یا راز کھول دینے کو کہتے ہیں۔ پنجابی میں باسن کو بھانڈا ہی کہتے ہیں۔ گلا گھونٹنا اردو میں بولتے ہیں، پنجابی میں کھینچ کر باندھنے کو یا مضبوط پکڑنے کو کہتے ہیں۔ مثلاً گھٹ کر باندھو یا گھٹ کر پکڑو۔ بھنانا، توڑنا اور تڑوانا ہے، اور اسی سبب سے پنجابی میں روپے کے لیے بھی بھنانا کہتے ہیں۔ اردو میں پہلے معنے متروک ہو گئے۔ دوسرے معنے رہے، وہ بھی رکو ٹ کر کے کہ جاؤ روپے کے ٹکے بھنا لاؤ۔ اور اس اصلیت کا سراغ یوں لگا کہ فارسی

میں روپے کے لیے خوردہ کردن بولتے ہیں اور اُردو میں بھی کہتے ہیں، صبح کو روپیہ خوردہ کیا تھا، دوپہر کو دیکھو تو برکت، یعنی سب پیسے اُٹھ گئے۔

کسوٹی :۔ گھِسنا مرادف فرسودن اردو میں بالکسر ہے۔ پنجابی میں اس طرح بولتے ہیں کہ کاف مفتوح معلوم ہوتا ہے اور دُہ کا تلفظ عجیب ہے کہ ان ہی کے لہجے کے لیے خاص ہے بہرحال اس سے کس وٹی (گھسنے کی بٹیا) معیار کا نام ہوا۔ اُردو میں یہی لفظ کسوٹی ہوگیا۔

روپ، سجیلا، جوبن، گنوایا، برج بھاشا ہے۔ ان کے علاوہ روزمرہ کی باتوں پر خیال کرو، یوسف، ہارون، موسےٰ، عیسےٰ وغیرہ عبرانی ہیں۔ کیمیا، فیلسوف، اصطرلاب یونانی ہیں، اُرد، یعنی ماش تامل ہے۔ نھا یعنی خرد گجراتی ہے، بڑا، جو کڑاہی میں تلتے ہیں، تلنگو ہے۔ گدام ملایا کی زبان ہے، تمباکو امریکہ کا لفظ ہے۔ یورپ کے رستے ہوکر اکبر کے عہد میں یہاں پہنچا۔

اردو میں اس وقت نثر کی کوئی کتاب نہ لکھی گئی جس سے سلسلہ ان تبدیلیوں کا معلوم ہو۔ میر جعفر زٹلی کے کلام میں محمد شاہی، بلکہ اس سے پہلے زمانے کا نمونہ کہتا۔ مگر زٹل کا اعتبار کیا۔ البتہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۴۵ھ میں فضلی تخلص ایک بزرگ نے "دہ مجلس" لکھی، اس کے دیباچے میں سبب تالیف لکھے ہیں اور غالباً یہی نثر اردو کی پہلی تصنیف ہے" پھر دل میں گزارا، کہ ایسے کام کو عقل چاہیئے۔ کامل اور مدد کسو طرف کی ہوتے شامل، کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے۔ اور گوہر مراد رشتہ امید میں نہ آوے۔ لہذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا۔ مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی لعبارت ہندی نثر نہیں ہوا۔

مستمع۔ پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطا کھایا اور بیان تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی، ناگاہ نسیم عنایت الٰہی دل افگار پر اہتزاز میں آئی۔ یہ بات آئینہ خاطر میں منہ دکھلائی"

میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" کے مضمون کو بھی مرزا رفیع نے نثر میں لکھا ہے۔ افسوس کہ اس وقت موجود نہیں۔ اس کا اندازہ بالکل یہی ہے کہ چند فقرے سودا کے ایک دیباچے سے نقل کرتا ہوں۔ جو کلیات میں موجود ہیں۔

نثر مرزا رفیع :۔ ضمیر منیر پر آئینہ داران معنے کے مبرہن ہوکہ محض عنایت حق تعالےٰ کی ہے۔ جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرعے کے از قبیل ریختہ در ریختہ

خامہ دوزبان اپنی سے صفحہ کاغذ پر تحریر فرماتے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کردن، تازبانی ان اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفرین رہوں ؎

قیمت قدر شناساہی سے پہنچے ہے بہم
ورنہ دنیا میں خزف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینے میں بیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہو بیچ قفس کے، جس وقت زبان پر آیا، فریاد بلبل ہے۔ واسطے گوش دادرس کے، غرض جب اہل سخن کا دُر منصفی زینت لب ہے سررشتہ حسن معانی کا اس کلام کے اس سے انصاف طلب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سپید کی مانند، شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے۔ تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے۔ چاہیئے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے۔ ورنہ گزند زہر آلود سے بے اجل کاہے کو مرے۔

اس تصنیف سے تخمیناً ۲۰ برس کے بعد جب کہ میر انشاء اللہ خاں اور مرزا جان جاناں مظہر کی دلی میں ملاقات ہوئی ہے۔ اس گفت گو کے چند فقرے بھی قابل غور ہیں۔ سید انشاء اللہ مرزا جانجاناں سے فرماتے ہیں:

## سیّد انشا فرماتے ہیں

"ابتدائے سن سبا سے تا اوائل ریعان اور اوائل ریعان سے الی الآن اشتیاق مالایطاق تقبیل عتبہ عالیہ نہ بحدے تھا کہ سلک تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے۔ لہٰذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں"

## مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں

اپنے تئیں کوں بھی بدو طفلی سے نہیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست رہا کی ہے۔

لیکن میر عفر غنی کے نام سے ایک گفت گو سید انشا نے دریائے لطافت میں لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر تعجب آتا ہے کہ اس صاحبِ کمال نے یہ زبان کس فصاحت کے قالب میں ڈھالی تھی کہ ان عبارتوں میں اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہے شاید مرزا جانجاناں اور سودا وغیرہ بزرگوں کی تحریر کچھ اور ہوگی، تقریر کا انداز اور ہوگا۔

بہر حال اس وقت تک انشا پردازی اور ترقی اور وسعت زبان اردو کی فقط شعراء کی زبان پر تھی۔ جن کی تصنیفات، غزلیں، عاشقانہ اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے اور غرض ان کی فقط اتنی تھی کہ امراء و اہل دول سے انعام لے کر گزارہ کریں یا تفریح طبع یا یہ کہ ہم چشموں میں تحسین و آفرین کا فخر حاصل کریں وہ بھی فقط نظم میں نثر کے حال پر کسی کو اصلا توجہ نہ تھی، کیونکہ کارروائی مطالب ضروری کی سب فارسی میں ہوتی تھی مگر خدا کی قدرت دیکھو۔ تھوڑے عرصے میں کئی قدرتی سامان جمع ہو گئے اور سب سے مقدم سبب اس کی عام فہمی تھی کہ ہر شخص سمجھتا تھا، اس لیے لکھنے والوں کو اسی میں واہ وا لینے کا شوق ہوا۔ میر محمد حسین خاں تحسین نے چہار درویش کا قصہ اردو میں لکھ کر نوطرز مرصع نام رکھا شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی ۱۷۹۷ء/ ۱۲۱۳ھ نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی۔

ادھر تو یہ چونچال لڑکا شعراء کے جلسوں اور امراء کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں میں سب کے دل بہلا رہا تھا۔ ادھر دانائے فرنگ، جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعے پر دوربین لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا۔ نظر باز تاڑ گیا۔ کہ لڑکا ہونہار ہے۔ مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس وقت پر حکمرانی کرتے ہیں، اس کی زبان سیکھنی واجب ہے، چنانچہ ۱۷۹۹ء/ ۱۲۱۴ھ میں میر شیر علی افسوس نے "باغ اردو" اور ۱۸۰۵ء/ ۱۲۲۰ھ میں "آرائشِ محفل" لکھی۔ میر امن دہلوی نے ۱۸۰۲ء/ ۱۲۱۷ھ میں "باغ و بہار" آراستہ کیا اور انہی دنوں میں "اخلاق محسنی" کا ترجمہ لکھا۔ ساتھ ہی جان گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں "قواعد اردو" لکھی، ۱۸۰۲ء/ ۱۲۰۵ھ میں سری للوجی لال کوی نے "پریم ساگر" لکھی اور "بیتال پچیسی" جو محمد شاہ کے زمانے میں سنسکرت سے برج بھاشا میں آئی تھی۔ اب عام فہم اردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی۔ لیکن اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا، کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں، جنہوں نے ۱۸۰۷ء/ ۱۲۲۲ھ میں قواعد اردو" لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے تھے۔

عجیب لطف کی بات یہ ہے کہ زبان اردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔ یعنی ۱۸۰۷ء/۱۲۲۲ھ میں مولوی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں کیا۔ بعد اس کے مولوی اسمٰعیل صاحب نے بعض رسالے عام اہلِ اسلام کی فہمائش کے لیے اردو میں لکھے۔

سنہ ۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل دفتروں میں اردو زبان ہوگئی۔ اسی سن میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی، سنہ ۱۸۳۶ء میں اردو کا اخبار دلی سے جاری ہوا۔ اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔

غرض اپنی آسانی کے وصف سے اور اس لحاظ سے کہ ملکی زبان یہی ہے، دفتری زبان بھی یہی ٹھہری۔ اردو نے آہستہ آہستہ فارسی کو پیچھے ہٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا تب سرکار نے مناسب سمجھا کہ اس ملک کے لوگوں کو ان ہی کی زبان میں انگریزی علوم و فنون سکھائے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء سے دلی میں سوسائٹی قائم ہو کر ترجمے ہونے لگے۔ اور ضرورت علمی الفاظ بہم پہنچانے لگی۔ خیال کرو کہ جس زبان کی فقط اتنی بنیاد ہو۔ وہ زبان کیا اور اس کی وسعت کا میدان کیا۔ البتہ اب امید کر سکتے ہیں کہ شاید یہ بھی ایک دن علمی زبانوں کے سلسلے میں کوئی درجہ پائے۔

اردو اس قدر جلد جلد رنگ بدل رہی ہے کہ ایک مصنف اگر خود اپنی ایک سن کی تصنیف کو دوسرے سن کی تصنیف سے مقابلہ کرے۔ تو زبان میں فرق پائے گا۔ باوجود اس کے اب تک بھی اس قابل نہیں کہ ہر قسم کے مضمون خاطر خواہ ادا کر سکے یا ہر علم کی کتاب کو بے تکلف ترجمہ کر دے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر علوم اور ہزاروں مسائل علمی ممالکِ فرنگ میں ایسے نکلے ہیں کہ زمانہ سلف میں بالکل نہ تھے۔ اس واسطے عربی، فارسی، سنسکرت، بھاشا وغیرہ جو کہ اردو کے بزرگ ہیں، ان کے خزانے میں بھی اس کے ادائے مطالب کے لیے لفظ نہیں اور اس میں ہم اردو بچاری کے افلاس پر چنداں تعجب نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جب کہ ہندو، مسلمان اپنے اپنے بزرگوں کی میراث کو بھی ہاتھ سے کھوئے بیٹھے ہیں۔

# برج بھاشا پر عربی اور فارسی زبانوں نے کیا کیا اثر کیے

جب دو صاحب زبان قومیں باہم ملتی ہیں تو ایک کے رنگ روپ کا دوسرے پر ضرور سایہ پڑتا ہے۔ اگرچہ اس کے اثر، گفت گو، لباس، خوراک، نشست برخاست مختلف رسوم میں بھی ہوتے ہیں، لیکن چونکہ مجھے اس مقام پر زبان سے غرض ہے۔ اس لیے اسی میں گفت گو کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم میں آتی ہے تو اپنے ملک کی صدہا چیزیں ایسی لاتی ہے کہ جو یہاں نہیں تھیں۔ اشیائے مذکور کبھی ضروری اور کبھی ایسی باعثِ آرام ہوتی ہیں کہ انہیں استعمال میں لانا ضروریات زندگی سے نظر آتا ہے، اس لیے یہ لوگ انہیں غنیمت سمجھ لیتے ہیں۔ اور بخوشی کام میں لاتے ہیں۔ ان اشیاء میں سے بہتیری چیزیں تو نام اپنے ساتھ لاتی ہیں اور بہتیری نئی ترکیب سے یا اوَل بدل کر یہاں نیا نام پاتی ہیں اور یہ پہلا اثر دوسری زبان کا ہے۔ اس کے علاوہ جب یہ دونوں ایک جگہ رہ سہہ کر شیر و شکر ہوتی ہیں تو ایک زبان میں دوسری زبان کے لفظ بھی گھل مل جاتے ہیں۔

جب مہمان و میزبان ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں۔ تو ایک خوش نما اور مفید تبدیلی کے لیے رستہ پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ طبعِ انسانی کے اتحاد سے سب کے خیالات متفق یا قریب قریب ہوں، مگر انداز بیان سب کا جدا جدا ہے اور طبیعت ہمیشہ نئے انداز کو پسند کرتی ہے۔ اس لیے اوائے مطلب میں ایک دوسرے کے انداز بیان سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پھر نئی نئی تشبیہیں۔ لطیف استعارے لے کر اپنی پرانی تشبیہوں اور مستعمل استعاروں کا رنگ بدلتے ہیں اور جس قدر زبان میں طاقت ہے، ایک دوسرے کے خیالات اور نئی طرز کو لے کر اپنی زبان میں نیا مزہ پیدا کرتے ہیں۔

یہ انقلاب حقیقت میں وقت بوقت ہر ایک زبان پر گزرتا ہے۔ چنانچہ قوم عرب نے جو ایک زمانے میں روم، یونان اور ہسپانیہ وغیرہ سے خلط ملط ہوئی تھی۔ ہزاروں لفظ علمی اور غیر علمی وہاں سے لیے، اسی طرح فارسی زبان عربی و ترکی وغیرہ الفاظ سے مالا مال نظر آتی ہے۔

انگریزی کے باب میں مجھے کچھ کہنا زیبا نہیں۔ کیونکہ اب روشن ضمیر انگریزی خواں بہت ہیں اور مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ مگر اتنا کہنا کافی ہے کہ جس طرح ایک مہذب

سلطنت میں تمام ضروریات سلطنت کے کارخانے اور ملکی سامان موجود ہونے چاہئیں۔ اسی طرح سب قسم کے الفاظ اور تمام ادائے خیالات کے انداز انگریزی زبان میں موجود ہیں۔

اب مجھے اپنی زبان میں گفت گو کرنی چاہیئے۔ لیکن اتنا یاد دلانا واجب ہے کہ اردو کہاں سے نکلی ہے اور کیوں کر نکلی ہے۔ اردو زبان اوّل لین دین، نشست برخاست کی ضرورتوں کے لیے پیدا ہوگئی۔ ہندوؤں کے ساتھ ہندی مسلمان، جو اکثر ایرانیوں یا ترکستانیوں کی اولاد تھے۔ ہندوستان کو وطن اور اس زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طرح زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی، اسی طرح کوئی زبان بے شاعری کے نہیں رہ سکتی۔ محمد شاہی دور تھا اور عیش و عشرت کی بہار تھی۔

ان شرفا کو خیال آیا ہوگا کہ جس طرح ہمارے بزرگ اپنی فارسی کی انشاپردازی میں گلزار کھلاتے تھے۔ اب ہماری یہی زبان ہے۔ ہم بھی اس میں کچھ رنگ دکھائیں۔ چنانچہ وہی فارسی کے خاکے اردو میں آتار کر غزل خوانیاں شروع کر دیں اور قصیدے کہنے لگے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ قوتِ بیان، یا لفظوں کی تراش یا ترکیبوں کی خوب صورتی یا تشبیہہ اور استعاروں کی رنگینی غرض اوّل جو کچھ نصیب ہوا شعرائے اردو کی بدولت ہوا اور یہی سبب ہے کہ جو کچھ سامان ایک ملکی اور ٹکسالی زبان کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ اس سے یہ زبان مفلس رہی۔ کیونکہ اس عہد میں علوم و فنون، تاریخ، فلسفہ، ریاضی وغیرہ کا چرچا عام ہوتا تو اس کے لیے بھی الفاظ ہو جاتے، جن جن باتوں کا چرچا تھا۔ انہی سامانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوتے۔ ہاں یہ کہنا ضرور چاہیئے کہ جو کچھ ہوا تھا۔ اپنے رنگ پر خوب ہوا تھا۔

اب ہمیں پھر مطلب پر آنا چاہیئے کہ بھاشا نے اردو کے کپڑے پہننے کے لیے فارسی سے کیا کیا لیا۔

• ۱۔ ان چیزوں کے نام لیے، جو عرب اور فارس سے آئیں اور اپنے نام اپنے ساتھ لائیں، مثلاً لباس میں، فرغل، لبادہ، کرتا، قبا، چوغا، آستین، گریبان پاجامہ، ازار، عمامہ، رومال، شال، دوشالہ، تکیہ، گاؤتکیہ، برقع پوستین وغیرہ

کھانے کے لیے ذیل میں،

دسترخوان، چپاتی، شیرمال، باقرخانی، پلاؤ، زردہ، مزعفر، قلیہ، قورمہ،

متنجن، فرنی، یاقوتی، حریرہ، ہریسہ، لوز، مربے، اچار، فالودہ گلاب، بید مشک، خوان، طبق، رکابی، تشتری، کفگیر، چمچہ، سینی، کشتی، چائے، جوش وغیرہ

متفرقات میں۔

حمام، کیسہ، صابون، شیشہ، شمع، شمعدان، فانوس، گلگیر، تنور رفیدہ، مشک، نماز، روزہ، عید، شب برات، قاضی، ساقی، حقہ نیچہ، چلم، تفنگ، بندوق، تختہ خرد، گنجفہ اور ان کی اصطلاحیں۔

یہ سب چیزیں اپنے نام ساتھ لے کر آئیں۔ بہت سی چیزیں آئیں کہ بھاشا میں ان کے لیے نام نہیں۔ سنسکرت کی کتابوں میں ہوں گے۔

پستہ، بادام، منقیٰ، شہتوت، بیدانہ، خوبانی، انجیر، سیب، بہی، ناشپاتی، اور انار وغیرہ۔

۰۔ ۲۔ بہت سے عربی فارسی کے لفظ کثرت استعمال سے اس طرح جگہ پکڑ بیٹھے ہیں کہ اب ان کی جگہ کوئی سنسکرت یا قدیمی بھاشا کا لفظ ڈھونڈ کر لانا پڑتا ہے۔ مگر اس میں یا تو مطلب اصلی فوت ہو جاتا ہے۔ یا زبان ایسی مشکل ہو جاتی ہے کہ عوام تو کیا خواص ہندو کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔

مثلاً:۔ دلال، فراش، مزدور، وکیل، جلاد، صراف، مسخرا، نصیحت، لحاف، توشک چادر، صورت، شکل، چہرہ، طبیعت، مزاج، برف، فاختہ، قمری، کبوتر، بلبل، طوطا، پر، دوات، قلم، سیاہی، گلاب، رقعہ، عینک، صندوق، کرسی، تخت، لگام، رکاب، زین، تنگ، پوزی، نعل، کوتل، عقیدہ، وفا، جہاز، مستول، بادبان، تہمت، درہ، پردہ، دالان، تہ خانہ، تنخواہ، ملاح، تازہ، غلط، صحیح، رسد، سرباری، کاریگہ، ترازو، شطرنج کے باب میں تعجب ہے کہ خاص ہند کا ایجاد ہے۔ مگر عرب اور فارس سے جو پھر کر آئی تو سب اجزا کے نام اور اپنی اصطلاحیں بدل آئی۔

سینکڑوں لفظ عربی و فارسی کے یہاں آئے۔ مگر ہوا موافق نہ آئی۔ اس لیے مزاج اور صورت بگڑ گئی، مثلاً مُرغا وغیرہ۔

صرف میں فارسی سے کچھ نہیں لیا۔ خود اتنا کیا کہ و ن علامت جمع ہندی کو عربی فارسی پر بھی لگا لیا۔

مثلاً آدمیوں، انسانوں، درختوں، میووں،

**اسمِ فاعل** فارسی عربی کے بے شمار لیے اور ان میں شطرنج باز کے قیاس پر چوپڑباز اور وفادار کے قیاس پر ظرفا سمجھ دار، سمجھ ناک بھی بول دیتے تھے۔

باغبان کے قیاس پر گاڑی بان، ہاتھی بان، بہلبان، نگہ بان اور دان حقیقت میں ایک ہیں، کیونکہ اصل میں دونوں زبانیں ایک دادا کی اولاد ہیں۔ اس کی تحقیق جیسی کہ چاہیئے فارسی لکچروں میں لکھی ہے۔

**اسمِ ظرف** قلم دان وغیرہ کے قیاس پر خاصدان، پاندان، ناگردان، پیک دان، مودیخانہ، پاخانہ،

**بابِ حروف** کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً حرفِ تشبیہہ کوئی نہیں لیا۔ مگر چنانچہ اور چونکہ موجود ہیں اور اس طرح آتے ہیں کہ ترجمے کے لیے ہندی حرف معلوم ہی نہیں ہوتا۔

**حروفِ شرط** اگر اور اس سے
اگرچہ بھی لیا

**واؤ عاطفہ** معیت معطوف اور معطوف علیہ اردو عبارت میں لے لیے، مثلاً آب و ہوا، شب و روز، صبح و شام، زور و شور،

**حروفِ استثنا** میں سے مگر اور عربی کے لفظ سوا، ماسوا، اِلّا و اِلّانہ، لیکن، ولیکن لے لیے، اپنے حرفوں کو گم کر دیا۔

**حروفِ نفی** نا اور بنا کی جگہ
نہ اور نے آگئے

**حروفِ ایجاب** ہ ہے، مگر ادب کی جگہ میں۔ ست بچن وغیرہ کی جگہ بجا، درست واقعی، حق، بے شک، برحق، بہ سر و چشم، آگئے، اصل زبان کے لفظ نہ رہے۔

**حروفِ تاکید** کی جگہ، ہرگز، زنہار، ضرور، البتہ آگئے، اصلی لفظ نہ رہے۔

**حروفِ تردید** کی جگہ یا خواہ ہیں،
اصل گم۔

**حروفِ تمنا** میں سے کوئی حرف نہیں، کاش، فارسی کا لفظ ہے۔

**حروفِ ترقی** میں بل تو نہیں بولتے۔
مگر بلکہ اپنے موقع پر آتا ہے۔

**اسم** کی بحث میں اسمائے اشارہ میں سے کچھ نہیں لیا۔ مگر ازانجاکہ، باآنکہ، باایکہ
مرکب ہوکر بہت آتے ہیں۔

**موصولات** میں سے کچھ نہیں لیا۔ مگر کافِ بیانہ اس طرح آنے لگا۔ کہ بے اس کے کلام
ہی بے مزہ ہوجاتا ہے، کیسا، ایسا، جیسا کی جگہ، کس طرح وغیرہ، کس وضع
وغیرہ، کتنا، اتنا، جتنا کی جگہ، کس قدر وغیرہ بھی بولنے لگے۔

**یائے نسبت** کی ترکیبوں میں فارسی عمومی کے بموجب نسبتی الفاظ بولنے لگے۔ چونکہ
دلّی وال کی جگہ دہلوی بولتے ہیں۔ اسی طرح اور الفاظ ہیں اور عورتوں میں
شیخانی، سیدانی، استانی وغیرہ وغیرہ

باوجودیکہ ہندی کے مصدر موجود تھے۔ مگر صدہا مصادر مرکبّہ بنا لیے۔ مثلاً ماننا، اب کہتے
ہیں: ہرچند سمجھایا، اس نے منظور نہ کیا، کسی عنوان قبول نہ کیا۔ یعنی نہ مانا۔

**مُکرنا** اب کہتے ہیں۔
عقل پہلے تو قبول دیا تھا۔ پھر انکار کر گیا۔ یعنی مکر گیا۔

**سوچنا** اب کہتے ہیں۔
ہرچند فکر کرتا ہوں، عقل کام نہیں کرتی۔

**پچتانا** اپنے کیے پر بہت پشیمان ہوا۔ مگر
اب کیا ہوسکتا ہے۔ یعنی پچتایا۔

اسی طرح خوش ہونا، غصّے ہونا، خفا ہونا، تنگ ہونا، دق ہونا، غمگین ہونا، تماشا دیکھنا
سیر کرنا، انتظار کرنا، راہ دیکھنا، یہاں تک کہ بہتیرے مصدروں کی اصل ہندی گم ہوگئی اس سے
بڑھ کر یہ کہ عربی فارسی کے مصدر یا مشتقّات لے کر ہندی کا اشتقّاق کرلیا۔

**گزشتن** سے گزرنا اور اس کے افعال،
محاورہ ہے کہ گئی گزری بات کا اب کیا کہنا

**فرمودن** سے فرمانا
اس کے بہت سے افعال۔

**قبول** سے قبولنا محاورہ ہے۔
بڑا بادی جور رہتا ہر گز نہ قبولا

**بدل** سے بدلنا - اور اس کے بہت سے افعال - محاورہ ہے کہ اد سے کا بدلا ہے صاحب ۔

**بخشیدن** سے بخشنا ۔

**لرزیدن** سے لرزنا

**نواختن** یا نوازش سے نوازنا

**شرم** ۔ سے شرمانا

**کاہلی** سے کہلانا ۔ میاں مجبورؔ ایک قدیمی شاعر تھے ۔ استاد مرحوم ان کی باتیں کیا کرتے تھے کہ بڈھے نے دیرینہ سال تھے ۔ مکتب پڑھایا کرتے تھے ۔ ایک دفعہ مشاعرے میں غزل پڑھی ۔ دیکھنا کس خوب صورتی سے فعل بٹھایا ہے ۔

باتیں دیکھ زمانے کی ، جی بات سے بھی کہلاتا ہے

خاطر سے سب یاروں کی مجبورؔ غزل کہہ لایا ہے

نحو میں ترکیب اضافی ۔ ترکیب توصیفی ، کہیں مبتدا ، کہیں خبر ہو کر تمام ہندی پر چھا گئی اس سے پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اختصار کے لحاظ سے لفظوں کا پھیلاؤ کم ہو گیا ۔

دوسرے جمع موصوف ہوا تو اسم صفت موصوف کو بھی اس کے لیے جمع لاتے تھے ، اب واحد لاتے ہیں ؎

ملائم ہو گئیں دل پر برہ کی ساعتیں کڑیاں

پھر کٹنے گے ان بن نہ کٹیں جن بنا گھڑیاں

اب کڑی ساعتیں بولتے ہیں ۔

تیسرے صیغہ مضارع بہ معنی حال ،

سودا ؎

نالہ سینے سے کرے عزم سفر آخر شب

راہ رو چلنے پہ باندھے ہے کمر آخر شب

**چوتھے** ۔ یہ کہ اقسام اضافتہ میں تشبیہ اور استعارے کے رنگ سے سیدھی سادی زبان رنگین ہو گئی ۔ چنانچہ بھاشا میں کہنا ہو تو کہیں گے ، راج کنور کے دل کے کنول کی کملاہٹ دربار کے لوگوں سے نہ دیکھی گئی ۔ اردو میں کہیں گے ، شہزادے کے غنچۂ دل کی کملاہٹ اہل دربار سے نہ دیکھی گئی ۔

ولی ۔ وغیرہ متقدمین کے کلاموں میں ایسی ترکیبیں بہت ہیں، بلکہ آدھے، آدھے اور سارے سارے مصرعے فارسی کے ہیں، مگر کچھ اور طرح سے ۔ علیٰ ہذالقیاس بھاشا کے الفاظ اور ترکیبیں بھی زیادہ ہیں اور اس طرح ہیں کہ آج کے لوگوں کو فصیح نہیں معلوم ہوتیں۔ اس کی مثال ایسی ہے گویا دودھ میں مٹھاس ملائی ۔ مگر وہ ابھی اچھی طرح گھلی نہیں، ایک گھونٹ خاصا میٹھا ایک بالکل پھیکا ہے ۔ پھر ایک میں مصری کی ڈلی دانت تلے آگئی، ہاں اب گھل مل کر وہ مرتبہ حاصل ہوا ہے جسے شیر و شکر کہتے ہیں۔

بعض اشخاص یہ بھی کہتے ہیں کہ خالی بھاشا میں کچھ مزہ نہیں، اُردو خواہ مخواہ طبیعت کو بھلی معلوم ہوتی ہے ۔ مگر میری عقل دونوں باتوں میں حیران ہے ۔ کیونکہ جب کوئی کہے : آج ایک شخص آیا تھا ۔ یا یہ کہیں کہ ایک منش آیا تھا تو دونوں یکساں ہیں ۔ کیونکر کہوں کہ منش مخالف طبع ہے ۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم بچپن سے شخص سنتے ہیں ۔ اس لیے ہمیں منش یا مانس، نامانوس معلوم ہوتا ہے ۔ اسی طرح اور الفاظ جن کی تعداد شمار سے باہر ہے ۔

اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ بہت سے لفظ خود متروک ہیں، مگر دوسرے لفظ سے ترکیب پاکر ایسے ہو جاتے ہیں کہ فصحا کے محاورے میں جان ڈال دیتے ہیں (مثلاً یہی مانس کہ اکیلا محاورے میں نہیں، مگر سب بولتے ہیں کہ احمد ظاہر میں تو بھلا مانس معلوم ہوتا ہے، باطن کی خبر نہیں ۔

بندھو ۔ بھاشا میں بھائی یا دوست کو کہتے ہیں، اب محاورے میں بھائی بند کہتے ہیں، نہ فقط بندھو، نہ بھائی بندھو اور ان استعمال کی ترجیح کے لیے دلیل کسی کے پاس نہیں، جو کچھ جس زمانے میں رواج پاگیا ۔ وہی فصیح ہو گیا ۔ ایک زمانہ آئے گا، ہمارے محاورے کو لوگ بے محاورہ کہہ کر ہنسیں گے ۔

اگرچہ یہ بات بغیر تمثیل ۔ ۔ دیکھنے کے بھی ہر شخص کے خیال میں نقش ہے کہ سنسکرت اور برج بھاشا کی مٹی سے اُردو کا پتلا بنا ہے ۔ باقی اور زبانوں کے الفاظ نے خط و خال کا کام کیا ہے ۔ مگر میں چند لفظ مثالاً لکھتا ہوں۔

دیکھو سنسکرت الفاظ جب اُردو میں آئے تو ان کی اکثریت نے انقلاب زمانہ کے ساتھ کیونکر صورت بدلی ہے ۔

ا ۔ چُورن سنسکرت ہے یعنی آٹا، بھاشا میں چون کہتے ہیں اور اُردو میں چُورن پسی ہوئی دوا کو کہتے ہیں اور کٹی ہوئی چیز کے نیچے جو باریک اجزا رہ جائیں وہ چُورا ہے ۔

۲۔ پشٹ — سنسکرت ہے۔ برج بھاشا میں پسان اسی سے ہے، پسنہاری، اُردو میں مہیٹھی پسی ہوئی دال کے لیے خاص ہوگئی اور پیسنا مصدر ہوگیا

۳۔ اٹ — جسے برج بھاشا اور اُردو، دونوں میں آٹا کہتے ہیں

۴۔ وارتا یا ورت — اُردو میں بات ہوگئی

۵۔ چتر دھر — اُردو میں چودھری ہوگیا۔

۶۔ چندر۔ چاندری — سنسکرت ہے۔ اُردو میں چاند اور چاندی ہوگئی۔

۷۔ گُڈھ — گڑھ، گھر یعنی خانہ اور کیا عجب ہے کہ فارسی میں کد یا کدہ بھی یہی ہو۔

۸۔ ہست — ہاتھ۔ ہے۔

۹۔ ہستی — کا ہاتھی ہوگیا۔

۱۰۔ بازو — سنسکرت ہے، بھاشا بادر، اُردو بادل یعنی ابر ہوگیا

۱۱۔ دُل — ایک ایک چیز کے دو دو ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں، بھاشا اور اُردو میں دال خاص غلّے کے لیے اور دلنا مصدر نکل آیا

۱۲۔ کشیر — دُودھ، بھاشا، کھیر یا چھیر اُردو میں دُودھ چاول سے تیار ہوتی ہے

۱۳۔ دُگدھ — سنسکرت ہے، بھاشا دُودھ ہوا۔ اب اُردو میں دُودھ کہتے ہیں۔

۱۴۔ ماش — یا ماکھ، ماس، اُردو میں مہینا ہوگیا۔

۱۵۔ گانڈا — اُردو میں گنّا ہوگیا، مگر گنڈیری میں ڈال باقی رہی۔ بہت سے الفاظ ہیں کہ عربی فارسی نے اردو کو دیئے اُردو نے کہیں تو لفظوں میں کچھ تصرّف کیا، معنی وہی رکھے، کہیں لفظوں کو سلامت رکھا معنی کچھ سے کچھ کرلیے، مثلاً

فیلسوف — یونانی لفظ ہے، بمعنی محب الحکمت، جسے عربی میں حکیم اور انگریزی میں ڈاکٹر یا فلوزفر کہتے ہیں مگر اُردو والے دغاباز اور مکّار کو کہتے ہیں۔

اور فیلسوفی مکّاری۔

ابّا ــــ امّاں، اَب اور اُمّ سے نکلے ہیں۔

خصم ــــ عربی میں بمعنی مقابل یا دشمن ہے مگر اردو میں خاوند بمقابل جورو کے ہے۔ جس سے زیادہ دنیا میں کوئی عزیز نہیں

تماشا ــــ سیر عربی میں فقط بمعنی رفتار ہے، اردو میں کہتے ہیں، چلو باغ کی سیر دیکھ آئیں عجب تماشا ہے۔

اخلاص ــــ عربی میں خالص کرنے کو کہتے ہیں، اردو والے پیار، اخلاص، محبت ایک معنی میں بولتے ہیں۔

خیرات ــــ عربی لفظ ہے، یعنی نیکیاں، اردو میں خیرات دو، صدقہ اتارو،

تکرار ــــ عربی میں دوبارہ کہنے یا کام کرنے کو کہتے ہیں، اردو میں نزاع یا جھگڑے کو کہتے ہیں۔

طوفان ــــ عربی لفظ ہے، فارسی میں کسی شے کی حالتِ افراط کو کہتے ہیں اردو بہ معنی تہمت بھی آتا ہے۔

خفیف ــــ عربی میں ہلکی شے کو کہتے ہیں۔ ہندی میں کہتے ہیں: وہ مجھ سے ذرا ملے توسہی، دیکھو کیسا خفیف کرتا ہوں یعنی شرمندہ

مصالح ــــ جمع مصلحت یا مالح کا مخفّف ہے، اردو میں گرم مصالح وغیرہ اور سامانِ عمارت کو بھی مصالح کہتے ہیں۔

خاطر ــــ عربی فارسی میں دل یا خیال کے موقع پر بولتے ہیں، اردو میں کہتے ہیں کہ بھلا ایک گھونٹ تو ہماری خاطر سے بھی لو یا ان کی بڑی خاطر کی۔

دستوری ــــ جن معنی میں یہاں بولتے ہیں، یہ یہیں کا ایجاد ہے۔ پنجابی میں جھونگا کہتے ہیں۔

روزگار ــــ فارسی میں زمانہ کو کہتے ہیں، ہندی میں روزگار نوکری ہے۔

رومال ــــ جن معنی میں یہاں بولتے ہیں، یہ یہیں کا ایجاد ہے۔ فارسی میں رو پاک یا دست پاک ہے۔

خیر وصلاح ــــ عوام النّاس خیر صلّا کہتے ہیں، یعنی صحت وسلامت۔

رسد —— اگرچہ فارسی لفظ معلوم ہوتا ہے، مگر اہل فارس ان معنی میں نہیں بولتے
بہت الفاظ اس طرح لیے کہ معنی کے ساتھ ان کی صورت بھی
بدل دی۔ اگرچہ ان میں سے عوام الناس بولتے ہیں، مگر الفاظ خواص کی زبانوں تک بھی
پہنچ گئے۔ مثلاً

اروادہ —— کہ اصل آزدابہ تھا۔

شروا —— شوربہ یا شورابہ

کھیسا —— کیسہ

کہگل —— کاہ، گل

ہمام دستہ —— ہاون دستہ

بجاز —— بزاز

قبور —— قربوس

دسپناہ —— دست پناہ، یہیں کی فارسی ہے۔

مُردار سنگ —— مُردہ سنگ

گدڑی —— گذری

پجاوہ —— پزاوہ پزیدن سے

ٹاٹ بافی —— تار بافی

زری کونا —— زری کہنہ

تار تلا —— تار طلا یعنی زری کہنہ

تانے تشنے —— طعن وتشنیع

بک بک جھک جھک —— زق زق، بق بق

توبہ تنسوہا —— توبۃً نصوحا

تاشہ —— تاسہ اور تاسک فارسی لفظ ہے۔

سہ بندی —— سپہ بندی، نونگہداشت فوج

غرفش —— غرِّش

افراتفری —— یعنی افراط، تفریط۔ اصل میں نہایت بہتات، اور نہایت کمی کے معنی ہیں۔ اب کہتے ہیں عجب افراتفری پڑی ہے یعنی چل چل پڑ رہی ہے۔

**قلانچ** —— قلاش، یا قلانچ ترکی میں دونوں ہاتھوں کے درمیان کی وسعت کو کہتے ہیں، اس لیے کپڑا ماپنے کا پیمانہ ہے۔ یہاں خرگوش یا ہرن وغیرہ جانور دوڑتے ہوں تو کہیں گے کہ قلانچیں بھرتے بھرتے ہیں۔ ذوقؔ ؎

وحشی کو دیکھا ہم نے اس آہو نگاہ کے  جنگل میں بھر رہا ہے قلانچیں ہرن کے ساتھ

**آقا** —— ترکی میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ یہاں آکا، یار دوست کو بولتے ہیں اور اس میں بانکپن کو دخل ہے۔

**قُورق** —— ترکی میں شے محفوظ کو کہتے ہیں، یہاں جو شے حاکم کی ضبطی میں آئے، اسے قرق کہتے ہیں۔

**مشّاطہ** —— مُشط عربی میں کنگھی کو کہتے ہیں۔ فارسی میں مشاطہ اُس عورت کو کہتے ہیں، جو عورتوں کو بناؤ سنگار کروائے۔ جیسے ہندوستان میں نائن۔

اُردو میں :۔

**مُشاطہ** —— بضمِ اوّل اور تخفیفِ ثانی، اُس عورت کو کہتے ہیں، جو زن و مرد کی نسبت تلاش کرے اور شادی کروائے۔

**مُرغا** —— فارسی میں مُرغ فقط پرندہ ہے، اُردو میں مُرغا، خروس، مرغی، ماکیان کو کہتے ہیں اور ان کے ہاں ہر جمعہ کو مرغوں کی پالی بندھتی ہے۔

**چخ** —— یا چق
ترکی میں باریک پردے کو کہتے ہیں۔

**کُتّا** —— ترکی میں بڑے کو کہتے ہیں، یہاں کتا موٹے کو کہتے ہیں، ہٹا کٹا محاورہ ہے۔

**نظر** —— بالتحریک ہے۔
مگر جمع اس کی بسکون اوسط ہی بولتے ہیں۔ وزیرؔ ؎

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو  کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

**خط** —— مشدّد ہے۔ مگر اب کہتے ہیں آج کل خطوں میں آداب و القاب کا دستور ہی نہیں۔ کسی استاد کا شعر ہے ؎

صاف تھا جب تک کہ خط اب تک جو صاف تھا  اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا۔

غم —— بھی عربی میں مشدد ہے۔
فارسی اور اُردو میں بالتخفیف بولتے ہیں۔

طرح —— عربی میں بالتسکین ہے، اُردو کے اہلِ محاورہ اور شاعر بھی بالتحریک باندھتے ہیں۔

محل —— بالتشدید ہے، مگر کہتے ہیں، کل بھولی بھٹیاری کے محلوں پر لبنت ہے

بھولی بھٹیاری —— کوئی بو علی بختیاری کا مخفف و مبدل کہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے، بھولی بھٹی کار۔

بجے منڈل —— بدیع منزل کا مخفف و مبدل ہے۔ دلی کے باہر شاہانِ قدیم کی تعمیرات سے ایک مشہور عمارت ہے۔

مرزا حسن —— کو پیار سے مرزا حسنو کہتے ہیں اور یہاں س ساکن ہی بولنا فصیح ہے۔

کلمہ —— لام کی زیر سے ہے۔ محاورے میں بہ سکونِ لام بھی بولتے ہیں اور وہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ جراٗت نے کیا خوب کہا ہے ؎

کلمہ بھرے ترا جسے دیکھے تو بھر نظر     کافر اثر ہے یہ تری کافر نگاہ کا

نشاہ —— اہلِ محاورہ اِسے بھی نشاہ کہتے ہیں۔ ذوقؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

جتنے نشے ہیں یاں، روشِ نشہ شراب
ہو جاتے بدمزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

گھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اس کا میر     سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا

اس طرح سینکڑوں لفظ ہیں جن کی تفصیل بے فائدہ طویل ہے

انگریزی زبان بھی اپنی عملداری بڑھاتی چلی آتی ہے۔ ہندو، مسلمان بھائیوں کو اس دن کا انتظار کرنا چاہیئے کہ عربی فارسی کے لفظ جواب تک ہمارے تمہارے باپ دادا بولتے رہے، آئندہ ان کی جگہ اس کثرت سے انگریزی لفظ نظر آئیں گے کہ عربی فارسی کے لفظ خود جگہ چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے، چند لفظ ایسے بھی دکھانے چاہئیں، جو مختلف ممالک یورپ کے ہیں اور اب ہماری زبان میں اس طرح پیوند پا گئے ہیں کہ جوڑ تک

نہیں معلوم ہوتا

مثلاً

| | |
|---|---|
| کمرا۔ اطالی ہے | اسٹام۔ سٹمپ انگریزی ہے |
| نیلام۔ پرتگالی ہے۔ وہ لیلام کہتے ہیں | بسکٹ۔ بسکٹ انگریزی ہے |
| پادری۔ زبان لاطینی سے آیا ہے | پنشن۔ انگریزی ہے |
| لالٹین۔ لین ٹرن انگریزی ہے | بوتام۔ بوتان فرنچ ہے |
| پستول۔ پسٹل انگریزی ہے | بٹن۔ انگریزی ہے |
| فرانیل۔ یا فلالین، فلینل انگریزی ہے | بگی۔ انگریزی ہے |
| بانبٹ۔ بابی نٹ۔ ایک جالی کی قسم کا کپڑا۔ | گلاس۔ انگریزی میں عام شیشہ ہے |
| بوتل۔ باٹل انگریزی ہے | میم۔ میڈم۔ انگریزی ہے |
| درجن۔ ڈزن انگریزی ہے | اردلی۔ آرڈلی انگریزی ہے۔ |

اسی طرح اسٹیشن، بجٹ، ریل، پولیس وغیرہ صدہا لفظ ہیں کہ خاص و عام سے بڑھ کر عورتوں کی زبان تک پہنچ گئے ہیں اور جو الفاظ دفتروں اور کچہریوں اور صاحب لوگوں کے ملازم بولتے ہیں، اگر سب لکھے جائیں تو ایک ڈکشنری بن جائے۔

ہر زبان کے فصحا کا قاعدہ ہے کہ اپنی زبان میں تصرفات لطیف سے کچھ ایجاد کر کے نئے الفاظ اور اصطلاحیں پیدا کرتے ہیں۔ ہماری اردو بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ ان اصطلاحوں کی بنیاد اگرچہ اتفاقی پڑتی ہے مگر ان لوگوں کی طبیعت سے ہوتی ہے جو علم کے ساتھ فکر عالی، طبیعت براق، ذہن پُر ایجاد اور ایجاد دل پذیر رکھتے ہیں۔ انہی کے کلام کا خاص اور عام کے دلوں میں بھی اثر ہوتا ہے۔ کہ بات سب کے دلوں کو بھلی لگتی ہے اور اسے اختیار کر لیتے ہیں۔

مثلاً

گھوڑے کا رنگ، جسے ہندوستان میں سرنگ اور پنجابی میں چینا یا کگا کہتے ہیں۔ فارسی میں اسے کرنگ کہتے ہیں۔ چونکہ بھاشا میں کُ علامتِ بدی اور سُ علامتِ خوبی ہے اس لیے اکبر نے اس کا نام سُرنگ رکھا۔

گھوڑے کی اندھیری کا نام اجیالی رکھا کہ نیک شگون ہے

خاکروب کو حلال خور کا خطاب بھی اسی ذرہ نواز بادشاہ کا بخشا ہوا ہے۔

جہانگیر کی رنگیلی طبیعت نے شراب کا نام رام رنگی رکھا اور اس کو فارس کے شعراء نے اشعار میں بھی باندھا،

طالبؔ آملی ؎

مدام منکرِ صہبا و لیک می گویم — کہ رام رنگیِ ما نشۂ دگر دارد

**سنگترہ** - کو اس کی خوبی و خوش رنگی کے سبب سے محمد شاہ نے رنگترہ کہا، بلبلِ ہندوستان کا نام گلدم نام رکھا،

**ہار** - کے لفظ کو بدشگون سمجھ کر جیلمال کہلوایا،

شاہ عالم نے سرخاب کو بھی گلسہرہ کہا، مگر اس نے رواج نہ پایا،

نواب سعادت علی خاں مرحوم نے ملائی کا نام بالائی رکھا کہ لکھنؤ میں عام اور دلّی وغیرہ میں کم رائج ہے، مذاق سلیم دونوں کے لطف میں امتیاز کر سکتا ہے۔

بھاشا کی ساخت کو دیکھو کہ ہر ایک زبان کے ملاپ کے لیے کیسی ملنسار طبیعت رکھتی ہے نظم و نثر پر غور سے نظر کرو، اس نے اپنے مہمان کے لیے فقط لفظوں ہی میں جگہ خالی نہیں کی بلکہ بہت سے الفاظ و خیالات جو کہ ملکی خصوصیت عربی و فارسی سے رکھتے تھے۔ وہ بھی لے لیے چنانچہ بہادری کا میدان رستم و سام کو دیا، حالانکہ یہاں وہ بھیم اور ارجن کا تھا، سوداؔ کہتے ہیں۔

رستم رہا زمین پہ نے سام رہ گیا — مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

رستم سے بھلا کہہ تو سر تیغ تلے دھر دے
پیارے یہ ہیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے

حسن و جمال کے شبستان میں لیلیٰ و شیریں آگئیں اور جب وہ آئیں تو رانجھے کی جگہ مجنوں و فرہاد کیوں کر نہ آتے، مجنوں و فرہاد کی آنکھوں سے گنگا جمنا تو بہہ نہیں سکیں، مجبور جیحوں سیحوں ہندوستان میں آگئے۔ ہانچل اور بندھیاچل کو چھوڑ کر کوہ بیستون، قصرِ شیریں، کوہ الوند سے سر پھوڑتے ہیں، مگر جب کوئی خوش طبع چاہتا ہے تو یہیں کے پھولوں سے بھی یہاں کے مکان سجا دیتا ہے اور وہ عجیب بہار دیتے ہیں،

ایک زبان کے محاورے کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز نہیں، مگر ان دونوں زبانوں میں ایسا اتحاد ہو گیا کہ یہ فرق بھی اٹھ گیا اور اپنے کار آمد خیالوں کے ادا کرنے کے لیے دل پذیر اور دل کش اور پسندیدہ محاورات، جو فارسی میں دیکھے، انہیں کبھی بجنسہٖ اور کبھی ترجمہ کر کے لیا مثلاً بر آمدن اور بسر آمدن، ہندی میں اس کا ترجمہ ڈھونڈیں تو نہیں ہے، مگر اہل زبان نے نہایت

خوب صورتی کے ساتھ تضمین کر لیا اور سودا نے کہا،

سودا ؎

اس دل کی تف آہ سے کب شعلہ بر آئے — بجلی کو دم سرد سے جس کے حذر آئے
افعی کو یہ طاقت ہے کہ اس سے لہر آئے — وہ زلفِ سیہ اپنی اگر لہر پر آئے

در آمدن یعنی گھس آنا،

سودا ؎

یاں تک شدِ دل آزار خلائق ہو کہ کوئی — مل کر لہو منہ سے صفِ محشر میں در آئے

عرق عرق شدن، آب شدن

ذوق ؎

آگ دوزخ کی بھی ہو جائے گی پانی پانی — جب یہ عاصی عرقِ شرم میں تر جائیں گے

حرف آمدن اور دل خون شدن

ذوق ؎

حرف آتے مجھ پہ دیکھیے کس کس کے نام سے — اس درد سے عقیق کا دل خوں یمن میں ہے

سید انشاء ؎

لب وہ کہ لعل کے بھی نگینے پہ حرف ہے۔

چشمک زدن،

ذوق ؎

لب پہ ترے پسینے کی بوند لے عقیق لب — چشمک زنی کرے ہے سہیل یمن کے ساتھ

پیمانہ پُر کردن، مار ڈالنا

سودا ؎

ساقی چمن میں چھوڑ کے مجھ کو کدھر چلا — پیمانہ میری عمر کا ظالم تو بھر چلا

دامن افشاندہ برخاستن، بیزار ہو کر اٹھ کھڑے ہونا

سودا ؎

کیا اس چمن میں آن کے لے جائے گا کوئی — دامن تو میرے سامنے گل جھاڑ کر چلا

از جامہ بیرون شدن

سودا ؎

نکلا پڑے ہے جامے سے کچھ ان دنوں رقیب — تھوڑے ہی دم دلاسے میں اتنا ابھر چلا

ذوقؔ ؎

کب صبا آتے ترے کوچے سے اے یار کہیں    جوں حباب لب جو جامے سے باہر نہ ہوا

نکش خنجر نداد ۔ یہ محاورہ بھی اہل ہند کا نہیں، کیونکہ یہاں آکاس ہے فلک نہیں ہے۔ اہل ہند اس کا مضمون کیوں باندھتے۔ مگر سوداؔ کہتے ہیں۔

تجھ رخ میں ہے جو لطف ملک کو خبر نہیں    خورشید کیا ہے اسکے فلک کو خبر نہیں

دل از دست رفتن۔ بے اختیار ہو جانا۔

سوداؔ کا مصرع ہے ؎

ہاتھ سے جاتا رہا دل دیکھ محبوباں کی چال

دل دادن، عاشق ہونا، ظفرؔ ؎

دل دے کے تم کو جان پہ اپنی بُری بنی    شیریں کلامی آپ کی میٹھی چھُری بنی

میر صاحب ؎

ایسا نہ ہو دلدادہ کوئی جان سے گزر جائے

از جان گزشتن، جان پر کھیل جانا، ظفرؔ کا شعر ہے

وہاں جاتے وہی جو جان سے جائے گزر پہلے

از سر چیزے گزشتن، دست بردار ہونا۔ سید انشاءؔ

خدا کے واسطے گزرا میں ایسے جینے سے

ذوقؔ ؎

پہنچیں گے رہگزر یار تلک کیوں کر ہم    پہلے جب تک نہ دو عالم سے گزر جائیں گے

آصف الدولہ ؎

تو اپنے شیوۂ جور و جفا سے مت گزرے    تری بلا سے مرا دم رہے رہے نہ رہے

سوداؔ ؎

چاہے تجھ چشم کے آگے جو ہو بادام سفید    کھینچ کر پوست کرے گردش ایام سفید

سفید شدن، پوست کشیدن بھی فارسی کا محاورہ ہے، جس کا ترجمہ انہوں نے کر لیا ہے اردو میں کھال اتارنا۔ ناسخؔ ؎

بھاگئی کون سی وہ چیز بتوں کی ہم کو    نہ کمر رکھتے ہیں ظالم نہ دہن رکھتے ہیں

یہ حقیقت میں لفظی ترجمہ فارسی محاورے کا ہے کہ نہ کمر دارند، نہ دہن دارند، ہندی کا محاورہ بھی ہے کہ نہ کمر ہے، نہ دہن ہے۔

بعض جگہ اصل اصطلاح فارسی کی لے کر اس پر اپنے شعر کی بنیاد قائم کی ہے، مثلاً تر دامن اصطلاح فارسی میں پُر گناہ ہے۔ دیکھو، اسی بنیاد پر کیا مضمون پیدا کیا ہے ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو　　　دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ذوقؔ ؎　　کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

چراغِ سحری - بیمار جان بلب ؎

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے　　　کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

اور دیکھو اُردو فارسی دو محاوروں کو کس خوب صورتی سے ترکیب دیا ہے ؎

آشیانے میں میر بلبل کے　　　آتش گل سے رات پھول پڑا

پنبہ دہن یعنی کم گو۔ زبان دراز، بے ادب پُر گو استاد مرحوم نے ساقی نامہ میں کہا ؎

شیشۂ مے کی یہ دراز زبان　　　اُس پہ ہے یہ ستم کہ پنبہ دہاں

شیشے کے منہ میں سے عرق یا شربت وغیرہ نکلتے وقت جو دھار بندھتی ہے اسے اصطلاح فارسی میں زبانِ شیشہ کہتے ہیں۔

آتش زیر پا، بے قرار، موئے آتش دیدہ، جسے آگ کا سینک پہنچا ہو ؎

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا　　　موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

مُردنِ چراغ، کشتنِ چراغ، چراغ کے بجھنے اور بجھانے کو کہتے ہیں، اسی سے شمعِ مردہ، چراغِ مُردہ،

دیکھنا ذوقؔ مرحوم نے کس لطف سے جان ڈالی ہے ؎

شمعِ مُردہ کے لیے دم عیسےٰ آتش
سوزشِ عشق سے زندہ ہوں محبت کے قتیل

داغِ دل فسردہ پہ پھاہا نہیں، نہ ہو　　　کام اس چراغ مُردہ کو کیا ہے کفن کے ساتھ

کمرِ کوہ اور دامنِ کوہ سے بھی دیکھو کیا مضمون نکالا ہے۔

ذوقؔ ؎

حاضر ہیں جلو میں ترے وحشی کے ہزار بس　　　باندھے ہوئے کہسار بھی دامن کو کمر سے

گردنِ مینا -

آتشؔ نے کیا خوب مضمون نکالا ہے ؎

ہر شب شبِ برات ہے ہر روز، روزِ عید
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کر

دستِ سبو،
خواجہ وزیر نے کس خوب صورتی سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ؎

ہوں وہ مے کش گر نہ آیا میکدے میں ایک دن
ہر سبو نے ہاتھ پھیلائے دعا کے واسطے،

سوسنِ دہ زبان، فارسی والوں کا خیال ہے۔
میر وزیر علی صبا کہتے ہیں۔

کھولا بہار نے جو کتب خانۂ چمن　　سوسن نے دس ورق کا رسالہ اٹھا لیا

سرو کو آزاد فارسی والوں نے کیا تھا۔ کہ بہار و خزاں اور ثمر اور بے ثمری کی قید سے آزاد ہے۔
ذوقؔ مرحوم اس بنیاد پر فرماتے ہیں۔

پا بزنجیر آب جو کی موج میں سب سرو ہیں
کیسی آزادی کہ یاں یہ حال ہے آزاد کا

قافلۂ نگہتِ گل، سیّد انشاء نے خوب ترجمہ کیا۔ ؎

جو ٹھنڈے ٹھنڈے چلی ہے اے آہ، چھا لو تاروں کی چھاؤں نکل تو
گلوں کی نکہت کا قافلہ بھی، چمن سے ہے لاد پھاند نکلا

آسمان زمین کے قلابے ملانے بھی ایجاد اہلِ اردو کا ہے
ذوقؔ ؎

قلابے آسمان و زمین کے نہ تو ملا　　اس بت سے کوئی ملنے کی ناصح بتا صلاح

طوفان باندھنا بھی انہی کی ایجاد ہے۔ ہندی میں نہ تھا ؎

اشک آئے نہیں مژگان پہ کہ یاروں نے ابھی
پانی سو نیزہ دیا باندھ کے طوفان چڑھا

بعض فارسی کے محاورے یا ان کے ترجمے ایسے تھے، کہ میر و مرزا وغیرہ استادوں نے لئے۔ مگر متاخرین نے چھوڑ دیئے۔
چنانچہ فارسی کا محاورہ ہے۔
تر آمدن ۔ یعنی شرمندہ شدن، میرؔ صاحب کہتے ہیں

کھلنے میں ترے منہ کے کلی پھاڑے گریبان
آگے ترے رخسار کے گل برگ تر آوے

تو گوئی ہے: میر حسن اس کا ترجمہ فرماتے ہیں ؎

کہے تُو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ

ایک اور موقع پر کہتے ہیں، ؎

کہے تو کہ دریا تھا اِک نور کا

میر صاحب ؎

اب کوفت سے ہجراں کی جہاں دل پہ رکھا ہاتھ

جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ یہیں تھا

نمود کردن بمعنی ظہور کردن بھی فارسی کا محاورہ تھا۔ ؎

نمود کرکے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا کہے تُو میر بھی ایک بلبلا تھا پانی کا

حیف آنا یا حیف کسانیکہ، میر صاحب ؎

حیف وے جن کے وہ اس وقت میں پہنچا جس وقت اُن کنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا

اب اگر کہیں گے تو کہیں گے کہ حیف ہے ان لوگوں کے حال پر۔ جن کے پاس تو گیا اور وہ بچارے اشارے سے بھی حال نہ کہہ سکے، کنے ہندی ہے۔ مگر اب متروک ہے۔

بے تہی۔ یعنی کم مائیگی، میر صاحب کا شعر ہے ؎

اس زمانے کی تری سے لہر بہرا گئی نہیں بے تہی کرنے لگے دریا دلوں کے حوصلے

خوشم نمے آید، مجھے بھلا نہیں لگتا۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

ناکامیٔ صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں رکھتا

خوشا بحال کسانیکہ۔ میر صاحب فرماتے ہیں

احوال خوش انھوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا

داغ ایں حسرت ام۔ میر صاحب کہتے ہیں ؎

داغ ہوں رشکِ محبت سے کہ اتنا بیتاب کس کی تسکیں کے لیے گھر سے تو باہر نکلا

میر صاحب کہتے ہیں ؎

اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائے گا غافل نہ رہ کہ قافلہ یک بار جائے گا

ایک قصیدۂ مدحیہ کے مطلع ثانی میں سودا کہتے ہیں ؎

اے تُو کہ کارِ جنّ و بشر تجھ سے ہے رواں

تیری وہ ذات جس سے دو عالم ہے کامراں

فارسی میں بیا امر کا صیغہ شعر کے اوّل میں لاتے ہیں اور وہ بہت مزہ دیتا ہے ؎

بیا کہ گریۂ من آں قدر زمیں نگذاشت　　　کہ در فراقِ تو خاکے بسر تواں کردن

عرفی۔

بیا کہ با دلم آں مے کند پریشانی　　　کہ غمزۂ تو نکردہ است با مسلمانی

میاں رنگین۔ اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

آتجھ بغیر مملکتِ دل اجاڑ ہے　　　چھاتی پہ رات ہجر کی کالا پہاڑ ہے

دستے دریں کار دارد۔ یعنی وہ اس کام میں واقفیت یا مہارت رکھتا ہے۔

سودا ؎

کون ایسا ہے جسے دست ہے دل سازی میں　　　شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند

او دھن ایں کار ندارد۔ سودا نے کہا ؎

نہیں ہے بحث کا طوطی ترا دہن مجھ سے　　　سخن تو دیکھ ہے رنگیں ترا چمن مجھ سے

گوش کردن، سننا، سودا نے ترجمہ کیا ؎

کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اہلِ کمال　　　یہ سنگ ریزہ ہوا ہے دُرِ عدن مجھ سے

بو کردن، سونگھنا، سودا نے ترجمہ کیا ؎

دیکھوں نہ کبھی گل کو ترے منہ کے میں ہوتے　　　سنبل کے سوا زلف تری بو نہ کروں میں

اور میر صاحب نے اس سے بڑھ کر کہا ؎

گل کو محبوب ہم قیاس کیا　　　فرق نکلا بہت جو باس کیا

خوابم برد یا خوابم در ربود۔ یعنی مجھے نیند آگئی۔ جرأت ؎

کل واں سے آتے ہی جو ہمیں خواب لے گیا　　　دیکھا تو پھر وہیں دل بے تاب لے گیا

ہندی کا محاورہ نیند آتی ہے، خواب کا لے جانا محاورہ نہیں

زنجیر کردن، قید کرنا۔ سید انشاء ؎

سودا زدہ دل ہے تو یہ تدبیر کریں گے　　　اس زلف گرہ گیر سے زنجیر کریں گے

خاک بر سر کردن، سودا نے ترجمہ کیا ہے ؎

تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی　　　شبنم بھی اس چمن سے صبا چشم تر گئی

ہندی میں "سر پر خاک ڈالنی کہتے ہیں

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض رسمیں اور ٹوٹکے جو ایران اور توران میں ہوتے تھے، اس کے اشارے اردو میں کرنے لگے۔ سودا ؎

دوانہ ان لٹوں کا ہوں قسم ہے روحِ مجنوں کی　　　نہ مارو مجھ کو چوبِ گل بغیر از بید کی چھڑیاں

میر اور سودا کے حال میں ان مطالب کی توضیح کی ہے۔

داغِ جنوں، اُستاد مرحوم عالم طفولیت کی ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

دیوانہ ہوں تیرا مجھے کیا کام کہ لوں گل زیبا نِشِ سر کو ہے مرے داغ جنوں گل

اور میر صاحب مثنوی میں کہتے ہیں ؎

سر تا پا اُشفتہ و داغی داغ جنوں سے جس پہ چراغی

ولایت میں رسم ہے کہ قلعے کے محاصرے میں یا ایک لشکر سے دوسرے لشکر میں جب قاصد کا پہنچنا ممکن نہیں ہوتا تو خط کا پُرزہ تیر میں باندھ کر پھینکتے ہیں۔ چنانچہ میر و سودا نے اُسے اُردو میں باندھا ہے ؎

نامہ جو واں سے آتے ہے سو تیر میں بندھا کیا دیجیے جواب اجل کے پیام کا

نہ تھا پیکاں پہ کیا جوہر جو نامہ تیر پہ لکھا اشارہ قتل کا قاتل نے کس تقصیر پہ لکھا

اگرچہ ان باتوں پر فصاحت کے اصول عامہ کے بموجب بہت اعتراض ہوتے۔ مگر احتراز نہ ہوتے، کیونکہ بولنے والوں کی نسلیں اور اصلیں اور گھر اور گھرانے فارسی سے شیر و شکر ہو رہے تھے جتنا اس کا دخل زیادہ ہوتا تھا، اتنا ہی مزہ زیادہ ہوتا تھا اور آج دیکھتے ہیں تو اور ہی رنگ ہے ہمارے قادر الکلام انشاء پرداز ترجمے کرکے انگریزی کے خیالوں کے چربے اتارتے ہیں اور ایسا ہی چاہیئے۔ جہاں اچھا پھول دیکھا چن لیا اور دستار نہیں تو کوٹ میں زیب گریباں کر لیا۔ ہمارے انشاء پردازوں نے جب دیکھا کہ فارسی والوں نے اپنی قادر سخنی کے زور یا ظرافت طبع کے شور سے عربی ترکیبوں کا استعمال کیا تو انھوں نے بھی اپنے پیارے ملک کی زبان کو اس نمک سے بے لطف نہ چھوڑا۔ سودا فرماتے ہیں ؎

جیسے کہتا ہے کوئی ہو ترا صفاً صفاً

سید رضی خاں رضی مرحوم نے کیا خوب کہا ؎

تری وہ مثل ہے کہ اے رضی نہ الی الذہی نہ الی الذی

دونوں زبانوں کے باب تشبیہات میں ایک نکتہ کہے بغیر مجھ سے آگے نہیں بڑھا جاتا یعنی مختلف افراد انسان کے طبائع پر غور کرو کہ ہزاروں کوس پر پڑے ہوں اور مختلف طبیعت کے ملکوں میں ہوں لیکن چونکہ طبیعتِ انسانی متحد ہے، اس لیے دیکھو، ان کے خیالات کس قدر ملتے جلتے ہوتے ہیں چنانچہ یہاں بالوں کی تعریف میں ناگوں کے لہرانے اور بھونروں کے اڑنے سے تشبیہہ دیتے تھے، فارسی میں زلف کی تشبیہہ سانپ کے ساتھ آتی ہے اس لیے اُردو میں سانپ رہے، مگر بھونرے اڑ گئے اور ( ) کی جگہ مشک، بنفشہ، سنبل، ریحان آ گئے جو کبھی یہاں دیکھے بھی نہیں مگر عرب کا سادہ مزاج

فصیح اپنی نیچر کا حق ادا کرتا ہے اور زلف کو کوتلے سے تشبیہ دیتا ہے سانولی رنگت کی تعریف میں شام برن اور میگھ برن کہتے تھے اس سے کھلتا رنگ ہوتا تو چنپک برنی کہتے تھے اب سخن رنگ اور سیم رنگ کے الفاظ حسن کو بہار دیتے ہیں، مگر خیدر مکھ اور ماہ رخ مشترک ہے۔

آنکھ کی تعریف میں یہاں مرگ کی آنکھ اور کنول کے پھول اور ممولا کی اچپلاہٹ سے تشبیہ دیتے تھے، اردو میں آہو چشم رہے مگر ممولے ہوا ہوگئے اور کنول کی جگہ ساغر لبریز اور نرگسِ شہلا آگئی جو کسی نے یہاں دیکھی بھی نہ تھی، بلکہ ترک چشم شمشیر نگاہ سے قتل کرنے لگے۔

رفتار کے لیے بھاشا میں ہتھنی اور ہنس کی چال ضرب المثل ہے۔ اب ہنس کے ساتھ ہاتھی بھی اڑ گیا، فقط کبک دری، شور محشر اور فتنۂ قیامت نے آفت برپا کر رکھی ہے۔

بھاشا میں ناک کی تشبیہ طوطے کی ناک سے تھی، اب زنبق کی کلی سے تشبیہ دیتے ہیں

آتش کا شعر ہے ؎

توڑنے والے گل زنبق کے ہیں　　　کاٹنے والے چمن کی ناک کے

فارسی والوں نے کمر کی نزاکت میں بڑی باریکیاں نکالی ہیں، مگر سنسکرت نے بھی اپنی جگہ مبالغے میں کچھ کمی نہیں کی۔ چنانچہ آنکھوں کی تعریف میں ایک شاعر نے کہا۔

گوشے ان کے کانوں سے جا لگے تھے۔

پہلے یہاں ہوا یا ابر یا ہنس کو قاصد کہتے تھے، انہوں نے نسیم اور صبا کو قاصد رکھا بلکہ نالہ اور آہ اور اشک سے بھی پیغام رسانی کا کام لیا۔

استاد مرحوم کا شعر ہے ؎

نالہ ہے ان سے بیان درد جدائی کرتا　　　کام قاصد کا ہے یہ تیر ہوائی کرتا

ظفر گر نہیں ہے کوئی نامہ بر　　　تم آنسو ہی اپنا روانہ کرو

سودا قاصدِ اشک آکے خبر کر گیا،　　　قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

فارسی والے طفل اشک باندھتے تھے۔ انہوں نے بھی اسے لڑکا بنایا اور دیکھو استاد مرحوم نے اس کے لیے دامن کیا خوب تیار کیا ہے ؎

طفل اشک ایسا گرا دامانِ مژگاں چھوڑ کر

اور ظفر نے کہا ؎　　　کیا ہی شریر لڑکے یہ اوپر تلے کے ہیں

اور معروف نے کہا ہے ؎

ابھی سے نام خدا کر نے قاصدی نکلا　　　یہ طفل اشک بڑا پاؤں کا بلی نکلا

بیاں کیا کروں اشک کی ابتری کا　　　یہ لڑکا بد اطوار پیدا ہوا ہے

یہ سمجھنا کہ فارسی زبان ہندی میں تصرف حاکمانہ کرتی رہی، نہیں، اسے بھی یہاں کے الفاظ لیے بغیر چارہ نہیں ہوا۔ چنانچہ جو الفاظ فارسی اور سنسکرت کے اصلیت میں متفق ہیں - ان سے قطع نظر کرکے کہتا ہوں کہ سلاطین چغتائیہ کے دفتروں میں صدہا لفظ ہندی کے تھے جو کہ فارسی عبارتوں میں بے تکلف مستعمل ہوتے تھے اور اب بھی عہد مذکور کی تاریخوں میں موجود ہیں۔

مثلاً جھروکہ، درشن اور پھول کٹارہ اور کھپوہ مرصع، جہانگیر بادشاہ اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ میرا بھائی شاہ مراد کوہستان فتح پور سیکری میں پیدا ہوا تھا۔ اسی واسطے میرے والد اسے پہاڑی راجہ کہا کرتے تھے اور آرام بانو بیگم میری چھوٹی بہن کو بہت پیار کرتے تھے اور اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ بابا بجہت خاطر من با ایں خواہر خود کہ لاڈلہ من است، بعد از من باید کہ بہ روشے سلوک کنی کہ من با دمی کنم، ناز او بر داشتہ بے ادبی و شوخی ہائے او را بگذرانی" اسی کتاب میں معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہان بچپن میں اکبر کو شاہ بابا اور جہانگیر کو شاہ بھائی کہا کرتا تھا۔

اسی طرح شعرا نے اپنے تصرفات رنگین کے ساتھ اشعار فارسی کو رونق دی ہے

امیر خسرو، سو برس پہلے کہتے ہیں ؎

بنشستہ چوں در پہ لکی نہ چرخ کہتار آمدہ

قران السعدین میں کہتے ہیں ؎

خان کرہ چھوتے کشور کشا ۔۔۔ کمز لب شاہان کرہ دار و بپا

اور دہلی کی یاد میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اے دہلی و لمّے بتان سادہ ۔۔۔ پگ بستہ و چیرہ کم نہادہ

سر آں دو چشم گردم کہ چو ہندوان رہزن

ہمہ راہ بنوک مژگاں زدہ بر جگر کٹارہ

عرفی، درچاشت کہ از شبنم گل گرد نشانست ۔۔۔ آں باد کہ در ہند اگر آید جگر آید

سیر گشتم زجھرتے ایام ۔۔۔ ہوس سیم و زر نمے دارم

ظہوری، سپہر از سر افراز یش در حساب ۔۔۔ زچو کھنڈ یش سایہ بر آفتاب

اشرف، چو کھنڈی شکوہش اگر سایہ افگند ۔۔۔ خیل سپہر شانہ بدزد و بزیر باز

طغرا، شوخ سوسن را بگو دل مے باید نشقات ۔۔۔ ذات راجپوت است ترسم سست بہ جمدھر کند

خسرو، پاں خوردہ بمن دادہ اُگال آں بت ہندی

ایں بوسہ بہ پیغام چہ رنگیں مزہ دارد

ظہوری، شود چہرہ زرد خورشید لال ۔۔۔ و ہندش اگر نازنیناں اُگال

اور سہ نثر میں بادشاہ کے لئے کیا خوب کہا ہے:

"بار جگت گردی عالم بر خود گرفتہ"

بیان مذکورہ بالا سے تمہیں اجمالاً معلوم ہوگیا ہوگا کہ اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا ہے، البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گزر چکا تھا اور ان کے معتقد باقی تھے۔ وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے۔ اس واسطے گویا اردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہ کا رنگ بھی آیا، اور بہت تیزی سے آیا، یہ رنگ اسی قدر آتا کہ جتنا چہرے پر ابٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سرمہ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید تھا، مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہماری قوتِ بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھاشا اور اردو میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا، چاہتا ہوں کہ دونوں کے نمونے آمنے سامنے رکھ کر ان کے فرق دکھاؤں مگر اس سے پہلے دو تین باتیں خیال رکھنی چاہئیں، اوّل تو شاعرانہ اردو کا نوجوان جس نے فارسی کے دودھ سے پرورش پائی، اس کی طبیعت میں بہت سے بلند خیالات اور مبالغہ مضامین کے ساتھ وہ حالات اور ملکی رسمیں اور تاریخی اشارے آگئے، جو فارس اور ترکستان سے خاص تعلق رکھتے تھے اور بھاشا کے طبعی مخالف تھے۔ ساتھ اس کے فارسی کی نزاکت اور لطافت طبعی کے سبب سے اردو کے خیالات اکثر ایسے پیچیدہ ہو گئے کہ بچپن سے ہمارے کانوں میں پڑتے اور ذہنوں میں جمتے چلے آتے ہیں، اس لئے ہمیں مشکل نہیں معلوم ہوتے، اُن پڑھ، انجان یا غیر زبان والا انسان سنتا ہے تو منہ دیکھتا رہ جاتا ہے کہ یہ کیا کہا۔ اس لئے اردو پڑھنے والے کو واجب ہے کہ فارسی کی انشاء پردازی سے ضرور آگاہی رکھتا ہو۔

فارسی اور اردو کی انشاء پردازی میں جو دشواری ہے اور ہندی کی انشاء میں آسانی ہے، اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لائق ہے، وہ یہ ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے، اس کی کیفیت ہمیں ان خط و خال سے سمجھاتی ہے جو خاص اسی شے کے دیکھنے، سننے، سونگھنے چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے، اس بیان میں اگرچہ مبالغے کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی مگر سننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا ہے، وہ سننے سے آجاتا ہے، برخلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں، صاف اسی کی برائی بھلائی نہیں دکھا دیتے، بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا برا سمجھا ہوا ہے، اس کے لوازمات کو شے اوّل پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں مثلاً پھول کی نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق سے مشابہ ہے جب گرمی کی شدت میں معشوق کے حسن کا انداز دکھاتا ہے تو کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول کے

رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا اور اسی رنگ میں شاعر کہتا ہے، خواجہ وزیر سے

ہوں وہ بلبل جو کرے ذبح خفا تو ہو کر
روح میری گئی عارض میں رہے بو ہو کر

یہ تشبیہیں اور استعارے اگر پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے، لیکن جب دُور جا پڑیں اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقّت ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لیے اس قدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے کہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطوئے ثانی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے کہتے ہیں کہ اگر اس کا ہمائے عقل اوجِ اقبال سے سایہ ڈالے تو ہر شخص کشور دانش و دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے، بلکہ اگر اس کے سینے میں دلائلِ عقل کا مادہ جوش مارے تو طبقۂ یونان کو غرق کر دے۔ اوّل تو ہما کی یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرضی ہے اور وہ بھی اسی ملک کے ساتھ خاص ہے۔ اس پر اقبال کا ایک فلک الافلاک تیار کرنا۔ اور اس پر نقطۂ اوج کا دریافت کرنا دیکھیے، وہاں ان کے فرضی ہما کا جانا دیکھیے۔ پھر زمین پر اس خیالی آسمان کے نیچے ایک تہ بہ تہ کا یونان لبانا دیکھیے۔ پھر اس فرضی ہما کی برکت کا اس قدر عام کرنا دیکھیے۔ جس سے دنیا کے جاہل اس خیالی یونان میں جا کر ارسطو ہو جائیں۔

دوسرے فقرے میں اوّل تو علمائے ہند نے تنور سے طوفان کا نکلنا مانا ہی نہیں ہے۔ اس پر طبقہ، طوفان کا اپنے فلسفے کی تہمت میں تباہ ہونا وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں اور روایتیں ہیں۔ کہ اگرچہ ہمارے معمولی خیالات ہوں مگر غیر قوم بلکہ ہمارے بھی عام لوگ اس سے بے خبر ہیں، اس لیے بے سمجھائے نہ سمجھیں گے، اور جب بات کو زبان سے کہہ کر سمجھانے کی نوبت آئی تو لطفِ زبان کجا اور یہ نہیں تو تاثیر کجا۔

مزہ وہی ہے کہ آدھی بات کہی، آدھی منہ میں ہے اور سننے والا پھڑک اٹھا۔ تار باجا اور راگ بوجھا، ان خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو باتیں بدیہی ہیں اور محسوسات میں عیاں ہیں، ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آ کر وہ بھی عام تصوّر میں جا پڑتی ہیں، کیونکہ خیالات کے ادا کرتے میں ہم اوّل اشیاء بے جان کو جاندار بلکہ اکثر انسان فرض کرتے ہیں۔ بعد اس کے جانداروں اور عاقلوں کے لیے جو باتیں مناسب حال ہیں، ان بے جانوں پر لگا کر ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے

ہیں. جو اکثر ملکِ عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیت رکھتے ہیں۔

مثلاً رات کو اہلِ محبت کے جلسے میں اول تو ساقی کا آنا واجب ہے۔ پھر بجائے ایک نازنین

**معشوق** عورت کے پری زاد لڑکا ہے۔ اس کی پیشانی اور رخسارے سے نورِ صبح روشن ہے۔ مگر زلف کی شام بھی برابر مشک افشاں ہے۔ صراحی کبھی سرکشی کرتی ہے۔ اسی لئے جگرِ خون ہو کر ٹپکتا ہے۔ کبھی جھکتی ہے۔ اور خندۂ قلقل سے ہنستی ہے۔ کبھی وہی قلقل، حق حق ہو کر یادِ الٰہی میں صرف ہوتی ہے۔ مگر پیالہ اپنے کھلے منہ سے ہنستا ہے۔ اور اس کے آگے دامن بھی پھیلاتا ہے۔ فلکِ تیرِ حوادث کا ترکش، کمان کہکشاں لگائے کھڑا ہے۔ مگر عاشق کا تیرِ آہ اس کے سینے کے پار جاتا ہے۔ پھر بھی زحل منحوس کی آنکھ نہیں پھوٹتی کہ عاشق کی صبحِ مراد روشن ہو۔ یہاں کی محفل میں شمع برقعِ فانوس میں تاجِ زر سر پہ رکھے کھڑی ہے۔ اس لئے پروانے کا آنا بھی واجب ہے۔ وہ عاشقِ زار آتے ہی جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ چراغ کو ہنساتے ہیں اور شمع کو عاشق کے غم رلاتے ہیں۔ وہ با وفا عشق کی تپ میں سراپا جلتی ہے۔ اس کی چربی گھل گھل کر بہتی ہے۔ مگر پائے استقامت اس کا نہیں ٹلتا۔ یہاں تک کہ سفیدۂ سحری کبھی آ کر کافور دیتا ہے۔ اور کبھی طبا شیر، شمع کا دل اس لئے بھی گداز ہے کہ شبِ زندگی کا دامن بہت چھوٹا ہے۔ لیکن صبح دونوں کے ماتم میں گریباں چاک کرتی ہے۔

بادہ خوار کے لئے مرغِ سحر بڑا موذی ہے۔ اس کے ذبح کو ہمیشہ تیغِ زبان تیز رہتی ہے۔

**عاشق** بادِ سحر قاصدِ خجستہ گام ہے کہ پیغامِ یار کا بہت جلد لاتا اور لے جاتا ہے۔ اسی عالم میں آفتاب کبھی تو پنجۂ شعاع سے آنکھ ملتا سر برہنہ حجرۂ مشرق سے نکلتا ہے۔ کبھی فلک کے سبزہ گھوڑے پر سوار کرن کا تاجِ زرنگار سر پر چمکاتا شفق کا پھریرا اڑاتا آتا ہے۔ کیونکہ اپنے حریف شاہِ انجم کی فوج کو پریشان کر کے فتحیاب آیا ہے۔

ان ہی بنیادوں پر جب گلزار کی شگفتگی یا باغ کی بہار دکھائی ہو تو ایسے خیالات میں دکھائیں گے کہ شاہدِ گل کے کان میں قاصدِ صبا کچھ ایسا افسون پھونک گیا کہ وہ مارے ہنسی کے فرشِ سبزہ پر لوٹ گیا۔ طفلِ غنچہ مسکرا کر اپنے عاشق بلبلِ شیدا کا دل لبھاتا ہے۔ کبھی خزاں کا غارت گر آتا ہے۔ تو گل اپنا جام اور غنچہ اپنی صراحی لے کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے باغ میں بہار خود ایک معشوق ہے اس کا چہرہ چمن ہے۔ گل رخسار ہیں۔ سنبل بال ہیں۔ بنفشہ زلف ہے۔ نرگس آنکھیں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ،

پھر بہار موسمِ جوانی ہے۔ درخت جوانانِ چمن ہیں۔ کہ عروسانِ گلشن سے گلے مل مل کر خوش ہوتے ہیں شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ تاک کا سیہ مست پڑا اینڈتا ہے۔ اطفالِ نبات دایۂ بہار کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ خضرِ سبزہ کی برکت سے نسیمِ سحری مردۂ ہزار سالہ میں دمِ عیسوی کا کام دیتی ہے۔ مگر بلبلِ زارِ عشق، شاہدِ گل ہی اداس ہے۔ آبِ رواں عمرِ گزران ہے اس کی موج کی تلوار سے دل کٹتے جاتے ہیں۔ سرو کے عکس

کا اژدہا نگلے جاتا ہے۔ شبنم کے آنسو جاری ہیں۔ بلبل کبھی خوش ہے کہ گل اس کا پیارا پاس ہنس رہا ہے۔ کبھی افسردہ ہے۔ کہ خزاں کا خونریز ان سب کو قتل کرے گا۔ یا اس کے دشمن یعنی گلچین وصیاد اسے یہاں سے نکالیں گے۔ سرو یا شمشاد کے عشق میں قمری کا گیروا لباس ہے۔ اس کے نالے کا آزادوں کو چیرتا ہے۔ کبھی عاشق زار بھی وہیں آنکلتا ہے۔ وہ بجائے اپنے معشوق کے حسرت وغم سے ہمکنار ہے۔ روتا ہے۔ اور قاصد صبا کو پیغام دیتا ہے۔ کہ میرے تغافل شعار کو ذرا میرے حال کی خبر کر دینا۔

بیان مذکورہ بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جو خاص فارس اور ترکستان کے ملکوں سے طبعی اور ذاتی تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض خیالات میں اکثر ان داستانوں یا قصوں کے اشارے بھی آ گئے ہیں۔ جو خاص ملک فارس سے علاقہ رکھتے تھے۔ مثلاً بجائے عورت کے لڑکوں کا عشق، ان کے خط کی تعریف شمشاد، نرگس، سنبل، بنفشہ، موے کمر، قد سرو وغیرہ کی تشبیہیں، لیلیٰ، شیریں، شمع، گل سرو وغیرہ کا حسن، مجنوں، فرہاد، بلبل، قمری پروانہ کا عشق، فانوس کا برقع، غازہ اور گلگونہ، مانی و بہزاد کی مصوری رستم و اسفندیار کی بہادری، زحل کی نحوست، سہیل یمن کی رنگ افشانی، مشاہیر فارس، یونان اور عرب کے قصے، راہ ہفتخوان، کوہ الوند، کوہ بے ستون، جوئے شیر، قصر شیریں، جیحوں، سیحوں وغیرہ وغیرہ، ہر چند یہ سب معاملات عرب اور فارس سے متعلق ہیں۔ مگر اردو میں بہت سے خیالات انہی کی بنیاد پر نظم و نثر میں پیدا ہوتے ہیں۔

تعجب یہ ہے کہ ان خیالوں نے اور وہاں کی تشبیہوں نے اس قدر زور پکڑا کہ ان کے مشابہ جو یہاں کی باتیں تھیں، انہیں بالکل مٹا دیا۔ البتہ سودا اور سید انشاء کے کلام میں کہیں کہیں ہیں اور وہ اپنے موقع پر نہایت لطف دیتی ہیں۔

غرض کہ اب ہماری انشاء پردازی ایک پرانی یادداشت ان تشبیہوں اور استعاروں کی ہے کہ صدہا سال سے ہمارے بزرگوں کی دست مال ہو کر ہم تک میراث پہنچی ہیں۔

ہمارے متاخرین کو نئی آفرین لینے کی آرزو ہوئی تو بڑا کمال یہ ہے کہ کبھی صفت بعد صفت کبھی استعارہ اور استعارہ سے اسے اور تنگ و تاریک کیا جس سے ہوا تو یہ ہوا کہ بہت غور کے بعد فقط ایک وہمی نزاکت اور فرضی لطافت پیدا ہو گئی کہ جسے محالات کا مجموعہ کہنا چاہئیے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ کلام ان کا خاص و عام کے دلوں پر تاثیر کرے۔ وہ مستعد لوگوں کی طبع آزمائی کے لئے ایک دقیق معمّا اور عوام کے لئے ایک عجیب گورکھ دھندا تیار ہو گیا۔ اور جواب ان کا یہ ہے کہ کوئی سمجھے تو سمجھے۔ جو نہ سمجھیں، وہ اپنی جہالت کے حوالے۔ اب اس کے مقابلے میں دیکھو۔ بھاشا کا انشا پرداز برسات میں اپنا باغ کیوں کر لگاتا ہے۔ درختوں کے جھنڈ چھائے ہیں۔ گھن کے پتے ہیں۔ ان کی گہری گہری چھاؤں ہے۔ جامن کی ٹہنیاں آم کے پتوں میں کھچڑی ہو رہی ہیں۔ کھرنی کی ٹہنیاں

فالسے کے درخت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چاندنی کی بیل کمرک کے درخت پر لپٹی ہے۔ عشق پیچہ لکھروندے پر چڑھو جاتا ہے۔ اس کی ٹہنیاں لٹکتی ہیں۔ جیسے سانپ لہرا رہے ہیں پھولوں کے گچھے پڑے جھوم رہے ہیں۔ میوے والے زمین کو چوم رہے ہیں۔ نیم کے پتّوں کی سبزی اور پھولوں کی سفیدی بہار پر ہے۔ آم کے مور میں اس کے پھولوں کی مہک آتی ہے۔ بھینی بھینی بو جی کو بھاتی ہے۔ جب درختوں کی ٹہنیاں ہلتی ہیں، مولسری کے پھولوں کا مینہ برستا ہے۔ پھل پھلاری کی بوچھاڑ ہو جاتی ہے۔ دھیمی دھیمی ہوا ان کی بوباس میں بسی ہوئی روشوں پر چلتی ہے ٹہنیاں ایسی ہلتی ہیں، جیسے کوئی جوبن کی متوالی اٹکھیلیاں کرتی چلی آتی ہے۔ کسی ٹہنی میں بھونرے کی آواز کسی میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ الگ ہی سماباندھ رہی ہے۔ پرند درختوں پر بول رہے ہیں۔ اور کلول کر رہے ہیں۔ حوض میں چادر اس زور سے گرتی ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس سے چھوٹی چھوٹی نالیوں میں پانی لہراتا جاتا ہے۔ تو عجب بہار دیتا ہے۔ درختوں سے جانور اترتے ہیں۔ نہاتے جاتے ہیں۔ آپس میں لڑتے جاتے ہیں۔ پر دن کو پھڑ پھڑاتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ پرند زمین پر چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔ ایک طرف سے کوئل کی کوک، ایک طرف سے کوکلے کی آواز، اسی جمگھٹ میں عاشق مصیبت زدہ بھی کہیں اکیلا بیٹھا جی بہلا رہا ہے۔ اور اپنی جدائی کے دکھ کو مزے لے لے کر اٹھاتا ہے۔

برسات کا سماں باندھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ سامنے سے کالی گھٹا جھوم کر اٹھی اور ابر دھواں دھار ہے۔ بجلی کوندتی چلی آتی ہے۔ سیاہی میں سارس اور بگلوں کی سفید سفید قطاریں بہاریں دکھا رہی ہیں۔ جب بادل کڑکتا ہے اور بجلی چمکتی ہے تو پرندے بھی دبک کر ٹہنیوں میں چھپ جاتے ہیں۔ کبھی دیواروں سے لگ جاتے ہیں۔ مور جدا جھنگارتے ہیں۔ پپیہے الگ پکارتے ہیں۔ محبت کا متوالا جیبلی کے جھرمٹ میں آتا ہے تو ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہوا لہک کر پھوار بھی پڑنے لگتی ہے۔ مست ہو کر وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ اور شعر پڑھنے لگتا ہے۔

جب ایک شہر کی خوبی بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں، شام ہوتے ایک مقام پر پہنچا۔ دیکھتا ہے۔ کہ پہاڑیاں ہری بھری ہیں۔ اور گرد سرسبز میدانوں میں بسے ہوئے گاؤں آباد ہیں۔ پہاڑ کے نیچے ایک دریا میں نرمل جل بہہ رہا ہے۔ جیسے موتی کی آب۔ بیچوں بیچ میں شہر آباد جب اس کے اونچے اونچے مکانوں اور برجیوں کا عکس پڑتا ہے۔ تو پانی میں کلیاں جگ مگ جگ مگ کرتی ہیں۔ اور دوسرا شہر آباد نظر آتا ہے۔ لب دریا کے پیڑ بوٹوں اور زمین کی سبزی کو برسات نے ہرا کیا ہے کہ وہ دھلین گایوں اور بچھڑوں کا چارہ ہو جائے

جب اداسی اور پریشانی کا عالم دکھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آدھی رات ادھر آدھی رات اُدھر، جنگل سنسان، اندھیر بیابان، مرگھٹ میں دور دور تک راکھ کے ڈھیر جلے ہوئے لکڑ پڑے، کہیں کہیں چتا میں آگ چمکتی ہے۔ بھوتوں پریتوں کی ڈراؤنی صورتیں اور بھیانک مورتیں ہیں۔ کوئی تاڑ سا قد لال لال دیدے

بھاڑ سے لمبے لمبے دانت نکالے گلے میں کھوپریوں کی مالا ڈالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ کوئی ایک ہاتھی کو بغل میں مارے بھاگا جاتا ہے۔ کوئی ایک کالا رنگ لکڑی کی طرح کھڑا اچھا رہا ہے۔ پیچھے غل ہوتا چلا آتا ہے کہ، بچیو، لیجیو۔ ماریو۔ ماریو جانے نہ پائے۔ دم بھر میں یہ بھوت پریت غائب ہوتے ہیں غل شور تھمتا ہے۔ پھر مرگھٹ کا میدان سنسان ہے۔ پتے ہوا سے کھڑکتے ہیں۔ ہوا کا سناٹا پانی کا شور، اُلو کی ہوک۔ گیدڑوں کا بولنا اور کتوں کا رونا۔ یہ ایسی وحشت ہے کہ پہلے ڈر بھی بھول جاتے ہیں۔

دیکھو یہ باغ دونوں آمنے سامنے لگے ہیں تم نے مقابلہ کیا؟ دونوں کے رنگ ڈھنگ میں کیا فرق ہے۔ بھاشا کا فصیح استعارے کی طرف بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جن خوش آوازیوں کو سنتا ہے۔ یا خوشبوئیوں کو سونگھتا ہے، انہی کو اپنی میٹھی زبان سے بے تکلف بے مبالغہ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔

لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ہندوستان میں مبالغے کا زور نہ تھا۔ نہیں نہیں۔ سنسکرت کا انشا پرداز ذرا بگڑ جائے تو زمین کے ماتھے پر پہاڑ تیوری کے بل ہو جائیں اور وہاں غار پتھروں سے دانت پیسنے لگیں۔ ان مضامین کو دیکھ کر اول ہمیں وہ عام قاعدہ یاد آتا ہے کہ ہر ملک کی انشا پردازی اپنے جغرافیے اور سرزمین کی صورت حال کی تصویر، بلکہ رسم و رواج اور لوگوں کی طبیعتوں کا آئینہ ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جو کچھ شاعر یا انشا پرداز کے پیش نظر ہوتا ہے۔ وہی اس کی تشبیہوں اور استعاروں کا سامان ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایران خراسان اور توران زمین میں بہار کا موسم دلوں کو شگفتہ کرتا ہے۔ یہاں برسات کا موسم سردیوں میں ذوق و شوق پیدا کرتا ہے۔ وہاں بہار میں بلبل ہزار داستان ہے۔ یہاں کویل اور پپیہا ہے۔ برج بھاشا کے انشا پرداز برسات کے لطف اور اس کی کیفیتیں بہت خوب دکھاتے ہیں۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں سچ کہا ہے کہ ہندوستان کی برسات ہماری فصل بہار ہے اور کویل یہاں کی بلبل ہے۔ اس موسم میں عجیب لطف سے بولتی ہے اور مستیاں کرتی ہے۔ بہار کے موسم کا کچھ لطف یہاں ہے۔ تو بسنت رت کا سماں ہے۔ جس میں ہولی کے رنگ اڑتے ہیں۔ پچکاریاں چھٹتی ہیں۔ گلال کے قمقمے چلتے ہیں۔ وہ باتیں نہیں، جو فارسی والے بہار کے سمے پر کرتے ہیں۔

بہر حال ہمیں اپنے بزرگوں کی اس صنعت کا شکر یہ بھی کرنا چاہیے کہ ہندی بھاشا میں جو اضافت کی طوالت کا، کے، کی سے ادا ہوتی، وہ فارسی کی اضافت میں آ کر مختصر ہو گئی اس کے علاوہ استعارہ و تشبیہ، جو بھاشا میں شاید اس سبب سے کم لاتے تھے کہ وہ کتاب یا انشا پردازی کی زبان نہ تھی، یا اس سبب سے کہ برابر کا، کی، کے آنے سے کلام مرتبۂ فصاحت سے گر جاتا تھا۔ اب انہوں نے فارسی کو اس میں داخل کر کے استعارہ و تشبیہ سے مرصع کر دیا۔ جس سے وہ خیالوں کی نزاکت اور ترکیب کی پختگی اور زور کلام اور تیزی و طراری میں بھاشا سے آگے بڑھ گئی اور بہت سے نئے الفاظ اور نئی

ترکیبوں نے زبان میں وسعت بھی پیدا کی۔

اس فخر کے ساتھ یہ افسوس پھر بھی دل سے نہیں بھولتا۔ کہ انہوں نے ایک قدرتی پھول کو جو اپنی خوشبو سے مہکتا اور رنگ سے لہکتا تھا۔ مفت ہاتھ سے پھینک دیا۔ وہ کیا ہے؟ کلام کا اثر اور اظہار اصلیت ہمارے نازک خیال اور باریک بین لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبت لفظی کے ذوق شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے۔ اور اصلی مطالب کے ادا کرنے میں بے پروا ہو گئے۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ زبان کا ڈھنگ بدل گیا اور نوبت یہ ہوئی کہ اگر کوشش کریں تو فارسی کی طرح پنج رقعہ، اور مینا بازار، یا فسانہ عجائب لکھ سکتے ہیں۔ لیکن ایک ملکی معاملہ یا تاریخی انقلاب اس طرح بیان نہیں کر سکتے۔ جس سے معلوم ہوتا جائے واقعۂ مذکور کیونکر ہوا اور کیونکر اختتام کو پہنچا اور اس سے پڑھنے والے کو ثابت ہو جائے۔ کہ روئداد وقت کی اور صورت حال معاملے کی ایسی ہو رہی تھی۔ کہ جو کچھ ہوا اسی طرح ہو سکتا تھا۔ دوسری صورت ممکن نہ تھی۔ اور یہ تو نا ممکن ہے، ایک فلسفے یا حکمت، اخلاق کا خیال رکھیں۔ جس کی صفائیٔ کلام لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف لگائے اور اس کے دلائل جو حسن بیان کے پردے میں برابر جلوہ دیتے جاتے ہیں۔ وہ دلوں کے تصدیق کے اقرار لیتے جائیں اور جس بات سے روکنا یا جس کام پر جھوکنا منظور ہو۔ اس میں پوری پوری اطاعت سننے والوں سے لے سکیں۔ یہ قباحت فقط نازک خیالی نے پیدا کی استعارہ وتشبیہ کے انداز و مترادف فقرے تکیہ کلام کی طرح ہماری زبان قلم پر چڑھ گئے بے شک ہمارے متقدمین اس کی رنگینی اور نزاکت کو دیکھ کر بھولے، مگر نہ سمجھے کہ یہ خیالی رنگ ہمارے اصلی جوہر کو خاک میں ملانے والا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج انگریزی ڈھنگ پر لکھنے میں یا ان کے مضامین کے پورا پورا ترجمہ کرنے میں ہم بہت قاصر ہیں۔ نہیں! ہماری اصلی انشاء پردازی اس رستے میں قاصر ہے۔

انگریزی تحریر کے عام اصول یہ ہیں کہ جس شے کا حال یا دل کا خیال لکھئے تو اسے اس طرح ادا کیجئے کہ خود وہ حالت گزرنے سے یا اس کے مشاہدہ کرنے سے جو خوشی یا غم غصہ یا رحم یا خوف یا جوش دل پر طاری ہوتا۔ یہ بیان وہی عالم اور وہی سماں دل پر چھا دیوے

بے شک ہماری طرز بیان اپنی چست بندش اور قافیوں کے مسلسل کھٹکوں سے کانوں کو اچھی طرح خبر کرتی ہے۔ اپنے رنگین الفاظ اور نازک مضمونوں سے خیال میں شوخی کا لطف پیدا کرتی ہے۔ ساتھ اس کے مبالغہ کلام اور عبارت کی دھوم دھام سے زمین آسمان کو تہ وبالا کر دیتی ہے۔ مگر اصل مقصود یعنی دلی اثر یا اظہار واقعیت ڈھونڈو تو ذرا نہیں چند مضمون ہیں کہ ہماری زبانوں پر بہت رواں ہیں مگر حقیقت میں ہم ان میں بھی ناکام ہیں۔ مثلاً ہم اگر کسی کے حسن کی تعریف کرتے ہیں۔ تو رشک حور اور غیرت پری پر قناعت نہ کر کے اسے ایک پتلا ناممکنات ومحالات کا بنا دیتے ہیں۔ مگر کسی حسین کا حسن خداداد خود ایک عالم ہے۔ کہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھ کر دلوں پر گزر جاتی ہے۔ دل ہی جانتے ہیں۔ بس اسی کو اس طرح کیوں ادا نہیں کر دیتے کہ سننے والے بھی کلیجا پکڑ کے رہ جائیں۔

ایک بلونت جوان کی تعریف کریں گے۔ تو رستم تہمتن، اسفندیار، رؤئیں تن ظہیر بلشنہ وغا، نہنگ قلزم ہیجا وغیرہ وغیرہ لکھ کر صفحے سیاہ کر دیں گے۔ لیکن اس کی بلند گردن، ابھرے ہوئے ڈنٹر، چوڑا سینہ، بازوؤں کی گلاوٹ، پتلی کمر، غرض خوشنما بدن اور موزوں ڈیل ڈول بھی ایک انداز رکھتا ہے۔ اس کی اپنی دلاوری اور ذاتی بہادری بھی آخر کچھ نہ کچھ ہے۔ جس کے کارناموں نے اسے اپنے عہد میں ممتاز کر رکھا ہے۔ اسی کو ایک وضع سے کیوں نہیں ادا کر دیتے۔ جسے سن کر مردار خیالوں میں اکڑ تکڑ اور کملائے ہوئے دلوں میں امنگ پیدا ہو جائے۔

ایک چمن کی تعریف سے کبھی فلک کے سبز باغ اور گلشن انجم کے دل پر داغ دیں گے۔

کبھی اسے فردوس بریں اور جنات رشک زمین بنائیں گے۔ بلکہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتے کی تعریف میں رنگ رنگ سے ورق سیاہ کر دیں گے مگر اس کی ہریاول کا لہلہانا، پھولوں کا چہچہانا، میٹھی میٹھی خوشبوؤں کا آنا۔ آب رواں کا لہرانا، موزوں درختوں، گلزار کے تختوں کی بہار، ہوا کی مہک اور طوطی کی چہک پپیہے کی کوک، کویل کی ہوک، جو کہ روحانی تفریح کے ساتھ انسان کے دل پر اثر کرتی ہے۔ اس کا بیان اس طرح نہیں کرتے۔ جس کے پڑھنے سے آنکھوں میں سماں چھا جائے، میدان جنگ ہو تو زمین کے طبقوں کو اٹھا کر آسمان میں تلپٹ کر دیتے ہیں۔ اور خون کے دریا ملکوں سے ملکوں میں بہا دیتے ہیں۔ مگر اپنے موقع پر وہ تاثیر جس سے ایک بہادر کی بہادری دیکھ کر دلوں میں قوم کی ہمدردی اور رفیق پر جان نثار کرنے کا ولولہ پیدا ہو، نہیں۔

دوسرے کوچے میں اگر علم کی تعریف پر اترتے ہیں۔ تو اس کی برکت سے پیر، پیغمبر، ملائک، فرشتہ بنا دیتے ہیں۔ کاش اس کے عوض میں چند ظاہر کھلے فائدے بیان کریں۔ جس سے ہر شخص کے دل میں اس کا شوق پیدا ہو اور عالم جاہل سمجھ جائے کہ اگر بے علم رہوں گا تو خواری و ذلت کی زندگی سے دین و دنیا دونوں خراب ہوں گے۔ ہماری تصنیفات میں اس کا کچھ ذکر ہی نہیں اور افسوس کہ اب تک بھی ہم نے اس پر توجہ نہیں کی۔ انگریزی میں بہت خیالات اور مضامین ایسے ہیں کہ ہماری زبان نہیں ادا کر سکتی۔ یعنی جو لطف ان کا انگریزی زبان میں ہے وہ اردو میں پورا ادا نہیں ہو سکتا۔ جو کہ حقیقت میں زبان کی ناطاقتی کا نتیجہ ہے۔ اور یہ اہل زبان کے لئے نہایت شرم کا مقام ہے۔

اگر شائستہ قوموں کی انشاء پردازی سوال کرے کہ اردو کی انشاء کیوں اس حالت میں مبتلا رہی ہے؟ تو حاضر جوابی فوراً بول اٹھے گی۔ کہ قوم کی انشاء پردازی بموجب اس کے حالات کے ہوتی ہے۔ اور خیالات اس کے بموجب حالات ملک اور تربیت ملکی کے ہوتے ہیں۔ جیسی ہندوستان کی تعلیم و شائستگی تھی اور بادشاہوں اور امیروں کی قدر دانی تھی۔ ویسی ہی انشاء پردازی رہی۔ اور خاتمہ کلام اس فقرے پر ہوگا کہ کوئی پرند اپنے بازوؤں سے بڑھ کر پر نہیں مار سکتا۔ اس کے بازو فارسی، سنسکرت بھاشا وغیرہ تھے۔ پھر اردو بیچاری انگلینڈ یا روم یا یونان کے محلوں پر کیونکر جا بیٹھتی۔ مگر حقیقت میں عقدہ اس سوال کا ایک اور گرہ میں بند ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر ایک شے کی ترقی کسی ملک میں اسی قدر زیادہ ہوتی ہے۔

جسقدر رشتے مذکور کو سلطنت سے تعلق ہوتا ہے۔ یورپ کے ملکوں میں قدیم سے دستور ہے۔ کہ سلطنت کے

اندرونی اور بیرونی زور قوم کی ذاتی اور علمی لیاقتوں پر منحصر ہوتے تھے اور سلطنت کے کل انتظام اور اس کے سب قسم کے کاروبار انہی کے شمول اور انہی کی عرق ریزتدبیروں سے قرار پاتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی تجویزوں کی بنیاد علمی اور تاریخی تجربے کے زوروں پر قائم ہوتی تھی۔ پھر لیاقت مذکورہ بھی سیکڑوں ہی میں منحصر نہیں بلکہ ہزاروں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں جہاں اور مہمات سلطنت ہیں۔ وہاں ایک یہ بھی تھا کہ ہر امر تنقیح طلب جلسۂ عام کے اتفاق رائے سے تحریروں اور تقریروں پر منحصر تھا، موقع پہ جب ایک شخص جلسۂ عام میں استادہ ہو کر کوئی مطلب ادا کرتا تھا۔ تو ادھر کی دنیا ادھر ہو جاتی تھی پھر جب طرف ثانی اس کے مقابل میں جواب ترکی بہ ترکی دیتا تھا۔ تو مشرق کے آفتاب کو مغرب سے طلوع کر دیتا تھا۔ اور اب تک بھی فقط تقریروں اور تحریروں کے زور سے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو متفق کر کے ایک رائے سے دوسری رائے پر پھیر لیتے ہیں، خیال کرنا چاہیئے کہ ان کے بیان میں کیسی طاقت اور زبان میں کیا کیا زور ہوں گے۔ برخلاف ہندوستان کے کہ یہاں کی زبان میں اگر ہوئے تو ایک بادشاہ کی خوش اقبالی میں چند شعرا کے دیوان ہوئے، جو فقط تفریح طبع اور دل لگی کا سامان ہے۔ کجا زمین کجا آسمان، نہ وہ جوہر پیدا ہوا۔ نہ کسی نے اس کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا۔ باوجود اس کے اردو کی خوش اقبالی اور خوش رواجی قابلِ رشک ہے۔ کیونکہ اس کی اصل تو برج بھاشا ہے۔ جو اپنی بہار جوانی میں بھی فقط ایک ضلع میں لین دین کی زبان تھی۔ خود وار دودہی سے نکلی جس کا چراغ دلی کی بادشاہت کے ساتھ گل ہونا چاہیئے تھا۔ پھر بھی اگر بیچوں بیچ ہندوستان میں کھڑے ہو کر آوازیں دیں کہ اس ملک کی زبان کیا ہے۔ تو جواب یہی سنیں گے۔ کہ اردو اس کے ایک کنارے مثلاً پشاور سے چلو تو اول افغانی ہے۔ اٹک اترو تو پوٹھواری کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ جہلم تک داہنے پر کشمیر پکار رہا ہے۔ کہ یور ولا۔ یور والا۔ یعنی ادھر آؤ، بائیں پر ملتان کہتا ہے کہ کتھے گھنیا یعنی کہاں چلے؟ آگے بڑھیں تو وہ بولی ہے کہ پنجابی خاص اسی کو کہتے ہیں کہ اس کے بائیں پہ پہاڑی ایسی زبان ہے کہ تحریر و تقریر سب سے الگ ہے۔ ستلج اتریں تو پنجابیت کی کمی سے لوگوں کی وضع و لباس میں بھی فرق شروع ہوتا ہے۔ دلی پہنچے تو اور ہی سماں بندھا ہوا ہے۔ میرٹھ سے بڑھے تو علی گڑھ میں بھاشا سے ملا جلا پورب کا انداز شروع ہو گیا کانپور، لکھنؤ سے الٰہ آباد تک یہی عالم ہے۔ جنوب کو ہٹیں تو مارواڑی ہو کر گجراتی اور دکھنی ہو جاتی ہے۔ پھر ادھر آئے تو آگے بنگلہ ہے۔ اور کلکتہ پہنچ کر تو عالم گوناگوں خلق خدا اور ملک خدا ہے۔ جس کا امتیاز حد انداز سے باہر ہے۔ میرے دوستو! تم جانتے ہو کہ ہر شے کی اصلیت اور حسن و قبح کے واسطے ایک مقام ایسا ہوتا ہے جیسے سکے کے لئے ٹکسال۔ کیا سبب ہے کہ ابتدا میں زبان کے لئے دلی ٹکسال تھی؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ دار الخلافہ تھی۔ دربار ہی میں خاندانی امرا اور امیر زادے خود صاحبِ علم ہوتے تھے۔ ان کی مجلسیں اہل علم اور اہل کمال کا مجمع ہوتی تھیں جن کی برکت سے طبیعتیں گویا ہر شے کے سلیقے اور شائستگی اور لطافت و ظرافت کا قالب ہوتی تھیں۔ اسی واسطے گفتگو، لباس، ادب، آداب، نشست، برخاست، بلکہ بات بات ایسی سنجیدہ اور پسندیدہ ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ سب کے دل قبول کرتے تھے۔ ہر شے کے لئے ہمیشہ نئی نئی

تراش اور نئی نئی اصلاحیں اور ایجاد و اختراع وہاں سے ہوتے تھے۔ اور چونکہ دارالخلافے میں شہر شہر کا آدمی موجود تھا۔ اس لئے وہ دل پذیر ایجاد اور اصلاحیں ہر شہر میں جلد عام ہو جاتی تھی۔ چنانچہ بہادر شاہ سے پہلے دلی ہر بات کے لئے سند رہی اور انہی صنعتوں سے لکھنؤ نے بھی سند افتخار حاصل کی۔ لکھنؤ کو دیکھ کر سمجھ لو کہ دل پسند ایجادوں اور رنگین باتوں کا ایجاد ہونا کسی شہر کے اینٹ پتھر کی تاثیر نہیں ہے۔ جہاں شائستہ اور رنگین مزاج لوگ جمع ہوں گے۔ اور دل پذیر باتوں کے سامان موجود ہوں گے۔ وہیں سے وہ پھول کھلنے لگیں گے۔ چنانچہ وہی دلی کے لوگ اور ان کی اولاد تھی کہ جب تباہی سلطنت اور آبادی لکھنؤ کے سبب سے وہاں پہنچے تو چند روز میں ویسی ہی تراشیں وہاں سے نکلنے لگیں۔ لکھنؤ دارالحکومت ہو گیا۔ اور اس کے ضمن میں زبان بھی دلی کی اطاعت سے آزاد ہو گئی۔ اس آزادی کی ناسخ، آتش، ضمیر، خلیق وغیرہ، اہل کمال نے بنیاد ڈالی اور انیس، دبیر، رند، خواجہ وزیر اور سرور نے خاتمہ کر دیا۔ انہوں نے زبان کو ترقی دی۔ مگر اکثر ان میں ایسے ہوئے کہ جنگل کے صاف کرنے کو اٹھے تھے۔ مگر اس میں دریا کا دہانہ لا ڈالا۔ یعنی صفائی زبان کی جگہ لغات کی بوچھاڑ کر دی۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کا ورق بھی زمانے نے الٹ دیا۔ اب آفتاب ہماری ملکۂ آفاق کا نشان ہے۔ جسے حکم نہیں کہ ان کی قلمرو کے خط سے باہر حرکت کر سکے۔ ڈاکوں اور ریل گاڑیوں نے پورب سے پچھم تک دوڑ کر بھانت بھانت کا جانور ایک پنجرے میں بند کر دیا۔ دلی برباد، لکھنؤ ویران دونوں کے سندی اشخاص کچھ پیوند زمین ہو گئے۔ کچھ دربدر، خاک سیراب جیسے اور شہر ویسے ہی لکھنؤ۔ جیسے چھاؤنیوں کے بازار، ویسی ہی دلی بلکہ اس سے بھی بدتر، کوئی شہر ایسا نہیں رہا۔ جس کے لوگوں کی زبان عموماً سند کے قابل ہو۔ کیونکہ شہر میں ایسے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص، جن سے کہ وہ شہر قابل سند ہو، صرف گنتی کے لوگ ہوتے ہیں اور وہ زمانے کی صدہا سالہ محنتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت مر گئے۔ کوئی بڈھا، جیسے خزاں کا مارا پتا کسی درخت پر باقی ہے۔ اس بڈھے کی آواز کمیٹیوں کے غل اور اخباروں کے نقار خانوں میں سنائی بھی نہیں دیتی۔ پس اب اگر دلی کی زبان کو سندی سمجھیں تو وہاں کے ہر شخص کو زبان کیونکر سندی ہو سکتی ہے؟ ہوا کا رخ ا [illegible] ی کے اختیار میں ہے، نہ کسی کو معلوم ہے کہ کدھر پھرے گا۔ اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اب ر [illegible] ن یا رنگ بدلے گی؟

ہم بھی جہاز بے ناخدا ہیں۔ توکل بخدا کر بیٹھے ہیں۔ زمانے کے انقلابوں کو رنگ چمن کی تبدیلی سمجھ کر دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں، آزادؔ ؎

قسمت میں جو لکھا تھا سو دیکھا ہے اب تک<br>
اور آگے دیکھئے ابھی کیا کیا ہیں دیکھتے

# نظم اردو کی تاریخ

فلاسفۂ یونان کہتے ہیں۔ شعر خیالی باتیں ہیں۔ جن کو واقعیت اور اصلیت سے تعلق نہیں۔ قدرتی موجودات یا اس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزون کر دیتا ہے۔ اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی۔ جب صبح کا نور و ظہور دیکھتا ہے۔ تو کبھی کہتا ہے اس دیگ مشرق سے دودھ ابلنے لگا۔ کبھی کہتا ہے۔ دریائے سیماب موج مارنے لگا کوئی مشرق سے کافور اڑاتا آتا ہے۔ صبح طباشیر بکھیرتی آتی ہے یا مثلاً سورج نکلا اور کرن ابھی اس میں نہیں پیدا ہوئے۔ وہ کہتا ہے۔ سنہری گیند ہوا میں اچھالی ہے۔ صبح طلائی تھال سر پر دھرے آتی ہے۔ کبھی مرغان سحر کا غل اور نور کا جلوہ آفتاب کی چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کرکے صبح کی دھوم دکھاتا ہے۔ اور کہتا ہے، بادشاہ مشرق سبز خنگ فلک پر سوار تاج مرصع سر اپر رکھے کرن کا نیزہ لئے مشرق سے نمودار ہوا۔ شام کو شفق کی بہار دیکھتا ہے۔ تو کہتا ہے۔ مغرب کے چھپر کھٹ میں آرام کیا اور شنگرفی چادر تان کر سو رہا۔ کبھی کہتا ہے۔ جام فلک خون سے چھلک رہا ہے۔ نہیں مغرب کے ایوان میں آگ لگ گئی۔ تاروں بھری رات میں چاند کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لاجوردی چادر میں ستارے ٹنکے ہوئے ہیں۔ دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے۔ اور روپہلی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں غرض ایسی باتیں ہیں کہ نہایت لطف دیتی ہیں۔ مگر اصلیت سے کچھ بھی غرض نہیں ہے۔ باوجود اس کے صنعت گاہ عالم میں نظم ایک عجیب صنعت صنائع الہٰی سے ہے۔ اسے دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ اول ایک مضمون کو ایک سطر میں لکھتے ہیں اور نثر میں پڑھتے ہیں۔ پھر اسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ لکھ کر دیکھتے ہیں تو کچھ اور ہی عالم ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس میں چند کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۱) وہ وصف خاص ہے کہ جسے سب موزونیت کہتے ہیں۔

(۲) کلام میں زور زیادہ ہو جاتا ہے اور مضمون میں ایسی تیزی آجاتی ہے کہ اثر کا نشتر دل پر کھٹکتا ہے

(۳) سیدھی سادی بات میں ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوشی یا غم و غصہ یا کسی کے ذوق و شوق کا خیال دل میں جوش مارتا ہے۔ اور وہ قوت بیان سے ٹکر کھاتا ہے۔ تو زبان سے خود بخود موزوں کلام نکلتا ہے۔ جیسے پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ نکلتی ہے۔ اسی واسطے شاعر وہی ہے۔ جس کی طبیعت میں صنعت خداداد ہو۔ قدرتی شاعر اگرچہ ارادہ کرکے شعر کہنے کو خاص وقت میں بیٹھتا ہے۔ مگر حقیقت میں اس کا دل اور خیالات ہر وقت کام میں لگے رہتے ہیں۔ قدرت کے کارخانے میں جو چیز اس کے حواس میں محسوس ہوتی ہے اور اس سے کچھ اثر اس کی طبیعت اٹھاتی ہے۔ وہ ہر شخص کو نصیب نہیں۔ خواہ لطف و شگفتگی ہو۔ خواہ آزادگی یا بیزاری، یہ ضرور ہے۔ کہ جو کیفیت وہ اٹھاتا ہے، اس کے لئے ڈھونڈتا رہتا ہے۔ کہ کیسے لفظ ہوں اور کس طرح انہیں ترکیب دوں

تاکہ جو کیفیت اس کے دیکھنے سے میرے دل پر طاری ہے۔ وہی کیفیت سننے والوں کے دل پر چھا جائے اور وہ بات کھوں کر دل پر اثر کر جائے۔

شاعر کبھی ایک حجرے میں تنہا بیٹھتا ہے۔ کبھی سب سے الگ اکیلا پھرتا ہے۔ کبھی کسی درخت کے سائے میں تنہا نظر آتا ہے۔ اور اسی میں خوش ہوتا ہے۔ وہ کیسی ہی خستہ حالی میں ہو۔ مگر مزاج کا بادشاہ اور دل کا حاتم ہوتا ہے۔ بادشاہ کے پاس فوج و سپاہ، دفتر دربار اور ملک داری کے سب کارخانے اور سامان موجود ہیں۔ اس کے پاس کچھ نہیں مگر الفاظ اور معانی سے وہی سامان، بلکہ اس سے ہزاروں درجے زیادہ تیار کر کے دکھا دیتا ہے۔ بادشاہ سالہا سال میں کن کن خطرناک معرکوں سے ملک یا خزانہ جمع کرتا ہے۔ یہ جسے چاہتا ہے گھر بیٹھے دے دیتا ہے۔ اور خود پروا نہیں۔ بادشاہ کو ایک ولایت فتح کر کے وہ خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ جو اسے ایک لفظ کے ملنے سے ہوتی ہے۔ جو اپنی جگہ پر موزوں سجا ہوا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اسے ملک کی پروا بھی نہیں۔

اس بات میں جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ یہ ہے کہ شیخ ابراہیم ذوقؔ جس مکان میں بیٹھے تھے۔ تنگ و تاریک تھا۔ گرمی میں دل دق ہو جاتا تھا۔ بعض قدیمی احباب کبھی جاتے تو گھبراتے اور کہتے کہ مکان بدلو، گھڑی بھر بھی بیٹھنے کے قابل نہیں، تم کیونکر دن رات یہیں کاٹتے ہو؟ وہ ہوں ہاں کرتے اور چپکے ہو رہتے۔ کبھی مسکراتے، کبھی جو غزل کہتے ہوتے۔ اسے دیکھنے لگے۔ کبھی ان کا منہ دیکھتے، خدا نے مکانات، باغ، آرام و آسائش کے سامان سب دیئے تھے۔ مگر وہ وہیں بیٹھے رہے اور ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے۔ اچھا ان کے قصائد اور غزلیں دیکھ لو، کسی بادشاہ کی سلطنت میں اس شان و شوکت اور دھوم دھام کے سامان موجود ہیں، گویا سلطنت کے سامان انہی کا مال تھے۔ کہ جس طرح چاہتے تھے، اپنے کام میں لاتے تھے۔ جب وہ اپنے کلام کو پڑھتے تھے تو بادشاہ کو جو مالک سلطنت ہوتا تھا۔ کچھ ان سے زیادہ خوشی نہ ہوتی ہوگی۔ کیونکہ اسے ان کا فکر بھی رہتا ہے۔ انہیں پروا بھی نہیں تھی۔

جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے موافق بے کچھ نہ کچھ روئیدگی کے نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح کوئی زبان اپنے اہل زبان کی حیثیت بموجب نظم سے خالی نہیں رہ سکتی۔ ہر روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی سرزمین کی خاصیت ظاہر کرتی ہے۔

زبانوں کے سلسلے میں ہر ایک نظم اپنی زبان اور اہل زبان کی شائستگی اور تہذیب علمی کے ساتھ لطافت طبع کے درجے دکھاتی ہے۔

زبان اردو کے ظہور پر خیال کریں اور اس کی تصنیفات پر نگاہ کریں تو اس میں نثر سے پہلے نظم آئے گی۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے پھر باتیں کرنی سیکھے۔ ہاں نظم جوش طبع تھا۔ اس لئے پہلے نکل پڑا۔ نثر شائستگی کے بوجھ سے گراں بار تھی۔ اپنی ضرورت کے وقت ظہور کیا۔ نثر اُردو

کی تصنیف ۱۱۴۵ھ سے پہلے نظر نہیں آتی۔ البتہ نظم کی حقیقت زبانی حکایتوں اور کتابی روایتوں کی خاک چھان کر یہ نکلتی ہے کہ جب برج بھاشا نے اپنی وسعت اخلاق سے عربی فارسی الفاظ کے مہمانوں کو جگہ دی تو طبیعتوں میں اسقدر روئیدگی نے بھی زور کیا۔ لیکن وہ صد سالہ تک دُہروں کے رنگ میں ظہور کرتی رہی یعنی فارس کی بحریں اور فارسی کے خیالات نہ آتے تھے۔

امیر خسرو نے کہ جن کی طبیعت، اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی۔ ملک سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ انشاپردازی کا کھولا خالق باری جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے۔ کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی۔ اس میں فارسی بحروں نے اول اثر کیا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کون کون سے الفاظ مستعمل تھے جو اب متروک ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی پہیلیاں عجیب غریب لطافتوں سے ادا کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے نمک نے ہندی کے ذائقے میں کیا لطف پیدا کیا ہے۔ مکرنی، انمل، دوسخنے وغیرہ خاص ان کے آئینے کا جوہر ہے۔ ہر ایک کی مثال لکھتا ہوں، کیونکہ ان سے بھی اس وقت کی زبان کا کچھ نہ کچھ پتا لگتا ہے۔

نبولی کی پہیلی

تر ور سے اک تریا اتری اس نے بہت رجھایا    باپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر جا دا بوجھ پہیلی موری    امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام نبولی

آئینے کی پہیلی

فارسی بولی آئینہ    ترکی سوجی پائی نا
ہندی بولتے آرسی آئے    منہ دیکھو جو اسے بتائے

ناخن کی پہیلی

بیسیوں کا سر کاٹ لیا    نا مارا نا خون کیا

لال کی پہیلی

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے    دیکھ سفیدی ہوت انگارا گونگے سے بھڑ جائے
بالس کا مندر واہ کا باشا۔ باشے کا رہ کھا جا    سنگ ملے تو سر پر راکھیں واہ کو راورا جا
سی سی کر کے نام بتایا، تا میں بیٹھا ایک    الٹا سیدھا ہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی تو سن لے میرے لال    عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال

دلی بلکہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں رسم ہے کہ عام عورتیں برسات کی بہار میں کھم گڑواتی ہیں۔ درخت ہو تو اس میں جھولا ڈلواتی ہیں۔ مل مل کر جھولتی ہیں۔ اور گیت گا کر جی خوش کرتی ہیں۔ ان میں شاید کوئی عورت ہوا جو یہ گیت نہ گاتی ہو۔

جو پیا آون کہہ گئے اجھوں نہ آئے سوامی ہو، اے ہو جو پیا آون کہہ گئے وغیرہ وغیرہ، یہ گیت بھی انہی امیر خسرو کا ہے۔ اور بروا راگ میں بھی انہی کی رکھی ہوئی ہے۔ واہ کیا زبانیں تھیں کہ جو کچھ ان سے نکل گیا، عالم کو بھایا۔ گویا زمانے کے دل پر نقش ہوگیا۔ بنانے والوں نے ہزاروں گیت بنائے اور گانے والوں نے گائے۔ آج ہوئے، کل بھول گئے۔ چھ سو برس گزرے۔ یہ آج تک ہیں اور ہر برسات میں ویسا ہی رنگ دیتے جاتے ہیں۔ اس حسن قبول کو خداداد نہ کہئے تو کیا کہیے۔

بڑی بڑی عورتوں کے گانے کے لئے تو ویسے گیت تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو پیا اور سوامی کی یاد میں اس طرح گانا مناسب نہ تھا۔ لیکن دل میں امنگ تو وہ بھی رکھتی تھیں۔ انہیں بھی فصل کی بہار منانی تھی ان کے لئے اور گیت رکھے تھے۔ چنانچہ ایک لڑکی گویا سسرال میں ہے۔ برسات کی رت آئی۔ وہ جھولتی ہے اور ماں کی یاد میں گاتی ہے۔

| | |
|---|---|
| اماں میرے باوا کو بھیجو جی کہ ساون آیا | یعنی مجھے آکر لے جائے۔ |
| بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری کہ ساون آیا | یعنی وہ کیوں کر آسکتا ہے؟ |
| اماں میرے بھائی کو بھیجو جی کہ ساون آیا | |
| بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری کہ ساون آیا | یعنی بچہ اکیلا اتنی دور کیوں کر آئے؟ |
| اماں میرے ماموں کو بھیجو ری کہ ساون آیا | یعنی اس کے لئے تو وہ عذر نہیں |
| بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری کہ ساون آیا | بھلا وہ کب میری سنے گا؟ |

ذرا غور کر کے دیکھو، باوجود علم و فضل اور اعلیٰ درجہ خیالات شاعرانہ کے جب یہ لوگ پستی کی طرف جھکتے تھے۔ تو ایسے تہ کو پہنچتے تھے کہ زمین کی ریت تک نکال لاتے تھے۔ ان الفاظ و خیالات پر نظر کرو کیسے نیچر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عورتوں اور لڑکیوں کے فطری خیالات اور دلوں کے ارمانوں کو کیا اصلی طور سے ظاہر کرتے ہیں۔ مکرنیوں کا انہیں موجد کہنا چاہیئے۔

| | | |
|---|---|---|
| مکرنی | (۱) سگری رین موہے سنگ جاگا | بھور بھئی تب بچھڑن لاگا |
| | اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا | اے سکھی ساجن نا سکھی دیا |

---

| | | |
|---|---|---|
| مکرنی | ۲۔ سرب سلونا سب گن نیکا | وا بن سب جگ لاگے پھیکا |
| | وا کے سر پر ہووے کون | اے سکھی ساجن نا سکھی لون |

| | | |
|---|---|---|
| مکرنی | ۳۔ وہ آوے تب شادی ہوئے | اس بن دوجا اور نہ کوئے |
| | میٹھے لاگے وا کے بول | اے سکھی ساجن نا سکھی ڈھول |

ایک کنوئیں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو کو رستہ چلتے چلتے پیاس لگی کنوئیں پر جا کر ایک سے پانی مانگا۔ ان میں سے ایک انہیں پہچانتی تھی۔ اس نے اوروں سے کہا کہ دیکھو خسرو یہی ہے انہوں نے پوچھا کیا تو خسرو ہے۔ جس کے سب گیت گاتے ہیں اور پہیلیاں اور مکرنیاں انمل سنتے ہیں۔ انہوں نے کہا، ہاں۔ اس پر ایک ان میں سے بولی کہ مجھے کھیر کی بات کہہ دے۔ دوسری نے چرخے کا نام لیا، تیسری نے ڈھول، چوتھی نے کتے کا انہوں نے کہا کہ مارے پیاس دم نکلا جاتا ہے۔ پہلے پانی تو پلا دو، وہ بولیں، جب تک ہماری بات نہ کہہ دے گا۔ نہ پلائیں گی۔ انہوں نے جھٹ کہا:

انمل: کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا۔ آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا، پانی پلا۔

اسی طرح کبھی کبھی ڈھکوسلا کہا کرتے تھے کہ وہ بھی انہیں کا ایجاد ہے۔

ڈھکوسلا بھادوں پکی پیپلی، چو چو پڑی کپاس بی مہترانی دال پکاؤ گی یا ننگا ہی سو رہوں۔

| | | |
|---|---|---|
| دو سخنے: | گوشت کیوں نہ کھایا، ڈول کیوں نہ گایا؟ | گلا نہ تھا |
| | جوتا کیوں نہ پہنا، سنبوسہ کیوں نہ کھایا؟ | تلا نہ تھا |
| | انار کیوں نہ چکھا، وزیر کیوں نہ رکھا؟ | دانا نہ تھا۔ |

| | | |
|---|---|---|
| دو سخنے فارسی: | سوداگر را چہ مے باید، بوچے کو کیا چاہیئے؟ | دوکان |
| اردو: | تشنہ را چہ مے باید، ملاپ کو کیا چاہیئے؟ | چاہ |
| | شکار بہ چہ مے باید کرد، قوت مغز کو کیا چاہیئے؟ | بادام |

موسیقی میں ان کی طبیعت ایک بین تھی۔ کہ بن بجائے پڑی بجتی تھی۔ اس لئے دھرپت کی جگہ قول و قلبانہ بنا کر بہت سے راگ ایجاد کئے کہ ان میں سے اکثر گیت ان کے آج تک ہندوستان کے زن و مرد کی زبان پر ہیں۔ بہار راگ اور بسنت کے میلے نے انہی کی طبیعت سے رنگ پکڑا ہے۔ بین کو مختصر کر کے ستار بھی انہی نے نکالا ہے۔

لطیفہ:۔ سلطان جی صاحب کے ہاں ایک سیاح فقیر مہمان آئے۔ رات دسترخوان پر بیٹھے۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ سیاح نے ایسے دفتر کھولے کہ بہت رات گئی ختم ہی نہ ہوں۔ سلطان جی صاحب نے کچھ انگڑائیاں، کچھ جمائیاں بھی لیں۔ وہ سادہ لوح کسی طرح بھی نہ سمجھے۔ سلطان جی صاحب، مہمان کی دل شکنی سمجھ کر کچھ نہ کہہ سکے۔ مجبور بیٹھے رہے۔ امیر خسرو بھی موجود تھے۔ مگر بول نہ سکتے تھے کہ آدھی رات کی نوبت بجی۔ اس وقت سلطان جی نے کہا

کہ خسرو یہ کیا بجا! عرض کی، آدھی رات کی نوبت ہے۔ پوچھا، اس میں کیا آواز آتی ہے؟ انہوں کہا، سمجھ میں تو ایسا آتا ہے:

نان کہ خوردی، خانہ برد، نان کہ خوردی، خانہ برد، خانہ برد، خانہ برد، نان کہ خوردی، خانہ بردئہ کہ بدست تو کردم خانہ گرد، خانہ برد، خانہ برد، حرف حرف کی حرکت و سکون پر خیال کرو، ایک ایک چوٹ کو کیا پورا پورا ادا رہے ہیں۔ اور نہ بدست تو کردم خانہ گرد کو دیکھو اس نے کیا کام کیا!

نقل: ایک دن کسی کوچے میں سے گزر ہوا۔ دھنیا ایک دکان میں روئی دھنک رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ جس دھنیے کو دیکھو، ایک ہی انداز پر روئی دھنکتا ہے۔ سب ایک ہی استاد کے شاگرد ہیں۔ کوئی بولا کہ قدرتی استاد نے سب کو ایک ہی انداز پر سکھایا ہے۔ آپ نے کہا کہ سکھایا ہے اور ایک حرکت میں بھی تال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کوئی بولا کہ لفظوں میں کیونکر لا سکیں؟ فرمایا:

درپئے جاناں جاں ہم رفت، جاں ہم رفت، جاں ہم رفت، رفت، رفت، جاں ہم رفت، ایں ہم رفت و آں ہم رفت، آنہم رفت، آنہم رفت، اینہم، آنہم، اینہم آنہم رفت رفتن، رفتن، رفتن، دہ، دہ، زفتن ا۔ رف، رف، رفتن دہ،

نقل: محلے کے سرے پر ایک بڑھیا سافن کی دکان تھی۔ چھو اس کا نام تھا۔ شہر کے بیہودہ لوگ وہاں بھنگ چرس پیا کرتے تھے۔ جب یہ دربار سے پھر کر آتے یا نفر یجا گھر سے نکلتے تو وہ بھی سلام کرتی۔ کبھی کبھی حقّہ بھر کر سامنے لے کھڑی ہوتی۔ یہ بھی اس کی دل شکنی کا خیال کر کے دو گھونٹ لے لیا کرتے۔ ایک دن اس نے کہا کہ بلالوں، ہزاروں غزلیں، گیت، راگ، راگنی بناتے ہو۔ کتابیں لکھتے ہو۔ کوئی چیز لونڈی کے نام پر بھی بنا دو۔ انہوں نے کہا، بی چھو! بہت اچھا کئی دن کے بعد اس نے پھر کہا کہ بھٹیاری کے لڑکے کے لئے خالق باری لکھ دی، ذرا لونڈی کے نام پر بھی کچھ لکھ دوگے تو کیا ہو گا؟ آپ کے صدقے سے ہمارا نام بھی رہ جائے گا۔ اس کے بار بار کہنے سے ایک دن خیال آگیا۔ ابی چھو! سنو۔

اوروں کی چھ پہری باجے چھو کی اٹھ پہری

باہر کا کوئی آئے نا ہیں، آئیں سارے شہری

صاف صوف کر کے آگے راکھے جن میں نا ہیں تو سل

اوروں کے جہاں سینک سمادے چھو کے وہاں موسل

یعنی یہ بادشاہوں سے بھی بڑی ہیں جنگلی گنواروں کا کام نہیں سفید پوش کرتے ہیں۔ پیالہ بنگ صاف مصفیٰ حاضر کرتی ہے جس میں تس تنکا نہ ہو۔ بھنگڑ فخر یہ کہا کرتے ہیں

کہ وہ ایسی بھنگ پیتا ہے کہ جس میں گاڑھے پن کے سبب سے سینک کھڑی رہے۔ آپ مبالغہ کرتے ہیں کہ وہ ایسی بھنگ بناتی ہے کہ جس میں موسل کھڑا رہے۔ غیر ان کی بدولت چھجو کا نام بھی رہ گیا۔

حق پوچھو تو جس طرح ہر جاندار کی عمر ہے۔ اسی طرح کتاب کی بھی عمر ہے۔ مثلاً شاہنامہ کو ۹ سو برس ہوئے سکندرنامہ کو ۸ سو برس سمجھو۔ گلستان بوستان کو ۹ سو برس کہو۔ زلیخا کی عمر قریب ۴ سو کے ہوئی۔ مگر اب تک سب جوان ہیں۔ اردو میں باغ و بہار، بدر منیر وغیرہ جوان ہیں۔ فسانۂ عجائب جاں بلب ہوگیا۔ بہت کتابیں اول شہرت پاتی ہیں۔ پھر گمنام ہوجاتی ہیں۔ یہ گویا بچے ہی تھے کہ مرگئے۔ بہتری تصنیف ہوتی ہیں اور چھپتی ہیں۔ مگر کوئی پوچھتا۔ یہ بچے مرے ہوئے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض کتابوں کی عمریں میعاد معلوم پر ٹھہری ہوئی ہیں وہ مدارس سرکاری تصنیفیں ہیں۔ کیونکہ جب تک تعلیم میں داخل ہیں۔ تب تک چھپتی ہیں اور خواہ مخواہ بکتی ہیں۔ لوگ پڑھتے ہیں۔ جب تعلیم سے خارج ہوگئیں مرگئیں کوئی اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

قبول خاطر و لطف سخن خداداد است

خدایہ نعمت نصیب کرے۔ غرض اس جوشِ طبع اور ہنگامۂ ایجاد میں ایک تازہ ایجاد اور ہوا۔ جس میں ہمارے لئے تین باتیں قابل لحاظ ہیں۔

(۱) مضامین عاشقانہ سے وہ سلسلہ اشعار کا ہمارے ہاتھ آیا۔ جسے غزل کہتے ہیں۔ وہی قافیے یا ردیف یا ردیف اور قافیے دونوں کی پابندی اسی طرح اول مطلع یا کئی مطلعے پھر چند اشعار۔ آخر میں مقطع اور اسی میں تخلص۔

۲۔ عروض فارسی نے پہلا قدم ہندوستان میں رکھا۔

۳۔ فارسی اور بھاشا کو لون مرچ کی طرح اس انداز سے ملایا ہے کہ زبان پر چٹخارا دیتی ہے اس میں یہ بات سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ انہوں نے بنیادِ عشق کی عورت ہی کی طرف سے قائم کی تھی۔ جو کہ خاصہ نظم ہندی کا ہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس تعشق کا انقلاب کس وقت ہوا۔ غزل مذکور یہ ہے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل، ورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ کتاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں

کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کوں ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں، چو ذرہ حیراں زمہر آں مہ بگشتم آخر

نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو

سپیت منکے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

ابتدائے ایجاد میں ایسا ہی ہوتا ہے، زمانہ مبتدیوں کا اصلاح دینے والا ہے، پھر تراشیں دے کر اعلیٰ درجہ خوبی و خوش اسلوبی پر پہنچا لیتا ہے۔ مگر اس وقت اس طرف کسی اور نے ایسی توجہ نہ کی کہ جس سے اس طرز کا رواج جاری ہو جاتا۔ البتہ ملک محمد جائسی نے مثنوی پدماوت کے علاوہ دوسرے اور گیت بھی لکھے اور وہ ایسے اعلیٰ رتبے کے ہیں۔ کہ ڈاکٹر گلگرسٹ صاحب کی تصنیف میں نہایت مدد کرتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ فارسی کی بحروں میں کوئی شعر اس کا نہیں۔ دکن میں ایک سعدی گزرے ہیں ان کا فقط اتنا حال معلوم ہے کہ اپنے تئیں ہندوستان کا سعدی شیرازی سمجھتے تھے۔ اور تعجب ہے کہ مرزا رفیع سودا نے اپنے تذکرے میں ان کے اشعار مندرجہ ذیل کو شیخ سعدی شیرازی ہی کے نام پر لکھا ہے۔

قند چو دیدم بروخت گفتم کہ یہ کا دیت ہے ؎

گفتا کہ دُر مو باورے اس شہر کی یہ ریت ہے

ہم نا تجھن کو دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا

ہم یہ کیا تم وہ کیا، ایسی یہ پیت ہے!

سعدی کہ گفتہ ریختہ، در ریختہ، دُر ریختہ

شیر و شکر ہم ریختہ، ہم ریختہ، ہم گیت ہے

کبیر اور تلسی داس وغیرہ کے دوہرے عالم میں زبان زد ہیں، اگر وہ فقط اتنی سند کے لئے کارآمد ہیں کہ اس عہد میں فارسی الفاظ کا دخل ہندوؤں کی زبانوں پر بھی ہو گیا تھا۔ انہیں اس نظم سے علاقہ نہیں، جو فارسی سے آکر اردو کے لباس میں ظاہر ہوئی اور ملکی مالک کو بے دخل کر کے گوشے میں بٹھا دیا:

حامد کوئی شخص ہوئے ہیں۔ ان کا زمانہ معلوم نہیں کہتے ہیں کہ حامد باری انہیں کی تصنیف ہے۔ ان کی فقط سات شعر کی ایک غزل دیکھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید کوئی پنجابی بزرگ ہیں۔ اس میں سے مطلع پر قناعت کرتا ہوں۔

عزم سفر جوں کردی ساجن نینوں نیندنہ آئی جی
قدرو صالت فدا نستم تم بن برہ ستائی جی

اگر یہی شعر ہیں تو جب سے اب تک بے شمار شاعر پنجاب میں نکل آئیں گے۔ یہاں کی شاعری اب تک انہیں تبیوں میں جاری ہے۔ لیکن یہ شاعر اور ان کی شاعری وہ نہیں ہے۔ جس سے ہم بحث کرتے ہیں۔ احمد گجراتی ہم عہد وہم وطن ولی کے ہیں، وہ فرماتے ہیں۔

گر بیضۂ زاغے کسے در زیر سیمرغے نہد
از اصل خود ناید بروں آخر گلیلا ہوئے پر
گر طفلکے بازی گرے خوانندہ و عالم شود
کہ دارد کے رود آخر زنبورا ہوئے پر
گر بچۂ شیرے کسے باشیر روبہ پرورد
مردی کہ دارد کسے رود آخر بگیلا ہوئے پر

سیوا ایک مصنف دکن میں گزرا ہے۔ جس نے روضتہ الشہدا کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ مرثیے اس کے اب تک وہاں کے امام باڑوں میں پڑھے جاتے ہیں اور غالب ہے کہ اس طرح کے شاعران عہدوں میں بہت ہوں گے۔ مگر ایسی شاعری کو علمی شاعری نہیں کہہ سکتے۔

نواز نام ایک مصنف نے فرخ سیر کے عہد میں شکنتلا کا ترجمہ بھاشا میں لکھا۔ اس عہد میں نظم اردو کے ضعف کا یہی سبب ہوگا کہ جو ذی استعداد اردو کے اہل زبان ہوتے تھے۔ وہ اردو کی شاعری کو فخر نہ سمجھتے تھے۔ کچھ کہنا ہوتا تھا کہ فارسی میں کہتے تھے۔ البتہ عوام الناس موزون طبع دل کی ہوس پوری کرنے کو جو منہ میں آتا تھا کہے جاتے تھے۔ جو اہل ولایت شاعر ہوتے تھے۔ وہ فارسی شعر کہتے۔ اردو انہیں آتی نہ تھی۔ کہتے تھے کہ تو ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا تمسخر کرتے ہیں۔ چنانچہ مرزا موسوی خاں فطرت کہ زبدۂ شعرائے ایران اور عمدہ شعرائے عالمگیری سے تھے۔ اور بعد ان کے قزلباش خاں امید کے متفرق اشعار دیکھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اس وقت ٹوٹی پھوٹی زبان تھی۔ اسے پورا ادا نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ میر معز فرماتے تھے ؎

از زلف سیاہ تو بدل دوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جوم پڑی ہے

قزلباش خاں امید باوجودیکہ فارسی میں بڑے نامور ہیں اور اہل ہند کے ساتھ ان کے جلسوں کی گرم جوشیاں بھی مشہور ہیں۔ مگر اردو میں جو اظہار کمال کیا ہے وہ یہ ہے۔

- بامن کی بیٹی آج مری انکھوں پڑی
عشوہ کیا و گالی دیا اور وگر لڑی

اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ نظم موجودہ نے دکن سے ظہور کیا۔ چنانچہ میر تقی میر نے بھی ایک غزل میں شاعرانہ انداز سے اشارہ کیا ہے۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اور قائم ان کے ہمعصر نے صاف کہہ دیا ہے سے

قائم ہیں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

بہر حال عالمگیر کے عہد میں ولی نے اس نظم کا چراغ روشن کیا جو محمد شاہ کے عہد میں آسمان پر ستارہ ہو کر چمکا اور شاہ عالم کے عہد میں آفتاب ہو کر اوج پر آیا۔

نظم اردو کے آغاز میں یہ امر قابل اظہار ہے کہ سنسکرت میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہیں۔ اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا اس کی شاخ دو معنین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی۔ فارسی میں یہ صنعت ہے۔ مگر کم۔ اردو میں پہلے پہلے شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی۔ اور دور اول کے شعرا میں برابر وہی قانون جاری رہا۔ اس عہد کے چند اشعار بھی نمونے کے طور پر لکھتا ہوں۔

لام نستعلیق کا ہے اس بت خوشخط کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

کیوں نہ ہو ہم سے وہ سجن باغی
قد ہو جس کا نہال کی مانند!

تُو جو دریا کے پار جاتا ہے!
دل مرا وار وار جاتا ہے

تم دیکھو یا نہ دیکھو ہم کو سلام کرنا
یہ تو قدیم ہی سے سر پہ ہمارے کر ہے

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے — کہ آخر بدنما لگتا ہے دیکھو چاند کو گہنا
صبح دکھا بانکی نہیں چھوڑے گا میرا لقدل — آج وہ افغان پسر آتا یہی ہے دل پہ ٹھان
نہ دیوے لے کے دل وہ جعد مشکیں — اگر باور نہیں تو مانگ دیکھو

شاہ حاتم نے بڑی کوشش کر کے ان رنگ آمیزیوں سے اردو کو پاک کیا۔ چنانچہ ان کے حال میں معلوم ہوگا۔

سودا کے عہد میں بھی اس مادہ فاسد کا بقیہ چلا آتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی ایک قصیدے میں ان بزرگوں کی شکایت کی ہے۔ جس کے اشعار میں سے ایک شعر یہ ہے۔

موہو پرورش شانہ تو پھر ہے موسل — رام پور کی ہو کٹاری تو کہیں ستیا پھل

مگر لطف یہ ہے کہ خود بھی موقع پاتے تھے۔ تو کہیں نہ کہیں کہہ جاتے تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے ؎

حکاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں — فیروزہ ہوئے مردہ تو دیتا ہے وہ جلا

اگرچہ وہ انداز پہلے کی نسبت بالکل نہیں رہے پھر بھی جس قدر رہیں، وہ ایسے زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ کہ جن مضامین کے ادا کرنے کی ہمیں آج کل ضرورت پڑتی ہے اس کے لئے خلل انداز ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی بھولنی نہ چاہیئے کہ جس طرح ایک نوجوان مرغ اپنے پر جھاڑ کر نئے پر نکالتا ہے۔ اسی طرح ہماری زبان بھی اپنے الفاظ کو بدلتی چلی آتی ہے۔ چنانچہ بہت سے الفاظ ہیں۔ جن کا دورہ یہ دور شعرا کے کلام میں اشارہ کیا گیا ہے

یہ اظہار قابل افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے۔ یعنی مضامینِ عاشقانہ۔ مے خواری۔ مستانہ۔ بے گل و گلزار و ہمی رنگ و بو کا پیدا کرنا ہجرت کی مصیبت کا رونا۔ وصل موہوم پر خوش ہونا۔ دنیا سے بیزاری اسی میں فلک کی جفاکاری اور غضب یہ ہے کہ اگر کوئی اصلی ماجرا بیان کرنا چاہتے ہیں۔ تو بھی خیالی استعاروں میں ادا کرتے ہیں۔ نتیجہ جس کا یہ کہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ میرے دوستو! دیکھتا ہوں کہ علوم و فنون کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ اور ہر قوم اپنے اپنے فنِ انشا کی دستکاریاں بھی سجائے ہوئے ہے کیا نظر نہیں آتا۔ ہماری زبان کس درجے پہ کھڑی ہے؟ ہاں صاف نظر آتا ہے کہ پاانداز میں پڑی ہے ::

ہمارے بزرگوں میں سے دلی میں اوّل مرزا رفیع سودا، پھر شیخ ابراہیم ذوق نے زبان کی پاکیزگی، الفاظ کی شستگی اور ترکیب کی چستی سے کلام میں خوب زور پیدا کیا۔ میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے زار نالی۔ افسردہ دلی۔ دنیا سے بیزاری کے مضامین کو خوب ادا کیا غالب نے بعض مواقع پر ان کی عمدہ پیروی کی۔ مگر معنی آفرینی کے عاشق تھے اور زیادہ توجہ ان کی فارسی پر رہی۔ اس لئے اردو میں غالباً صاف اشعار کی تعداد سو دو سو شعر سے آگے نہ نکلی۔ جرأت نے عاشق و معشوق کے معاملات اور دونوں کے دلی خیالات کو نہایت

خوبی اور شوخی سے بیان کیا۔ مومن خاں نے باوجود مشکل پسندی کے پیروی کی۔ لکھنؤ میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش۔ رند، صبا، وزیر وغیرہ نے شاعری کا حق ادا کیا مگر پھر خیال کرو کہ فقط زبانی طوطے مینا بنانے سے حاصل کیا۔ جو شاعری ہمارا ہر قسم کا مطلب اور ہمارے دل کا ہر ایک ارمان پورا نہ نکال سکے۔ گویا ایک ٹوٹا قلم ہے۔ جس سے پورا حرف نہ نکل سکے۔ دارالخلافہ دہلی جو کہ انشا اور شاعری اُردو کے لئے دارالضرب تھا، وہاں ذوق اور غالب نے رسمی شاعری پر خاتمہ کیا۔ لکھنؤ میں ناسخ و آتش سے شروع ہو کر رند۔ وزیر، صبا تک سلسلہ جاری رہا۔ ایک زمانے میں مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویّا مرثیہ خواں لیکن لکھنؤ میں ان دونوں شاخوں کے صاحب کمال بھی ایسے ہوئے کہ اصلوں کو رونق دے دی۔ اسی اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس اور مرزا دبیر خاتمہ شعرائے اُردو کا ہیں۔ اور چونکہ اس فن کے صاحب کمال کا پیدا ہونا نہایت درجے کی آسودگی اور زمانے کی قدر دانی اور متعدد سامانوں پر منحصر ہے اور اب زمانے کا رنگ اس کے بالکل برخلاف ہے اس لئے ہندوستان کو اس شاعری کی ترقی اور ایسے شعرا کے پیدا ہونے سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیئے۔ البتہ کوئی نیا فیشن نکلے پھر اس میں خدا جانے کیا کیا کمال ہوں اور کون کون اہل کمال ہوں۔

خاتمہ کلام میں عقل کے نجومی سے سوال ہوا کہ اس شاعری کا ستارہ جو نحوست زوال میں آگیا ہے۔ کبھی اوج اقبال پر بھی طلوع کرے گا۔ یا نہیں؟ جواب ملا کہ نہیں۔ پوچھا گیا کہ سبب؟ جواب ملا کہ حکام وقت کی یہ زبان نہیں۔ نہ ان کے کار آمد ہے۔ اسی لیے وہ اس کے قدر دان نہیں۔ نہ وہ اسے جانتے ہیں۔ نہ اس کے جاننے کو کچھ فخر جانتے ہیں۔ وہاں سے ہمارے شعرا کو جھوٹے خوشامدی کا خطاب ملا ہوا ہے۔ اچھا یا قسمت یا نصیب! جن لوگوں کے کلام ہماری زبان کے لئے سند سمجھے جاتے تھے ان کی تو یہ عزت ہوئی۔ اب اس نیم جان مردے کے رونے والے چند بڈھے رہے، جن کی دردناک آوازیں کبھی کبھی آہ سرد کے شعلوں میں بلند ہو کر سینوں میں رہ جاتی ہیں۔ کبھی وہ دل آسودہ ہوتے ہیں تو ایک مشاعرہ کر کے مل بیٹھتے ہیں۔ اور آپس ہی میں ایک دوسرے کی تعریفیں کر کے جی خوش کر لیتے ہیں۔ شاعر غریب اپنے بزرگوں کی قبریں قائم رکھنے کو اتنی ہی تعریف پر قناعت کر لیں مگر پیٹ کو کیا کریں۔ یہ دوزخ تو بہت سی تعریف سے نہیں بھرتا۔

پھر سوال ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر ہے۔ جس سے اس کے دن بھی پھیریں اور

پھر ہماری نظم کا باغ لہلہاتا نظر آئے۔ جواب ملا کہ ہاں ہمت و تدبیر کو خدا نے بڑی برکت دی ہے۔ صورت یہی ہے کہ ایشیا میں ایسے کمالوں کی رونق حکام کی توجہ سے ہوتی ہے۔ شاعروں کو چاہیئے۔ کہ اسے حاکموں کے کار آمد یا ان کی پسند کے قابل بنائیں۔ ایسا کریں گے۔ تو شعر کہنے والوں کو کچھ فائدہ ہوگا۔ اور جس قدر فائدہ ہوگا۔ اسی قدر چرچا زیادہ ہوگا۔ اسی قدر ذہن، فکر و جودت کریں گے اور دلچسپ ایجاد اور خوش نما اختراع نکالیں گے۔ اسی کو ترقی کہتے ہیں۔

یہ تو تم نے دیکھ لیا کہ اردو میں جو سرمایہ انشاء پردازی کا ہے۔ فارسی کی بدولت ہے۔ قدمائے فارس ہر قسم کے مضامین سے لطف اٹھاتے تھے۔ متاخرین فقط غزل میں منحصر ہو گئے۔ ذی استعداد قصیدے بھی کہتے رہے۔ اردو والوں نے بھی آسان کام سمجھ کر اور عوام پسندی کو غرض ٹھہرا کر حسن و عشق وغیرہ کے مضامین کو لیا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ کیا۔ بہت خوب کیا۔ لیکن وہ مضمون اس قدر مستعمل ہو گئے۔ کہ سنتے سنتے کان تھک گئے ہیں۔ وہی مقرری باتیں ہیں۔ کہیں ہم .................. لفظوں کو پس و پیش کرتے ہیں کہیں ادل بدل کرتے ہیں۔ اور کہے جاتے ہیں۔ گویا کھاتے ہوئے بلکہ اوروں کے چبائے ہوئے نوالے ہیں۔ انہیں کو چباتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں۔ خیال کرو، اس میں کیا مزا رہا! حسن و عشق سبحان اللہ بہت خوب لیکن تابکے؟ حور ہو یا پری گلے کا ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے۔ حسن و عشق سے کہاں تک جی نہ گھبرائے اور اب تو وہ بھی بوڑھی کی بڑھیا ہو گئی۔

ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ان خیالات کے ادا کرنے کے لئے ہمارے بزرگ الفاظ و معنی اور استعاروں اور تشبیہوں کے ذخیرے تیار کر گئے ہیں۔ اور اس قدر رواں ہو گئے ہیں کہ ہر شخص تھوڑے فکر سے کچھ نہ کچھ کر لیتا ہے۔ اگر اور خیال نظم کرنا چاہے۔ تو ویسا سامان نہیں۔ البتہ ذی استعداد مشاق چاہیں۔ تو کر بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن کم بخت حسن و عشق کے مضمون، اس کے خط و خال اور بہار و گلزار کے الفاظ ان کی زبان و دہان میں رچے ہوئے ہیں۔ اگر کچھ کہنا چاہیں تو اول اسے بھلائیں۔ پھر اس کے مناسب مقام ویسے ہی نرالے استعارے، نئی تشبیہیں انوکھی ترکیبیں اور لفظوں کی عمدہ تراشیں پیدا کریں۔ اور یہ بڑی عرق ریزی اور جاں کاہی کا

کام ہے۔ بے ہمتی جو ہماری قوم پر حاکم با اختیار بنی ہوئی ہے۔ اسے اس سے زیادہ رو کنے کا موقع کیا مل سکتا ہے!

اس اتفاقی معاملے نے اور تو جو کیا سو کیا! بڑی قباحت یہ پیدا کی کہ ارباب زمانہ نے متفق اللفظ کہہ دیا کہ اُردو نظم مضامین عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے۔ اسے ہر ایک مضمون کے ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت بالکل نہیں اور یہ ایک بڑا داغ ہے جو ہماری قومی زبان کے دامن پر لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اسے کون دھوئے اور کیوں کر دھوئے! ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے۔ جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی۔ دونوں کناروں سے پانی لائے گی اور اس داغ کو دھوئے گی۔ بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دے گی؛

# آبِ حیات کا پہلا دور

## تمہید

نظم اردو کے عالم کا پہلا نوروز ہے۔ نفسِ ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالمِ وجود میں آئی تھی۔ مگر بچوں کی نیند پڑی سوتی تھی۔ ولیؔ نے آکر ایسی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی ہے کہ اس بچے نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ لی اور اثر اس کا درجہ حرارتِ برقی کی طرح دل دل میں دوڑ گیا۔ گھر گھر شاعری کا چرچا ہے جس امیر اور جس شریف کو دیکھو، شعر کی سوچ میں غرق بیٹھا ہے ان بزرگوں کی باتیں تو ان کے شعروں سے بھی سن سکتے ہو۔ مگر حیران ہوں کہ صورت کیوں کر دکھاؤں اوّل تو حرفوں میں تصویر کھینچنی مشکل اس پر میں زبان کا اپاہج اس رنگ کے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ جو ایسے لوگوں کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر کھینچ دکھاؤں کہ ادب کی آنکھ ان کی متانت پر نظر نہیں اٹھا سکتی اور محبت کی آنکھ ان کی پیاری حالت سے نگاہ نہیں ہٹا سکتی۔ دیکھو جلسہ مشاعرہ کا امرا و شرفا سے آراستہ ہے۔ معقول معقول بڈھے اور جوان برابر لمبے لمبے جامے، موٹی موٹی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہیں۔ کوئی کٹاری باندھے ہے۔ کوئی سیف لگائے ہے۔ بعض وہ کہن سال ہیں کہ جن کے بڑھاپے کو سفید داڑھی نے نورانی کیا ہے بعض ایسے ہیں کہ عالمِ جوانی میں اتفاقاً داڑھی کو رخصت کیا تھا۔ اب کیوں کر رکھیں کہ وضع داری کا قانون ٹوٹتا ہے، اس پر خوش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بڑھاپے کی زندہ دلی سے آج نوجوانوں کی جوانی پانی پانی ہوتی ہے۔ ان شوخیوں سے انہیں کچھ اور مطلب نہیں ہے مگر یہ کہ اپنے اوپر آپ ہنسیں، اور اوروں کو خوش کریں۔

اس دور میں ولیؔ تو مجلس کی شمع ہیں اور اہلِ مجلس دلی اور دکن کے شریف و نجیب فصیح زبان ہیں کہ جو کچھ دیکھتے ہیں۔ اسی روشنی سے دیکھتے ہیں، ان کی زبان ایک ہی سمجھنی چاہیئے۔ مگر ولیؔ نے اپنے کلام میں ایہام اور الفاظِ ذومعنین سے اتنا کام نہیں لیا۔ خدا جانے ان کے قریب العہد بزرگوں کو پھر اس قدر شوق اس کا کیوں کر ہو

گیا ؛ شاید دو بروں کا انداز جو ہندوستان کی زبان کا سبزۂ خود رَو تھا۔ اس نے اپنا رنگ دیا۔ اگرچہ دلی کے بعد دلّی میں سینکڑوں صاحب طبع دیوان بنانے پہ کمر بستہ ہو گئے، مگر میں اس مشاعرے میں چند ایسے بزرگوں کو لاتا ہوں، جن کے ناموں پر اس وقت کے معرکوں میں استادی کا چترِ شاہی سایہ کئے تھا۔ اور غالباً اس زبان کا نمونہ شعر کا انداز دکھانے کو اس قدر ہو گا۔ ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں۔ جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے دل میں جو خیالات گذرتے ہیں، وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ ایچ پیچ کے خیال، دور دور کی تشبیہیں۔ نازک استعارے نہیں بولتے۔ اسی واسطے اشعار بھی صاف اور بے تکلف ہیں اور یہ دلیل ہے، اس بات کی کہ ہر ایک زبان اور اس کی شاعری جب تک عالمِ طفولیت میں ہوتی ہے تب تک بے تکلف، عام فہم اور اکثر حسب حال ہوتی ہے، اسی واسطے لطف انگیز ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے محاوراتِ قدیمی اور مضمون بھی اکثر سبک اور مبتذل ہوں گے۔ مگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی ایسی دل کو بھلی لگتی ہے۔ جیسے ایک حسنِ خداداد ہو کہ اس کی قدرتی خوبی ہزاروں بناؤ سنگار کا کام کر رہی ہے۔ میں خود نہیں کہتا، فلاسفہ سلف کا قول سنتا ہوں کہ ہر شے اپنی مختلف کیفیتوں میں خوبصورتی اور بدصورتی کا ایک عالم رکھتی ہے بس انسان وہی ہے کہ جس پیرایے میں خوبصورتی جوبن دکھائے یہ اس سے کیفیت اٹھائے نہ کہ فقط حسینوں کے زلف و رخسار میں پریشان رہے۔ خوش نظر اسے نہیں کہتے کہ فقط گل و گلزار ہی پہ دیوانہ پھرے نہیں، ایک گھاس کی پتی بلکہ سڈول کانٹا خوشنما ہو تو اس کی نوک جھوک پر بھی پھول ہی کی طرح لوٹ جائے :

# شمس ولی اللہ

---

یہ نظم اردو کی نسل کا آدم جب ملکِ عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیّت کا تاج رکھا گیا۔ جس میں وقت کے محاورے نے اپنے جواہرات خرچ کئے اور مضامین کی رائج الوقت دست کاری سے مینا کاری کی۔ جب کشورِ وجود میں پہنچا تو دیوانِ

مشاعرہ کے صدر میں اس کا تخت سجایا گیا۔ شہرتِ عام نے جو اس کے بقائے نام کا ایوان بنایا ہے۔ اس کی بلندی اور مضبوطی کو ذرا دیکھو، اور جو کتابے لکھے ہیں انہیں پڑھو۔ دنیا تین سو برس دور نکل آئی ہے۔ مگر وہ آج تک سامنے نظر آتے ہیں۔ اور صاف پڑھے جاتے ہیں۔ اس زمانے تک اردو میں متفرق شعر ہوتے تھے۔ ولی اللہ کی برکت نے اسے وہ زور بخشا کہ آج کی شاعری نظم فارسی سے ایک قدم پیچھے نہیں تمام بحریں فارسی کی اردو میں لائے۔ شعر کو غزل اور غزل کو قافیہ ردیف سے سجایا ردیف وار دیوان بنایا۔ ساتھ اس کے رباعی، قطعہ، مخمس اور مثنوی کا راستہ بھی نکالا۔ انہیں ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر کو اور فارسی میں رودکی کو اور عربی میں مہلہل کو۔ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے اور یہ ثبوت ہے۔ فصیح عرب کے قول کا کہ الشعراء تلامیذ الرحمٰن۔ اسی کو دانائے فرنگ کہتا ہے کہ شاعر اپنی شاعری ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں کہ ہماری زبان زور بیان میں ایک طفل نورفتار تھی جو انگلی کے سہارے بغیر چل نہ سکے پس چلتے قدم کہ آگے بڑھی انہی کی پرورش کے سہارے سے بڑھی اردو زبان اس وقت سوا ہندی دہروں اور بھاشا کے مضامین کے اور کسی قابل نہ تھی۔ انہوں نے اس میں فارسی ترکیبیں اور فارسی مضامین کو بھی داخل کیا۔ ولی احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے اور شاہ وجیہ الدین کے مشہور خاندان میں سے تھے۔ ان کی علمی تحصیل کا حال ہماری لاعلمی کے اندھیرے میں ہے۔ کیوں کہ اس عہد کی خاندانی تعلیم اور بزرگوں کی صحبتوں میں ایک تاثیر تھی کہ تھوڑی سی نوشت و خواند کی لیاقت بھی استعداد کا پردہ نہ کھلنے دیتی تھی۔ چنانچہ ان کے اشعار سے معلوم ہو گا کہ وہ قواعد عروض کی طرح زبان فارسی سے ناواقف تھے۔ پھر بھی کلام کہتا ہے کہ فارسیت کی استعداد درست تھی۔ ان کی انشاپردازی اور شاعری کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہو گی کہ ایک زبان کو دوسری زبان سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا ہے کہ آج تک زمانے نے کچھ پلٹے کھائے ہیں۔ مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی۔ علم میں درجہ فضیلت نہ رکھتے تھے مگر کہتے ہیں ؎

اک دل نہیں آرزو سے خالی
ہر جا ہے محال اگر خلا ہے

یہ سیر کتاب کا شوق اور علماء کی صحبت کی برکت ہے۔ ولی کی طبیعت میں

بلند پروازی بھی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اگرچہ سودا کی طرح کسی سے دست و گریباں نہیں ہوئے۔ مگر اپنے ہمعصروں پر چوٹیں کی ہیں۔ [illegible] رلی سرہندی کے معاملے سے ظاہر ہے۔

اگرچہ ایشیا کے شاعروں کا پہلا عنصر مضمون عاشقانہ ہے، مگر جس شوخی سے اخلاق کی شوخی ظاہر ہو، اس کا ثبوت ان کے کلام سے نہیں ہوتا بلکہ برخلاف اس کے صلاحیت اور متانت ان کا جوہر طبعی تھا۔ اُن کے پاس سیاحی اور تجربے کا توشہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس عہد میں تھوڑا سفر بھی بڑی سیاحی کی قیمت رکھتا تھا۔ اس میں یہ اپنے وطن سے ابوالمعالی کے ساتھ دِلی میں آئے۔ یہاں شاہ سعداللہ گلشن کے مرید ہوئے۔ شاید ان سے شعر میں اصلاح لی ہو مگر دیوان کی ترتیب فارسی کے طور پر یقیناً ان کے اشارے سے کی۔ ان کا دیوان اس عہد کے شاعروں کی بولتی تصویر ہے، کیونکہ اگر آج دریافت کرنا چاہیں کہ اس وقت کے امراء و شرفاء کی کیا زبان تھی؟ تو اس کیفیت کو سوا دیوان ولی کے اور کوئی نہیں بتا سکتا۔ انہی کے دیوان سے ہم اس وقت اور آج کی زبان کے فرق بخوبی نکال سکتے ہیں۔

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| سوں اور سیں ، سیتی | بجائے | سے | بہتر | بجائے | اندر |
| کوں بہ واو معروف | ″ | کو | مجھ کو | ″ | میرا |
| ہمن کوں | ″ | ہم کو | موہن، سریجن، پیا، پیتم | ″ | معشوق |
| جگ منے | ″ | دنیا میں | انجھواں | بجائے | آنسو کی جمع |
| پر منے بجائے پر میں فارسی کا ترجمہ ہے بیراہنے زیر | | | بھواں پلکاں | ″ | بھویں پلکیں |
| تجھ لب کی صفت بجائے تیرے لب کی صفت | | | نین | ″ | آنکھ |
| نمن | یعنی | طرح یا مثل | دھن | ″ | دہن |
| جگ | ″ | جہان، دنیا | مرا | ″ | میرا |
| بچن | ″ | کلام | یوہ | ″ | یہ |
| نت | ″ | ہمیشہ | | | |
| مکھ | ″ | منہ | بعض قافیے مثلاً | | |
| تسبی | بجائے | تسبیح | گھوڑا ، موڑا ، گورا | | |
| سہی | ″ | صحیح | دھڑ ، سر | | |

| | | | |
|---|---|---|---|
| بگانہ | بجائے | بیگانہ | گھوڑی، گوری |
| مُرض | " | مَرض | اکثر غزلیں بے ردیف ہیں۔ |

چونکہ نظم فارسی کی روح اسی وقت اردو کے قالب میں آئی تھی۔ اسی واسطے ہندی لفظوں کے ساتھ فارسی کی ترکیبیں اور "بر" اور "در" بلکہ بعض جگہ افعالِ فارسی بھی مُنہ میں کھٹکتے ہیں۔ وہ خود دکنی تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں بعض بعض الفاظ دکنی بھی ہوتے ہیں۔

آج اس وقت کی زبان کو سن کر ہمارے اکثر ہمعصر ہنستے ہیں۔ لیکن یہ ہنسی کا موقع نہیں، حوادث گاہِ عالم میں ایسا ہی ہوا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا آج تم ان کی زبان پر ہنستے ہو، کل ایسے لوگ آئیں گے کہ وہ تمہاری زبان پر ہنسیں گے۔ اس انجمن غفلت کے ممبر اگر تھوڑی دیر کے لئے عقلِ دوربین کو صدرِ انجمن کر لیں تو یہ اس تدبیر کے سوچنے کا موقع ہے کہ آج ہم کیوں کر اپنے کلام کو ایسا کریں، جس سے ہماری زبان کچھ مُدّت تک زیادہ مطبوعِ خلائق رہے۔ اگرچہ سامنے ہمارے اندھیرا ہے، لیکن پیچھے پھر کر دیکھنا چاہیئے۔ اور خیال کرنا چاہیئے کہ زبان نے جو ترقی کی ہے۔ تو کن اصول پر اور کس جانب میں قدم رکھتی گئی ہے۔ اُدھر ہم بھی آج کے کاروبار اور اس کے آئندہ حالات کو خیال کریں اور اسی انداز پہ قدم ڈالیں، شاید ہمارے کلام کی عمر میں کچھ برس زیادہ ہو جائیں۔

شاعرِ قدرت کے دیوان میں ایک سے ایک مضمون نیا ہے۔ مگر یہ لطیفہ بھی کچھ کم نہیں کہ شاعری کا چراغ تو دکن میں روشن ہوا اور ستارے اس دلّی کے اُفق سے طلُوع ہوا کریں۔ اس عہد کی حالت اور بھاشا زبان کو خیال کرتا ہوں تو سوچتا رہ جاتا ہوں کہ یہ صاحبِ کمال زبان اردو اور انشائے ہندی میں کیوں کر ایک نئی صنعت کا نمونہ دے گیا اور اپنے پیچھے آنے والوں کے واسطے ایک نئی سڑک کی داغ بیل ڈالتا گیا۔ کیا اسے معلوم تھا۔ کہ اس طرح یہ سڑک ہموار ہو گی۔ اس پہ دکانیں تعمیر ہوں گی، لالٹینوں کی روشنی ہو گی، اہل سلیقہ دکان دار جواہر فروشی کریں گے۔ اور اردوئے معلّیٰ اس کا خطاب ہو گا۔ افسوس یہ ہے کہ ہماری زبان کے مؤرّخ اور ہمارے شعراء کے تذکرہ نویسوں نے اس کے دلی اور خدا رسیدہ ثابت کرنے میں تو بڑی عرق ریزی کی، لیکن ایسے حال نہ لکھے۔ جن سے اس کے ذاتی خصائل و حالات مثلاً دنیاداری یا گوشہ گیری، اقامت یا سیاحی، راہ علم و عمل کی نشیب و فراز منزلیں یا اس کی صحبتوں کی مزے مزے کی

کیفیتیں معلوم ہوں، بلکہ برخلاف اس کے سنہ ولادت اور سال فوت تک بھی نہ بتایا اتنا ثابت ہے کہ ان کا ابتدائے عہد شاید عالمگیر کا آخر زمانہ ہوگا۔ اور وہ مع اپنے دیوان کے سنہ محمد شاہی میں دلی پہنچے۔

قاعدہ ہے کہ جب دولت کی بہتات اور عیش و نشاط میں کچھ نیکی پر خیالات آتے ہیں۔ تو صوفیانہ لباس میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت محمد شاہی دور نے در و دیوار کو دولت سے مست کر رکھا تھا۔ جس سے کہ تصوف کے خیالات عام ہو رہے تھے۔ دوسرے ولی خود فقر کے خاندان عالی سے تھے اور فقیر ہی کے دیکھنے والے بھی تھے۔ تیسرے زبان اردو کے والدین یعنی بھاشا اور فارسی بھی صوفی ہیں ان جذبوں نے انہیں تصوف شاعرانہ میں ڈالا اور دل کی امنگ نے پیش قدمی کا تمغہ حاصل کرنے کو اس کام پر آمادہ کیا کہ جو سلف سے اس وقت تک کسی کو نہ سوجھا تھا۔ وہ یہی کہ فارسی کے قدم بقدم چلیں اور پورا دیوان مرتب کریں۔ چنانچہ ان کے پیر کا اشارہ اس کی تائید کرتا ہے۔

غرض جب ان کا دیوان دلی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت نے زبان سے پڑھا۔ گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انہیں کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے، انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا اگرچہ اس اعتبار سے یہ نہایت خوشی کا موقع ہے کہ عمدہ جوہر انسانیت پسندیدہ لباس پہن کر ہماری زبان میں آیا۔ مگر اس کوتاہی کا افسوس ہے کہ کوئی تلکی فائدہ اس سے نہ ہوا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ کسی علمی یا آئینی رستے سے . . . . . . . . . . . نہیں آیا، بلکہ فقیر از شوق یا تفریح کی ہوا سے اڑ کر آگیا تھا۔ کاش شاہنامہ کے ڈھنگ سے آتا۔ کہ محمد شاہی عیاشی اور عیش پرستی کا خون بہاتا اور اہل ملک کو پھر تیموری اور بابری میدانوں میں لاڈالتا یا تہذیب و شائستگی سے اکبری عہد کو پھر زندہ کر دیتا۔

باوجودیکہ اس کی زبان آج کل بالکل متروک ہے، مگر دیوان اب تک ہر جگہ ملتا اور بکتا ہے، یہاں تک کہ پیرس اور لندن میں چھپ گیا ہے۔ اس میں علاوہ ردیف وار غزلوں کے رباعیاں، قطعے، دو تین مخمس، قصیدے، ایک مثنوی مختصر معرکہ کربلا کے حال میں، ایک شہر سورت کے ذکر میں ہے۔ واسوخت اس وقت

بس نہ تھا۔ اس ایجاد کا فخر میر صاحب کے لیے چھوڑ گئے۔ بادشاہ یا کسی امیر کی تعریف بھی نہیں۔ شاید خواجہ میر درد کی طرح تعریف کرنی عیب سمجھتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی خواجہ حافظ کی طرح بادشاہ وقت کے نام سے اپنے شعر کو شان و شکوہ دیتے تھے۔

چنانچہ ولی کی تصنیفات میں سے ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

رسالہ نور المعروف تصوّف میں لکھا ہے اس میں کہتے ہیں کہ میں محمد نور الدین صدیقی سہروردی کے مریدوں کا خاک پا ہوں اور شاہ سعد اللہ گلشن کا شاگرد، مگر یہ نہیں لکھا کہ کس امر میں۔ لطیفہ ولی نے اپنے جوش ریختہ گوئی میں ناصر علی سرہندی کو کہ علی تخلص کرتے تھے، یہ شعر لکھا۔ ؎

اچھل کر جا پڑے جوں مصرعۂ برق
اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں

ناصر علی نے جواب میں لکھا۔

با عجاز سخن گر اوڑ چلے وہ
ولی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں

اب ان کے کلام سے اس وقت کی زبان کا نمونہ دکھانا ضرور ہے، لیکن ہمارے تذکرہ نویسوں کا دستور رہے کہ جب شاعر کا حال لکھتے ہیں تو اس کے اشعار انتخاب کر کے لکھتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ فیضان سخن رائیگاں نہیں جاتا۔

نظیر کے بعض شعر ایسے ہیں کہ میر سے پہلو مارتے ہیں۔ پس اگر نظیر کا ذکر لکھ کر اس کے چند شعر منتخب لکھ دیئے تو نا واقف سوائے اس کے کہ نظیر کو میر کا ہم پلّہ شاعر سمجھے اور کیا تصوّر کر سکتا ہے۔ بڑی قباحت اس میں ہے کہ شاعر مذکور ہیں اور ہم میں سالہا سال کے عرصے حائل ہیں۔ پس ان شعروں سے ان کی اصلی قابلیت اور طبیعت کی کیفیت کھلنی مشکل ہو جاتی ہے۔ میں ان کے دیوان سے نیک نیتی کے ساتھ چند غزلیں پوری کی پوری لکھ دوں گا۔ تاکہ اصلیت حال ظاہر ہو جائے۔ ہاں اگر کسی کی پوری غزل ہاتھ نہ آئیں۔ تو پھر مجبوری ہے۔

| | |
|---|---|
| تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا | جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہوں گا |
| دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی | یہ کشور ایراں میں سلیماں سے کہوں گا |
| زخمی کیا ہے مجھ تری پلکوں کی انی نے | یہ زخم ترا خنجر و بھالاں سے کہوں گا |

بے صبر نہ ہو اے ولی اس درد سے ہر گاہ
جلدی سے ترے درد کی درماں سے کہوں گا

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا ۔۔۔ ہے مطالع مطلعِ انوار کا!
یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا ۔۔۔ ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا!
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں ۔۔۔ تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
عاقبت ہووےگا کیا معلوم نئیں ۔۔۔ دل ہوا ہے مبتلا دیدار کا
بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں ۔۔۔ کام تھا تجھ چہرۂ گلنار کا
کیا کہے تعریف دل ہے بےنظیر ۔۔۔ حرف حرف اس مخزنِ اسرار کا
گر ہوا ہے طالبِ آزادگی ۔۔۔ بندہ مت ہو سبحہ و زنار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی ۔۔۔ دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اے ولی ہونا سریجن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر ۔۔۔ جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر
ہے جدائی میں زندگی مشکل ۔۔۔ آ جدائی نہ کر خدا سوں ڈر
اس سوں جو آشنائی ڈر کر ہے ۔۔۔ آشنائی نہ کر خدا سوں ڈر
آرسی دیکھ کر نہ ہو مغرور ۔۔۔ خود نمائی نہ کر خدا سوں ڈر

اے ولی غیر آستانۂ یار
جبہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

جب صنم کو خیالِ باغ ہوا ۔۔۔ طالبِ نشۂ فراغ ہوا،
فوجِ عشاق دیکھ ہر جانب ۔۔۔ نازنیں صاحبِ دماغ ہوا
مان سیں تجھ لباں کے سرخ ہوا ۔۔۔ جگرِ لالہ داغ داغ ہوا
دلِ عشاق کیوں نہ ہو روشن ۔۔۔ جب خیالِ صنم چراغ ہوا

اے ولی گلبدن کو باغ میں دیکھ
دلِ صدبرگ باغ باغ ہوا

جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہوگا ۔۔۔ ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہوگا
مت جا چمن سوں لالہ بلبل پہ مت ستم کر ۔۔۔ گرمی سوں تجھ نگہ کی گل گل گلاب ہوگا
مت آئینے کو دکھلا اپنا جمال روشن ۔۔۔ تجھ مکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہوگا

نکلا ہے وہ ستمگر تیغ ادا کوں لے کر — سینے پہ عاشقاں کے اب نیم آب ہوگا
رکھتا ہے کیوں جفا کو مجھ پر روا اے ظالم — محشر میں تجھ سیں آخر میرا حساب ہوگا
مجھ کو ہوا ہے معلوم اے مست جام خونیں — تجھ انکھڑیاں کے دیکھے عالم خراب ہوگا۔
ہاتف نے یوں دیا ہے مجھ کو ولی بشارت
اس کی گلی میں جا تو مقصد شتاب ہوگا۔

تخت جس بے خانماں کا دشت ویرانی ہوا — سر او پر اس کے بگولا تاج سلطانی ہوا
تجھ حسنِ عالمتاب کا جو عاشق و شیدا ہوا — ہر خوبرو کے حسن کے جلوہ سوں بے پروا ہوا
سیتے ہیں اب محشر تلک کوئیں کو لب اے وہ — تجھ نین کے جو جام سوں مے پی کے متوالا ہوا
پایا ہے جگ میں اے ولی وہ لیلی مقصود کوں
جو عشق کے بازار میں مجنوں نمن رسوا ہوا

لیا ہے جب سوں موہن نے طریقہ خود نمائی کا — چڑھا ہے آرسی تر پہ رنگ حیرت فزائی کا
کیوں کرے آلودہ زر جگ متے صید مراد — ہے علم او پر معطل صورت شیر طلا
بلہوس رکھتے ہیں دائم فکر رنگ عاشقاں — ہے مفلس کی صدا سینے ہیں تدبیر طلا
بو کنارے مکھ پر ترے اے زلیخا وش نہیں — سورہ یوسف کو لکھا گرد تحریر طلا
ہوا ہے سیر کا مشتاق بیتابی سوں من میرا — چمن موں آج آیا ہے مگر گل پیرہن میرا
خمارِ ہجر نے جس کے دیا ہے دردِ دل مجھ کوں — رکھوں نشہ نمن انکھیاں میں گر وہ مست نا آوے
عجب نیں گر گلاں دوڑیں بکڑ کر صورتِ قمری — ادا سوں جب چمن بھیتر وہ سرو سرفراز آوے
تا حشر رہے بوے گلاب اُسکے عرق سے — جس بر منے یکبار وہ گل پیرہن آوے
سایہ ہو میرا سبز برنگ پرِ طوطی — گر خواب میں وہ خوش خطِ شیریں بچن آوے
کھینچیں آپس انکھیاں منے جوں کحلِ جواہر — عشاق کے گر ہات وہ خاکِ چرن آوے
ہرگز سخن سخت کو لاوے نہ زباں پر — جس ذہن میں یک بار وہ نازک بدن آوے
یہ تِل تجھ مکھ کے کعبے میں مجھے اسود حجر دستا
زنخداں میں ترے مجھ چاہ زمزم کا اثر دستا

# شاہ مبارک آبرو

آبرو تخلص مشہور شاہ مبارک، اصلی نام نجم الدین تھا۔ شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے۔ باوجودیکہ بڑے شاعر اور پرانے مشتاق تھے۔ مگر خان آرزو کو اپنا کلام دکھا لیتے تھے۔ دیکھو اس زمانے میں لوگ کیسے منصف اور طالب کمال تھے۔ یہ اپنے زمانے میں مسلم الثبوت شاعر زبان ریختہ کے اور صاحب ایجاد نظم اردو کے شمار ہوتے تھے، وہ ایسا زمانہ تھا کہ اخلاص کو دسواس اور ادھر کو سر کا قافیہ باندھ دیتے تھے، اور عیب نہ سمجھتے تھے، ردیف کی کچھ ضرورت نہ تھی، البتہ کلام کی بنیاد ایہام اور ذومعنیین لفظوں پر ہوتی تھی، اور محاورے کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، وہ ایک آنکھ سے معذور تھے، ان کی اور مرزا جان جاناں مظہر کی خوب خوب چشمکیں ہوتی تھیں، بلکہ ان کی آنکھ کا بھی اشارہ ہو جاتا تھا، چنانچہ مرزا صاحب نے کہا ؎

آبرو کی آنکھ میں اک گانٹھ ہے
آبرو سب شاعروں کی . . . ہے

شاہ آبرو نے کہا ؎

کیا کروں حق کے گیے کو، کور میری چشم ہے
آبرو جگ میں رہے تو جانِ جاناں لشم ہے

شاہ کمال بخاری اس زمانے میں ایک بزرگ شخص تھے، ان کے بیٹے میر مکھن تھے اور پاکباز تخلص کرتے تھے، شاہ مبارک کو ان سے محبت تھی، چنانچہ اکثر شعروں میں ان کا نام یا کچھ اشارہ کرتے تھے۔

دیکھنا کیا مزے کا بحث کہا ہے ع

عالم ہمہ دوغ است و محمد مکھن

ان کی علمی استعداد کا حال معلوم نہیں۔ کلام سے ایسا تراوش ہوتا ہے کہ صرف و نحو عربی کو جانتے تھے اور مسائل علمی سے بے خبر نہ تھے۔

ان کے شعر جب کہ میر مکھن پاکباز کے کلام سے چھپڑے نہ جائیں، تب تک مزہ نہ دیں گے۔ اس لیے پہلے ایک شعر ان کا ہی لکھتا ہوں۔ اس زمانے کے خیالات پر

خیال کرو سے

مجھے درد و الم گھیرے ہے نت میرے میاں صاحب
خبر لیتے نہیں کیسے ہو تم؟ میرے میاں صاحب

آیا ہے صبح نیند سے اُٹھ رسمسا ہوا
جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگ زرد
سونا وہ ہے کہ ہووے کسوٹی کسا ہوا

انداز سیں زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں
جو خال اپنے حد سے بڑھا سو مسا ہوا

قامت کا سبھ جگت منیں بالا ہوا ہے نام
قد اس قدر بلند تمہارا رسا ہوا

دل یوں ڈرے ہے زلف کا مارا بھونک سیں
رسی سیں اژدہا کا ڈرے جوں ڈسا ہوا

اے آبرو اوّل تو سمجھ پیچ عشق کا
پھر زلف سے نکل نہ سکے دل پھنسا ہوا

پلنگ کوں چھوڑ خالی گود سیں اُٹھ گئے سجن میتا
چتر کاری لگے کھانے ہمن کو گھر ہوا چیتا

لگائی بینوا کی طرح سیں جب وہ چھڑی تم نے
تسج اوروں کو لیا ہے ہاتھ اپنے ایک تو تھیا

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیئے
کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گزری سو جگ بیتا

لگا دل یار سے تب اس کو کیا کام آبرو ہم سیں
کہ زخمی عشق کا پھر مانگ کر پانی نہیں پیتا

نین سے نین جب ملاتے گیا
دل کے اندر مرے سماتے گیا

نگہ گرم سیں مرے دل میں
خوش نین آگ سی لگائے گیا

تیرے چلنے کی سن خبر عاشق
یہی کہتا ہوا کہ ہلائے گیا

سہو کر بولتا تھا مجھ سیتی
بوجھ کر بات کو چھپائے گیا

آبرو ہجر بیچ مرتا تھا
مکھ دکھا کے اسے جلائے گیا

یہ رسم ظالمی کی دستور ہے کہاں کا
دل چھین کر ہمارا دشمن ہوا ہے جاں کا

ہر یک نگہ میں ہم سے کرنے لگے ہو نوکیں
کچھ یوہ تری آنکھوں نے پکڑا ہے طور بانکا

تجھ راہ میں ہوا ہے اب تو رقیب کتا
لو پائے کہ ہماری آ باندھتا ہے ناں کا

خندوں کے طور گویا دیوار قہقہا ہے
پھر کر پھرے نہ لڑکا جو اسطرف کو جھانکا

رستم وہل کے دل میں ڈالے انجھو سو پانی
دیکھے اگر ہجواں کی تلوار کا جھماکا

فاسق کے دل پہ ڈالی جب نفس نے برکی رجوا ڑے کی گلی کا تب جا غبار چھالکا

سب عاشقوں میں ہم کوں مژدہ ہے آبرو کا

ہے قصد گر تمہارے دل بیچ امتحاں کا

مت قہر سیتی ہاتھ میں لے دل ہمارے کوں جلتا ہے کیوں پکڑتا ہے ظالم انگارے کوں

ٹک باغ میں شتاب چلو اے بہارِ حسن گل چشم ہو رہا ہے تمہارے نظارے کوں

مرتا ہوں ٹک دہی ہے رمق آ در س دکھا جا کر کہو ہماری طرف سے پیارے کوں

میں آ پڑا ہوں عشق کے ظالم بھنور کے بیچ تختہ ادپر چلا دتے ہیں جی کے آرے کوں

اپنا جمال آبرو کوں ٹک دکھاؤ آج

مدت سے آرزو ہے درس کی بچار کوں

رستم اس مرد کی کھاتے ہیں قسم زوروں کی تاب لاوے جو کوئی عشق کے جھک جھوروں کی

قدرداں حسن کے کہتے ہیں اسے دل مردہ سانورے چھوڑ کے جو چاہ کرے گوروں کی

گانٹھ کاٹی ہے مرے دل کی تری انکھیاں نے وہ پلک نئیں یہ کترنی ہے بگھر چوروں کی

لب شیریں پہ سرِ جب کے نہیں خط سیاہ ڈار چھوٹی ہے مٹھائی پہ شکر خوروں کی

جھلکیں سورج نیں جوں خط شعاع کے شعلے دیکھ انکھ منیں یہ لال جھمک ڈوروں کی

قادری جبکہ سجی بر میں سجن بوٹہ دار عقل چکر میں گئی دیکھ کے چھب موروں کی

آبرو کوں نہیں کم ظرف کی صحبت کا دماغ

کس کو برداشت ہے ہر وقت کے ہکتوریں کی

افسوس ہے کہ ہم کوں وہ یار بھول جاوے وہ شوق وہ محبت وہ پیار بھول جاوے

رستم تری انکھوں کے ہووے اگر مقابل انکھیوں کو دیکھ تری تلوار بھول جاوے

عارض کے آئینے پر تمنا کے سبز خط ہے طوطی اگر جو دیکھے گلزار بھول جاوے

کیا شیخ دکیا برہمن جب عاشقی میں آویں تسبی کرے فراموش زنار بھول جاوے

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتاں

جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

پانی پت آج چھوڑ جو گنور تم چلے تو راہ بیچ جائیو جاناں سنبھال کے

کنجی اس کی زباں شیریں ہے دل مرا قفل ہے بتاشے کا

کیوں چھپا ظلمت میں اگر اس لب سے شرمندہ نہ تھا

جان کچھ پانی مرے ہے چشمۂ حیواں کے بیچ

اب دیکھو ہوا زمانہ سازی  آفاق تمام دہر یلہ ہے

تم نے بجاونے کو جب ہاتھ بیچ نے لی  مجنوں ہو گئے سب ہو اس طرح کی لے لی

سجا ہے نرگسی بوٹے کا جامہ  کرے کیونکر نہ مجھ سے چشم پوشی

ابرو کے قتل کو حاضر ہوئے کس کے کمر  خون کرنے کو چلے عاشق کو تہمت باندھ کر

دو بھواں سے لگے ہیں جیکے نین  وہ کہاتا ہے حاجی الحرمین

عزت ہے جوہری کی جو قیمتی ہو جوہر  ہے آبرو ہمن کو جگ میں سخن ہمارا

جہاں اس خو کی گرمی تھی نہ تھی واں آگ کو عزت
مقابل اس کے ہو جاتی تو آتش لکڑیاں کھاتی

اسی انداز میں حافظ عبدالرحمان خاں احسان نے بھی ایک شعر کہا ہے، اور کیا خوب کہا ہے

دخترِ رز سے کہا میخانے میں شرابیوں نے  آج تو خوب ہی کھٹکے تری سوکن کو لگے

یعنی بھنگ خانے میں بھنگڑوں نے خوب سبزیاں گھونٹیں، اور طرے اڑائے تم بھی یاروں پر نظر عنایت کرو۔

مبارک نام تیرے آبرو کا کیوں نہ ہو جگ میں  اثر ہے وہ ترے دیدار کی فرخندہ فالی کا

نالہ ہمارے دل کا غم کا گواہ بس ہے
اپنے تئیں شہادتِ انگشت آہ بس ہے

تمہارے لوگ کہتے ہیں کمر ہے  کہاں ہے؟ کس طرح کی ہے؟ کدھر ہے

تخلص آبرو برجا ہے میرا  ہمیشہ اشکِ غم سے چشم تر ہے

اس ناتواں کی حالت واں جا کہے ہے اڑ کر  میرا یہ رنگ رو ہے گویا لکھی کبوتر

مکھن میاں خفا ہیں فقیروں کے حال پر  آتا ہے ان کو جوش جمالی کمال پر

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے
وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

خدمت گار خان۔ بادشاہی خواجہ سرا تھا اور سرکار شاہی میں بڑا صاحب اختیار تھا۔ اکثر بادشاہی نوکر اس کی سخت گیری اور بدمزاجی سے دق رہتے تھے، انہیں بھی اس سے کام پڑتا تھا۔ کبھی آسانی سے مطلب نکل آتا تھا، کبھی دشواری سے چنانچہ ایک موقعہ پر یہ شعر کہا ہے

یارو خدمت گار خاں خوجوں کے بیچ
ہے تو مستثنیٰ، ولیکن منقطع

# شیخ شرف الدین مضمون

مضمون تخلص، شیخ شرف الدین نام، شیخ فریدالدین شکر گنج کی اولاد میں تھے، جاجمو علاقہ اکبر آباد وطن اصلی تھا، دلی میں آ رہے تھے۔ اصلی پیشہ سپاہ گری تھا، تباہی سلطنت سے ہتھیار کھول کر مضمون باندھنے پر قناعت کی اور زینت المساجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے۔ اس عالم میں بھی ایک خوش مزاج با اخلاق یار باش آدمی تھے۔ دورِ اول کے استادوں میں شمار ہوتے تھے اور انہی کا انداز تھا کیونکہ رواج بھی تھا اور خاص و عام اسی کو پسند کرتے تھے۔

اس زمانے کے لوگ کس قدر منصف اور بے تکلف تھے، باوجودیکہ مضمون سن رسیدہ تھے اور خان آرزو سے عمر میں بڑے تھے، مگر انہیں غزل دکھاتے اور اصلاح لیتے تھے نزلے سے دانت ٹوٹ گئے تھے اس لیے خان موصوف انہیں شاعرِ بیدانہ کہتے تھے۔

مرزا رفیع نے بھی ان کا عہد پایا تھا۔ چنانچہ جب انتقال ہوا تو مرزا نے غزل کہی، جس کا مطلع و مقطع بھی لکھتا ہوں۔

لیے مے اُٹھ گیا ساقی، مرا بھی پُر ہو پیمانہ ۔۔۔ الٰہی کس طرح دیکھوں میں ان آنکھوں سے میخانہ

بنائیں اٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی ۔۔۔ گیا مضمون دنیا سے، رہا سودا، سو مستانہ

اور اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس صاحب کمال نے زمانے کے دل میں کیا اثر پیدا کیا تھا

ہائے دلّی خدا تجھے بہشت نصیب کرے، کیسے کیسے لوگ تیری خاک سے اٹھے اور خاک میں مل گئے۔ استاد مرحوم نے ایک دن فرمایا۔ کہ شیخ مضمون کے زمانے میں کوئی امیر باہر سے محل میں آئے اور پلنگ پر لیٹ گئے۔

ایک بڑھیا ماما نئی نوکر ہوئی تھی۔ وہ حقہ بھر لائی اور سامنے رکھا، نواب صاحب کی زبان پر اس وقت مضمون کا یہ شعر تھا۔

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا

صبر ایوبؑ کیا، گریۂ یعقوبؑ کیا

ماما سن کر بولی: الٰہی تیری امان، اس گھر میں تو آپ ہی پیغمبری وقت پڑ رہا ہے، بے چارے نوکروں پر کیا گزرے گی، چلو بابا یہاں سے،

تعجب یہ ہے کہ اس مضمون کو مخلص کاشی نے بھی باندھا ہے۔ ؎

درفراقِ تو چہ اے بت محبوب کنم
صبرِ ایوبؑ کنم، گریۂ یعقوبؑ کنم

کرے ہے دار کو کامل بھی سرتاج
ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج

خط آگیا ہے اس کے، مری ہے سفید ریش
کرتا ہے اب تلک بھی وہ ملنے میں شام بیچ

کریں کیوں نہ شکرؔ لبوں کو مرید
کہ دادا ہمارا ہے بابا فریدؒ

ہنسی تیری پیارے پھلجھڑی ہے
یہی غنچے کے دل میں گھبڑی ہے

مے کدے میں گر سراپا فعل نامعقول ہے
مدرسہ دیکھا تو واں بھی فاعل و مفعول ہے

تیر مژگاں برستے ہیں مجھ پر!!
اب پیکاں کا اس طرف ہے ڈھال

# محمد شاکر ناجیؔ

ناجیؔ تخلص، سید محمد شاکر نام، شرافت اور سعادت کے ساتھ کمال شاعری سے اپنے زمانے میں نامور تھے۔ اہلِ سخن نے انہیں طبقہ اوّل کے ارکان میں تسلیم کیا ہے۔ عمدۃ الملک امیر خاں، جو محمد شاہی دربار کے رکن اعظم تھے، یہ ان کے نعمت خانے کے داروغہ تھے۔ شاہ مبارک آبروؔ نے جہاں ان کے کمال کی تعریف کی ہے۔ وہاں اس امر کا بھی اشارہ کیا ہے ؎

سخن سنجاں میں ہرگیا آبروؔ آج
نہیں شیریں زباں شاکرؔ سریکا

مگر تیز مزاج اور شوخ طبع بہت تھے۔ راہ چلتے سے الجھتے تھے اور جس کے گرم ہوتے تھے، اُسے بچا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔

زلف کے حلقے میں دیکھا جب سے دانہ خال کا
مرغِ دل عاشق کا تب سے صید ہے اس جال کا

گندمی چہرے کو اپنے زلف میں پنہاں نہ کر
ہندواں سُن کر مبادا شور ڈالیں کال کا

بینواؤں سے نہ بل اے موکمر مت پیچ کھا
مونڈ سر لڑکوں کو کرتے ہیں وہ اپنا بال کا

مہر کی بے جا ہے چرخِ بے مروّت سے امید
پیر زالوں سے نہیں احسان کر اِک بال کا

ایک دم ناجیؔ کے تئیں آ کر جلا لے پیار سے
جاں بلب ہوں اے سجن یہ وقت نئیں اہمال کا

نہ تھا آزردہ دل کنعاں سے یوسفؑ
ڈرا تھا خواب میں اخواں سے یوسفؑ

نہ ہوتا راہ میں گلبانگ شہرت
جو روتا راہ میں خاراں سے یوسفؑ

کنوئیں میں جا پڑا یعقوب کا دل
چلا جب نالہ و افغاں سے یوسفؑ

لگا نے بہانے شہر کے نیل
جو رویا درد کے انجواں سے یوسفؑ

جو ناجیؔ ڈرنا ہوتا معصیت کا
نہ گردن پھیرتا فرماں سے یوسفؑ

دیکھ موہن تری کمر کی طرف
پھر گیا مانی اپنے گھر کی طرف

جن نے دیکھے ترے لبِ شیریں
نظر ان کی نہیں شکر کی طرف

ہے محال ان کا دام میں آنا
دل ہے ان سب بتاں کا زر کی طرف

تیرے رُخسار کی صفائی دیکھ
چشم دانا نہیں ہُنر کی طرف

حشر میں پاکباز ہے ناجیؔ
بدعمل جائیں گے سقر کی طرف

اے صبا کہہ بہار کی باتیں
اس بتِ گلعذار کی باتیں

کس پہ چھوڑے نگاہ کا شہباز
کیا کرے ہے شکار کی باتیں

چھوڑتے کب ہیں نقد دل کو صنم
جب یہ کرتے ہیں پیار کی باتیں

معشوق مل کر آپ سے گر دلبری کرے
گر دیو ہو تو چاہیے آدم گری کرے

شیشہ اسی کے آگے بجا ہے کہ رُخ ستی
پیالے کو جب لے ہاتھ میں رنگ پری کرے

اس قد سے جب چمن میں خراماں ہو تو لے جاں
شمشاد و سرو آکے تیری چاکری کرے

دشمن ہے دیں کا خالِ سیہ مکھ اوپر ترے
ہندو سے کیا عجب ہے اگر کافری کرے

ناجی جو کوئی صاف کرے دل کا آئینہ
وہ عاشقی کے ملک میں اسکندری کرے

کفن ہے سبز ترے گیسوؤں کے ماروں کا — مکان غم ہے ترے در کے بے قراروں کا
رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تک بھلا — چلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا
موزوں قد اس کا چشم کی میزاں میں جب تُلا — طوبیٰ تب اُس سے ایک قدم اوکسا ہوا

اگر ہو وہ بت ہندو کبھی اشنان کو ننگا
بھنور میں دیکھ کر جمنا اسے غوطے میں جا لگا

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم امید — لب صدف کے تر نہیں ہر چند گوہر میں ہے آب

بہا سستا ہو یا مہنگا نہیں موقوف غلّے پر
یہ سب خرمن اسی کے ہیں خدا ہے جس کے پلّے پر

انگوٹھی لال کی کرتی قیامت، آج گر ہوتی — جبھوں کی آن پہنچی، لڑ موئے وہ ایک چھلّے پر
رہے روشن کی جو کوئی یاد میں مشغول ہے — مہر اس کے روبرو سورج مکھی کا پھول ہے
نہ ٹوکو یار کو کہ خط رکھاتا یا منڈاتا ہے — مرے نشّے کی خاطر لطف سے سبزی بناتا ہے

جہاں دل بند ہو ناصح وہاں آوے خلل کرنے
رقیب ناولد ناجی گویا لڑکوں کا بابا ہے

نادری چڑھائی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں خود شامل تھے۔ اس وقت دربارِ دہلی کا رنگ، اشرفا کی خواری، پاجیوں کی گرم بازاری اور اس پر ہندوستانیوں کی آرام طلبی اور ناز پروری کو ایک طولانی مخمس میں دکھایا ہے۔ افسوس کہ اس وقت دو بند اس کے ہاتھ آئے ہے

ڈرے ہوئے تو برس بیس ان کو بیتے تھے
دعا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالی مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہنسلیاں بازو اوپر طلا کے نال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا — کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا — ملے تھے وھاں جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و دکاں نہ غلّہ نے بقّال

## محمد احسن احسنؔ

احسن تخلص، محمد احسن نام، یہ بھی انہی لوگوں کے ہم عصر و ہم زبان ہیں۔ چنانچہ ایک غزل اور تین شعر ان کے ہاتھ آئے وہی لکھے جاتے ہیں ؎

صبا کہیو اگر جاوے ہے تو اس شوخ دلبر سوں — کہ کر کر قول پرسوں کا گیا برسوں ہوئے برسوں
عجب نئیں ابر گر جلتوں کو تو جل سوں جلا دیگا — گیا ہے یار سیر کے برسوں کہتا ہے کہ میں برسوں
یو قاصد وعدہ کرتا ہے جو پرسوں کا کہ کل پھر آوے — کبوتر بھی نہیں آتا گلی اس کی سیتی برسوں
ترس تجھ کو نہیں اے شوق آنکھی کیا ہے ترسائی — ترے دیدار کو ہیں دیدہ ترسوں کھڑے ترسوں
ترے تل سوں مجھے نت مینہ کا سودا ہے اے ظالم — عجب نئیں ہے اگر وہ تیل ٹکساوے مرے سر سوں
زلف تیری معطر ہے عطر فتنے سیتی ظالم — الٰہی آبرو رکھیو پڑا ہے کام ابتر سوں
غزل اس طرح سے کہنی بھی احسنؔ تجھ سوں بن آوے
جواب اب آبرو کب کہہ سکے مضموں بہتر سوں

لام نستعلیق کا ہے اس بت خوشخط کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

یہی مضمونِ خط ہے احسن اللہ — کہ حسنِ خوبرویاں عارضی ہے
نازک بدن پہ اپنے کرتے ہو تو جو غرّہ — گویا کمر نے تجھ کو فرعون سا بنایا

# غلام مصطفےٰ خاں یکرنگ

یکرنگ تخلص غلام مصطفےٰ خاں نام۔ قدیم تذکروں میں انھیں طبقۂ اول کے شاعروں میں لکھا ہے مگر یہ لوگ باانصاف ہوتے تھے اور ہر کلام کے حسن و قبح کو خوب سمجھتے تھے اس لیئے باوجود کہن سالی اور کہنہ مشقی کے آخر عمر میں کلام اپنا مرزا جان جاناں مظہر کو بھی دکھاتے تھے لیکن جو کلام ان کا موجود ہے۔ بزرگوں سے سنا اور تذکروں میں بھی دیکھا بڑے مشاق تھے اور اپنے وقت میں سب انھیں خوش فکر اور باکمال مانتے تھے اور لطف یہ ہے کہ تخلص کی طرح عالم آشنائی میں یکرنگ رکھتا تھے۔

یکرنگ پاس اور سخن کچھ نہیں بساط — رکھتا ہوں میں دو نین کہو تو نذر کروں
زبان شکوہ ہے ہندی کا سرپات — کہ خوباں نے لگائے ہیں مجھے ہات
اس زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال — یکرنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں
جو کوئی توڑتا ہے غنچۂ گل — دل بلبل شکستہ کرتا ہے۔
یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت دے — مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں
پارسائی اور جوانی کیونکہ ہو — ایک جاگر آگ پانی کیونکہ ہو
نہ کہو کہ یار جاتا ہے — دل سے صبر و قرار جاتا ہے
گر خبر لینی ہو تو لے صیاد — ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

مرزا جان جاناں کی استادی اور اپنی شاگردی کا اشارہ ہے:

جس کے درد دل میں کچھ تاثیر ہے — گر جواں بھی ہے تو میرا پیر ہے
لگے ہیں خوب کانوں میں تبوں کے — سخن یکرنگ کے گویا گہر ہیں
اس کو مت جانو میاں اور دل کی طرح — مصطفےٰ خاں آشنا یکرنگ ہے
جدائی سے تری اے صندلی رنگ — مجھے زندگانی دردسر ہے

خدا جانے ان باتوں کو سن کر ہمارے شائستہ زمانے کے لوگ کیا کہیں گے کچھ تو پروا بھی نہ کریں گے اور کچھ واہیات کہہ کر کتاب بند کر دیں گے مگر تم ان باتوں کو ہنرل نہ سمجھو ایک پل کی پل آنکھیں بند کر لو اور تصور کی آنکھیں کھول دو۔ دیکھو وہی محمد شاہی عہد کے کہن سال درباری لباس پہنے بیٹھے ہیں اور باوجود اس متانت و معقولیت کے مسکرا مسکرا کر آپس میں اشعار پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ کیا ان نورانی صورتوں پر پیار نہ آئے گا! کلام کی تاثیر بیٹھنے دے گی محبت کا جوش ان کے ہاتھ نہ چوم لے گا؟

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

میرے دوستو! غور کے قابل تو یہ بات ہے کہ آج جو تمہارے سامنے ان کے کلام کا حال ہے کل اوروں کے سامنے یہی تمہارے کلام کا حال ہونا ہے ایک وقت میں جو بات مطبوع خلائق ہو، یہ ضروری نہیں کہ دوسرے وقت میں بھی ہو۔ خیال کرو۔ انہی بزرگوں کے جلسے میں آج ہم اپنی وضع اور لباس سے جائیں اور اپنا کلام پڑھیں تو وہ سنجیدہ اور برگزیدہ لوگ کیا کہیں گے؟ ایک دوسرے کی طرف دیکھیں گے اور مسکرائیں گے گویا سفلہ اور چھچھورا سمجھیں گے ان بزرگوں کو کوئی بات ناپسند ہوتی تھی تو اتنا ہی اشارہ کافی ہوتا ہوتا تھا۔ اس خیال کی تصدیق اور اس زمانے کی وضع و لباس دکھانے کو "دریائے لطافت" کی ایک عبارت نقل کرتا ہوں۔ سید انشا جن کی کوئی بات ظرافت سے خالی نہیں ایک اپنے عہد کے بڈھے میر صاحب کی تقریر ایک کسبی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ یہ دونوں دلّی کے رہنے والے ہیں اور لکھنؤ میں باتیں کر رہے ہیں۔

# بی نورن کہتی ہیں

اجی اُو میر صاحب! تم عید کا چاند ہو گئے۔ دلّی میں آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے لکھنؤ میں تمہیں کیا ہو گیا کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے اب کے کربلا میں کتنا میں نے ڈھونڈا کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا ایسا نہ کیجیو کہیں آٹھوں میں بھی نہ چلو تمہیں علی کی قسم آٹھوں میں ضرور چلیو۔

اب جس رنگ سے سید انشا، میر صاحب موصوف کی تصویر کھینچتے ہیں اسے ملاحظہ فرمایئے اور اتنا خیال اور بھی رہے کہ یہ پرانے دیرینہ سال ایک زمانے کے ایک خوش طبع رنگین مزاج شخص تھے کوئی ثقہ متقی پرہیز گار نہ تھے باوجود اس کے تازہ اوضاع و اطوار اور نئی رفتار و گفتار پر کیا خیالات رکھتے تھے۔

بیان صورت میر موصوف ایکہ سیاہ رنگ، کوتاہ قد، فربہ گردن دراز گوش نہ دش، دستار لطور بعض کندہ سازان کہنہ، رنگش سبز یا اگرئی والا اکثر سفید گاہے گلسرخ ہم در گوشہ دستارے زنند وجامہ مصطلح ہندوستان (نہ جامہ لغوی) در بر مبارک بسیار پاکیزہ مے باشد چوں لباس باریک را ازیں جہلت کہ برائے کفار مقرر است نمے پوشند رخت پوشاکی ملازمان شریف الیشاں اکثر گندہ است، لیکن قیمتی دو نیم روپیہ ایک تھان تمام دریک جامہ صرف مے شود۔ چولی زیر پستان بالائے آں دوپٹہ لپیٹو لیہ دامن بر زمین جاروب مے کشند و مسی ہم بہ دندان مبارک مے مالند و پاپوش از سقرلاط در دو ور چاق و سطان شنارہ از تارہائے طلائی، حالانکہ ہیئت معلوم شد طرز کلام با کسبی باید شنید میر صاحب فرماتے ہیں:

اجی بی نورن! یہ کیا بات فرماتی ہو۔ تم اپنے جیوڑے کی چین ہو، پر کیا کہیں جب سے دلی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ مجھ سے سینے ریختے میں استاد دلی ہوئے ان پر توجّہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبرو اور میاں ناجی اور میاں حاتم۔ پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السودا اور میر تقی صاحب پھر حضرت خواجہ میر درد صاحب نبرد اللہ مرقدہ جو میرے بھی استاد تھے وہ لوگ تو سب مر گئے اور ان کی قدر دانی کرنے والے بھی جاں بحق تسلیم ہوئے اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ہیں ویسے ہی شاعر ہیں اور دلّی میں بھی ایسا ہی کچھ چھچھڑا ہے۔ تخم تاثیر صحبت کا اثر سبحان اللہ یہ کون میاں جرات بڑے شاعر پوچھو تو تمہارا رائے بان کس دن شعر کہتا تھا اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے اور دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے۔ اگر پوچھئے کہ ضرب زید عمرواً کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں اور میاں حسرت کو دیکھو اپنا عرق بادیان اور شربت انارین چھوڑ کے شاعری میں آگے قدم رکھا ہے اور میر انشا اللہ خاں بچارے میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے آگے پر بزاد تھے ہم بھی گھورنے کو جاتے تھے اب چند روز سے شاعر بن گئے مرزا مظہر جان جاناں صاحب کے روزمرہ کو نام رکھتے ہیں اور سب سے زیادہ ایک اور سنیے کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوریؒ ریختہ آپ کو جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے ایک قصہ کہا ہے اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا تھا رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے میر حسن پر زہر کھایا ہے ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس کو شعر کیونکر کہیے سارے لوگ دلّی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لے کر مرد تک پڑھتے ہیں ؎

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی
کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سو اس بچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلّم لیکن بچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا تیغے کا چلانے والا تھا تو ایسا قابل کہاں سے ہوا اور شہد پن جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے بھلا یہ کلام کیا ہے۔

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو!
یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

مرد ہو کر کہتا ہے ؏ کہیں ایسا نہ ہو کمبخت میں ماری جاؤں اور ایک کتاب بنائی ہے

اس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے جس میں اوپر والیاں چیلیں اوپر والا چاند اجلی دھوبن وغیرہ وغیرہ ان بزرگوں کا خیال کرو کہ مصحفی اور سید انشاء اور جرات کو اپنی جگہ پر یہ کچھ کہتے تھے پھر ہم اپنی اپنی تراشں اور ایجادوں کو قبولیت دوام کا سرٹیفیکیٹ دے کر کس طرح نازاں ہوئے جو نئی اُمت ہمارے بعد آئے گی وہ خدا جانے کیا کچھ مین میکھ نکالے گی خیر اپنے اپنے وقت پر یوں ہی ہوا ہے اور یوں ہی ہوتا رہے گا

خاتمہ: پہلا دور برخاست ہوتا ہے ان مبارک صدر نشینوں کو شکریے کے ساتھ رخصت کرنا چاہیئے کہ مبارک جانشینوں کے لئے جگہ خالی کر کے اٹھے ایجاد کے بانی اور اصلاح کے مالک تھے ملک کی زبان میں جو کچھ کیا اچھا کیا جو کام باقی ہے اچھے نکتہ پردازوں کے لئے چھوڑ چلے گئے ہر مکان جلسے کے بعد درہم برہم معلوم ہوتا ہے مگر یہ اس طرح سجا کر چلے ہیں کہ جو ان کے بعد آئیں گے آرائش و زیبائش کے انداز سوچ سوچ کر پیدا کریں گے اب زیادہ گفتگو کا موقع نہیں کہ دور دوم کو زیب دینے والے آن پہنچے۔

# دُوسرا دَور

## تمہید

دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس فصل میں زبان کے حسن قدرتی کے لئے موسم بہار ہے یہ وقت ہے کہ مضامین کے پھول گلشن فصاحت میں اپنے قدرتی جوبن دکھا رہے ہیں حسن قدرتی کیا شے ہے؟ ایک لطف خداداد ہے جس میں بناؤ سنگار کا نام بھی آ جائے تو تکلف کا داغ سمجھ کر سات سات پانی سے دھوئیں، ان کا گلزار نیچر کی گلکاری ہے صنعت کی دست کاری یہاں اگر قلم لگائے تو ہاتھ کاٹے جائیں۔ اس میں تو کلام نہیں کہ یہ باکمال بھی ایک ہی شہد کی مکھی ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ دریائے محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر اس خوبی کا وصف کسی زبان سے ادا نہیں ہوتا کہ جو کچھ دل میں ہوتا ہے جوں کا توں ادا کر دیتے ہیں، خیالی رنگوں کے طوطے مینا نہیں بناتے۔ ہاں طوطی و بلبل کی طرح صاف زبان اور قدرتی الحان لائے ہیں انہوں نے اپنے نغموں میں گٹکری اینچ پیچ تان کسی گویّے سے لے کر نہیں ڈالی تم دیکھنا بے تکلف بولی اور سیدھی سادی باتوں سے جو کچھ دل میں آئے گا بے ساختہ کہہ دیں گے کہ سامنے تصویر کھڑی کر دیں گے اور جب تک سننے والے سنیں گے کلیجے پکڑ کر رہ جائیں گے۔ اس کا سبب کیا؟ وہی بے ساختہ پن جس کے سادہ پن پہ ہزار بانکپن قربان ہوتے ہیں

ع ہے حسن وہی جس میں بے ساختہ پن نکلے

ان کی اصلاح نے بہت سے لفظ ولیؔ کے عہد کے نکال ڈالے مگر پھر بھی جلد رے اور گھیرے گھیرے اور مرے ہے بجائے مرتا ہے اور دوانہ بجائے دیوانہ اور میاں اور فقط جان کا لفظ بجائے معشوق موجود ہے۔ متاخرین اس کی جگہ جانِ جاں یا۔ جاناں یا۔ یار یا۔ دوست یا۔ دلبر وغیرہ بولنے لگے مگر موہن دور دوم میں نہ رہا۔ سجن رہا اور بل گیا، یعنی جل گیا، یعنی صدقہ گیا اور من بجائے دل بھی ہے

سید انشاء ایک جگہ بعض الفاظ مذکورہ کا ذکر لکھتے ہیں کہ اس عہد کی گفتگو میں اس قسم کے الفاظ شرفا بولتے تھے۔ پرودٹھا بجائے پراٹھا اور دھیرا بجائے آہستہ یا متوقف، اور بمعنی طرف اور بھچک بمعنی حیران (یہ دو لفظ سوداؔ نے بھی باندھے ہیں) اور تکوں۔ بجائے کو۔ یا اپنے تئیں کو، اور جانے ہارا بجائے جانے والا اور فرماتا ہے بجائے فرماتا ہے اور جاتا ہے بجائے جاتا ہے۔

# شاہ حاتم

دستور دنیا کا یہ ہے کہ بیٹا باپ کے نام سے شاگرد اپنے نامی استاد کے نشان سے روشناس ہوتا ہے۔ مگر اس حاتم کو نصیب کا بھی حاتم کہنا چاہیئے جو اس نام سے نشان دیا جائے کہ وہ استاد سودا کا تھا خوش نصیب اس باپ کے جس کی نسل کمال سے وہ فرزند پیدا ہو کہ خانوادہ کمال کے لئے باعث فخر شمار کیا جائے ان کا تخلص حاتم اور شیخ ظہور الدین نام تھا۔ والد کا نام فتح الدین تھا خود کہا کرتے تھے کہ ظہور ۱۱۱۱ھ میرے تولد کی تاریخ ہے۔ رہنے والے خاص شاہ جہاں آباد کے تھے یہ معلوم نہیں کہ بزرگ ان کے کہاں سے آئے کسی تذکرہ سے ان کی علمیت تحصیلی کا حال معلوم نہیں ہوتا ہے نہ کچھ ان کے کلام سے ثابت ہوتا ہے۔ مگر اس قدر استعداد ضرور رکھتے تھے کہ ان کی انتقاد پردازی میں خلل نہیں آنے دیتی اور یہ جوہر اس عہد کے شریف خاندانوں کے لئے عام تھا۔ اصل حال یہ ہے کہ بعد عالمگیر کے جب اولاد میں کشاکشی ہوئی اور سلطنت تباہ ہو گئی تو جو شرفا منصب دار عہدہ دار تھے روز کے فسادوں سے دل شکستہ ہو گئے خصوصاً جبکہ ادھر مرہٹہ نے ادھر سکھ نے زور پکڑا اور قیام سلطنت کی طرف سے لوگ بالکل مایوس ہوئے تو اکثروں نے نوکری چھوڑ کر بسبب بے علمی کے مختلف حرفے اور پیشے اختیار کر لیئے اور بعض لوگ باوجودیکہ صاحب علم تھے، مگر دنیا سے دل برداشتہ ہو کر چھوڑ ہی بیٹھے۔

شاہ حاتم پہلے ہی سپاہی پیشہ تھے۔ عمدۃ الملک امیر خاں کی مصاحبت میں عزت اور فارغ البالی بلکہ عیش و عشرت سے بسر کرتے تھے اور چونکہ محمد شاہی دور تھا اس لئے آئین زمانہ کے بموجب جو اس وقت کے نوجوانوں کے شوق تھے سب پورے کرتے تھے دلی میں قدم شریف کے پاس میر بادل علی شاہ کا تکیہ ایسے رند مشرب لوگوں کا ٹھکانا تھا یہ بھی وہیں جایا کرتے تھے چنانچہ فقیر کی صحبت نے ایسا اثر کیا کہ انہی کے مرید ہو گئے رفتہ رفتہ سب گناہوں سے توبہ کی بلکہ زمانے کی گردش نے دنیا کے تعلقات سے بھی توبہ کروا دی۔ توکل پر گزارہ کیا اور فقط ایک رومال اور ایک پتلی سی چھڑی جو کہ ہندوستان کے فقرائے آزاد منش کا تحفہ ہے، وہ پاس رہ گئی۔

شاہ موصوف نے باوجودیکہ نہایت مہذب اور متین تھے اور عمر میں بھی سن رسیدہ ہو گئے تھے مگر بہت خوش مزاج اور نہایت خلیق اور ظریف تھے۔

فقیری اختیار کر لی تھی مگر بانکوں کی طرح دوپٹہ سر پر ٹیڑھا ہی باندھتے تھے راج گھاٹ کے راستے میں قلعے کے نیچے شاہ تسلیم کا تکیہ تھا وہاں کچھ چمن تھے کچھ درختوں کا سایہ تھا سامنے فضا کا میدان تھا شام کو روز وہاں جا کر بیٹھا کرتے تھے اور چند احباب اور شاگردوں کے ساتھ شعر و سخن کا چرچا رکھتے تھے چنانچہ ۵ برس تک اس معمول کو نباہ

دیا، گرمی، جاڑا، برسات آندھی جائے مینہ جائے وہاں کی نشست قضا نہ ہوتی تھی۔ اہل دہلی کے قدیمی بزرگوں کا دستور تھا کہ جو بات ایک دفعہ اختیار کر لیتے تھے پھر اسے مرتے دم تک نباہ دیتے تھے اور اسے وضع داری یا پاس وضع کہتے ہیں یہ ایک قانون تھا کہ آئین شریعت کے برابر پہلو مارتا ہوا جاتا تھا ایسی پابندیاں بعض معاملات میں استقلال بن کر ملک اور اہل ملک کے لئے قابل فخر ہوتی ہیں اور بعض جزئیات میں تکلیف بیجا ہو کر خاندانوں اور گھرانوں کو بلکہ عام ہو کر ملک کو برباد کر دیتی ہیں۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفی اپنے تذکرہ میں ان کی شاعری کی ابتدا یہ لکھتے ہیں کہ سنہ ۳ محمد شاہی عہد میں ولی کا دیوان دکن سے دہلی میں آیا۔ اس زمانے کے حال بموجب وہی غنیمت تھا اس واسطے خاص و عام میں اس کا بہت چرچا ہوا۔

شاہ حاتم کی طبیعت موزوں نے بھی جوش مارا شعر کہنا شروع کیا اور ہمت و لیاقت سے اسے انتہا کو پہنچایا۔ پہلے رمزؔ تخلص کرتے تھے پھر حاتم ہو گئے۔ یہ پہلے شعرائے طبقہ اوّل کے منتخب شاعروں میں تھے۔ اس وقت بھی زبان ان کی فصیح اور کلام بے تکلف تھا مگر پھر طبقہ دوم میں داخل ہو گئے۔ کلیات ان کا بہت بڑا ہے۔ جو اکثر زبان قدیم کی غزل اور قصائد اور رباعیات و مثنوی وغیرہ پر مشتمل ہے کتب خانہائے قدیم لکھنؤ اور دہلی میں دیکھا وہ شاہ آبرو اور ناجی کی طرز میں ہے۔

لیکن آخر عمر میں کلیات مذکور سے خود انتخاب کر کے ایک چھوٹا سا دیوان مرتب کیا اس کا نام دیوان زادہ رکھا کیونکہ دیوان سے پیدا ہوا تھا وہ صاحبزادہ بھی پانچ ہزار سے زیادہ کا مال بغل میں دبائے بیٹھا ہے بہر حال بیکار نالہ ان کا استحقاق پیدا کرتا ہے کہ طبقہ دوم سے نکال طبقہ سوئم کی اولیت کا طرہ ان کی زیب دستار کیا جائے یا اس کا ایک رکن اعظم قرار دیا جائے انہوں نے دیوان زادہ پر ایک دیباچہ بہت مفید لکھا ہے خلاصہ اس کا یہ ہے خوشہ چین خرمن سخنوران عالم بصورت محتاج و بمعنی حاتم۔ کہ از سنہ ۱۱۲۹ھ تا سنہ ۱۱۶۹ھ کہ چہل سال باشد، عمر درین فن صرف کردہ در شعر فارسی پیرو مرزا صاحب و در ریختہ ولی را استاد مے داند اول کیسکہ دریں فن دیوان ترتیب نمودہ او بود و فقیر دیوان قدیم پیش از نادر شاہی در بلاد ہند مشہور دارد بعد ترتیب آں تا امروز کہ سنہ ۳ عزیز الدین عالمگیر ثانی باشد ہر رطب و یابس کہ از زبان این بے زبان برآمدہ، داخل دیوان قدیم نمودہ کلیات مرتب ساختہ، از ہر ردیف دو سہ غزلے را از ہر غزل دو سہ بیتے ورائے مناقب و مرثیہ و چند مخمس و مثنوی از دیوان قدیم نیز داخل نمودہ بہ دیوان زادہ مخاطب ساختہ و سرخی غزلیات بسہ قسم منقسم ساختہ یکے طرحی دوم فرمائشی سوم جوابی تا تفریق آں معلوم گردد و معاصران فقیر، شاہ مبارک آبرو و شرف الدین مضمون و مرزا جان

جاناں مظہر و شیخ احسن اللہ احسن، میر شاکر ناجی و غلام مصطفےٰ یکرنگ است و لفظ در، و بر، د، از، و الفاظ و افعال دیگر کہ در دیوان قدیم خود تقید دارد دریں جا یازدہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشند و روزمرہ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیحانِ رند در محاورہ آرند منظور دارد" پھر ایک جگہ کہتے ہیں" زبان ہندی بھاکھا را موقوف کردہ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمود و شمہ ازاں الفاظ کہ تقید دارد، بہ بیان مے آرد چنانچہ عربی و فارسی مثلاً تجسیح را تسبی و صحیح را صحی و بیگانہ را بگانہ و دیوانہ را دوانہ و مانند آں، یا متحرک را ساکن و ساکن را متحرک مرض را مرض و نیز الفاظ ہندی مثل نین و جگ و بت۔ وغیرہ و۔ لفظ۔ مرا۔ و میرا واز یں قبیل کہ براں قباحت لازم آید یا بجائے سی اسنتی۔ ادھر را۔ اودھر۔ و۔ کدھر۔ را۔ کیدھر کہ زیادتی حرف باشد یا بجائے پر۔ پہ یا، یہاں۔ را۔ یاں۔ و۔ وہاں۔ را۔ واں کہ در مخرج تنگ بود۔ یا قافیہ۔ سا۔ با۔ ڑا۔ ر ہندی مثل گھوڑا۔ و۔ بورا۔ و، دھڑ۔ و سر۔ و مانند آں مگر ہائے ہوز را بدل کردن بالف کہ از عام تا خاص محاورہ دارند، بندہ دریں امر بہ متابعت جمہور مجبور است چنانچہ بندہ را۔ بندا۔ و۔ پردہ۔ را۔ پردا۔ و آنچہ ازیں قبیل باشد و ایں قاعدہ را تا کہ شرح دہد مختصر کہ لفظے غیر فصیح انشاءاللہ نخواہد بود۔

مضمون ان کے صاف عاشقانہ و عارفانہ ہیں شعر آپس کی باتیں اور زبان شستہ و رفتہ ہے لیکن لفظ اب اور یہاں۔ وغیرہ زائد اکثر ہوتے ہیں۔ غرض اسی دیوان کے دیباچے میں اپنے شاگردوں کی ذیل میں ۴۵ آدمیوں کے نام درج کرتے ہیں انہی میں مرزا رفیع بھی ہیں، میاں ہدایت کی زبانی ہدایت ہے کہ شاہ حاتم جب سودا کی غزل کو اصلاح دیتے تھے تو اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

از ادب صائب خموشم ورنہ در ہر داد بے
رتبۂ شاگردی من نیست استادِ مرا

اور احباب سے کہتے تھے کہ یہ شعر صائب نے میری استادی اور مرزا رفیع کی شاگردی کے حق میں کہا ہے۔ لکھنؤ سے مرزا کے قصیدے اور غزلیں آتیں تو آپ دوستوں کو پڑھ پڑھ کر سناتے اور خوش ہوتے۔

سعادت یار خاں رنگین ان کے شاگرد رشید اپنی مجالس رنگین میں لکھتے ہیں کہ تیسرے پہر کو بھی اکثر شاہ صاحب کے پاس شاہ تسلیم کے تکیے میں حاضر ہوا کرتا تھا ایک دن میاں محمد امان نثار۔ لالہ مکند رائے فارغ رمز۔ دھے اکبر علی اکبر وغیرہ چند

شاگرد خدمت میں موجود تھے اور میری نو مشقی کے دن تھے کہ حسب معمول وہاں حاضر ہوا شاہ صاحب نے فرمایا کہ آج رات کو مطلع کہا ہے ؎

سر کو ٹپکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے

رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے!

میاں رنگین لکھتے ہیں، ابتدا سے میرے مزاج میں چالاکی بہت تھی اور شعور کم تھا اپنی نادانی سے گستاخانہ بول اٹھا کہ اگر مصرع ثانی میں اس طرح ارشاد ہو تو اچھا ہے ؎

سر کو ٹپکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے　　　ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

شاہ صاحب بہت خوش ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فرمایا، آفرین، آفرین ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، انشاءاللہ تمہاری طبیعت بہت ترقی کرے گی مشق نہ چھوڑنا ان کے دوستوں میں سے ایک شخص بولے کہ صاحبزادے استاد کے سامنے یہ گستاخی زیبا نہ تھی حضرت نے پھر فرمایا کہ مضایقہ کیا ہے واللہ میں دیوان میں اسی طرح لکھوں گا بعد اس کے یہ قطعہ پڑھا ؎

من داں سادہ دل کہ عیب مرا　　　ہم چو آئینہ روبرو گوید

نہ چو شانہ بصد زباں در رو　　　پس سر رفتہ مو بمو گوید

اس میں شک نہیں کہ یہ نیک نیتی اور دریا دلی شاہ حاتم کی قابل رشک ہے. کیونکہ شعرا میں اپنے لیے خود پسندی اور دوسرے کے لئے ناتواں بینی ایک ایسی عادت ہے کہ اگر اسے قدرتی کہیں تو کچھ مبالغہ نہیں بلکہ شاگردوں کو استادوں سے دست و گریباں ہوتے دیکھا تو اکثر اسی فن میں دیکھا، یہ وصف یا اس فرشتہ سیرت میں پایا یا مرزا محمد علی ماہر میں کہ مرزا محمد افضل سرخوش کے استاد تھے.

**نقل:** مرزا محمد علی ماہر عہد عالمگیری ایک مشاق اور مسلم الثبوت شاعر اپنے زمانے کے تھے اور مرزا سرخوش ان کے قدیمی شاگرد تھے مگر طبع مناسب اور کثرت مشق سے یہ بھی درجہ کمال کو پہنچ گئے مرزا ماہر اکثر فرمائش کر کے ان سے شعر کہوایا کرتے تھے اور یہ سعادت سمجھ کر کہہ دیا کرتے تھے سرخوش لکھتے ہیں کہ انہوں نے ایک مثنوی بہاریہ تحفۃ العراقین کے ڈھنگ میں لکھی تھی چنانچہ مطلع میں نے کہہ دیا کہ ؎

اے بر سر نامہ گل زنامت　　　باراں بہار شیخ جامت

اور میرے "ساقی نامہ" کے لئے انہوں نے مطلع کہہ دیا ؎

بو و نامہ نشہ بخش ادا　　　کہ بر سر کشد جام حمد خدا

پھر لکھتے ہیں کہ ایک شب قطب الدین مائل کے ہاں شعرا کا جلسہ تھا چاندنی رات تھی سب مہتابی پر بیٹھے تھے مجھ سے شعر کی فرمائش کی میں نے اسی دن مطلع کہا تھا وہ پڑھا ؎

کے توانم دید زاہد جام صہبا بشکند — مے پرور زلفم حبابے گر بدریا بشکند

سب نے تعریف کی اور آدھی رات تک اس کے مصرعے لوگوں کی زبان پر تھے حکیم محمد کاظم صاحب تخلص حکیم کہ اپنے تئیں مسیح البیان بھی کہتے تھے بار بار یہ شعر پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا کی قدرت، ہندوستان میں ایک شخص پیدا ہو اور فارسی کی زبان میں ایسے شعر کہے۔ دوسرے دن دانشمند خاں کے مکان پر جلسہ ہوا وہاں میں نہ تھا۔ مگر مرزا ماہر موجود تھے سب نے پھر اس مطلع کا ذکر کیا اور کہا کہ تمہارا شاگرد کتنا خوش فکر نکلا ہے۔ اس کے شعر کی کیفیت میں عجب لطف سے کل رات کٹی آفریں ہے آپ کی محنت پر خوب تربیت کیا انہوں نے کہا کہ وہ میرے شاگرد نہیں باہم اتحاد ہے وہ مجھے شعر دکھاتے ہیں میں انھیں شعر دکھاتا ہوں۔ حکیم نے کہا سر خوش سے بارہا گفتگو آئی۔ وہ باصرار کہتے تھے کہ میں شاگرد ہوں ماہر نے کہا کہ بزرگ زادہ ہے جو چاہا کہہ دیا، مجھے اس کی استادی کی لیاقت کب ہے؟

دوسرے دن میں خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا کہ تم نے اپنے تئیں میرا شاگرد کیوں کہا؟ مجھے تو فخر ہے کہ تم جیسا شخص میرا شاگرد ہو مگر دنیا میں ایسے بلند فکر لوگ بھی ہیں کہ وہ مجھ کو اور میرے شعر کو خاطر میں نہیں لاتے ان کی نظر میں میرے شاگردی کیا قدر منزلت ہوگی شعرا خدا کے شاگرد ہیں۔ ان کو کسی کی شاگردی کی پروا نہیں۔ شاہ حاتم کا ایک دیوان فارسی میں بھی ہے مگر بہت مختصر۔ میں نے دیکھا وہ ۱۱۷۹ھ کا خود ان کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ غزل ۹۰ صفحے رباعی و فرد وغیرہ ۶۵ صفحے۔ ولادت ان کی ۱۱۱۱ سنہ ہجری میں ہے اور ۹۶ برس کی عمر میں ماہ رمضان ۱۲۰۷ھ میں دہلی میں فوت ہوئے اور وہیں دلی دروازہ کے باہر دفن ہوئے مگر مصحفی نے تذکرہ فارسی میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ میں فوت ہوئے اور ۸۳ برس کی عمر پائی۔

یار کا مجھ کو اس سبب ڈر ہے — شوخ ظالم ہے اور ستم گر ہے
دیکھ سرد چمن ترے قد کوں — خجل ہے پا بگل ہے بے بر ہے
حق میں عاشق کے تجھ لباں کا بچن — قند ہے نیشکر ہے شکر ہے
کیونکہ سب سے تجھے چھپا نہ رکھوں — جان ہے دل ہے دل کا اندر ہے

ہے
مارنے کو رقیب کے حاتم
شیر ہے ببر ہے و ھنترّ ہے

یہاں طالعوں سے ملنا ہے پیارا    عبث دیکھے ہے زاہدا استخارا
میں پایا ہوں دے تجھ چشم کا بھید    نہ مانگوں گا کبھی ان کا اشارا
نہال دوستی کو کاٹ ڈالا    دکھا کر شوخ نے ابرو کا آرا
لیا اس گلبدن کا ہم نے بوسہ    تو کیا چہ مار رقیبوں نے ہمارا
کتی عالم کٹے ہیں قتل ان نے
کرے کیا ایکلا حاتم بچارا

چھپا نہیں جا بجا حاضر ہے پیارا    کہاں وہ چشم! جو مارے نظارا
جدا نئیں سب ستی تحقیق کر دیکھ    ملا ہے سب سے اور سب سے ہے نیارا
مسافر اٹھ تجھے چلنا ہے منزل    بجے ہے کوچ کا ہر دم نقارا
مثال بحر موجیں مارتا ہے    کیا ہے جس نے اس جگ سوں کنارا
سیانے خلق سے یوں بھاگتے ہیں    کہ جوں آتش ستی بھاگے ہے پارا
سمجھ کر دیکھ سب جگ سیکھ یاہی    کہاں ہیگا سکندر کہاں ہے دارا
کہیں ہیں اہل عرفاں اس کو جیتا    جو مر کر عشق میں دنیا سوں ہارا
صفا کر دل کے آئینے کو حاتم
دکھا / دیکھا چاہے سجن گر آشکارا

جب سنا موتی نے تجھ دنداں کے موتی کا بہا    آب میں شرمندگی سوں ڈوب جوں پانی بہا
مردماں کو دیکھ کر بسمل ترے کوچے کے بیچ    ڈر گیا اور چشم سے آنسو کے جا ہے خوں بہا
لب تمہارے سرخ ہم نے تاڑ کر پوچھا تھا مول    جوہری کہنے لگے یہ لعل ہے گا بے بہا
حاتم اس بے مہر نے مجھی نہ دی اس غم ستی
جا کنارے بیٹھ کر اس غم ستی دریا بہا

آب حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا    مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا
شیریں لباں سوں سنگ دلوں کو اثر نہیں    فرہاد کام کوہ کنی کا کیا تو کیا
جلنا لگن میں شمع صفت سخت کام ہے    پروانہ جوں شتاب عبث جی دیا تو کیا
ناسور کی صفت ہے نہ ہوگا کبھی وہ بند    جراح زخم عشق کا اگر سیا تو کیا

محتاجگی سوں مجھ کو نہیں ایک دم فراغ
حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

خال اس کے نے دل لیا میرا | تل میں ان نے لہو پیا میرا
جان بے درد کو ملا کیوں تھا | آ گئے آ یا مرے کیا میرا
اس کے کوچے میں مجھ کو پھرتا دیکھ | رشک کھاتی ہے آسیا میرا
نہیں شمع و چراغ کی حاجت | دل ہے مجھ بزم کا دیا میرا

زندگی درد سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

کاملوں کا یہ سخن مدت سوں مجھ کو یاد ہے | جگ میں بے محبوب جینا زندگی برباد ہے
بندگی سوں سرو قد کی اک قدم باہر نہیں | سرو گلشن بیچ کہتے ہیں مگر آزاد ہے
بے مدد زلفوں کی اس کے حسن نے قیدی کیا | میرا دل بے دام کرنا صنعت استاد ہے
خلق کہتی ہے بڑا تھا عاشقی میں کوہکن | تجھ لب شیریں کی حسرت میں ہر اک فرہاد ہے

دل نہاں پھرتا ہے حاتم کا نجف اشرف کے بیچ
گو وطن ظاہر میں اس کا شاہجہاں آباد ہے

اے خرد مند مبارک ہو تمہیں فرزانگی | ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو دیوانگی
بے مروت بے وفا بے دید بے نا آشنا | آشناؤں سے نہ کر بے رحمی اور بیگانگی

ملک دل آباد کیوں کرتا ہے حاتم کا خراب
اے مرے بستی! خوش آتی ہے تجھے ویرانگی؟

# سراج الدین علی خاں آرزو

خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ و منطق پر ہے جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے ان کا دلچسپ حال قابل تحریر تھا۔ لیکن چونکہ فارسی تصنیفات کی ہموں نے انہیں کوئی دیوان اردو میں نہ لکھنے دیا۔ اس لئے یہاں ان کے باب میں اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامن تربیت سے ایسے شائستہ فرزند تربیت پا کر اٹھے جو زبان اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے اور جس شاعری کی بنیاد جگت اور ذو معنی لفظوں پر تھی اسے کھینچ کر فارسی کی طرز و ادا پر لے آئے۔ مطالب پرے آئے

یعنی مرزا جان جاناں مظہر، مرزا رفیع، میر تقی، خواجہ میر درد وغیرہ۔

خان آرزو اردو کے شاعر نہ تھے نہ اس زمانے میں اسے کچھ کمال سمجھتے تھے البتہ بعض متفرق اشعار کہے تھے۔ وہ زمانے کی گردشوں سے اس طرح گھس پس کر اڑ گئے کہ آج کل کے لوگوں کو خبر بھی نہیں میرے دیوانے دل نے جو استادوں کی زبان سے لیکر سینے میں امانت رکھے وہ کاغذ کے سپرد کرتا ہوں یقین ہے کہ یہ امانت دار ضائع نہ کرے گا خان موصوف نے ۱۱۶۹ھ میں رحلت کی۔ اصل وطن ان کے بزرگوں کا اکبر آباد ہے، مگر یہ دلی سے خاص دل لگی رکھتے تھے۔ چنانچہ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ ہڈیوں کی خاک دلی میں آکر زمین کا پیوند ہوئی۔

آتا ہے ہر سحر اٹھ تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

اس تند خو صنم سے جب سے لگا ہوں ملنے
ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو

تجھ زلف میں لٹک نہ رہے دل تو کیا کرے
بیکار ہے اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے

رکھے سیپارہ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

کھول کر بند قبا کو ملک دل غارت کیا
کیا حصار قلب دلبر نے کھلے بند دل کیا

اس زلف سیاہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے
آئینے کے گلشن میں گت جھوم پڑی ہے

دریائے اشک اپنا جب سر براوج مارے
طوفان نوح بیٹھا گوشے میں موج مارے

مرے شوخ خراباتی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو
بہار حسن کو دی آب اس نے جب چرس کھینچا

مغاں مجھ مست بن پھر خندہ قلقل نہ ہووے گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

باوجودیکہ عزت خاندان اور نفس کمالات کی حیثیت سے خان موصوف کو امراء و غرباء سب معزز و محترم سمجھتے اور علم و فضل کے اعتبار سے قاضی القضات کا عہدہ دربار شاہی سے حاصل کیا مگر مزاج کی شگفتگی اور طبیعت کی ظرافت نے دماغ میں خود پسندی اور تمکنت کی بو نہیں آنے دی تھی چنانچہ لطیفہ، شاگردوں میں ایک نوجوان بچپن سے حاضر رہتا تھا حسن اتفاق یہ کہ چہرہ اس کا نمک حسن سے نمکین تھا وہ کسی سبب سے چند روز نہ آیا۔ ایک دن کہیں سر راہ بیٹھے تھے کہ وہ ادھر سے گزرا انہوں نے بلایا شاید اسے ضروری کام تھا کہ وہ عذر کرکے چلا انہوں نے پھر روکا اور بلا کر یہ شعر پڑھا کر لطافت طبع سے اسی وقت شبنم کی طرح ٹپکا تھا ہے

یہ ناز یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا
کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

**لطیفہ** ایک دن کہیں مشاعرہ تھا۔ ایک جانب میں چند فہمیدہ اور سخن شناس بیٹھے شعرو سخن سے دماغ تازہ کر رہے تھے ایک شخص نے خاں موصوف کی تعریف کی اور اس میں بہت مبالغہ کیا حکیم اصلح الدین خاں صاحب مسکرائے اور کہا کہ ؎

آرزو خوب است اما اینقدر ہا خوب نیست

سب ہنسے اور خود خاں صاحب دیر تک اس مصرع لطیف کی داد دیتے رہے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے محبت نہیں رہی

# اشرف علی خاں فغاں

فغاںؔ تخلص، اشرف علی خاں نام احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے بذلہ سنجی ولطیفہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ زبان سے پھلجھڑی کی طرح پھول جھڑتے تھے۔ اس لئے ظریف الملک کوکہ خاں خطاب تھا اگرچہ شاعری پیشہ نہ تھے مگر شعر کا مزہ ایسی بری بلا ہے کہ اس کے چٹخارے کے سامنے سارے بے مزہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایسے ہی صاحب کمالوں میں ہیں ابتدائے عمر میں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی کہ جبھی سے اس کام میں نام پیدا کیا۔ مصحفی اپنے تذکرہ میں قزلباش خاں امید کا شاگرد لکھا ہے۔ مگر ان کی اردو ابھی سن چکے شاہد فارسی میں اصلاح لی ہو گلزار ابراہیمی میں لکھا ہے کہ ندیم کے شاگرد تھے اور خود بھی جا بجا کہتے ہیں ؎

| | |
|---|---|
| ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں | دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہو گیا |
| دشت جنوں میں کیوں نہ پھروں میں برہنہ پا | اب تو فغاںؔ ندیم مرا رہنما ہوا |

الغرض جب احمد شاہ درانی کے حملوں نے ہندوستان کو تہ وبالا کر دیا اور دلی میں دربار کا طور بے طور دیکھا تو مرشد آباد میں ایرج خاں اس کے چچا کا ستارہ اوج پر تھا ان سے ملنے گئے اور وہاں سے علاقہ اودھ میں پہنچے اس زمانے میں دلی کا آدمی کہیں جاتا تھا تو لوگ ایسا سمجھتے تھے گویا پیرزادے آئے بلکہ اس کی نشست برخاست کو سلیقے اور انداز کا دستور العمل سمجھتے تھے۔ اس وقت شاہ اودھ بھی نواب وزیر ہی کہلاتے تھے نواب شجاع الدولہ مرحوم حاکم اودھ ان کے ساتھ بہت تعظیم سے پیش آئے اور اعزاز و اکرام کے ساتھ رکھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ نازک مزاج بہت تھے اور زمانہ بھی ایسا تھا کہ ایسے مزاجوں کی نزاکتیں پیش جاتی تھیں۔ چنانچہ ایک دن اختلاط میں ان کا کپڑا نواب کے ہاتھ سے جل گیا یہ

رسیجندہ ہو کر عظیم آباد چلے گئے وہاں جا کر اس سے زیادہ عزت پائی اور راجہ شتاب رائے کی سرکار میں اختیار اور اقتدار حاصل کیا راجہ صاحب بھی علاوہ خاندانی بزرگی کے ان کے کمال ذاتی اور شیریں کلامی اور علم مجلسی کے سبب سے نہایت عزیز رکھتے تھے چنانچہ وہیں رہے اور باقی عمر خوشحالی میں بسر کر کے دنیا سے انتقال کیا۔

ان کے کمال کی سند اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ مرزا رفیع جیسے صاحب کمال اکثر ان کے اشعار مزے لے لے پڑھا کرتے اور بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ حقیقت میں مرزا کا خود بھی یہی انداز تھا کیونکہ ان کے کلام میں ہندی کے محاورے نے فارسیت کے ساتھ نئے لطف سے پختگی پائی ہے اور ہر خیال کو لطافت اور چوچلے کے ساتھ ادا کرتے ہیں ان کے جس دیوان سے میری آنکھیں روشن ہوئیں میرے استاد ظاہر و باطن شیخ ابراہیم ذوق کے لڑکپن کا لکھا ہوا تھا۔ اگرچہ فغاں کی زبان اسی زمانے کی زبان ہے مگر فن شاعری کے اعتبار سے نہایت با اصول اور برجستہ ہے اور الفاظ کی بندش ان کی مشق پر گواہی دیتی ہے۔ مقدار میں دیوان درد سے کچھ بڑا تھا مگر فقط غزلوں کا دیوان تھا اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت ایشیا کی شاعری کے لیے نہایت مناسب تھی۔ ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تیزی اور طراری کو ان کے مزاج سے وہ لگاؤ تھا، جو باروت اور حرارت کو لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں ایسی تھی جیسے تلوار میں جوہر۔

**لطیفہ** ایک دن راجہ صاحب کے دربار میں غزل پڑھی جس کا قافیہ تھا۔ لالیاں اور جالیاں سب سخن فہموں نے بہت تعریف کی راجہ صاحب کی صحبت میں جگنو میاں ایک مسخرے تھے ان کی زبان سے نکلا کہ نواب صاحب سب قافیے آپ نے باندھے مگر تالیاں رہ گئیں، انہوں نے ٹال دیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ راجہ صاحب نے خود فرمایا کہ نواب صاحب سنتے ہو؟ جگنو میاں کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ مہاراج اس قافیے کو تبندل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور حضور فرمائیں تو اب بھی ہو سکتا ہے۔ مہاراج نے کہا کہ ہاں کچھ کہنا تو چاہیئے انہوں نے اسی وقت پڑھا ؎

جگنو میاں کی دم جو چمکتی ہے رات کو<br>
سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں تالیاں

تمام دربار چہک اٹھا اور میاں جگنو مدھم ہو کر رہ گئے

افسوس یہ ہے کہ اس قسم کے لطائف بڑھتے بڑھتے ان سے اور راجہ صاحب سے بھی شکر رنجی ہو گئی اس کی بنیاد یہ ہوئی کہ احمد شاہ درانی نے جو سلطنت پر حلے کیے

ایک دن اس کی دوست وراز ی ادب اعتدالیوں کا ذکر ہو رہا تھا خدا جانے طنز سے یا سادہ مزاجی سے راجہ صاحب نے کہا کہ نواب صاحب! ملکہ زمانی کو احمد شاہ درانی کیونکر لے گیا انہیں یہ بات ناگوار ہوئی افسردہ ہو کر بولے کہ مہاراج جس طرح ستیا جی کو راون لے گیا تھا اسی طرح وہ لے گیا۔ اسی دن سے دربار میں جانا چھوڑ دیا۔

ان کی لیاقت اور حسن تدبیر کو اس بات سے قیاس کر سکتے ہیں کہ حکام فرنگ سے اس عالم میں اس طرح رسائی پیدا کی کہ باقی عمر فارغ البالی اور خوشحالی میں گزاری ۱۱۹۶ھ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

مبتلائے عشق کو اے ہمدماں شادی کہاں | آ گئے اب تو گرفتاری میں آزادی کہاں
گہ میں مسکن کبھی ہے اور کبھی صحرا کے بیچ | خانۂ الفت ہو ویراں ہم کو آبادی کہاں
ایک میں تو قتل سے خوش ہوں ولیکن مجھ سوا | پیش جا دیگی مرے قاتل یہ جلا دی کہاں

کاش آ جاوے قیامت اور رہے دیوان حشر!
وہ فغاں جو ہے گریباں چاک فریادی کہاں

خط و پیچو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں | لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں
بادِ صبا توں عقدہ کشا اس کی ہو جیو | مجھ سا گرفتہ دل اگر آوے نظر کہیں
اتنا و فور خوش نہیں آتا ہے اشک کا | عالم کو مت ڈبو بیو اے چشم تر کہیں
میری طرف سے خاطر صیاد جمع ہے | کیا اڑ سکے گا طائر بے بال و پر کہیں
تیری گلی میں خاک بھی چھانی کہ دل ملے | ایسا ہی گم ہوا کہ نہ آیا نظر کہیں
رونا جہاں تلک تھا مری جان! رو چکا | مطلق نہیں ہے چشم میں نم کا اثر کہیں
باور اگر تجھے نہیں آتا تو دیکھ لے | آنسو کہیں ڈھلک گئے لخت جگر کہیں

ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک روا نہیں
ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے بھی ڈر کہیں

بے فائدہ ہے آرزوئے سیم و زر فغاں | کس زندگی کے واسطے یہ دردِ سر فغاں
چلتے ہیں اس گلی میں فرشتے کے پر فغاں | کیونکر پھرے وہاں سے ترا نامہ بر فغاں
بوئے کباب سوختہ آتی ہے خاک سے | دامن سے کیا گرا کوئی لخت جگر فغاں
یاں تک تو گرم ہے مرے خورشید کا حسن | دیکھے اگر کوئی تو نہ ٹھیرے نظر فغاں
کہتے ہیں فصل گل تو چمن سے گزر گئی! | اے عندلیب تو نہ قفس بیچ مر گئی
شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشک سرخ کا | تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

اتنا کہاں رفیق بصارت ہے چشم کا — دل بھی ادھر گیا مری جیدھر نظر گئی
تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں — انصاف کو نہ چھوڑ مروت اگر گئی
آخر فغاں وہی ہے اسے کیوں بھلا دیا — وہ کیا ہوئے تپاک وہ الفت کدھر گئی

مجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے
یوں بھی گزر گئی مری ووں بھی گزر گئی

مفت سودا ہے ارے یار کہاں جاتا ہے — آ مرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے
کج کلہ تیغ بکف چیں بر ابرو بے باک — یا الٰہی یہ ستمگار کہاں جاتا ہے

لیے جاتی ہے اجل جان فغاں کو اے یار
لیجیو نیر اگر منت رکہاں جاتا ہے

صنم بتا تو خدائی کا مجھ کو کیا نہ ہوا — ہزار شکر کہ تو بہت ہوا خدا نہ ہوا
کباب ہو گیا آخر کو کچھ برا نہ ہوا — عجیب یہ دل ہے جلا تو بھی بے مزا نہ ہوا

شگفتگی سے ہے غنچے کے تپش پریشانی
بھلا ہوا کبھی کافر تو مجھ سے وا نہ ہوا

مزا نہ ہیں جیا آخر کو نیم بسمل ہو — غضب ہوا مرے قاتل کا مدعا نہ ہوا
نپٹ ہوا ہوں فضیحت بہت ہوا ہوں خراب — تری طفیل اے خانہ خراب کیا نہ ہوا

طرف سے اپنی تو نیکی میں ہے مرا صاحب
مری بلا سے فغاں کا اگر بھلا نہ ہوا

کھا پیچ و تاب مجھ کو ڈسیں اب وہ کالیاں — ظالم اسی لیے تمہیں نے زلفیں تھیں پالیاں
تنہا نہ در کو دیکھ کے گرتے ہیں اشک چشم — سوراخ دل میں کرتی ہیں کانوں کی بالیاں

دیکھا کہ یہ تو چھوڑتا ممکن نہیں مجھے
چلنے لگا وہ شوخ مراتب یہ چالیاں

ہر بات پہ ہر روٹھنا ہر دم میں ناخوشی — ہر آن دو کھنا مجھے ہر وقت گالیاں
ایذا ہر ایک طرح سیں دیا غرض مجھے — کچھ بس نہ چل سکا تو یہ طرحیں نکالیاں
ہم نے شب فراق میں سنتا ہے اے فغاں — کیا خاک سو کے حسرتیں دل کی نکالیاں
یہ تھا خیال خواب میں پیگا یہ روز وصل — آنکھیں جو کھل گئیں وہی راتیں ہیں کالیاں

# خاتمہ

دوسرے دور کے شعرا رخصت ہوتے ہیں سُبحان اللہ اس بڑھاپے پر ایسے زندہ دل اس کمال پر ایسے بے تکلف سادہ مزاج ؎

کیا خوب آدمی تھے خدا مغفرت کرے

نہ استعاروں کے پیچ نہ تشبیہوں کی رنگا رنگی اپنے خیالات کو کیسی صاف صاف زبان اور سیدھے سیدھے محاورے میں کہہ گئے کہ آج تک جو سنتا ہے سر دُھنتا ہے ان کا کلام حال تھا جو خیال شعر میں باندھتے تھے اس کا عالم ان کے دل و جان پر چھا جاتا تھا یہی سبب ہے کہ جس شعر کو دیکھو تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے اسی کو آج اہل فرنگ ڈھونڈتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر شے اصلی حالت دکھائی چاہیئے۔ مگر حالت کون دکھائے کہ اپنی حالت بگڑی ہوئی ہے ؎

صحبت گل ہے فقط بلبل سے کیا بگڑی ہوئی
آج کل سارے چمن کی ہے ہوا بگڑی ہوئی

آدمی کہتے ہیں جس کو ایک پتلا گل کا ہے
پھر کہاں گل اس کو جب گل ہو ذرا بگڑی ہوئی

دل شکستوں کا سخن ہووے نہ کیونکر نادرست
ساز بگڑے ہے تو نکلے ہے صدا بگڑی ہوئی

# تیسرا دور

## تمہید

اس مشاعرے میں ان صاحب کمالوں کی آمد آمد ہے، جن کے پا انداز میں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے اور بلاغت قدموں میں لوٹی جاتی ہے۔ زبان اردو ابتدا میں کچا سونا تھی۔ ان بزرگوں نے اسے اکثر کدورتوں سے پاک صاف کیا اور ایسا بنا دیا۔ جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان، حسینوں کے زیور، بلکہ بادشاہوں کے تاج و افسر تیار ہوتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے مرصع کار پیچھے آئے۔ مگر اس فکر کا نولکھا ہار انہیں بزرگوں کے گلے میں رہا۔ جب یہ صاحب کمال چمن کلام میں آئے تو اپنے بزرگوں کی چمن بندی کی سیر کی۔ فصاحت کے پھول کو دیکھا کہ قدرتی بہار میں حسنِ خداداد کا جوبن دکھا رہا ہے۔ چونکہ انہیں بھی ناموری کا تمغہ لینا تھا۔ اس لئے بڑوں سے بڑھ کر قدم مارنے چاہے۔ یہ گرد و پیش کے میدانوں میں بہت دوڑے۔ سب پھول کام میں آئے ہوئے تھے۔ جب سامنے کچھ نہ پایا تو ناچار اپنی عمارتوں کو اونچا اٹھایا۔ تم دیکھنا وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے۔ آسمان سے تارے اتاریں گے۔ قدردانوں سے فقط داد نہ لیں گے، پرستش لیں گے۔ لیکن وہ پرستش کہ سامری کی طرح عارضی نہ ہو۔ ان کے کمال کا دامن قیامت کے دامن سے بندھا پاؤ گے۔ یہ اپنی صنعت میں کچھ تکلف بھی کریں گے، مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا۔ اصل کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے۔ سودا کا کلام باوجود بلندی مضمون اور چستی بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا۔

اتنی بات کا افسوس ہے کہ اس ترقی میں طبیعت کی بلند پروازی سے اُدھر کی طرف رُخ کیا۔ کاش آگے قدم بڑھاتے تاکہ حسن و عشق کے محدود صحن سے نکل جاتے اور ان میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے کہ نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے نہ عجائب و لطائف کا شمار ہے۔ اس بات کو بھولنا نہ چاہیئے کہ خان آرزو کے فیض صحبت

نے ان نوجوانوں کے کمال کو اس طرح پرورش کیا جس طرح دایہ اپنے دامن میں ہونہار بچوں کو پالتی ہے۔ میں نے طبقۂ دوم اور سوم کے اکثر استادوں کے حال مجمل طور پر حواشی میں لکھ دیئے ہیں اور اکثر کے نام و کلام سے یہ جام خالی ہے۔ حقیقت میں ان سب کو زبان اُردو کی اصلاح کا حق حاصل ہے لیکن اپنے استادوں اور بزرگوں سے یہی سنا کہ مرزا جان جاناں۔ سوداؔ۔ میرؔ۔ خواجہ میر دردؔ چار شخص تھے کہ جنہوں نے زبان اردو کو خراد اتارا ہے۔

ھمارے زبان دانوں کا قول ہے کہ ۶۰ برس کے بعد ہر زبان میں ایک واضح فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ طبقہ سوم کے اشخاص جو حقیقت میں عمارت اردو کے معمار ہیں انہوں نے بہت سے الفاظ پرانے سمجھ کر چھوڑ دیئے اور بہت سی فارسی کی ترکیبیں جو مصری کی ڈلیوں کی طرح دودھ کے ساتھ منہ میں آتی تھیں۔ انہیں گھلایا۔ پھر بھی بہ نسبت حال کی بہت سی باتیں ان کے کلام میں ایسی تھیں کہ اب متروک ہیں۔ چنانچہ فارسیت کی ترکیبوں کے اشعار دیباچے میں لکھے گئے ہیں۔

لیکن پرانے الفاظ جو اب متروک ہیں۔ ان کی مثال کے چند اشعار میرؔ اور مرزا اور خواجہ میر دردؔ کے کلام سے لکھتا ہوں۔ پھر بھی انصاف سے نہیں گزرا جاتا۔ ان میں اپنی اپنی جگہ ایک ایک لفظ ایسا جڑا ہوا ہے کہ جسے اٹھانا مشکل ہے۔

میرؔ صاحب فرماتے ہیں۔

ہوتا تھا مجلس آرا اگر غیر کا تو مجھ کو — مانند شمع مجلس کا ہے کو یوں جلایا

نقاش دیکھ تو میں کیا نقش یار کھینچا! — اس شوخ کم نما کا نت انتظار کھینچا

دیر و حرم میں کیوں کر قدم رکھ سکے گا میرؔ — ایدھر تو اس سے بت پھرا ادھر خدا پھرا

ٹک بھی نہ مڑ کے میری طرف تو نے کی نگاہ — اک عمر تیرے پیچھے میں ظالم لگا پھرا

گل و آئینہ کیا! خورشید و مہ کیا — جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

رسم قلمرو عشق مت پوچھ تو کہ ناحق! — ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا!

لوہو لگتا ہے ٹپکنے جو پلک مارتی ہوں — اب تو یہ رنگ ہے اس دیدہ اشک افشاں کا

کیوں کر تمہاری بات کرے کوئی اعتبار — ظاہر میں کیا کہو ہو سخن زیر لب ہے کیا

سیمیں تنوں کا [illegible] ہے کچھ تو ل — شاہد پرستیوں کا ہم پاس زر کہاں ہے

تا بہ قدر [illegible] نظارہ کیا — دل نے اب زور بیقرار کیا

خون جگر ہو بہنے لاگا
پلکوں ہی پہ رہنے لاگا

پی پی کے اپنا لہو رہیں گو کہ ہم ضعیف
جوں رنگتی نہیں ہے انہوں کے تو کان پہ

کیفیتیں ہزار ہیں اس کام جاں کے بیچ
دیتے ہیں لوگ جان تو ایک ایک آن پر

تازہ چمک تھی شب کو تاروں میں آسمان کی
اس آسیا کو شاید پھر ہے کنہو نے ہارا

زمانے نے مجھ جرعہ کش کو نداں
کیا خاک وحشت سر خم کیا

دل لے کے میری جان کا دشمن ہوا نداں
جس بے وفا سے اپنے تئیں پیار ہو گیا

گہے خون جگر گہ اشک گاہے لخت دل یارو
کسی نے بھی کہیں دیکھا ہے یہ بستار رونے کا

کہا تھا میں تئے نہ دیکھو غیر کی اور
سو اس نے آنکھ مجھ سے ہی چھپائی

آنکھوں نے میر صاحب قبلہ ستم کیا
حضرت بکا کیا نہ کرو رات کے تئیں

باہر نہ آتا چاہ سے یوسف جو جانتا
لے کارواں مرے تئیں بازار جائے گا

ہر ذرہ خاک تیری گلی کی ہے بے قرار
یاں کونسا ستم زدہ ماٹی میں رل گیا

آتش تیر جدائی سے یکایک اس بن
یوں جلا دل کہ ٹک جی بھی جلایا نہ گیا

رہے خیال تنک ہم بھی روسیاہوں کا
لگے ہو خون بہت کرنے بے گناہوں کا

ہو اس سے جہاں سیاہ تد بھی
نالے مرے اثر نہ ہو گا۔

مت رنج کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد
دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

بس طبیب اٹھ جا مرے بالیں سے مت دے دردسر
کام جاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا!

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

حیف وے جن کے وہ اس وقت میں پہنچا جس وقت
ان کنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا

لگوائے پتھرے اور برا بھی کہا کئے
تم نے حقوق دوستی کے سب ادا کئے

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میر کو تم عبث اداس کیا

اس عہد میں استمراری جمع مؤنث میں دونوں فعل جمع لاتے تھے مثلاً "عورتیں آتیاں تھیں اور گاتیاں تھیں" اب پہلے فعل کو واحد لاتے ہیں۔ مثلاً عورتیں آتی تھیں اور گاتی بجاتی تھیں وغیرہ۔

بارہا وعدوں کی راتیں آتیاں
طالعوں نے صبح کر دکھلاتیاں

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں
نہ چوب گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہلنا بالفتح بولتے تھے۔ چنانچہ سودا ابھی ایک

غزل میں کہتے ہیں۔ جس کا قافیہ و ردیف ہے چلتے دیکھا نکلتے دیکھا ے

تیغ تیرے کا سدا شکر ادا کرتے ہیں
لبوں کو زخم کے دن رات میں ہلتے دیکھا

اسی طرح اکثر اشعار مرزا رفیع کے ہیں کہ باوجود محاورۂ قدیمانہ آج کل کے ہزار محاورے ان پر قربان ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ے

اَخدا کے واسطے اس بانکپن سے درگزر
گلی میں سودا آیوں کہا دامان کھگر یار کا !

بے وفائی کیا کہوں دل ساتھ تجھ محبوب کی
تیری نسبت تو میاں بلبل سے گل نے خوب کی

جس کے دل کو تری زلفوں سے یہاں لاگ لگے
اس کی آنکھوں میں جو رسی بھی ہو تو ناگ لگے

تجھ عشق میں پیارے وہ زیر چوب گل ہیں
نے پھول کی کسی نے جن کو چھڑی لگائی

خبر شتاب لے سودا کے حال کی پیارے
نہیں ہے وقت مری جان یہ تائل کا

نہ جانے حال کس ساقی کو یاد آتا ہے شیشے کا
کہ بے ہچکیاں چھوڑا نکل جاتا ہے شیشے کا

نہ جانے یاد کر روتا ہے کس کے دل کے صدمے کو
کہیں ٹکڑا جو سودا کو نظر آتا ہے شیشے کا

بیہودہ اس قدر نہیں آتا ہے کام ناز
مکھ پر خط آچکا نہ کر دصبح و شام ناز

عالم کو مار رکھا ہے تیغ با قد دوتا
زاہد یہ کاٹ ہے تری تیغ دو نیم کا

سودا کہے تھا یار سے ایک مو نہیں غرض
اُدھر کھلی جو زلف ادھر دل بکھر چلا

سودا نہ نکلی گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈتے
لڑکے پھیریں ہیں پتھروں سے دامن بھرے ہوئے

تسلی اس دوانے کی نہ ہو جھونلی کے پتھروں سے
اگر سودا کو چھیڑا ہے تو لڑکو مول لو چھیڑیاں

نگر آباد ہیں بسے ہیں گانوں !
تجھ بن اجڑے پڑے ہیں اپنے بھانوں

قیس و فرہاد کا نہیں کچھ ذکر
اب تو سودا کا باجتا ہے نانوں

جاتے ہیں لوگ قافلے کے پیش و پس چلے
ہے یہ عجب سرا کہ جہاں آئے پس چلے

اس غزل میں قفس چلے اور بس چلے قافیہ ہے اسی میں کہتے ہیں ے

صیاد اب تو کر دے قفس سے ہمیں رہا
ظالم پھڑک پھڑک کے پر و بال گھس چلے

صبا سے ہر گھڑی مجھ کو لہو کی باس آتی ہے
چمن میں آہ گلچیں نے یہ کس بلبل کا دل توڑا

موجب میری رنجش کا جو پوچھے ہے تو اے جان
موندوں گا نہیں کھول کے جوں غنچہ دہاں کو

داغ تجھ عشق کا چمکے ہے مرے دل کے بیچ
بہر فتنے ہیں درخشاں نہ ہوا تھا سو ہوا

دے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

بل بے ساقی تیری بے پروائیاں
جا نہیں مشتاقوں کی لب تک آئیاں

اسی طرح چندی صفت میں اب جمع نہیں آتے

ظلم ہو گئیں دل پہ برہ کی ساعتیں کڑیاں — یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کی ہار ہو پڑیاں
چیز کیا ہوں جو کریں قتل وہ انکھیاں مجھ کو — پھر گئیں دیکھ کے منہ خنجر براں مجھ کو!
خیال ان انکھڑیوں کا چھوڑیو مت مرنے کے بعد بھی — دلا آیا جو تو اس میکدے میں جام لینا تھا
ناتوانی بھی عجب شے ہے کہ گلشن میں نسیم — نت لیے پھرتی ہے دوش اوپر بو رنگ بو مجھے

فارسی کی جمع کو اس وقت سب فصحا عموماً بولتے تھے۔ اب بغیر حالت صفت یا اضافت کے نہیں بولتے۔ سودا کہتے ہیں ؎

سودا غزل چمن میں تو ایسی ہی کہہ کے لا — گل پھاڑیں سن کے جیب کو دیں بلبلاں صدا
ہاتھ سے جاتا رہا دل کو دیکھ محبوباں کی چال — اور ایک جگہ کہتے ہیں
یاالٰہی میں کہوں کس سیتی اپنا احوال — زلف خوباں کی ہوئی ہے مرے جی کو جنجال

خوباں اور محبوباں۔ مرزا کی زبان پر بہت چڑھے ہوئے ہیں

اور خواجہ میر درد علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔

پرورش غم کی ترے یاں تئیں تو کی دیکھا — کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا
تو کب تئیں مجھ سات مری جان ملے گا — ایسا بھی کبھی ہو گا کہ پھر آن ملے گا!
گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر! — میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا
ساقی مرے بھی دل کی طرف ٹک نگاہ کر — لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہ گیا
اے آنسو و نہ آوے کچھ دل کی بات منہ پر — لڑکے ہو تم کہیں مت افشائے راز کرنا
ہم جانتے نہیں ہیں اے درد کیا ہے کعبہ — جیدھر ملے وہ ابرو اودھر نماز کرنا
کہا میں مرا حال تم تک بھی پہنچا — کہا تب اچنتا سا کچھ ہمیں سنا تھا
مرے دل کو جو ہر دم تو بھلا اتنا ٹٹولے ہے — تصور کے سوا تیرے بتا تو اس میں کیا نکلا؟
جائیے کس واسطے اے درد میخانے کے بیچ — اور ہی ہستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ
سو بار دیکھیاں ہیں تری بے وفائیاں — تس پر بھی نت غرور ہے دل میں گناہ کا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہو گا
کہ نہ ہنستے ہی رو دیا ہو گا!

درد کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانے — اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا
اے شانہ تو نہ ہو جو دشمن ہمارے جی کا — کہیں دیکھیو نہ ہووے زلفوں کا بال بیکا
اگر تجھ کو چلنا ہے۔ چل ساتھ میرے — یہ کب تک تو باتیں بناتا رہے گا؟
بعد مدت کے درد کل مجھ سے — مل گیا راہ میں وہ غنچہ دہن

میری اس کی جو لڑ گئیں نظریں　　　ہو گئے آنکھوں میں ہی دو دو سخن

ان کے عہد میں زبان میں کچھ کچھ اصلاح ہو گئی۔ مگر رسم الخط میں بہت کچھ بزرگوں کی میراث باقی تھی۔ ایک مجموعہ میرے ہاتھ آیا کہ سنہ ۱۱۷۰ھ کی تحریر ہے۔ وہ کسی فہمیدہ شخص نے بڑے شوق سے لکھا ہے اس میں　　　میر سوزؔ۔ تاباںؔ۔ فغاںؔ۔ سوداؔ۔ خواجہ میر دردؔ انعام اللہ خاں خواجہ آبروؔ۔ میر محمد باقر حزیںؔ۔ میر کمال الدین شاعرؔ۔ خواجہ احسن اللہ خاں بیاںؔ۔ قائم الدین قائمؔ کے دیوانوں کی انتخاب غزلیں ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عہد میں کو علامت مفعول کوںؔ لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ شاہ آبروؔ اور کمال الدین شاعرؔ وغیرہ نے جن غزلوں میں کو ردیف ہے۔ انہیں ردیف کںؔ ہی میں لکھا ہے۔ متاخرین نے ان کو دور کیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ واؤ کو معروف ہی بولتے تھے۔ چنانچہ خواجہ میر اثرؔ نے کہ خواجہ میر دردؔ کے بھائی تھے ایک بے ردیف غزل میں موؔ۔ روؔ۔ قافیہ رکھا ہے اور کو۔ استفہامیہ باندھا ہے۔ مرزا رفیع نے بھی ایک جگہ ایسا کہا ہے۔ ان کی ایک غزل ہے قفس کو۔ جرس کو۔ نفس کو اس کا مقطع یہ ہے:

ترغیب نہ کر سیرِ چمن کی ہمیں سوداؔ　　　ہر چند ہوا خوب ہے واں لیک ہوس کو

ایک غزل ہے ابرو نہیں۔ گیسو نہیں۔ اس میں کہتے ہیں۔

خط سبز اس کا سیہ۔ کچھ رو ہوا میرا اسفید　　　خواہشِ ترکِ نیاز و ناز دونو کو نہیں

حسن کے ترکِ عشق میرا ہنس کے کہتا وہ شوخ　　　نیل بگڑا ہے کہیں یا ردلقیں مجھ کو نہیں

الفاظ مفصلہ ذیل کی رسم الخط اس عہد میں اس طرح تھی۔

تو ...... توں　مجھے ...... مجھ سیں　اس نے ...... اُنے　تجھ ... تجھ کوں

سے ...... سیں　تو نے ...... تو نیں　جس نے ...... جنے　کسے ... کسو

اس سے ...... اس سیں　جوں ... جیوں　جی ...... جیو ......

اشعارِ مذکورہ بالا جو کہ حقیقت میں محاورہ مرحوم کے نقشِ مزار ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ نئے ہونہار یا اگلے وقتوں کی یادگار جو باقی ہیں انہیں پڑھ کر کہاں تک خیالات کو وسعت دیں گے۔ مجھے اس لکھنے سے فقط یہی مطلب نہیں کہ اس عہد تک زبان پر اتنی قدر قدامت کا اثر باقی تھا بلکہ ایک بڑی بات کا افسوس ظاہر کرنا منظور ہے۔ وہ یہ ہے کہ سوداؔ کی ۷۵ برس کی اپنی عمر اور تخمیناً ۵۵، ۶۰ برس ان کی شاعری کی عمر۔ میرؔ کی ۱۰۰ برس کی عمر، شاعری کی ۸۰۔ ۸۵ برس کی عمر اور اس بات سے کسی کو انکار نہ ہو گا۔ کہ جو زبان دلی کی ان کے اوائل کلام میں تھی وہی اوسط میں نہ تھی۔ پھر وہی اواخر میں نہ تھی۔ یقیناً تینوں زبانوں میں ظاہر اور واضح امتیاز ہوئے ہوں گے۔ مگر چونکہ رسم ملک نے دیوانوں

کی ترتیب حروف تہجی پر رکھی ہے۔ اس لئے آج ہم معلوم نہیں کر سکتے کہ ان کے عہدوں میں وقت بوقت ملکی زبانوں میں کیا کیا انقلاب ہوئے یا مختلف وقتوں میں خود ان کی طبیعت کے میلان اور زور کلام کے آثار چڑھاؤ کس کس درجے پر تھے۔ اس اندھیرے میں فقط دو شاعر ہمارے لئے چراغ رکھ گئے ہیں کہ حسب تفصیل ذیل چند قسموں میں اپنے کلام کو تقسیم کیا۔

| | ادائل عمر | عہد جوانی | سن کہولت | پیرانہ سالی |
|---|---|---|---|---|
| (۱) امیر خسرو | تحفۃ الصغر | غرۃ الکمال | وسط الحیوۃ | بقیہ نقیہ |
| (۲) جامی | ........ | فاتحۃ الشباب | واسطۃ العقد | خاتمۃ الحیوۃ |

خیر یہ سمجھ لو کہ جن الفاظ پر ہم لوگوں کے بہت کان کھڑے ہوتے ہیں یہی ان کے ادائل عمر یا جوانی کے کلام ہیں۔ منشی احمد حسن خاں صاحب میر تقی مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ انکی زبانی ڈپٹی کلب حسین خاں صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ اکثر الفاظ جو میر صاحب پہلے دوسرے دیوان میں کہہ گئے ہیں وہ چوتھے پانچویں میں نہیں ہیں جو دوسرے تیسرے میں ہیں۔ وہ پانچویں چھٹے میں نہیں۔ بہر حال اخیر عمر میں ان کی زبان کا اندازہ وہ ہوگا جو کہ سید انشاء، مصحفی، جرأت کی زبان ہے۔

**وَاللہ اَعلَم بحقیقت الحال**

# مرزا جانِ جاناں مظہرؔ

اگرچہ نظم کے جوش و خروش اور کثرتِ کلام کے لحاظ سے میرؔ اور سوداؔ کے ساتھ ان کا نام لیتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ صانع قدرت نے طبیعت کی لطافت اور اصلی نفاست اور ہر بات میں انداز کی خوبی اور خوبصورتی ان کے مزاج میں رکھی تھی۔ اور زمانہ بھی سب کا ایک تھا۔ اس کے علاوہ پرانے تذکرہ نویس لکھتے ہیں۔

بلکہ بزرگوں کی زبان سے بھی یہی سنا کہ زبان کی اصلاح اور انداز سخن اور طرز کے ایجاد میں انہیں ویسا ہی حق ہے جیسا کہ سوداؔ اور میرؔ کو۔ اسی واسطے ان کا حال بھی اس سلسلے میں لکھنا واجب ہے۔ ان کے والد عالمگیر کے دربار میں صاحبِ منصب تھے۔ نسب ان کا باپ کی طرف سے محمدؐ بن حنفیہ سے ملتا ہے کہ اگر حضرت علیؓ کے بیٹے تھے۔ بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی دربار شاہی میں صاحبِ منصب تھے۔ دادی اسد خاں وزیر عالمگیر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ پردادا سے اکبر بادشاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں۔ ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسے تھے ۱۱۱۱ھ میں جب کہ عالمگیر دکن پر فوج لیے پڑا تھا۔ ان کے والد نوکری چھوڑ کر دلی کو پھرے۔ یہ کالا باغ علاقہ مالوہ میں رمضان کو جمعہ کے دن پیدا ہوئے۔ عالمگیر کو خبر گزری۔ آئین سلطنت تھا کہ امرا کے ہاں اولاد ہو تو حضور میں عرض کریں۔ بادشاہ خود نام رکھیں یا پیش کیے ہوئے ناموں میں سے پسند کر دیں۔ کسی کو خود بھی بیٹا یا بیٹی کر لیتے یہ امور طرفین کے دلوں میں اتحاد اور محبت پیدا کرتے تھے۔ ان کے لئے ایک وقت پر سند ترقی ہوتے تھے۔ اور بادشاہوں کو ان سے وفاداری اور جان نثاری کی امیدیں ہوتی تھیں۔ شادی بھی اجازت سے ہوتی تھی۔ کبھی ماں باپ کی تجویز کو پسند کرتے تھے۔ کبھی خود تجویز کر دیتے تھے۔ غرض عالمگیر نے کہا کہ بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے۔ باپ مرزا جانؔ ہے اس کا نام ہم نے جان جاناں رکھا۔ پھر اگرچہ باپ نے شمس الدین نام رکھا۔ مگر عالمگیری نام کے سامنے نہ چمکا۔ مظہر تخلص انہوں نے آپ کیا کہ جانِ جاناں کے

ساتھ مشہور چلا آتا ہے۔ مرزا جان بھی شاعر تھے اور جانی تخلص کرتے تھے۔

۱۶ برس کی عمر تھی کہ باپ مر گئے۔ اسی وقت سے مشتِ خاک کو بزرگوں کے گوشۂ دامن میں باندھ دیا۔ ۳۰ برس کی عمر تک مدرسوں اور خانقاہوں میں جھاڑو دی اور جو دن بہارِ زندگی کے پھول ہوتے ہیں۔ انہیں بزرگوں کے روضوں پر چڑھا دیا۔ اس عہد میں تصوف کے خیالات ابر کی طرح ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ قطع نظر کمالِ شاعری کے ہزارہا مسلمان بلکہ ہندو بھی ان کے مرید تھے اور دل سے اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کے باب میں بہت سے لطائف ایسے مشہور ہیں۔ کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانے کے لوگ اچھا نہ سمجھیں۔ لیکن وہ ایک زمانہ تھا۔ کہ صفاتِ مذکورہ داخلِ فضائل تھیں۔ کچھ تو اس اعتقاد سے کہ خطائے بزرگان گرفتن خطاست اور کچھ اس سبب سے کہ اگر لطیف اور شفاف سطح پر کوئی داغ ہو اور وہ ایک عمدہ نظر گاہ میں جلوہ گر ہو تو وہاں وہ دھبا بدنما نہیں بلکہ گل کاری معلوم ہوتا ہے۔ اور جسے برا معلوم ہو وہ خوش عقیدہ نہیں میں روسیاہ بزرگوں کی ہر بات کو چشم عقیدت کا سرمہ سمجھتا ہوں۔ مگر مقتضائے زمانہ پر ... کے نمونے پر اکتفا کرنا چاہیئے۔

وہ خود بیان کرتے تھے کہ حسن صورت اور لطفِ معنیٰ کا عشق ابتدا سے میرے دل میں تھا۔ چھوٹے سن میں بھی مصرع موزوں زبان سے نکلتے تھے۔ شیر خوارگی کے عالم میں حسن کی طرف اس قدر میلان تھا کہ بدصورت کی گود میں نہ جاتا تھا۔ کوئی خوب صورت لیتا تھا تو ہمک کر جاتا تھا اور پھر اس سے لیتے تھے تو بمشکل آتا تھا۔

# میر عبدالحی تاباں

ان کے عہد میں میر عبدالحی تاباں تخلص ایک نوجوان شریف زادہ حسن و خوبی میں اس قدر شہرۂ آفاق تھا کہ خاص و عام اس کو یوسفِ ثانی کہتے تھے۔ گوری رنگت پر کالے کالے کپڑے بہت زیب دیتے تھے۔ اس لئے ہمیشہ سیاہ پوش رہتا تھا۔ اس کے حسن کی یہاں تک شہرت پھیلی کہ بادشاہ کو بھی دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ معلوم ہوا کہ مکان حبش خاں کے پھاٹک میں ہے۔ اور وہ بڑا دروازہ جو کوچۂ مذکور سے بازار لاہوری دروازہ میں نکلتا ہے۔ اس کے کوٹھے پر نشست ہے۔ زمانے کی تاثیر اور وقت کے خیالات کو دیکھنا چاہیئے کہ بادشاہ خود سوار ہو کر اس راہ سے نکلے۔ انہیں بھی خبر ہو گئی

تھی۔ بنے سنورے اور بازار کی طرف مونڈھا بچھا کر آ بیٹھے، بادشاہ جب اس مقام پر پہنچے تو اس لئے کہ ٹھہرنے کا ایک بہانہ ہو۔ وہاں آبِ حیات منگوایا اور پانی پی کر دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ الغرض تاباںؔ خود صاحب دیوان تھے۔ شاہ حاتم اور میر محمد علی حشمت کے شاگرد تھے۔ اور مرزا صاحب کے مرید تھے۔ مرزا صاحب بھی چشم محبت اور نگاہ شفقت سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مرزا صاحب بیٹھے ہیں اور ان کی صحبت میں کہ جہاں کبھی وعظ و ارشاد اور کبھی نظم و اشعار کا جلسہ رہتا تھا، تاباں بھی حاضر ہیں اور باادب اپنے مرشد کی خدمت میں بیٹھے ہیں حضرت اگرچہ محفل ارشاد کے آداب سے گرم جوشی ظاہر نہ کرتے تھے۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ دیکھتے ہیں اور مارے خوشی کے باغ باغ ہوئے جاتے ہیں۔

تاباںؔ بھی مزاج داں تھے۔ اشعار اور لطائف نمکیں کہتے۔ حضرت سُن سُن کر خوش ہوتے۔ کوئی بات سب کے سامنے کہنی خلاف ادب ہوتی تو جو اہل عقیدت میں ادب کا طریقہ ہے، اسی طرح دست بستہ عرض کرتے کہ کچھ اور بھی عرض کیا چاہتا ہوں۔ حضرت مسکرا کر اجازت دیتے۔ وہ کان کے پاس منہ لے جاتے اور چند کلمے چپکے چپکے ایسے گستاخانہ کہتے کہ سوا اس پیارے عزیز کے کوئی نہیں کہہ سکتا۔ جسے بزرگوں کی محبت نے گستاخ کیا ہوا۔ پس حضرت مسکراتے اور فرماتے کہ درست ہے۔ پھر وہ اسی قسم کی کچھ اور باتیں کہتے۔ پھر آپ فرماتے کہ یہ بالکل درست ہے۔ جب تاباں اپنی جگہ پر آ بیٹھتے تو حضرت خود کہتے کہ ایک بات کا تمہیں خیال نہیں رہا۔ تاباں پھر کان کے پاس منہ لے جاتے۔ اس وقت سے بھی تیز تر کوئی لطیفہ آپ اپنے حق میں کہتے اور اپنے پیارے عزیز کی ہم زبانی کا لطف حاصل کرتے۔ نہایت افسوس ہے کہ وہ پھول اپنی بہار میں لہلہاتا گر پڑا (ہائے میری دلی تیری جو بات ہے جہان سے نرالی ہے) جب اس یوسفِ ثانی نے عین جوانی میں دلوں پر داغ دیا تو تمام شہر نے اس کا سوگ رکھا میر تقی میرؔ نے بھی اپنی ایک غزل کے مقطع میں کہا ہے ؎

داغ ہے تاباںؔ علیہ الرحمۃ کا چھاتی پہ میر
ہو نجات اس کو بیچارا ہم سے بھی تھا آشنا

مرزا صاحب کی تحصیل عالمانہ نہ تھی مگر علم حدیث کو باصول پڑھا تھا حنفی مذہب کے ساتھ نقشبندی طریقے کے پابند تھے اور احکام شریعت کو صدق دل سے ادا کرتے تھے۔ اوضاع و اطوار اور ادب آداب نہایت سنجیدہ اور برجستہ تھے کہ جو شخص ان کی صحبت

میں بیٹھتا تھا۔ ہوشیار ہو کر بیٹھتا تھا۔ لطافتِ مزاج اور سلامتی طبع کی نقلیں ایسی ہیں کہ آج سن کر تعجب آتا ہے۔ خلافِ وضع اور بے اسلوب حالت کو دیکھ نہ سکتے تھے۔

نقل: ایک دن درزی ٹوپی سی کر لایا۔ اس کی تراش ٹیڑھی تھی۔ اس وقت دوسری ٹوپی موجود نہ تھی۔ اس لئے اسی کو پہنا مگر سر میں درد ہونے لگا۔

نقل: جس چارپائی میں کان ہو، اس پر بیٹھا نہ جاتا تھا گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ چنانچہ دلی دروازہ کے پاس ایک دن ہوادار میں سوار چلے جاتے تھے۔ راہ میں ایک بنیے کی چارپائی کے کان پر نظر جا پڑی۔ وہیں ٹھہر گئے اور جب تک اس کا کان نہ نکلوالیا آگے نہ بڑھے۔

نقل: ایک دن نواب صاحب کہ ان کے خاندان کے مرید تھے، ملاقات کو آئے اور خود صراحی لے کر پانی پیا۔ اتفاقاً آبخورا جو رکھا تو ٹیڑھا۔ مرزا کا مزاج اس قدر برہم ہوا کہ ہرگز ضبط نہ ہو سکا اور بگڑ کر کہا کہ عجب بے وقوف احمق تھا جس نے تمہیں نواب بنا دیا۔ آبخورا بھی صراحی پر رکھنا نہیں آتا۔

نقل: مولوی غلام یحییٰ فاضل جلیل، جنھوں نے میر زاہد پر حاشیہ لکھا ہے۔ بہ ہدایت غیبی مرزا کے مرید ہونے کو دلّی میں آئے۔ ان کی ڈاڑھی بہت بڑی اور گھن کی تھی۔ جمعہ کے دن جامع مسجد میں ملے اور ارادہ ظاہر کیا۔ مرزا نے ان کی، صورت کو غور سے دیکھا اور کہا کہ اگر مجھ سے آپ بیعت کیا چاہتے ہیں۔ تو پہلے ڈاڑھی ترشوا کر صورت بھلے آدمیوں کی بنائیے پھر تشریف لایئے۔ اللہُ جمیلٌ و یحبّ الجمال بھلا یہ ریچ کی صورت مجھ کو اچھی نہیں معلوم ہوتی تو خدا کو کب پسند آئے گی۔ ملّا متشرع آدمی تھے۔ گھر میں بیٹھ رہے۔ تین دن تک برابر خواب میں دیکھا کہ بغیر مرزا کے تمہارا عقدۂ دل نہ کھلے گا۔ آخر بے چارے نے ڈاڑھی حجام کے سپرد کی اور جیسا خشخاشی خط مرزا صاحب کا تھا، ویسا ہی رکھ کر مریدوں میں داخل ہوئے۔

اسی لطافتِ مزاج اور نزاکتِ طبع کا نتیجہ ہے کہ زبان کی طرف توجہ کی اور اسے تراشا کہ جو شعرائے پہلے گزرے تھے۔ انہیں پیچھے ہی چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کر دیا اور اپنی زبان کو نیا نمونہ تراش کر دیا۔ جس سے برا نا رستہ ایہام گوئی کا زمین شعر سے مٹ گیا۔ ان کے کلام میں مضامین عاشقانہ عجب تڑپھ دکھاتے ہیں۔ اور یہ مقام تعجب نہیں کیوں کہ وہ قدرتی عاشقِ مزاج تھے۔ اوروں کے کلام میں یہ مضامین خیال ہیں۔ ان کے اصلی حال ہیں۔ زبان ان کی نہایت صاف و شستہ و شفاف ہے۔ اس وقت کے محاورے

کی کیفیت کچھ ان کے اشعار سے اور کچھ اس گفتگو سے معلوم ہوگی جو ایک دفعہ بروقت ملاقات ان سے اور سید انشاؔ سے ہوئی۔ چنانچہ اصل عبارت "دریائے لطافت" سے نقل کی جاتی ہے۔

# سیّد انشاء اللہ خاں اور مرزا جانجاناں مظہر کی ملاقات

درزمانیکہ راقم مدتے ہمراہ والد مرحوم مغفور وارد دارالخلافہ بود۔ ازبسکہ آوازۂ فصاحت و بلاغت جناب فیض مآب مرزا جان جاناں مظہر علیہ الرحمۃ گوش راقم را متقر خود داشت دل بادیدہ مستعد ستیزہ شد کہ چرا از دیدار مرزا صاحب خود را ایں ہمہ محروم مے پسندی و مرا از لذت جاودانی و عیش روحانی کہ در کلام معجز نظام آنحضرت است باز میداری چار ونا چار خط را تراش دادہ جامہ ململ ڈھاکہ پوشیدہ دستار سرخ باندھیو بر سر گذاشتم و دیگر لباس ہم ازیں قبیل واز سلاح آنچہ با خود گرفتم کٹار بسیار خوبے بود کہ بکمر زدہ بودم۔ بایں ہیئت بسواری فیل روانہ خدمت سراپا افادت ایشاں شدم۔ چوں بالائے بام کہ کیول رام بانیہ متصل جامع مسجد ساختہ پیش کش مرزا صاحب کردہ بود برآمدم۔ دیدم کہ جناب معزی الیہ با پیراہن و کلاہ سفید و دوپٹہ تاسپالی رنگ بصورت سموسہ بر دوش گذاشتہ نشستہ اند بہ کمال ادب سلامے بر ایشاں کردم از فرط عنایت و کثرت مکارم اخلاق کہ شیوہ ستودۂ بزرگان خدا پرست است بجواب سلام ملتفت شدہ برخاستند و سر ایں بے لیاقت را در کنار گرفتہ بہ پہلوئے خود جا دادند۔

مرزا صاحب کا ایک دیوان فارسی ہے کہ خود ۶۰ برس کی عمر ۱۱۷۰ھ میں ۲۰ ہزار شعر میں سے ایک ہزار شعر انتخاب کیا تھا۔ اسی واسطے اکثر غزلیں ناتمام اور بے ترتیب ہیں۔ اس کو انتہائی درجے کی منصفی اور سلامتی طبع سمجھنا چاہیئے ورنہ اپنے اشعار کہ اولاد معنوی ہوتے ہیں۔ کس کا جگر ہے کہ اپنے ہاتھ سے کاٹے۔ فارسی بھی بہت شستہ ہے اور مضامین عاشقانہ ایک انداز کے ساتھ بندھے ہیں۔

مرا چہ جرم کہ ہر نالہ ام زموزونی
غلط کنند عزیزاں بمصرعۂ استاد

اردو میں بھی پورا دیوان نہیں۔ غزلیں اور اشعار ہیں جو سودا اور میر کی زبان ہے۔

وہی ان کی زبان ہے۔ لیکن سودا بھلا کسے خاطر میں لاتے تھے۔ چنانچہ سب آداب اور رعاتیوں کو بالائے طاق رکھ کر فرماتے ہیں ؎

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ
سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ
واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹھ کا
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ
اور ریختہ بھی ہے تو فرزشہ (فیروزشاہ) کی لاٹھ کا
القصہ اس کا حال یہی ہے جو بیچ کہوں
کتّا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

**خریطۂ جواہر** ایک مختصر انتخاب اساتذہ فارس کے اشعار کا ہے کہ اپنی پسند کے بموجب لکھتے گئے تھے۔ وہ حقیقت میں خریطۂ جواہر ہے۔

جب کہ صحرائے نا میں ۹، منزلیں عمر کی طے کر ۸۰ میں قدم رکھا تو دل کو آگاہی ہونے لگی کہ اب روح مسافر بدن کا بوجھ پھینکا چاہتا ہے۔ چنانچہ خود اکثر تحریروں اور تقریروں میں صاف صاف اظہار کرتے تھے۔

**نقل** ایک معتقد کا بیٹا حسنِ اعتقاد سے غزل لے کر آیا کہ شاگرد ہو اور اصلاح لے انہوں نے کہا کہ اصلاح کے ہوش و حواس کسے ہیں اب عالم کچھ اور ہے۔ عرض کی کہ میں بطور تبرک سعادت حاصل کرنی چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ اس وقت ایک شعر خیال میں آیا ہے اسی کو تبرک اور اسی کو اصلاح سمجھ لو۔

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر
فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

غرض ساتویں محرم کی تھی رات کے وقت ایک شخص مٹھائی کی ٹوکری ہاتھ میں لئے آیا۔ دروازہ بند تھا آواز دی اور ظاہر کیا کہ مرید ہوں نذر لے کر آیا ہوں۔ وہ باہر نکلے۔ تو قرابین ماری کہ گولی سینے کے پار ہو گئی۔ وہ تو بھاگ گیا۔ مگر انہیں زخم کاری آیا۔ تین دن تک زندہ رہے اس عالم اضطراب میں لوٹتے تھے اور اپنا ہی شعر پڑھتے تھے۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یہ تین دن نہایت استقلال اور ثابت قدمی سے گزارے بلکہ جب شاہ عالم بادشاہ کو خبر پہنچی تو بعد تحقیقات کے کہلا بھیجا کہ قاتل نہیں ملتا۔ نشان بتایئے تو ہم اسے سزا دیں جواب میں کہا کہ فقیر کشتۂ راہ خدا ہیں اور مردے کا مارنا قتل نہیں۔ قاتل ملے تو آپ سزا نہ دیں۔ یہاں بھیج دیں۔ آخر دسویں کو شام کے وقت دنیا سے انتقال کیا۔ بہت لوگوں نے تاریخیں کہیں۔ مگر درجہ اول پر میر قمر الدین منّت کی تاریخ ہے جس کا مادہ خاص الفاظ حدیث ہیں اور اتفاق یہ کہ موزون ہیں۔ عاش حمیداً مات شہیداً"

اس قتل کا سبب دلّی کے خاص و عام میں مشہور تھا کہ بموجب رسم کے ساتویں کو علم اٹھے تھے۔ یہ سرراہ اپنے بالا خانے پر خاص خاص مریدوں کو لیے بیٹھے تھے۔ جیسا کہ عوام جہلا کی عادت ہے۔ شائد طرفین سے کچھ کچھ طعن و تعریض ہوئے ہوں۔ وہ کسی جاہل کو ناگوار ہوئے۔ ان میں کوئی سنگدل فولاد خاں نام سخت جاہل تھا۔ اس نے یہ حرکت کی۔ لیکن حکیم قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب اپنے کلام میں اکثر اشعار حضرتؑ علی کی مدح میں کہا کرتے تھے، اس پر بگڑ کر کسی سنّی نے یہ حرکت کی۔

نہ کرد مظہر ما طاعتے و رفت بخاک!
نجات خود بہ تولائے بوتراب گزاشت

جدّ مرحوم ایک اردو کا شعر ان کے نام سے پڑھا کرتے تھے:

ہوں تو سُنّی پر علی کا صدق دل سے ہوں غلام
خواہ ایرانی کہو تم خواہ تورانی مجھے

دلّی میں چتلی قبر کے پاس گھر ہی میں دفن کر دیا تھا کہ اب خانقاہ کہلاتی ہے۔ قبر پر انہی کا شعر لکھا ہے ؎

بہ لوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیرے

تاریخ مرزا رفیع سودا نے بھی کہی ؎

مرزا کا ہوا جو قاتل ایک مرتدِ شوم
اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم

تاریخ از روے۔ درد یہ سن کے کہی
سودا نے کہ ہائے جانجاناں مظلوم

اس لکھنے سے مجھے اظہار اس امر کا منظور ہے[۱۱۹۵] کہ ہجو ہماری نظم کی ایک خاردار شاخ ہے جس کے پھل سے پھول تک میں بے لطفی بھری ہے اور اپنی زمین اور دہقان دونوں کی کثافت طبع پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ اس میں بھی مرزا رفیع مرحوم سب سے زیادہ بدنام ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا تھا باعث اس کا فقط شوخیِ طبع یا کوئی عارضی جوشِ ناراضی کا ہوتا تھا اور مادۂ کثافت فقط اتنا ہوتا تھا کہ جب الفاظ کاغذ پر آجاتے تھے تو دل صاف ہو جاتا تھا۔ چنانچہ تاریخ مذکور کے الفاظ دل کی صفائی کا حال ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارا زمانہ ایسے مہذب اور شائستہ لوگوں سے آراستہ ہے کہ لفظ ہجو کو گالی سمجھتے ہیں مگر دلوں کا مالک اللہ ہے۔

ان کے شاگردوں میں میر محمد باقر حزیں۔ بساون لعل بیدار، خواجہ احسن اللہ خاں بیاں، انعام اللہ خاں یقین، مشہور صاحب دیوان اور اچھے شاعر ہوئے۔ ان کی غزلیں تمام و کمال نہ ملیں۔ جو کچھ سردست حاضر تھا، درج کیا۔

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے کی زندگی کٹتی
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا
ڈبایا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا

زلیخا کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشقِ بدگماں اپنا

مرا جی جلتا ہے اس بلبل بیکس کی غربت پر
کہ جن نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جان جاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

لوگ کہتے ہیں موا مظہر بے کس افسوس
کیا ہوا اس کو وہ اتنا بھی تو بیمار نہ تھا

جواں مارا گیا خوباں کے بدلے میرزا مظہر
بھلا تھا یا برا تھا۔ زور کچھ تھا خوب کام آیا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار

شاخِ گل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو!
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
نہیں آتا اسے تکیے پہ آرام
یہ سر پاؤں سے تیرے ہل رہا ہے
اگر ملیے تو خفت ہے وگر دوری قیامت ہے
غرض نازک دماغوں کو محبت سخت آفت ہے
کوئی لیوے دل اپنے کی خبر یا دلبر اپنے کی
کسی کا یار جب عاشق کہیں ہو کیا قیامت ہے
توفیق دے کہ شور سے اک دم تو چپ رہے
آخر مرا یہ دل ہے الٰہی جرس نہیں

# غزل ہائے تاباںؔ

نہیں ہے دوست اپنا یار اپنا مہرباں اپنا
سناؤں کس کو غم اپنا الم اپنا بیاں اپنا
بہت چاہا کہ آوے یار یا اس دل کو صبر آوے
نہ یار آیا نہ صبر آیا دیا جی میں نداں اپنا
قفس میں تڑپتے ہیں یہ عندلیباں سخت بے بس ہیں
نہ گلشن دیکھ سکتے ہیں نہ یہ اب آشیاں اپنا
مجھے آتا ہے رونا ایسی تنہائی پہ اے تاباںؔ
نہ یار اپنا نہ دل اپنا نہ تن اپنا نہ جاں اپنا

رہتا ہوں خاک و خوں میں سدا لوٹتا ہوا
میرے غریب دل کو الٰہی یہ کیا ہوا
ہیں اپنے دل کو غنچۂ تصویر کی طرح
یارب کبھو خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہوا
ناصح عبث نصیحت بیہودہ تو نہ کر
ممکن نہیں کہ چھوٹ سکے دل لگا ہوا
ہم بے کسی پہ اپنی نہ روویں تو کیا کریں
دل سا رفیق ہائے ہمارا جدا ہوا

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو، ہوا سو ہوا
تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا
سبب جو میری شہادت کا یار سے پوچھا
کہا کہ اب تو اسے گاڑ دو ہوا سو ہوا
یہ درد عشق ہے میرا نہیں علاج طبیب
ہزار کوئی دوائیں کرد ہوا سو ہوا
بھلے بُرے کی ترے عشق میں اڑا دی شرم
ہمارے حق میں کوئی کچھ کہو ہوا سو ہوا

نہ پائی خاک بھی تاباں کی ہم نے پھر ظالم
وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا

سن فصلِ گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں
کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں

بیمار ہے۔ زمیں سے اٹھتی نہیں عصا بن
نرگس کو تم نے شاید آنکھیں دکھائیاں ہیں

آئینہ روبرو رکھ اور اپنی چھب دکھانا
کیا خود پسندیاں ہیں کیا خود نمائیاں ہیں

دیکھے سے آئینہ بھی حیران ہے ترا رو
چہرے کے بیچ تیرے کیا کیا صفائیاں ہیں

خورشید گر کہوں میں تو جان ہے وہ پیلا
جو مہ کہوں ترا رو اس پر تو چھائیاں ہیں

جب پان کھا کے پیارا گلشن میں جا ہنسا ہے
بے اختیار کلیاں تب کھل کھلائیاں ہیں

کہتے تھے ہم کسی سے تم بن نہیں ملیں گے
اب کس کے ساتھ پیارے دے دلربائیاں ہیں

عاشق سے گرم ملنا پھر بات بھی نہ کہنا!
کیا بے مروتی ہے کیا بے وفائیاں ہیں

افسوس اے صنم تم ایسے ہوئے ہو ابتر
ملتے تو غیر سے جا ہم سے روکھائیاں ہیں

قسمت میں دیکھیں کیا ہے جیتے رہیں کہ مر جائیں
قاتل سے ہم نے یارو آنکھیں لڑائیاں ہیں

اب مہرباں ہوا ہے تاباں ترا ستمگر
آہیں تری کسی نے شاید سنائیاں ہیں

# مرزا محمد رفیع سودا

سودا تخلص مرزا محمد رفیع نام۔ شہر دہلی کو ان کے کمال سے فخر ہے۔ باپ مرزا محمد شفیع میرزایان کابل سے تھے۔ بزرگوں کا پیشہ سپاہ گری تھا۔ مرزا شفیع بطریق تجارت وارد ہندوستان ہوئے۔ ہند کی خاک دامنگیر نے ایسے قدم پکڑے کہ یہیں رہے بعض کا قول ہے کہ باپ کی سوداگری سودا کے لئے وجہ تخلص ہوئی۔ لیکن بات یہ ہے کہ ایشیا کے شاعر ہر ملک میں عشق کا دم بھرتے ہیں اور سودا اور دیوانگی عشق کے ہمزاد ہیں۔ اس لئے وہ بھی ان بزرگوں کے لئے باعث فخر ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے سودا تخلص کیا اور سوداگری کی بدولت ایہام کی صنعت رونق میں آئی۔

سودا ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ دلی میں پرورش اور تربیت پائی۔ کابلی دروازہ کے علاقہ میں ان کا گھر تھا۔ ایک بڑے پھاٹک میں نشست رہتی تھی۔ شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ اکثر ادھر ٹہلتے ہوئے جا نکلتے تھے۔ میں ہمرکاب ہوتا تھا مرزا

کے وقت کے حالات اور مقامات کے ذکر کر کے قدرت خدا کو یاد کیا کرتے تھے۔

سودا بموجب رسم زمانہ کے اوّل سلیمان قلی خاں وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے شاہ موصوف نے بھی اپنے دیوان کے دیباچے میں جو شاگردوں کی فہرست لکھی ہے، اس میں مرزا کا نام اس طرح لکھا ہے، جس سے فخر کی خوشبو آتی ہے۔ خوشا نصیب اس استاد کے جس کی گود میں ایسا شاگرد پل کر بڑا ہو۔ خان آرزو کے شاگرد نہ تھے۔ مگر ان کی صحبت سے بہت فائدے حاصل کئے۔ چنانچہ پہلے فارسی شعر کہا کرتے تھے۔ خان آرزو نے کہا کہ مرزا فارسی اب تمہاری زبان مادری نہیں۔ اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمہارا کلام اہل زبان کے مقابل میں قابل تعریف ہو۔ طبع موزوں ہے، شعر سے نہایت مناسبت رکھتی ہے۔ تم اردو کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہو گے۔ مرزا بھی سمجھ گئے اور دیرانہ سال استاد کی نصیحت پر عمل کیا۔ غرض طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دلی جیسے شہر میں ان کی استادی نے خاص و عام سے اقرار لیا کہ ان کے سامنے ہی ان کی غزلیں گھر گھر اور کوچہ و بازار میں خاص و عام کی زبانوں پر جاری تھیں۔

جب کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے اور فرمائشیں کرنے لگے۔ ایک دن کسی غزل کے لئے تقاضا کیا۔ انہوں نے عذر بیان کیا۔ حضور نے فرمایا۔ بھئی مرزا کے غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟ مرزا نے کہا پیرو مرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے۔ دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ حضور نے فرمایا بھئی ہم تو پاخانے میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی، حضور! ویسی بو بھی آتی ہے یہ کہہ کر چلے آئے۔ بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بلا بھیجا اور کہا کہ ہماری غزلیں بناؤ۔ ہم تمہیں ملک الشعرا کر دیں گے۔ یہ نہ گئے اور کہا کہ حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے۔ کرے گا تو میرا کلام ملک الشعرا کرے گا اور ایک بڑا مخمس شہر آشوب لکھا۔ ع

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے ڈانواں ڈول

بے درد ظاہر بین کہتے ہیں کہ بادشاہ اور دربار بادشاہ کی ہجو کی ہے۔ غور سے دیکھو تو ملک کی دلسوزی میں اپنے وطن کا مرثیہ کہا ہے۔

مرزا دل شکستہ ہو کر گھر میں بیٹھ رہے۔ قدر دان موجود تھے۔ کچھ پروا نہ ہوئی ان میں اکثر روسا اور امرا خصوصاً مہرباں خاں اور بسنت خاں ہیں۔ جن کی تعریف میں

قصیدہ کہا ہے۔

کل حرص نام شخصے سودا پہ مہربان ہو

بولا نصیب تیرے سب دولت جہاں ہو

حرص کی زبانی دنیا کی دولت اور نعمتوں کا ذکر کر کے خود کہتے ہیں کہ اے حرص!

جو کچھ کہا ہے تو نے یہ تجھ کو سب مبارک

میں اور میرے سر پہ میر البسنت خاں ہو

ان لوگوں کی بدولت ایسی فارغ البالی سے گزرتی تھی کہ ان کے کلام کا شہرہ جب نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ میں سنا تو کمال اشتیاق سے برادرمن مشفقِ مہربان من لکھ کر خط مع سفر خرچ بھیجا اور طلب کیا۔ انہیں دلی کا چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ جواب میں فقط رباعی پر حسنِ معذرت کو ختم کیا ہے

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک؟

آوارہ ازیں کوچہ باں کو کب تک؟

حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے

بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

کئی برس کے بعد وہ قدردان مرگئے۔ زمانے بدل گئے۔ سودا بہت گھبرائے اس عہد میں ایسے تباہی زدوں کے لئے دو ٹھکانے تھے۔ لکھنؤ یا حیدرآباد۔ لکھنؤ پاس تھا اور فیض و سخاوت کی گنگا بہ رہی تھی۔ اس لئے جو دلی سے نکلتا تھا ادھر ہی رخ کرتا تھا۔ اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ پھر دوسری طرف خیال نہ جاتا تھا۔ اس وقت حاکم بلکہ وہاں کے محکوم بھی جو یائے کمال تھے۔ نکتے کو کتاب کے مولوں خریدتے تھے۔

غرض ۶۰ یا ۶۶ برس کی عمر میں دلی سے نکل کر چند روز فرخ آباد میں نواب بنگش کے پاس رہے۔ اس کی تعریف میں بھی کئی قصیدے موجود ہیں۔ وہاں سے ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے۔ نواب شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی۔ وہ بہت اعزاز سے ملے اور ان کے آنے پر کمال خرسندی ظاہر کی۔ لیکن یا تو بے تکلفی سے یا طنز سے اتنا کہا کہ مرزا وہ رباعی تمہاری اب تک میرے دل پر نقش ہے۔ اور اسی کو مکرر پڑھا۔ انہیں اپنے حال پر بڑا رنج ہوا۔ اور پاس وضعداری پھر دربار نہ گئے۔ یہاں تک کہ شجاع الدولہ مرگئے اور آصف الدولہ مسند نشین ہوئے۔

لکھنؤ میں مرزا فاخر مکین زبانِ فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ ان سے اور مرزا

رفیع سے بگڑی اور جھگڑے نے ایسا طول کھینچا کہ نواب آصف الدولہ کے دربار تک نوبت پہنچی (عنقریب اس کا حال بہ تفصیل بیان کیا جائے گا۔) انجام یہ ہوا کہ علاوہ انعام و اکرام کے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ہو گیا اور نواب نہایت شفقت کی نظر فرمانے لگے۔ اکثر حرم سرا میں خاصہ پر بیٹھے ہوتے اور مرزا کی اطلاع ہوتی فوراً۔ باہر نکل آتے تھے۔ شعر سن کر خوش ہوتے اور انہیں انعام سے خوش کرتے تھے۔

جب تک مرزا زندہ رہے، نواب مغفرت مآب اور اہل لکھنؤ کی قدر دانی سے ہر طرح فارغ البال رہے۔ تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں وہیں دنیا سے انتقال کیا۔ شاہ حاتم زندہ تھے۔ سن کر بہت روے اور کہا کہ افسوس ہمارا پہلوان سخن مر گیا۔

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ اواخر عمر میں مرزا نے دلّی چھوڑی۔ تذکرہ دلکشا میں ہے کہ ۶۶ برس کی عمر میں گئے۔ تعجب ہے کہ مجموعہ سخن جو لکھنؤ میں لکھا گیا۔ اس میں ہے کہ مرزا عالم شباب میں واردِ لکھنؤ ہوئے۔ غرض چونکہ شجاع الدولہ ۱۱۸۸ھ میں فوت ہوئے تو مرزا نے کم و بیش ۷۰ برس کی عمر پائی۔

ان کے بعد کمال بھی خاندان سے نیست و نابود ہو گیا۔ راقم آثم ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ گیا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک شخص ملے کہ ان کے نواسے کہلاتے تھے۔ بے چارے پڑھے لکھے بھی نہ تھے اور نہایت آشفتہ حال تھے۔ سچ ہے ؎

میراثِ پدر خواہی علم پدر آموز

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی!

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

ان کا کلیات ہر جگہ مل سکتا ہے اور قدر و منزلت کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے حکیم سید اصلح الدین خاں نے ترتیب دیا تھا اور اس پر دیباچہ بھی لکھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے پرانے محاوروں سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو سرتاپا نظم اور انشائے اردو کا دستور العمل ہے۔ اول قصائد اردو بزرگان دین کی مدح میں اور اہل دول کی تعریف میں۔ اسی طرح چند قصائد فارسی ۲۴ مثنویاں ہیں بہت سی حکائتیں اور لطائف منظوم ہیں۔ ایک مختصر دیوان فارسی کا تمام و کمال دیوان ریختہ جس میں بہت سی لاجواب غزلیں اور مطلع رباعیاں۔ مستزاد۔ قطعات۔ تاریخیں۔ پہیلیاں۔ واسوخت۔ ترجیع بند۔ مخمس سب کچھ کہا ہے اور ہر قسم کی نظم میں ہجویں ہیں۔ جو ان کے مخالفوں کے دل و جگر کو کبھی

خون اور کبھی کباب کرتی ہیں۔ اب تذکرہ شعرائے اُردو کا ہے اور وہ نایاب ہے

غزلیں اردو میں پہلے سے بھی لوگ کہہ رہے تھے۔ مگر دوسرے طبقے تک اگر شعرائے کچھ مدح میں کہا ہے تو ایسا ہے کہ اسے قصیدہ نہیں کہہ سکتے۔ پس اوّل قصائد کا کہنا اور پھر دھوم دھام سے اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا ان کا فخر ہے۔ وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عناں و عناں ہی نہیں گئے۔ بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے۔ ان کے کلام کا زور شور انوری اور خاقانی کو دباتا ہے اور نزاکت مضمون میں عرفی و ظہوری کو شرماتا ہے۔

مثنویاں ۴۴ ، ۴۲ ہیں اور حکایتیں اور لطائف وغیرہ ہیں۔ وہ سب نظم اور فصاحت کلام کے اعتبار سے ان کا جوہرِ طبعی ظاہر کرتی ہیں۔ مگر عاشقانہ مثنویاں ان کے مرتبے کے لائق نہیں۔ میر حسن مرحوم تو کیا، میر صاحب کے "شعلۂ عشق" اور " دریائے عشق" کو بھی نہیں پہنچیں۔ فارسی کے مختصر دیوان میں سب ردیفیں پوری ہیں۔ زورِ طبع اور اصول شاعرانہ سب قائم ہیں۔ صائب کا انداز ہے مگر تجربہ کار جانتے ہیں کہ ایک زبان کی مشق اور مزاولت دوسری زبان کے اعلیٰ درجہ کمال پر پہنچنے میں سنگِ راہ ہوتی ہے۔ چنانچہ شیخ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے "آخر آخر خیالِ شعرِ فارسی ہم پیدا کرد۔ مگر از فہم و عقلش این امر بعید بود کہ کرد۔ غرض غزلہائے فارسی خود نیز کہ در لکھنؤ گفتہ بقیدِ ردیف ترتیب دادہ داخل دیوان ریختہ نمودہ و ایں ایجاد اوست" دیوان ریختہ (وقت کی زبان سے قطع نظر کرکے) باعتبار جوہر کلام کے سرتاپا مرصّع ہے۔ بہت سی غزلیں دلچسپ اور دل پسند بحروں میں ہیں کہ اس وقت تک اردو میں نہیں آئی تھیں۔ زمینیں سنگلاخ ہیں اور ردیف قافیے بہت مشکل۔ مگر جس پہلو سے انہیں جما دیا ہے ایسے جمے ہیں کہ دوسرے پہلو سے کوئی بٹھائے تو تمہیں معلوم ہو۔

گرمیِ کلام کے ساتھ ظرافت جو ان کی زبان سے ٹپکتی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑھاپے تک شوخی طفلانہ ان کے مزاج میں امنگ دکھاتی تھی۔ مگر ہجووں کا مجموعہ جو کلیات میں ہے اس کا ورق ورق ملنے والوں کے لئے زعفران زار کشمیر کی کیاریاں ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت کی شگفتگی اور زندہ دلی کسی طرح کے فکر و تردّد کو پاس نہ آنے دیتی تھی۔ گرمی اور مزاج کی تیزی بجلی کا حکم رکھتی تھی اور اس شدت کیساتھ کہ نہ کوئی انعام اسے بجھا سکتا تھا نہ کوئی خطرہ اسے دبا سکتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ ذرا سی

ناراضی میں بے اختیار ہو جاتے تھے۔ کچھ اور بس نہ چلتا تھا۔ جھٹ ایک ہجو کا طومار تیار کر دیتے تھے۔

غنچہ نام ان کا ایک غلام تھا۔ ہر وقت خدمت میں حاضر رہتا تھا اور ساتھ قلم دان لئے پھرتا تھا۔ جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے "ارے غنچہ لا تو قلمدان۔ ذرا میں اس کی خبر تو لوں۔ یہ مجھے سمجھا کیا ہے۔" پھر شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منہ کھول کر وہ بے نقط سناتے تھے کہ شیطان بھی امان مانگے۔

عربی اور فارسی دو ذخیرہ دار اردو کے ہیں۔ ان کے خزانے میں ہجوؤں کے تھیلے بھرے ہیں۔ مگر اس وقت تک اردو کے شاعر صرف ایک دو شعروں میں دل کا غبار نکال لیتے تھے۔ یہ طرز خاص کہ جس سے ہجو ایک موٹا ٹہنا اس باغ شاعری کا ہو گئی۔ انہی کی خوبیاں ہیں۔ عالم۔ جاہل۔ فقیر۔ امیر۔ نیک۔ بد کسی کی داڑھی ان کے ہاتھ سے نہیں بچی اس طرح پیچھے پڑتے تھے کہ انسان جان سے بیزار ہو جاتا تھا۔ مگر میر ضاحک، فدوی، مکین، بقا وغیرہ اہل کمال تھے بھی چھوڑتے نہیں۔ ان کا کہنا انہیں کے دامن میں ڈالا ہے۔ البتہ حسن قبول اور شہرتِ عام ایک نعمت ہے کہ وہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ انہیں خدا نے دی۔ وہ محروم رہے۔ مرزا نے جو کچھ کہا بچے بچے کی زبان پر ہے۔ انہوں نے جو کہا وہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ انہیں میں سے ایک شعر ہے کہ فدوی کی طبع موزون سے مرزا صاحب کی شان میں واقع ہوا ہے۔

کچھ کٹ گئی ہے پیٹی کچھ کٹ گیا ہے ڈوڑا
دُم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لٹوڑا

ع بھڑوا ہے مسخرا ہے سودا اسے ہوا ہے۔

مرزا نے جو راجہ نرپت سنگھ کے ہاتھی کی ہجو میں مثنوی کہی ہے۔ اس کے جواب میں بھی کسی نے مثنوی لکھی ہے اور خوب لکھی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

تم اپنے فیلِ معنی کو نکالو
مرے ہاتھی سے دو ٹکر لڑا لو

سید انشا نے لکھا ہے کہ دو ٹکریں چاہیئے۔ یہ سید صاحب کی سینہ زوری ہے۔

ہجوؤں میں ایک ساقی نامہ ہے۔ جس میں فوقی شاعر کی ہجو ہے۔ اصل میں قیام الدین قائم کی ہجو میں تھا۔ وہ بزرگ باوجود شاگردی کے مرزا سے منحرف ہو گئے تھے۔ جب

یہ ساقی نامہ لکھا گیا تو گھبرائے اور آکر خطا معاف کروائی۔ مرزا نے ان کا نام نکال دیا۔ اور فوقی ایک فرضی شخص کا نام ڈال دیا۔

مرثیے اور سلام بھی بہت کہے ہیں۔ اس زمانے میں مسدس کی رسم کم تھی۔ اکثر مرثیے چومصرعے ہیں مگر مرثیہ گوئی کی آج کی ترقی دیکھ کر ان کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ شاید انہی مرثیوں کو دیکھ کر اگلے وقتوں میں مثل مشہور ہوتی تھی۔ کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویّا مرثیہ خواں۔ حق یہ ہے کہ مرثیہ کا شاعر گویا ایک مصیبت زدہ ہوتا ہے کہ اپنا دکھڑا روتا ہے۔ جب کسی کا کوئی مر جاتا ہے تو غم و اندوہ کے عالم میں جو بے چارے کی زبان سے نکلتا ہے سو کہتا ہے اس پر کون بے درد ہے جو اعتراض کرے۔ وہاں صحت و غلطی اور ضائع و بدائع کو کیا ڈھونڈتا یہ لوگ فقط اعتقادِ مذہبی کو مدّنظر رکھ کر مرثیے سلام کہتے تھے۔ اس لئے قواعدِ شعری کی احتیاط کم کرتے تھے۔ اور کوئی اس پر گرفت بھی نہ کرتا۔ پھر بھی مرزا کی تیغ زبان جب اپنی اصالت دکھاتی ہے۔ تو دلوں میں چھریاں ہی مار جاتی ہے۔ ایک مطلع ہے ؎

نہیں ہلال فلک پر مہ محرم کا
چڑھا ہے چرخ پہ تیغا مصیبت و غم کا

ایک اور مرثیے کا مطلع ہے ؎

یارو سنو تو خالقِ اکبر کے واسطے
انصاف سے جواب دو حیدر کے واسطے
وہ بوسہ گہ بنی تھی پیمبر کے واسطے
یا ظالموں کی برشِ خنجر کے واسطے

باوجود عیوبِ مذکورہ بالا کے جہاں کوئی حالت اور روئداد دکھاتے ہیں، پتھر کا دل ہو تو پانی ہوتا ہے۔ اور وہ ضرور آجکل کے مرثیہ گویوں کو دیکھنی چاہیئے۔ کیوں کہ یہ لوگ اپنے زورِ کمال میں آکر اس کوچے سے نکل گئے ہیں۔

واسوخت مخمس، ترجیع بند، مستزاد، قطعہ، رُباعیاں، پہیلیاں وغیرہ اپنی اپنی طرز میں لاجواب ہیں۔ خصوصاً تاریخیں بے کم و کاست ایسی برمحل و برجستہ واقع ہوئی ہیں کہ ان کے عدمِ شہرت کا تعجب ہے۔ غرض جو کچھ کہا ہے اسے اعلےٰ درجہ کمال پر پہنچایا ہے۔ مرزا کی زبان کا حال نظم میں تو سب کو معلوم ہے کہ کبھی دودھ ہے کبھی شربت مگر نثر میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ فقط مصری کی ڈلیاں چبانی پڑتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ نثرِ اردو ابھی بچہ ہے۔ زبان نہیں کھلی چنانچہ شعلۂ عشق کی عبارت سے واضح ہے کہ اردو ہے

مگر مرزا بیدل کی نثر فارسی معلوم ہوتی ہے۔ کتاب مذکور اس وقت موجود نہیں۔ لیکن ایک دیباچے میں انہوں نے تھوڑی سی نثر بھی لکھی ہے۔ اس سے افسانہ مذکور کا انداز معلوم ہو سکتا ہے۔

کل اہل سخن کا اتفاق ہے کہ مرزا اس فن میں استاد مسلّم الثبوت تھے۔ وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے۔ جو شعر اور فنِ انشا ہی کے واسطے پیدا ہوئی تھی۔ میر صاحب نے بھی انہیں پورا شاعر مانا ہے۔ ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اس پر سب رنگوں میں ہر رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ۔ جب دیکھو طبیعت، شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز۔ نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور اُن کے نہیں چند صفتیں خاص ہیں۔ جن سے کلام ان کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔

کلام زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریبان ہے۔ جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس در و بست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں۔ گویا ولایتی طپنچے کی چاپلیں چڑھی ہوئی ہیں اور یہ خاص ان کا حصہ ہے۔ چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں، شعر مزا ہی نہیں دیتا۔ خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں۔ مگر اس باریک نقاشی پر ان کی فصاحت آئینے کا کام دیتی ہے۔ تشبیہ اور استعارے ان کے ہاں ہیں۔ مگر اسی قدر کہ جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ۔ رنگینی کے پردے میں مطلب اصلی گم نہیں ہونے دیتے۔

ان کی طبیعت، ایک ڈھنگ کی پابند نہ تھی نئے نئے خیال اور چٹپٹے قافیے جس پہلو سے جمتے دیکھتے تھے، جما دیتے تھے اور وہی ان کا پہلو ہوتا تھا کہ خواہ مخواہ سننے والوں کو بھلے معلوم ہوتے تھے۔ یا زبان کی خوبی تھی کہ جو بات اس سے نکلتی تھی اس کا انداز نیا اور اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ان کے ہمعصر استاد خود اقرار کرتے تھے کہ جو باتیں ہم کاوش اور تلاش سے پیدا کرتے ہیں وہ اس شخص کے پیش پا افتادہ ہیں۔

جن اشخاص نے زبان اردو کو پاک صاف کیا ہے، مرزا کا ان میں پہلا نمبر ہے انہوں نے فارسی محاروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا ہے۔ جیسے علم کیمیا کا ماہر ایک مادے کو دوسرے مادے میں جذب کر دیتا ہے اور تیسرا مادہ پیدا کر دیتا ہے کہ کسی تیزاب سے اس کا جوڑ کھل نہیں سکتا۔ انہوں نے ہندی زبان کو فارسی محاروں اور استعاروں سے نہایت

زور بخشا۔ اکثر ان میں سے رواج پا گئے۔ اکثر آگے نہ چلے۔

انہیں کا زور طبع تھا۔ جس کی نزاکت سے دو زبانیں ترتیب پا کر تیسری زبان پیدا ہو گئی اور اسے ایسی قبولیت عام حاصل ہوئی کہ آئندہ کے لئے وہی ہندوستان کی زبان ٹھہری، جس نے حکام کے درباروں اور علوم کے خزانوں پر قبضہ کیا۔ اسی کی بدولت ہماری زبان فصاحت اور انشا پردازی کا تمغا لے کر شائستہ زبانوں کے دربار میں عزت کی کرسی پائے گی۔ اہل ہند کو ہمیشہ ان کی عظمت کے سامنے ادب اور ممنونی کا سر جھکانا چاہیئے۔ ایسی طبیعتیں کہاں پیدا ہوتی ہیں کہ پسند عام کی نبض شناس ہوں اور وہی باتیں نکالیں۔ جن پر قبولِ عام رجوع کر کے سالہا سال کے لئے رواج کا قبالہ لکھ دے۔

ہر زبان کے اہل کمال کی عادت ہے۔ کہ غیر زبان کے بعض الفاظ میں اپنے محاورے کا کچھ نہ کچھ تصرف کر لیتے ہیں۔ اس میں کسی موقع پر قادر الکلامی کا زور دکھانا ہوتا ہے۔ کسی موقع پر محاورہ عام کی پابندی ہوتی ہے۔ بیخبر کہہ دیتا ہے کہ غلطی کی، مرزا نے بھی کہیں کہیں ایسے تصرف کئے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔ ع

جیسے کہتا ہے کوئی ہو تر اصفّا صفّا

ایک غزل میں کہتے ہیں۔

لب و لہجہ ترا سا ہیگا کب خوبانِ عالم میں
غلط الزام ہے جگ میں کہ سب مصری کی ڈلیاں ہیں۔

کل تو مست اس کیفیت سے تھا کہ آتے دیر سے
نظر بھر جو مدرسہ دیکھا سو وہ مے خانہ تھا۔

ساقِ سیمیں کو ترے دیکھ کے گوری گوری
شمع مجلس میں ہوئی جاتی ہے تھوڑی تھوڑی

اپنے کعبے کی بزرگی شیخ جو چاہے سو کر!
از روئے تاریخ تو بیش از صنم خانہ نہیں

فارسی محاورے کو بھی دیکھنا چاہیئے کہ کس خوبصورتی سے بول گئے ہیں

ہے مجھے فیض سخن اس کی ہی مسداحی کا
ذات پر جس کی میرہن کُنہِ عزّوجل

بہت ہر ایک سے ٹکرا کے چلے تھے کالا
ہو گیا دیکھ کے وہ زلف سیہ فام سفید
خیال ان انکھڑیوں کا چھوڑ مت مرنے کے بعد از بھی
دلا آیا جو تو اس مے کدے میں جام لیتا جا
سودا تجھے کہتا ہے نہ خوباں سے مل اتنا
تو اپنا عزیب عاجز دل بیچنے والا!
عاشق بھی نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم
دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کے ہم

یہاں ردیف میں تصرف کیا ہے کہ "د" سے "حذف ہو گئی ہے اسی طرح عاجز میں "غنچہ" حکیم کی ہجو میں کہتے ہیں ؂

لکھ دیا مجنون کو شیر شتر
کہہ دیا مستسقی سے جا فصد کر

ایک کہانی میں لکھتے ہیں ؂

قضا کار وہ والیے نامدار
ہُوا درد قولنج سے بے قرار

مرزا اکثر ہندی کے مضمون اور الفاظ نہایت خفیف طور پر تضمین کر کے زبان ہند کی اصلیّت کا حق ادا کرتے تھے۔ اس لُطف میں یہ اور سید انشاء شامل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؂

ترکش الینڈ سینۂ عالم کا چھان مارا
مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا
محنت کے کروں بھج بل کی میں تعریف کیا یارو
ستم پربت ہو تو اس کو اٹھا لیتا ہے جوں رائی
نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اس کو نہ دیکھا ہو
کنھیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا وہ ہرجائی
ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے
یہ نین ہیں کہ جن سے یہ جنگل ہرے ہوئے
بوندی کے جندھروں سے وہ بھرتے ہیں ہمدگر

لڑکے مجھ آنسوؤں کے غضب منکرے ہوئے

اُٹے دل یہ کس سے بگڑ کر آتی ہے فوجِ اشک
لختِ جگر کی لاش کو آگے دھرے ہوئے۔

مرزا خود الفاظ تراشتے تھے اور اس خوبصورتی سے تراشتے تھے کہ مقبول خاص و عام ہوتے تھے۔ آصف الدولہ مرحوم کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا ہے، چند شعر اس کے لکھتا ہوں۔ مضامین ہندی کے ساتھ الفاظ کی خوبصورت تراش کا لطف دیکھو۔

تیرے سائے تلے ہے تو وہ مہنت — پشہ کر جائے دیو دو سے لڑنت
نام سُن پیل کوہ پیکر کے — یہ چلیں جوئے شیر ہو کر ونت
سحر صولت کے سامنے تیرے — ساحری بھول جائے اپنی پڑھنت
تیری ہیبت سے نہ فلک کے تلے — کانپتی ہے زمین کے بیچ گڑنت
تکلے کی طرح بل نکل جاوے — تیرے آگے جو دو کرے اکڑنت
دیکھ میدان میں اس کو روزِ نبرد — ہنہ پر ادن کے بھول جائے بسنت
تگنگ پا اگر سنے تیرے — داب کر دم کھسک چلے ہنونت
آوے بالغرض سامنے تیرے — روزِ ہیجا کے سور یا ساونت
تن کا ان کے زرہ میں ہوں یوں حال — مُرغ کی دام میں ہو جوں پھڑکنت

اسی طرح باقی اشعار ہیں مُرغ کی پھڑکنت، چل کر بھسمنت، تیر کی کمان سے سرکنت زمین میں کھدنت۔ گھوڑے کی کڑکنت اور ڈپٹنت۔ جو دنت (مقابل) دبکنت (ڈر کر دبکنا) روباہ شیر کو سمجھتی ہے۔ کیا پشمنت۔ سیجنت (بے فکر) روہیوں کی بکھرنت تاروں کی چھٹکنت۔ لپٹنت (لپٹنا) پڑھنت (پڑھنا) گھٹنت (گھٹنا) عام شعرائے ہند و ایران کی طرح سب تصنیفات ایک کلیات میں ہیں۔ اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ کون سا کلام کس وقت کہا ہے اور طبیعت نے وقت بوقت کس طرف میل کیا ہے خصوصاً یہ کہ زبان میں کب کب کیا کیا اصلاح کی ہے۔ یہ اتفاقی موقع میر صاحب کو ہاتھا کہ چھ دیوان الگ الگ لکھ گئے۔ متقدمین اور متاخرین کے کلاموں کے مقابلہ کرنے والے کہتے ہیں کہ ان کے دفتر تصنیفات میں ردّی بھی ہے اور وہ بہت ہے۔ چنانچہ جس طرح میر صاحب کے کلام میں بہتر ۷۲، نشتر بتاتے ہیں۔ ان کے زبردست کلام میں سے بہتر خنجر تیار کرتے ہیں۔ اس رائے میں مجھے بھی شامل ہونا پڑتا ہے کہ بے شک جو کلام آج کی طرز کے موافق ہے۔ وہ ایسے مرتبۂ عالی پر پہنچے جہاں ہماری تعریف کی پرواز نہیں پہنچ سکتی اور دل

کی پوچھو تو جن اشعار کو پرانے محاوروں کے جرم میں رد ہی کرتے ہیں۔ آج کے ہزار محاورے ان پر قربان۔ سن لیجیے ؎

گر کیجیے انصاف تو کی زور وفائیں
خط آتے ہی سب ٹل گئے اب آپ ہیں نائیں
تم جن کی ثنا کرتے ہو کیا بات ہے انکی ؟
لیکن ٹک ادھر دیکھیو اے یار بھلائیں
کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودؔا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلائیں

استاد مرحوم کہا کرتے تھے کہ جب سودا کے سامنے کوئی یہ شعر پڑھ دیتا تھا اپنی ہی زبان پہ آجاتا تھا تو وجد کیا کرتے تھے اور مزے لیتے تھے۔ اسی انداز کا ایک شعر نظیری کا یاد آگیا۔ اگرچہ فارسی ہے مگر جی نہیں چاہتا کہ دوستوں کو لطف سے محروم رکھوں۔

بوئے یار من ازیں سست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

بہار سخن کے گلچینو! وہ ایک زمانہ تھا کہ ہندی بھاشا کی زمین جہاں دوہروں کا سبزہ خودرو اگا ہوا تھا، وہاں نظم فارسی کی تخم ریزی ہوئی تھی۔ اس وقت فارسی کی بحروں میں شعر کہنا اور ادھر کے محاورات کو ادھر لینا اور فارسی مضامین کو ہندی لباس پہنانا ہی بڑا کمال تھا۔ اس صاحب ایجاد نے اپنے زور طبع اور قوت زبان سے صنعتوں اور فارسی کی ترکیبوں اور اچھوتے مضمونوں کو اس میں ترتیب دیا اور وہ خوبی پیدا کی کہ ایہام اور تجنیس وغیرہ صنائع لفظی جو ہندی دہروں کی بنیاد تھے۔ انہیں لوگ بھول گئے ایسے زمانے کے کلام میں رطب ویابس ہو تو تعجب کیا ہم اس الزام کا برا نہیں مانتے۔

اس وقت زمین سخن میں ایک ہی آفت تو نہ تھی۔ ادھر تو مشکلات مذکورہ ادھر پرانے لفظوں کا ایک جنگل۔ جس کا کاٹنا کٹھن۔ پس کچھ اشخاص آئے کہ چند کیاریاں تراش کر تخم ریزی کر گئے۔ ان کے بعد والوں نے جنگل کو کاٹا۔ درختوں کو چھانٹا۔ چمن بندی کو پھیلایا۔ جو ان کے پیچھے آئے۔ انہوں نے روش۔ خیاباں۔ داربست گلکاری نہال۔ گلبن سے باغ سجایا۔ غرض عہد بعہد اصلاحیں ہوتی رہیں اور آئندہ ہوتی رہیں گی۔ جس زبان کو آج ہم تکمیل جاودانی کا ہار پہنائے خوش بیٹھے ہیں۔ کیا یہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی؟ کبھی نہیں ہم کس منہ سے اپنی زبان کا فخر کر سکتے ہیں۔ کیا دور گذشتہ کا سما بھول گئے؟ ذرا پھر کر دیکھو

تو ان بزرگانِ متقدمین کا مجمع نظر آئے گا کہ محمد شاہی دربار کی کھڑکی دار پگڑیاں باندھے ہیں پچاس پچاس گز گھیر کے جامے پہنے بیٹھے ہیں۔ وہاں اپنے کلام لے کر آؤ۔ جس زبان کو تم نئی تراش اور ایجاد اور اختراع کا خلعت پہناتے ہو کیا وہ اسے تسلیم کریں گے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ ہماری وضع کو سفلہ اور گفتگو کو چھچھورا سمجھ کر منہ پھیر لیں گے۔ پھر ذرا سامنے دوربین لگاؤ۔ دیکھو ان تعلیم یافتہ لوگوں کا لین ڈوری آچکا ہے جو آئے گا اور ہم پر ہنستا چلا جائے گا۔

یہ چمن یوں ہی رہے اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

مرزا قتیل چار شربت میں فرماتے ہیں۔ مرزا محمد رفیع سودا اور ریختہ پایۂ ملا ظہوری دارد غیر ازینکہ زبان ہر دو باہم تخالف دارد فرقے نتواں کرد۔" مرزا قتیل مرحوم صاحب کمال شخص تھے۔ مجھ بے کمال نے ان کی تصنیفات سے بہت فائدے حاصل کئے ہیں۔ مگر ظہوری کی کیا غزلیں کیا قصائد دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے الجھا ہوا ریشم ہیں۔ سودا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے کہ محاورے اور زبان کا حاکم اور قصیدہ اور ہجو کا بادشاہ ہے۔

یہ بات بھی لکھنے کے قابل ہے کہ تصوف جو ایشیا کی شاعری کی مرغوب نعمت ہے، اس میں مرزا پھیکے ہیں، وہ حصہ خواجہ میر درد کا ہے۔

کہتے ہیں کہ مرزا قصیدے کے بادشاہ ہیں۔ مگر غزل میں میر تقی کے برابر سوز و گداز نہیں یہ بات کچھ اصلیت رکھتی ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے بھی اس بات کے چرچے تھے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب
ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

یعنی دیکھو تو سہی غزل کچھ کم ہے؟

قدرت اللہ خاں قاسم بھی اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں۔ زعم بعضے آنکہ سر آمد شعرائے فصاحت آقا مرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی بوئے نہ رسیدہ اما حق آنست کہ

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مرزا دریائیست بے کراں و میر نہریست عظیم الشان

در معلومات قواعد میر را بہ مرزا برتری ست و در قوتِ شاعری مرزا را بر

میر سروری۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ قصیدہ غزل مثنوی وغیرہ اقسام شعر ہیں کوچے کی راہ جدا جدا ہے۔ جس طرح قصیدے کے لیے شکوہِ الفاظ اور بلندیٔ مضامین چستی ترکیب وغیرہ لوازمات ہیں۔ اسی طرح غزل کے لیئے عاشق معشوق کے خیالات عشقیہ ذکر وصل شکایات فراق۔ درد انگیز اور الم ناک حالت۔ گفتگو ایسی بے تکلف و صاف صاف زم زم گویا وہی دونوں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ادائے مضامین کے الفاظ بھی اور ہیں اور اس کی بحریں بھی خاص ہیں۔ میر صاحب کی طبیعت قدرتی درد خیز اور دل حسرت انگیز تھا کہ غزل کی جان ہے۔ اس لئے ان کی غزلیں ہی ہیں اور خاص خاص بحور قوافی میں ہیں۔ مرزا کی طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر، ذہن براق اور زبان مشاق رکھتے تھے۔ توسن فکر ان کا منہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا رک نہ سکتا تھا۔ کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ آئے تغزل کی خصوصیت نہیں رہتی تھی۔ جس برجستہ مضمون میں بندھ جائے باندھ لیتے تھے۔ بے شک ان کی غزلوں کے بھی اکثر شعر چستی اور درستی میں قصیدے کا رنگ دکھاتے ہیں۔

ایک دن لکھنؤ میں میر اور مرزا کے کلام پر دو شخصوں نے تکرار میں طول کھینچا دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے۔ انہیں کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ فرمائیں۔ انہوں نے کہا کہ دونوں صاحب کمال ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا صاحب کا کلام واہ ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا ؎

سرھانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا ؎

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

لطیفہ در لطیفہ — ان میں سے ایک شخص جو مرزا کے طرف دار تھے، وہ مرزا کے پاس بھی آئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔ مرزا بھی میر صاحب کے شعر کو سن کر مسکرائے اور کہا شعر تو میر کا ہے مگر داد خواہی ان کی دوا معلوم ہوتی ہے۔

رسالہ عبرۃ الغافلین طبع شاعر کے لئے سیڑھی کا کام دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا فقط طبعی شاعر نہ تھے بلکہ اس فن کے اصول و فروع میں ماہر تھے۔ اس کی فارسی عبارت بھی زباندانی کے ساتھ ان کی شگفتگی اور شوخی طبع کا نمونہ ہے۔ اسکی تالیف

ایک افسانہ ہے اور قابل سننے کے ہے۔ اس زمانے میں اشرف علی نام ایک شریف خاندانی شخص تھے۔ انہوں نے فارسی کے تذکروں اور استادوں کے دیوانوں میں سے ۱۵ برس کی محنت میں ایک انتخاب مرتب کیا اور تصحیح کے لئے مرزا فاخر مکیں کے پاس لے گئے کہ ان دنوں فارسی کے شاعروں میں نامور وہی تھے انہوں نے کچھ انکار کچھ اقرار بہت سی تکرار کے بعد انتخاب مذکور کو رکھا اور دیکھنا شروع کیا مگر جا بجا استادوں کے اشعار کو کہیں بے معنی سمجھ کر کاٹ ڈالا کہیں تیغ اصلاح سے زخمی کر دیا۔ اشرف علی خاں صاحب کو جب یہ حال معلوم ہوا تو گئے اور بہت سی قیل و قال کے بعد انتخاب مذکور لے آئے۔ کتاب اصلاحوں سے چھلنی ہو گئی تھی۔ اس لئے بہت رنج ہوا۔ اسی عالم میں مرزا کے پاس لاکر سارا حال بیان کیا اور انصاف طلب ہوئے۔ ساتھ اس کے یہ بھی کہا کہ آپ اسے درست کر دیجئے۔

انہوں نے کہا کہ مجھے فارسی زبان کی مشق نہیں۔ اردو میں جو چند لفظ جوڑ لیتا ہوں، خدا جانے دلوں میں کیونکر قبولیت کا خلعت پایا ہے۔ مرزا فاخر مکین فارسی داں اور فارسی کے صاحب کمال ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا ہوگا۔ سمجھ کر کیا ہوگا۔ آپ کو اصلاح منظور ہے۔ تو شیخ علی حزیں مرحوم کے شاگرد شیخ آیت اللہ ثنا۔ میر شمس الدین فقیر کے شاگرد مرزا بچھو ذرہ تخلص موجود ہیں۔ حکیم بو علی خاں ہاتف بنگالہ میں نظام الدین صانع بلگرامی فرخ آباد میں۔ شاہ نور العین واقف شاہجہان آباد میں ہیں، یہ ان لوگوں کے کام ہیں۔

جب مرزا صاحب نے ان نامور فارسی دانوں کے نام لئے تو اشرف علی خاں نے کہا کہ ان لوگوں کو تو مرزا فاخر خاطر میں بھی نہیں لاتے۔ غرض کہ ان کے اصرار سے مرزا نے انتخاب مذکور رکھ لیا۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ جو جو باکمال سلف سے آج تک مسلم الثبوت چلے آتے ہیں۔ ان کے اشعار تمام زخمی تڑپتے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر مرزا کو بھی رنج ہوا۔ بموجب صورتحال کے رسالہ عبرت الغافلین لکھا اور مرزا فاخر کی غلط فہمیوں کو اصول انشاء پردازی کے بموجب کما حقہ ظاہر کیا۔ ساتھ ان کے دیوان پر نظر ڈال کر اس کی غلطیاں بھی بیان کیں اور جہاں ہو سکا۔ اصلاح مناسب دی۔

مرزا فاخر کو بھی خبر ہوئی۔ بہت گھبرائے اور چاہا کہ زبانی پیاموں سے ان داغوں کو دھوئیں۔ چنانچہ بقاء اللہ خاں بقا کو گفتگو کے لئے بھیجا وہ مرزا فاخر کے شاگرد تھے، بڑے مشاق اور باخبر شاعر تھے۔ مرزا اور ان سے خوب خوب گفتگوئیں رہیں۔ اور مرزا فاخر کے بعض اشعار، جن کے اعتراضوں کی خبر اڑتے اڑتے ان تک بھی پہنچ گئی تھی، ان پر رد و قدح

بھی ہوئی چنانچہ ایک شعر ان کا تھا۔

گرفتہ بود دریں بزم چوں قدح دل من
شگفتہ روئے صہبا شگفتہ کرد مرا

مرزا کو اعتراض تھا کہ قدح کو گرفتہ دل کہنا بے جا ہے۔ اہل انشا نے ہمیشہ قدح کو کھلے پھول سے تشبیہ دی ہے۔ یا ہنسی سے کہ اسے بھی شگفتگی لازم ہے۔ بقا نے جواب میں شاگردی کا پسینہ بہت بہایا اور اخیر کو باذل کا ایک شعر بھی سند میں لائے ؎

چہ نشاط بادہ بخشد بمن خراب بے تو
بہ دل گرفتہ ماند قدح شراب بے تو

مرزا رفیع سن کر بہت ہنسے اور کہا، اپنے استاد سے کہنا کہ استادوں کے شعروں کو دیکھا کرو تو سمجھا بھی کرو۔ یہ شعر تو میرے اعتراض کی تائید کرتا ہے۔ یعنی باوجودیکہ پیالہ ہنسی اور شگفتگی میں ضرب المثل ہے اور پیالہ شراب سامان نشاط ہے۔ مگر وہ بھی دل افسردہ کا حکم رکھتا ہے۔

غرض جب یہ تدبیر پیش نہ کی گئی تو مرزا فاخر نے اور راہ لی۔ شاگرد لکھنؤ میں بہت تھے۔ خصوصاً شیخ زادے کہ ایک زمانے میں وہی ملک اودھ کے حاکم بنے ہوئے تھے اور سینہ زوری اور سرشوری کے بخار ابھی تک دماغوں سے گئے نہ تھے۔ ایک دن سودا تو بے خبر گھر میں بیٹھے تھے، وہ بلوا کر کے چڑھ آئے۔ مرزا کے پیٹ پر چھری رکھ دی اور کہا کہ جو کچھ تم نے کہا ہے، وہ سب لو اور ہمارے استاد کے سامنے چل کر فیصلہ کرو۔ مرزا کو مضامین کے گل پھول اور باتوں کے طوطے، مینا تو بہت بناتے آتے تھے، مگر یہ مضمون ہی نیا تھا۔ سب باتیں بھول گئے۔ بچارے نے جزدان غلام کو دیا خود میانے میں بیٹھے اور ان کے ساتھ ہوئے۔ گرد وہ لشکر شیطان تھا۔ یہ بیچ میں تھے چوک میں پہنچے تو انہوں نے چاہا کہ یہاں انہیں بے عزت کیجیے۔ کچھ تکرار کر کے پھر جھگڑنے لگے۔ مگر جسے خدا عزت دے، اسے کون بے عزت کر سکتا ہے؟ اتفاقاً سعادت علی خاں کی سواری آنکلی۔ مجمع دیکھ کر ٹھہر گئے اور حال دریافت کر کے سودا کو اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھا کر لے گئے۔ آصف الدولہ حرم سرا میں دسترخوان پر تھے سعادت علی خاں اندر گئے اور کہا بھائی صاحب بڑا غضب ہے آپ کی حکومت اور شہر میں یہ قیامت! آصف الدولہ نے کہا، کیوں بھئی خیر باشد۔ انہوں نے کہا کہ مرزا رفیع، جس کو باواجان نے برادر من مشفق مہربان کہہ کر خط لکھا۔ آرزو مین کر کے بلایا اور وہ نہ آیا۔ آج وہ

یہاں موجود ہے اور اس حالت میں ہے کہ اگر اس وقت میں نہ پہنچتا تو شہر کے بدمعاشوں نے اس بے چارے کو بے حرمت کر ڈالا تھا۔ پھر سارا ماجرا بیان کیا۔ آصف الدولہ فرشتہ خصال گھبرا کر بولے کہ بھئی مرزا فاخر نے ایسا کیا تو مرزا کو کیا گویا ہم کو بے عزت کیا باوا جان نے انہیں بھائی لکھا تو وہ ہمارے چچا ہوئے۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ اس میں کیا شبہہ ہے! اسی وقت باہر نکل آئے۔ سارا حال سنایا۔ بہت غصے ہوئے اور حکم دیا کہ شیخ زادوں کا محلے کا محلا کھڑوا کر پھینک دو اور شہر سے نکلوا دو۔ مرزا فاخر کو جس حال میں ہو، اسی حال سے حاضر کرو۔ سودا کی نیک نیتی دیکھنی چاہیئے۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جناب عالی! ہم لوگوں کی لڑائی کاغذ قلم کے میدان میں آپ ہی فیصل ہو جاتی ہے حضور اس میں مداخلت نہ فرمائیں۔ غلام کی بدنامی ہے، جتنی مدد حضور کے اقبال سے پہنچی ہے، وہی کافی ہے۔ غرض مرزا رفیع باعزاز و اکرام وہاں سے رخصت ہوئے۔ نواب نے احتیاطاً سپاہی ساتھ کر دیئے۔

حریفوں کو جب یہ راز کھلا تو امرائے دربار کے پاس دوڑے۔ صلاح ٹھہری کہ معاملہ روپیہ یا جاگیر کا نہیں۔ تم سب مرزا فاخر کو ساتھ لے کر مرزا رفیع کے پاس چلے جاؤ اور خطا معاف کرا لو۔ دوسرے دن آصف الدولہ نے سرِ دربار مرزا فاخر کو بھی بلایا۔ اور کہا تمہاری طرف سے بہت نازیبا حرکت ہوئی اگر شعر کے مرد میدان ہو تو اب روبرو سودا کے ہجو کہو۔ مرزا فاخر نے کہا ایں از ما نمے آید۔ آصف الدولہ نے بگڑ کر کہا۔ درست ایں از شما نمے آید، ایں مے آید کہ شیاطین خود را بر سر میرزائے بے چارہ فرستادید از خانہ ببازارش کشیدند و مے خواستند آبرویش بخاک ریزند۔ پھر سودا کی طرف اشارہ کیا یہاں کیا دیر تھی۔ فی البدیہہ رُباعی پڑھی ؎

تو فخر خراسانی و فا ساقط از د
گوہر بدہاں داری رہا ساقط از د
روزاں و شباں زحق تعالیٰ خواہم
مرکب وہدت خدا دہا ساقط از د

یہ جھگڑا تو رفع دفع ہوا مگر دور دور سے ہجوؤں میں چوٹیں چلتی رہیں۔ لطف یہ ہے کہ مرزا فاخر کی کہی ہوئی ہجویں کوئی جانتا بھی نہیں، سودا نے جو کچھ ان کے حق میں کہا وہ ہزاروں کی زبان پر ہے۔

**مرزا فاخر مکین** اصل میں کشمیری تھے۔ اوّل قنوت حسین خاں کشمیری سے اصلاح لیتے تھے۔ پھر عظیمائے کشمیری کے شاگرد ہوئے۔ ان کے کمال میں کلام کی جگہ نہیں۔ صحت الفاظ اور تحقیق لغت میں بڑی کوشش کی۔ دیوان نے رواج نہیں پایا۔ مگر اصل اشعار متفرق بیاضوں میں ہیں۔ یا وہ مشہور ہیں کہ انہوں نے سوداؔ کے حق میں کہے، سودا نے تضمین کرکے انہیں پر الٹ دیئے۔ کچھ اشعار سودا نے عبرۃ الغافلین میں اعتراضوں کی ذیل میں لکھے۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ کیفیت سے خالی نہ تھے۔ زمانے نے بھی پورا حق ان کی قدردانی کا ادا کیا۔ سینکڑوں شاگرد غریب اور تو انگر لکھنؤ اور اطراف میں ہو گئے۔ پیشہ توکل تھا۔ اور بے دماغی سے اسے رونق دیتے تھے۔

**نقل** مولوی غلام ضامن صاحب رتبے کے فاضل تھے۔ ایک دن غزل لے کر گئے کہ مجھے شاگرد کیجئے اور اصلاح فرمایئے۔ مرزا فاخر نے ٹال دیا۔ مولوی صاحب نے پھر کہا۔ انہوں نے پھر انکار کیا اور کج خلقی کرنے لگے۔ جو عجز و انکسار کے حق تھے، سب مولوی صاحب نے ادا کیے۔ ایک نہ قبول ہوا۔ ناچار یہ شعر پڑھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

مرزا مکین مانشود چوں مکین ما
کین است جزو اعظم مرزا کین ما

یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتدا سوداؔ کی طرف سے کم ہوتی تھی۔ ہاں کوئی چھیڑ دیتا تھا تو پھر یہ بھی حد سے پرے پہنچا دیتے تھے۔ چنانچہ میر ضاحک مرحوم کے حال سے معلوم ہوگا۔

آصف الدّولہ ایک دفعہ شکار کو گئے۔ خبر آئی کہ نواب نے بھیلوں کے جنگل میں شیر مارا۔ باوجودیکہ ہمیشہ انعام و اکرام کے انباروں سے زیر بار تھے۔ مگر فوراً کہا

یارو یہ ابن ملجم پیدا ہوا دوبارہ
شیر خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

نواب کو بھی خبر ہوئی۔ جب پھر کر آئے تو خود شکایتِ دوستانہ کے طور پہ کہا کہ مرزا تم نے ہمیں کو شیر خدا کا قاتل بنایا! ہنس کر کہا کہ جناب عالی! شیر تو اللہ ہی کا تھا۔

نہ حضور کا، نہ فدوی کا۔

لطیفہ۔ آصف الدولہ مرحوم کی انا کی لڑکی خورد سال تھی۔ نواب فرشتہ سیرت کی طبیعت میں ایک تو عموماً تحمل اور بے پروائی تھی۔ دوسرے اس کی ماں کا دودھ پیا تھا۔ ناز برداری نے اس کی شوخی کو شرارت کر دیا۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ نواب سوئے تھے۔ ایسا غل مچایا کہ بدخواب ہو کر جاگ اٹھے۔ بہت جھنجھلائے اور خفا ہوتے ہوئے باہر نکل آئے۔ سب ڈر گئے کہ آج نواب کو غصہ آیا ہے، خدا خیر کرے۔ باہر آ کر حکم دیا کہ مرزا کو بلاؤ۔ مرزا اسی وقت حاضر ہوئے۔ فرمایا کہ بھئی مرزا! اس لڑکی نے مجھے بڑا حیران کیا ہے۔ تم اس کی ہجو کہہ دو۔ یہاں تو ہر وقت مصالحہ تیار تھا۔ اسی وقت قلمدان لے کر بیٹھ گئے۔ اور مثنوی تیار کر دی کہ ایک شعر اس کا لکھتا ہوں ؎

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے
نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڑ پیلے

بعض بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ دلی میں نالے پر ایک دکان میں بھٹیاری رہتی تھی۔ وہ آپ بھی لڑاکا تھی۔ مگر لڑکی اس سے بھی سوا چنچل ہوئی۔ آتے جاتے جب دیکھتے لڑتے ہی دیکھتے۔ ایک دن کچھ خیال آ گیا۔ اس پر یہ ہجو کہی تھی۔

لطیفہ۔ شیخ قائم علی ساکن اٹاوہ ایک طباع شاعر تھے۔ کمال اشتیاق سے مقبول نبی خاں انعام اللہ خاں یقین کے بیٹے کے ساتھ بارادۂ شاگردی ان کے پاس آئے اور اپنے اشعار سنائے۔ آپ نے پوچھا۔ تخلص کیا ہے۔ کہا امیدوار۔ مسکرائے اور فرمایا ؎

ہے فیض سے کسی کے شجران کا بار داد
اس واسطے کیا ہے تخلص امیدوار

بے چارے شرمندہ ہو کر چلے گئے۔ قائم تخلص اختیار کیا اور کسی اور کے شاگرد ہوئے۔ ان کی طبیعت میں شوخیاں تھیں۔ وہ حقیقت میں اتنی نہ تھیں جتنا انہیں لوگوں نے خطرناک بنا رکھا تھا۔ بے شک جوان سے لڑتا تھا، اسے خوب خراب کرتے تھے مگر اخلاق و انصاف سے خالی نہ تھے۔

نقل۔ راسخ عظیم آبادی کا دیوان میں نے دیکھا ہے۔ بہت سنجیدہ کلام ہے۔ پرانے مشاق تھے اور سب ادھر کے لوگ انہیں استاد مانتے تھے۔ مرزا کے پاس شاگرد ہونے کو آئے۔ مرزا نے کہا کوئی شعر سنائیے۔ انہوں نے پڑھا۔

ہو گئے ہیں ہم ضعیف اب فریدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنی آنسو صبح پیری ستارا ہے

مرزا نے اٹھ کر گلے لگا لیا۔ ایسا ہی معاملہ جرأت سے ہوا تھا۔

لطیفہ۔ ایک دن میاں ہدایت ملاقات کو آئے بعد رسوم معمولی کے آپ نے پوچھا کہ فرمائیے میاں صاحب آج کل کیا شغل رہتا ہے۔ انہوں نے کہا افکار دنیا فرصت نہیں دیتے۔ طبیعت کو ایک مرض یادہ گوئی کا لگا ہوا ہے۔ گاہے ماہے غزل کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ مرزا ہنس کر بولے کہ غزل کا کیا کہنا۔ کوئی ہجو کہا کیجیے۔ بچارے نے حیران ہو کر کہا کہ ہجو کس کی کہوں؟ آپ نے کہا کہ ہجو کو کیا چاہیئے۔ تم میری ہجو کہو۔ میں تمہاری ہجو کہوں۔

لطیفہ۔ ایک ولایتی نے کہ زمرہ اہل سیف میں معتبر ملازم تھا۔ عجب تماشا کیا یعنی سودا نے اس کی ہجو اور ایک محفل میں اس کے سامنے ہی پڑھنی شروع کر دی۔ ولایتی بیٹھا سنا کیا۔ جب ہجو ختم ہوئی۔ اٹھ کر سامنے آ بیٹھا اور ان کی کمر پکڑ کر مسلسل و متواتر گالیوں کا جھاڑ باندھ دیا۔ انہیں بھی ایسا اتفاق آج تک نہ ہوا تھا۔ حیران ہو کر کہا کہ خیر باشد! جناب آغا اقسام ایں مقالات شایان شان شما نیست۔ ولایتی نے پیش قبض کمر سے کھینچ کر ان کے پیٹ پر رکھ دی اور کہا نظم خورت گفتی حالا ایں نثر را گوش کن۔ ہر چہ تو گفتی نظم بود۔ نظم از ما نمے آید، ما بہ نثر ادا کردیم۔"

لطیفہ۔ سید انشاؔ کا عالم نوجوانی تھا۔ مشاعرے میں غزل پڑھی ؎

جھڑکی سہی ادا سہی چین جبیں سہی
سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

جب یہ شعر پڑھا کہ ؎

گر ناز نیں کہے سے برا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

سوداؔ کا عالم پیری تھا۔ مشاعرے میں موجود تھے۔ مسکرا کر بولے "دریں چہ شک"

نقل۔ ایک دن سوداؔ مشاعرے میں بیٹھے تھے۔ لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ ایک شریف زادے کی ۱۲، ۱۳ برس کی عمر تھی۔ اس نے غزل پڑھی، مطلع تھا۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے ؎
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

گرمیِ کلام پر سودا بھی چونک پڑے۔ پوچھا۔ یہ مطلع کس نے پڑھا؟ لوگوں نے کہا، حضرت یہ صاحبزادہ ہے۔ سودا نے بھی بہت تعریف کی۔ بہت مرتبہ پڑھوایا اور کہا کہ میاں لڑکے جوان تو ہوتے نظر نہیں آتے۔ خدا کی قدرت انہی دنوں میں لڑکا جل کر مر گیا۔

جب فخرِ شعرائے ایران زمین شیخ علی حزیںؔ واردِ ہندوستان ہوئے۔ پوچھا کہ شعرائے ہند میں آج کل کوئی صاحبِ کمال ہے! لوگوں نے سوداؔ کا نام لیا اور سوداؔ خود ملاقات کو گئے۔ شیخ کی عالی دماغی اور نازک مزاجی شہرۂ آفاق ہے۔ نام نشان پوچھ کر کہا کچھ اپنا کلام سناؤ۔ سوداؔ نے کہا ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپھے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

شیخ نے کہا کہ "تڑپھے" چہ معنی دارد؟ سودا نے کہا کہ اہلِ ہند طپیدن را تڑپھنا مے گویند۔ شیخ نے پھر شعر پڑھوایا اور زانوں پہ ہاتھ مار کر کہا کہ مرزا رفیع قیامت کردی۔ یک مرغِ قبلہ نما باقی بود آنرا ہم نگذاشتی۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بغل گیر ہو کر پاس بٹھایا۔ بعض اشخاص کی روایت ہے کہ شیخ نے کہا "در پوچ گویانِ ہند بد نیستی"۔

لطیفہ۔ خان آرزو کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ سوداؔ ان دنوں نوجوان تھے۔ مطلع پڑھا۔

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

یا تو لاعلمی یا ان کی آتش بیانی کے ڈر سے کوئی نہ بولا۔ مگر خانِ آرزو جن کی دایۂ قابلیت کے دودھ سے مظہرؔ۔ سوداؔ۔ میرؔ۔ دردؔ وغیرہ نوجوانوں نے پرورش پائی ہے انہوں نے فوراً یہ شعر پڑھا کہ قدسی کے مطلع پر اشارہ ہے۔

شعرِ سوداؔ حدیثِ قدسی ہے
چاہیئے لکھ رکھیں فلک پہ فلک

آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را
اختر ز فلک مے نگرد روئے زمیں را

سودا بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے۔ خاں صاحب کے گلے سے لپٹ گئے اور اس شکریے کے ساتھ خوشی ظاہر کی گویا حقیقتہً خاں صاحب نے ان کے کلام کو مثلِ حدیثِ قدسی تسلیم کیا ہے۔ ان کا ایک اور شعر ایسا ہی ہے۔

بہار بے سپر جام و یار گزرے ہے
نسیم تیر سی سینے کے پار گزرے ہے

فارسی میں کوئی استاد کہتا ہے ؎

بہار بے سپر جام و یار مے گزرد
نسیم ہم چو خدنگ از کنار مے گزرد

مگر اہل تحقیق کا قول ہے کہ ایسی صورتِ خاص کو سرقہ نہیں ترجمہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ شعر کو شعر ہی میں ترجمہ کرنا بھی ایک دشوار صنعت ہے۔ قطع نظر اس کے اسی مطلع کے بعد اور اشعار کو دیکھو کیا موتی پرو دیئے ہیں اور کلیات ایک دریا ہے۔ کہ اقسام جواہر سے بھرا ہوا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس رتبے کا شاعر ایک مطلع کا محتاج تھا۔ اس لیے چرا لیا ہے۔ ابوالفضل نے ایک مراسلے میں لکھا ہے۔

ولد الزناست حاسد منم آنکہ طالع من
ولد الزنا کش آمد چو ستارۂ یمانی

یہ شعر قصائد نظامی میں موجود ہے۔ اور اسی مضمون کو عربی میں متنبی کہتا ہے۔

وتنکر موتھم وانا سھیل　　　طلعت لموت اولاد الزناء

خود سودا سے زبان بزبان روایت پہنچی ہے کہ غزل فارسی کی ان کی ہجو میں مولوی ندرت کشمیری نے کہی اور مرزا نے اسے مخمس کرکے اسی پہ الٹ دیا۔ اس کے مطلع پر خان آرزو نے مصرع لگا دیئے تھے۔ باقی تمام مخمس مرزا کا ہے۔

شعر ناموزوں سے تو بہتر ہے کہنا ریختہ
کب کہا میں قتل کر مضمون کسی کا ریختہ
بے حیائی ہے یہ کہنا سن کے میرا ریختہ
خون معنیٰ تا رفیع بادہ پیما ریختہ
آبروئے ریختہ از جوش سودا ریختہ

نقل۔ معتبر لوگوں سے سنا ہے کہ کسی شخص نے سودا سے پوچھا۔ بلبل مذکر ہے یا مونث؟ مسکرا کر بولے کہ نوع انسان میں ایک ہو تو مرد سے عورت ہو جاتی ہے، لفظ کو دیکھو دو موجود ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ انہوں نے ایک جگہ مذکر بھی باندھا ہے۔ چنانچہ غزل ہے اثر لگا کہنے، چشم تر لگا کہنے۔ تارِ نظر لگا کہنے۔ اس میں کہتے ہیں کہ۔

سُنے ہے مُرغِ چمن کا تو نالہ اے صیاد
بہار آنے کی بلبلُ خبر لگا کہنے!

اکثر اہل لکھنؤ اب مذکر باندھتے ہیں۔ چنانچہ سرورؔ کا شعر ہے۔

کرے گا تو مرے نالوں کی ہمسری بلبل
شعور اتنا تو کر جا کے جانور پیدا

آتشؔ۔ ع۔ سیر چمن کو چلیئے بلبل پکارتے ہیں۔ رندؔ ع۔ جانور کا جو ہوا شوق تو پالے بلبل۔ مگر حق یہ ہے کہ اس وقت تک تذکیر و تانیث لفظوں کی مقرر نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے الفاظ ہیں کہ مرزاؔ اور میر صاحب نے انہیں مذکر باندھا ہے۔ بعد ان کے سید انشاؔ۔ جرأتؔ۔ مصحفیؔ سے لے کر آج تک سب مؤنث باندھتے چلتے آتے ہیں۔

چنانچہ میر صاحب کی طرح میرزائے موصوف بھی فرماتے ہیں۔

کہا طبیب نے احوال دیکھ کر میرا
کہ سخت جان ہے سوداؔ کا آہ کیا کیجیے

بتاں کا دید میں کرتا ہوں شیخ جس دن سے — حلال تب سے ہے مے مو بمو مرے دل پہ
کریں شمار ہم دل کے یار داغوں کا — تو آ کہ سیر کریں آج دل کے باغوں کا
ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا — موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کا
بسکہ پونچھوں ہوں میں اپنی چشم خوں آلود کو — جامہ کا ہر ایک تختہ سیر ہے گلزار کا

جب مرزا رفیع لڑکے تھے۔ اس وقت میر جعفر زٹلی کا بڑھاپا تھا۔ اگلے وقتوں کے لوگ رنگین جریبیں جن پہ نقاشی کا کام ہوتا تھا۔ اکثر ہاتھ میں رکھا کرتے تھے۔ ایک دن شام کے وقت میر موصوف ایک سبز رنگ جریب ٹیکتے ٹہلنے کو باہر نکلے۔ مرزا بغل میں کتابوں کا جزدان لئے سامنے سے آتے تھے۔ اس زمانے میں ادب کی بڑی پابندی تھی۔ بزرگوں کو سلام کیا اور ان کی زبان سے دعا لینے کو بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ مرزا نے جھک کر سلام کیا۔ انہوں نے خوش ہو کر دعا دی۔ چونکہ بچپن ہی میں مرزا کی موزونی طبع کا چرچا تھا۔ میر صاحب کچھ باتیں کرنے لگے۔ مرزا ساتھ ہو لیئے۔ انہوں نے نوخیز طبیعت کے بڑھانے کے لئے کہا کہ مرزا بھلا ایک مصرع پر مصرع تو لگا دو۔

ع لالہ در باغ داغ چوں دارد؟

مرزا نے سوچ کر کہا۔ ع عمر کوتاہ است غم فزوں دارد

میر صاحب نے فرمایا۔ واہ بھئی دل خون ہوتا ہے، جگر خون ہوتا ہے، بھلا سینہ

کیا خون ہوگا۔ سینہ پر زخون ہوتا ہے۔

مرزا نے پھر ذرا فکر کیا اور کہا ع چہ کند سوزشِ دروں دارد

میر صاحب نے کہا کہ ہاں مصرع تو ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا طبیعت پر زور دے کر کہو۔ مرزا دق ہو گئے تھے، جھٹ کہہ دیا ع یک عصا سبز زیر...... دارد

میر جعفر مرحوم ہنس پڑے اور جریب اٹھا کر کہا۔ کیوں! یہ ہم سے بھی ؟ دیکھ کہوں کا تیرے باپ سے۔ بازی بازی بریش بابا ہم بازی۔ مرزا لڑکے تو تھے ہی بھاگ گئے۔ چند اشعار جن سے میر اور مرزا کے کلام میں امتیاز ہوتا ہے، لکھے جاتے ہیں۔ ان شعروں میں دونوں استادوں کی طبیعت برابر لڑی ہے۔ مگر دونوں کے انداز پر خیال کرو

ع

ہمارے آگے تیرا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

قسم جو کھائیے تو طالعِ زلیخا کی
عزیزِ مصر کا بھی صاحب اک غلام لیا

چمن میں صبح جو اس جنگ جو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا موجِ رواں سے کام لیا

کمال بندگیِ عشق ہے خداوندی
کہ ایک زن نے مہِ مصر سا غلام لیا

گلا میں جس سے کروں تیری بے وفائی کا
جہاں میں نام نہ لے پھر وہ آشنائی کا

گلا لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفتِ دیں کو
خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا
جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا
صبا نے مار طمانچہ منہ اس کا لال کیا

دلِ پہنچا ہلاکت کو بہت کھینچ کسالا
لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ

میں دشمنِ جاں ڈھونڈھ کے اپنا جو نکالا
سو حضرتِ دل سلمہ اللہ تعالیٰ

اک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

سودا جہاں میں آ کے کوئی کچھ نہ لے گیا
جاتا ہوں ایک میں دلِ پُر آرزو لیے

رات ساری تو کٹی سنتے پریشان گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
اب آئی سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجھ کو نیند
جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے مر کہیں

کفر کچھ چاہیئے اسلام کی رونق کے لیے
حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹے شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

مت رنج کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد
دل ڈھائیے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
یہ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

نہ بھول اے آرسی گر یار کو تجھ سے محبت ہے
نہیں ہے اعتبار اس کا یہ منہ دیکھے کی الفت ہے

بگولے سے جسے آسیب اور صرصر سے زحمت ہے
ہماری خاک یوں برباد ہوا اے ابر رحمت ہے

چند مقابلے اسی طرح کے جرأت کے حال میں بھی ہیں۔ (دیکھو صفحہ ۲۲۸ - ۲۲۹

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

دل کے پرزوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

مہر ہر ذرّے میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے!
تم بھی ٹک دیکھو تو صاحب نظراں ہے کہ نہیں

جُرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں

پاس ناموس مجھے عشق کا ہے اے بُلبُل
ورنہ یاں کونسا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں

آگے شمشیر تمہاری کے بھلا یہ گردن
مو سے باریک ترا اے خوش کمراں ہے کہ نہیں

پوچھا سوداؔ سے میں اک روز کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معیّن بھی مکاں ہے کہ نہیں؟

یک بیک ہو کے برآشفتہ لگا وہ کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں؟

دیکھا میں قصرِ فریدوں کے اوپر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

سینے میں ہوا نالہ و پہلو میں دل آتش
دھڑکے ہے پڑا دل کہ نہ ہو مشتعل آتش

اشک آتش و خواں آتش و ہر لختِ دل آتش
آتش پہ برستی ہے پڑی متصل آتش

یک لحظہ طرف ہو کے مرے دیدہ و دل سے
نادم تو سمندر رہے سدا منفعل آتش

یاقوت نہیں ہے وہ ترے لعل سے اے شوخ
جا ڈوب موئی آگ میں ہو کر خجل آتش

داغ آج سے دُکھنا نہیں ان سنگدلوں کا
مدّت سے ہوتی ہے مری چھاتی پہ سِل آتش

دِل عشق کے شعلے سے جو بھڑکا تو رہا کیا
اے جان نکل جا کہ لگی متصل آتش

یک قطرۂ مے لے اڑی سوداؔ کو جگہ سے
باروت کے تودے کو ہے بس ایک تِل آتش

دیں شیخ و برہمن نے کیا یار فراموش
یہ سبحہ فراموش وہ زنّار فراموش

دیکھا جو حرم کو تو نہیں دیر کی وسعت
اس گھر کی فضا کر گیا معمار فراموش

بھولے نہ کبھی دل سے میرا مصرعِ جانکاہ
نالہ نہ کرے مرغِ گرفتار فراموش

دل سے نہ گئی آہ ہوسِ سیرِ چمن کی
اور ہم نے کیا رخنۂ دیوار فراموش

یا نالہ ہی کر منع تو، یا گریہ کو ناصح
دو چیز عاشق سے ہو یک بار فراموش

بھولا پھروں ہوں آپ کو اک عمر سے لیکن    تجھ نہ کیا دل سے ہیں زنہار فراموش
دل درد سے کس طرح مرا خالی ہو سودا
وہ ناشنوا حرف ہیں گو فتار فراموش

جو گزری مجھ پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا    بلا کشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر    مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا
پہنچ چکا ہے سرِ زخم دل تلک یارو    کوئی سیو کوئی مرہم کرو ہوا سو ہوا
کہے ہے سن کے مری سرگزشت وہ بیرحم    یہ کون ذکر ہے جانے بھی دو ہوا سو ہوا
خدا کے واسطے آور گزر گنہ سے مرے    نہ ہوگا پھر کبھو اے تندخو ہوا سو ہوا
یہ کون حال ہے احوالِ دل پہ اے آنکھو    نہ پھوٹ پھوٹ کے اتنا بہو ہوا سو ہوا
دیا اسے دل و دیں اب یہ جان ہے سودا
پھر آگے دیکھئے جو ہو سو ہو ہوا سو ہوا

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں    تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں
کیونکر نہ چاک چاک گریبان دل کروں    دیکھوں جو تیری زلف کو میں دست شانے میں
زینت دلیلِ مفلسی ہے ٹک کماں کو دیکھ    نقش و نگار چھٹ نہیں کچھ اس کے خانے میں
اے مرغ دل سمجھ کے تو چشمِ طمع کو کھول    تو نے سنا ہے دام جسے ہے وہ دانے میں
چلّے میں کھینچ کھینچ کیا قد کو جوں کماں    تیر مراد پر نہ بٹھایا نشانے میں
پایا ہر ایک بات میں اپنے میں یوں تجھے    معنی کو جس طرح سخن عاشقانے میں
دستِ گرہ کشا کو نہ تزئیں کرے فلک    منہدی بندھی نہ دیکھی ہیں انگشت شانے میں
ہمسا تجھے تو ایک ہمیں تجھ سے ہیں کئی    جا دیکھ لے تو آپ کو آئینہ خانے میں
سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

افعی کو یہ طاقت ہے کہ اس سے بسر آوے    وہ زلف سیہ اپنی اگر لہر پر آوے
صورت ہمیں اس مہر کی پہچان اگر آوے    ہر ذرّے سے ہیں کچھ اور ہی جھمکا نظر آوے
مجھ چشم سے اب اشک نہیں آنے کا ناصح    آوے بھی غم دل سے تو لختِ جگر آوے
پھرتا ہوں ترے واسطے میں دربدر اے یار    تجھ سے نہ ہوا یہ کہ کبھو میرے گھر آوے
گویا دل عاشق بھی ہے اک فیل سیہ مست    رکتا نہیں روکے سے کسو کے جدھر آوے
کہہ کہہ کے دکھ اپنا میں کیا مغز کو خالی    اتنا نہ ہوا سن کے تری چشم بھر آوے

شیشہ نہ کہے راز مرے دل کا تو اے جام ——— سرگوشی سے اس کی نہ تری چشم بھر آوے
کیا ہو جو قفس تک مرے اب صحن چمن سے ——— دو برگ لئے گل کے نسیم سحر آوے
سب کام نکلتے ہیں فلک تجھ سے ولیکن ——— میرے دل ناشاد کی امید بر آوے
جب پھونکیے ناقوس صنم خانۂ دل شیخ ——— کعبے کا ترے وجد میں دیوار و در آوے
نامے کا جواب آنا تو معلوم ہے اب کاش ——— قاصد کے بد و نیک کی مجھ تک خبر آوے
میں بھی ہوں ضعیف اس قدر اے مور کہ وہ آپ ——— گزرے مرے سر سے جو ترے تا کمر آوے
سب سے کہے دیتا ہوں یہ کہہ دیں کہ پھر آنا ——— بالیں پہ مرے شور قیامت اگر آوے
دیتا ہے کوئی مرغ دل اس شوخ کو سودا ——— کیا قہر کیا تو نے غضب تیرے پہ آوے

اب لے تو گیا ہے پرا سے دیکھیو نادان
پل میں نہ اڑا تا وہ اگر بال و پر آوے

خوبوں میں دلدہی کی روش کم بہت ہے یاں ——— خواہانِ جاں جو چاہو تو عالم بہت ہے یاں
غافل نہ رہ تو اہل تواضع کے حال سے ——— تیغ و کماں کی طرح خم و چم بہت ہے یاں
چشم ہوس اٹھا لے تماشے سے جوں حباب ——— تا دیدنی کا دید بس اک دم بہت ہے یاں
خون جگر بادام و لوزینہ سے لگاؤ ——— صورت معاش خلق کی برہم بہت ہے یاں
آنکھوں میں دوں اس آئینہ رو کو جگہ و لے ——— ٹپکا کرے ہے بسکہ یہ گھر نم بہت ہے یاں
کہتا ہے حال ماضی و مستقبل ایک ایک ——— جام جہاں نما تو نہیں، جم بہت ہے یاں
دیکھا جو باغ دہر تو مانند صبح و گل ——— کم فرصتی ملاپ کی باہم بہت ہے یاں
آیا ہوں تازہ دیں بحرم شیخنا مجھے ——— پوجنا نماز سے بھی مقدم بہت ہے یاں

سودا اگر اس سے دل کی تسلی کے واسطے
گوشے سے چشم کے نگہ کم بہت ہے یاں

ابراہیم علی خاں تذکرہ گلزار ابراہیمی میں لکھتے ہیں کہ مرزا غلام حیدر مجذوب مرزا رفیع کے بیٹے ہیں اور اب کہ ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ درستی فہم اور آشنا پرستی کے اوصاف سے موصوف ہیں۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ ایک مغل بچہ خوش اخلاق جوان ہے۔ مرزا سودا کا متبنّیٰ ہے۔ سپاہ گری کے عالم میں زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے مربی کی شاگردی کا دم بھرتا ہے۔

عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں ——— بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں
نہ اندیشے کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی ——— تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں

ہمارے تم سے جو عہد وفا ہوں ان کو تم جانوں
مرے پیماں میں کچھ نوعِ دگر ہووے تو میں جانوں
ذرا تم مار کا کلی کو مرے لب سے لگا دیکھو
ہزاروں سانپ کاٹیں پھر اثر ہووے تو میں جانوں

خوباں سے جو دل ملا کرے گا
ڈرتا ہوں یہی کہ کیا کرے گا

آوے بھی مسیحا مرے بالیں پہ تو کیا ہو
بیمار پہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو
جور وشفا پہ یار کی دل مت نگاہ کر
اپنی طرف سے ہووے جہاں تک نباہ کر
خاک وخوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تیری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں
آہ میں اپنی اثر ڈھونڈے ہے اے مجذوب تو
بید مجنوں کی نہ شاخیں ہم نے پھلیاں دیکھیاں

بس اب تیری تاثیر اے آہ دیکھی
نہ آیا وہ کافر بہت راہ دیکھی

خاموش جو اتنا ہوں مجھے گنگ نہ سمجھو
اب عرض تمنا ہے کہ آ لب پہ اڑی ہے
چاہوں مدد کسی سے نہ اغیار کے لئے
میں بھی تو یار! کم نہیں دو چار کے لئے
طوبیٰ تلے میں بیٹھ کے روؤں گا بار بار
جنت میں تیرے سایۂ دیوار کے لئے
ہے درد سر ہی بلبل آزاد کی صفیر
موزوں ہے نالہ مرغ گرفتار کے لئے

میرؔ تقی مرحوم کی زبان سے ان کے باب میں کچھ الفاظ نکلے تھے۔ اس پہ فرماتے ہیں۔

اے میر سمجھیو مت مجذوب کو اوروں سا
ہے وہ حلفِ سوداؔ اور اہل ہنر بھی ہے
اشک آنکھ میں ہو عشق سے تا دل میں غم رہے
یہ گھر ہے وہ خراب کہ آتش میں نم رہے
نکلے اگر قفس سے تو خاموش ہم صفیر
صیاد نے سنا یہ ترا نہ تو ہم رہے

# میر ضاحک

میر مرحوم کو سوداؔ کے دیوان میں بہت مداخلت ہے اور ان کے سلسلہ اولاد میں بھی ایسے عالی رتبہ کمال پیدا ہوئے کہ خود صاحبِ طرز کہلائے اس لئے ابتدا سے دل چاہتا تھا کہ اس خانوادۂ سیادت کا سلسلہ مسلسل لکھوں مگر پھول نہ ہاتھ آئے جو لڑی پرو دیتا۔ اسی واسطے طبع اول میں مقصر رہا بے درد بے انصاف اصول فن سے بے خبر ہیں۔ کیا جانیں۔ انہیں اپنے مضامین اخباروں میں چمکانے کے لئے روشنائی ہاتھ آئی اور جہاں اور شکایتیں چھاپیں۔ ان

میں ایک ۔ بر شمار یہ بھی بڑھایا۔ راقم آثم نے اطراف مشرقی اور خاص لکھنؤ میں بھی احباب کو لکھا۔ کہیں سے آواز نہ آئی۔ البتہ مولوی غلام محمد خاں طپش نے اس شفقت کے ساتھ جواب یاس دیا کہ دل مشقت تلاش سے رہا ہو گیا اب کہ طبع ثانی کا موقع ہے آرزوے قدیم پھر دل میں لہرائی۔ ناچار برسوں کے سوکھے مرجھائے پھول جو دل افسردہ کے طاق میں پڑے تھے۔ انہی کا سہرا بنا کر سادات عظام کے روضوں پر چڑھاتا ہوں۔ اور جس ابتدا تک دست آگاہی نے رسائی کی، وہاں سے شروع کرتا ہوں۔

میر ضاحک مرحوم کا نام سید غلام حسین تھا۔ ان کے بزرگ ہرات سے آکر پرانی دلی میں آباد ہوئے۔ خاندان سیادت ان کا سند ہی تھا۔ امامی ہردی کی اولاد میں تھے۔ اور شاعری بھی گھرانے میں میراث چلی آتی تھی۔ میر موصوف نہایت خوش طبع شگفتہ مزاج خندہ جبیں ہنسنے اور ہنسانے والے تھے۔ اسی واسطے یہ تخلص اختیار کیا تھا۔ وضع اور لباس قدمائے دہلی کا پورا نمونہ تھا۔ سر پہ سبز عمامہ بوضع عرب۔ بڑے گھیر کا جامہ۔ جبہ کہ وہ بھی اکثر سبز ہوتا تھا گلے میں خاک پاک کا کنٹھا۔ داہنے ہاتھ میں ایک چوڑی۔ اس میں کچھ کچھ دعائیں کندہ۔ چھنگلی بلکہ اور انگلیوں میں بھی کئی انگوٹھیاں۔ داڑھی کو منہدی لگاتے تھے۔ بہت بڑی نہ تھی۔ مگر ریش بچہ منڈاتے تھے۔ کبھی کبھی ہاتھوں کو بھی منہدی ملتے تھے۔ میانہ قد، رنگ گورا۔

دیوان اب تک نظر سے نہیں گزرا۔ جس پر کچھ رائے ظاہر کی جائے۔ خواص میں جو کچھ شہرت ہے۔ ان ہجووں کی بدولت ہے۔ جو سودا نے ان کے حق میں کہیں سلطنت کی تباہی نے ان سے بھی دلی چھڑوائی اور فیض آباد کو آباد کیا۔

سودا نے جو ان کے حق میں گستاخی کی ہے اس کا سبب یہ ہوا کہ اول کسی موقع پر انہوں نے سودا کے حق میں کچھ فرمایا۔ سودا ان کے پاس گئے اور کہا کہ آپ بزرگ ، میں خورد۔ آپ سید، میں آپ کے جد کا غلام۔ عاصی اس قابل نہیں کہ آپ اس کے حق میں کچھ ارشاد فرمائیں۔ ایسا نہ کیجیے کہ مجھ گنہگار کے منہ سے کچھ نکل جائے اور قیامت کے دن آپ کے جد کے سامنے روسیاہ ہوں۔ تلامیذ الٰہی کے دماغ عالی ہوتے ہیں ان کی زبان سے نکلا کہ نہیں بھئی یہ شاعری ہے اس میں خردی و بزرگی کیا۔ سودا آئیں تو کہاں جائیں۔ پھر جو کچھ انہوں نے کہا خدا نہ سنوائے۔ یہ بھی بزرگوں سے سنا کہ مرزا نے جو کچھ ان کی جناب میں یاوہ گوئی کی ہے۔ میر صوف نے اس سے زیادہ خراب وخوار

کیا تھا۔ لیکن وہ کلام عجیب طرح سے فنا ہوا۔

میر حسن مرحوم ان کے صاحب زادے سودا کے شاگرد تھے۔ میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لئے گئے اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے۔ بعد رسم عزا پرسی کے اپنی یاوہ گوئی پر جو کہ اس مرحوم کے حق میں کی تھی۔ بہت سے عذر کئے اور کہا کہ سید مرحوم نے دنیا سے انتقال فرمایا۔ تم فرزند ہو جو کچھ اس روسیاہ سے گستاخی ہوئی معاف کرو بعد اس کے نوکر سے دیوان منگا کر جو ہجویں ان کی کہی تھیں۔ سب چاک کر ڈالیں۔ میر حسن نے بمقتضائے علو حوصلہ وسعادت مندی اسی وقت دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں ان کی تھیں۔ وہ پھاڑ ڈالیں۔ لیکن چونکہ سودا کی تصنیف قلم سے نکلتے ہی بچے بچے کی زبان پر پھیل جاتی تھی۔ اس لئے سب قائم رہیں۔ ان کا کلام کہ اسی مجلد کے اندر تھا مفقود ہو گیا۔ سودا کے دیوان میں میر ضاحک مرحوم کی یہ ہجو جب میں دیکھتا تھا۔

ع یارب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر

تو حیران ہوتا تھا کہ سکندر کا یہاں کیا کام ؟ میر مہدی حسن فراغ کو خدا مغفرت کرے۔ انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن حسب معمول مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں پائیں باغ میں تخت بچھے تھے۔ صاحب عالم خود مسند پر بیٹھے تھے۔ شرفا و شعراء کا مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے۔ کہ میر ضاحک تشریف لائے ان کی وضع اور لباس پر کہ ان دنوں میں بھی انگشت نما تھی۔ صاحب عالم مسکرائے۔ میر صاحب آکر بیٹھے۔ مزاج پرسی ہوئی۔ حقہ سامنے آیا۔ اتفاقاً صاحب عالم نے مرزا رفیع سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمائیے (دونوں صاحبوں کے معاملات تو انہیں معلوم ہی تھے۔ خدا جانے چھیڑ منظور تھی۔ یا اتفاقاً زبان سے نکلا) سودا نے کہا کہ میں نے تو ان دنوں میں کچھ نہیں کہا مرزا سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انہوں نے ایک مخمس کہا ہے صاحب عالم نے فرمایا کیا؟ سودا نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ میر ضاحک مرحوم اٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریبان ہو گئے۔ سکندر بیچارے حیران کہ نہ واسطہ نہ سبب یہ کیا آفت آگئی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں صاحبوں کو الگ کیا۔ اور سودا کو دیکھیے تو کنارا کھڑے مسکرا رہے ہیں (یہ شان نزول ہے اس مخمس کی)

ہر چند چاہا کہ ان کے جلسے اور باہمی گفتگو کے لطائف و ظرائف معلوم ہوں۔ کچھ نہ ہو تو چند غزلیں ہی پوری مل جائیں۔ کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ جب ان کے چراغ خاندان سید خورشید علی نفیس بھی شعاع توجہ اور لطف فرمائیں تو غیروں سے کیا امید ہو۔

نہوں نے آزاد خاکسار کو آبِ حیات کی رسید سے شاداب نہ کیا ؎

تشنہ بودم زدمِ تیغ چو آہم دادند — وز جوابِ لبِ تو جوابم دادند

تاریخ وفات بھی نہ معلوم ہوئی۔ ممکن نہیں کہ باکمال صاحبزادے نے تاریخ نہ کہی ہو مگر آزاد کو کون بتائے۔ صاحب تذکرۂ گلزار ابراہیمی سنہ ۱۱۹۶ھ میں کہتے ہیں کہ فیض آباد میں ہیں اور وارستگی سے گزران کرتے ہیں۔

جس تذکرے میں دیکھا ایک ہی شعر ان کا درج پایا ؎

کیا دیجیے اصلاح خدائی کو وگرنہ — کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

# خواجہ میر درد

درد تخلص۔ خواجہ میر نام۔ زبان اردو کے چار رکنوں میں سے ایک رکن[1] یہ ہیں سلسلہ مادری ان کا خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی سے ملتا ہے۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب تخلص ان کے باپ تھے۔ اور شاہ گلشن صاحب سے نسبت ارادت رکھتے تھے۔ خاندان ان کا دلی میں بباعث پیری و مریدی کے نہائت معزز اور معظم تھا۔ علوم رسمی سے آگاہ تھے۔ کئی مہینے مفتی دولت صاحب سے مثنوی کا درس حاصل کیا تھا۔ ملک کی بربادی سلطنت کی تباہی آئے دن کی غارت و تاراج کے سبب سے اکثر امرا و شرفا کے گھرانے شہر چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے۔ ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ آئی۔ اپنے اللہ پر توکل رکھا اور جو سجادہ بزرگوں نے بچھایا اسی پر بیٹھے رہے "جیسی نیت ویسی برکت" خدا نے بھی نباہ دیا۔ دیوان اردو مختصر ہے۔ سوا غزلیات اور ترجیع بند اور رباعیوں کے اور کچھ نہیں قصائد و مثنوی وغیرہ کہ عادت شعرا کی ہے۔ انہوں نے نہیں لکھے۔ باوجود اس کے سودا اور میر تقی کی غزلوں پر جو غزلیں لکھی ہیں ہرگز ان سے کم نہیں ایک مختصر دیوان غزلیاتِ فارسی کا بھی ہے۔ تصنیف کا شوق ان کی طبیعت میں خداداد تھا۔ چنانچہ اوّل پندرہ برس کی عمر میں بحالت اعتکاف رسالہ اسرار الصلوٰۃ لکھا۔ انتیس برس کی عمر میں واردات درد نام ایک اور رسالہ اور اس کی شرح میں علم الکتاب ایک بڑا نسخہ تحریر کیا کہ اس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں۔ نالۂ درد۔ آہ سرد۔ درد دل۔ سوز دل۔ شمع محفل وغیرہ جنہیں شائق تصوف نظر عظمت سے دیکھتے ہیں اور واقعات درد اور ایک رسالہ حرمتِ غنا میں ان سے یادگار ہے۔ چوں کہ اس زمانے کے خاندانی مخصوص اہل تصوف کو شاعری واجب

تھی۔ اس واسطے ان کے والد کا بھی ایک دیوانِ مختصر مع اس کی شرح کے اور ایک رسالہ نالۂ عندلیب موجود ہے۔ ان کے بھائی میاں سید محمد میر اثرؔ تخلص کرتے تھے۔ وہ بھی صاحبِ دیوان تھے۔ بلکہ ایک مثنوی خواب و خیال ان کی مشہور ہے اور بہت اچھی لکھی ہے۔ خواجہ میر دردؔ صاحب کی غزل سات شعر نو شعر کی ہوتی ہے۔ مگر انتخاب ہوتی ہے خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے۔ گویا تلواروں کی آب داری نشتر میں بھی دیتے تھے خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے۔ کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا انہوں نے کہا اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔ میر صاحب نے انہیں آدھا شاعر شمار کیا ہے۔ ان کے عہد کی زبان سننی چاہو، تو دیوان کو دیکھ لو، جو میر، مرزا کی زبان ہے وہی ان کی زبان ہے۔

زمانے کے کلام بموجب ان کے کلام میں بھی نت یعنی ہمیشہ اور ٹک یعنی ذرا، تیئں یعنی کو، اور یہاں تئیں یعنی یہاں تک اور مجھ ساتھ یعنی میرے ساتھ اور ایدھر، کیدھر، جیدھر۔ نہیں بہ حذفِ ہ وغیرہ الفاظ موجود ہیں۔ چنانچہ درد کی تمہید میں میر اور سودا کے اشعار کے ساتھ کچھ اشعار ان کے بھی لکھے گئے ہیں۔ دو تین شعر نمونے کے طور پہ یہاں بھی لکھتا ہوں۔

؎ چلیئے کہیں اس جا کہ ہم تم ہوں اکیلے — گوشہ نہ ملے گا کوئی میدان ملے گا

جا گہ کے علاوہ اکثر جگہ گی کے اور ہے وغیرہ دب دب کر نکلتے ہیں۔

اک لحظ اور بھی وہ اڑاتا چمن کا دید — فرصت نہ دی زمانے نے اتنی شرار کو

اس سے اعتراض مقصود نہیں وقت کی زبان یہی تھی۔ سید انشا نے بھی لکھا ہے کہ خواجہ میر اثر مرحوم مثنوی میں ایک جگہ دِسا بھی کہہ گئے ہیں۔ اور بڑے بھائی صاحب تلوار کو تروار کہا کرتے تھے۔ لیکن اس سے قطع نظر کر کے دیکھا جاتا ہے۔ تو بعض الفاظ پر تعجب آتا ہے۔ چنانچہ خواجہ میر درد کی ایک پُرزور غزل کا مطلع ہے ؎

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم بھی مہمان تھے تو آپ ہی صاحبِ خانہ تھا

گویا بت خانہ کو کثرتِ استعمال کے سبب سے ایک لفظ تصور کیا۔ کہ دیر کے حکم میں ہو گیا ورنہ ظاہر کہ یہ قافیہ صحیح نہیں۔ اگلے وقتوں کے لوگ خوش اعتقاد بہت ہوتے تھے۔ اسی واسطے جو لوگ اللہ کے نام پر توکل کر کے بیٹھ رہتے تھے۔ ان کی سب سے اچھی گزر جاتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ خواجہ صاحب کو نوکری یا دلی سے باہر جانے کی ضرورت

نہ ہوئی۔ دربار شاہی سے بزرگوں کی جاگیریں چلی آتی تھیں۔ امیر غریب خدمت کو سعادت سمجھتے تھے۔ یہ بے فکر بیٹھے اللہ اللہ کرتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ نے خود ان کے ہاں آنا چاہا۔ اور انہوں نے قبول نہ کیا۔ مگر ماہ بماہ ایک معمولی جلسہ اہل تصوف کا ہوتا تھا۔ اس میں بادشاہ بے اطلاع چلے آئے۔ اتفاقاً اس دن بادشاہ کے پاؤں میں درد تھا بادشاہ نے عذر کیا کہ معاف کیجئے۔ عارضے سے معذور ہوں۔ انہوں نے کہا کہ عارضہ تھا تو تکلیف کرنی کیا ضرور تھی۔

موسیقی میں اچھی مہارت تھی۔ بڑے بڑے باکمال گویئے اپنی چیزیں بنظر اصلاح لاکر سنایا کرتے تھے۔ راگ ایک پرتاثیر چیز ہے فلاسفہ یونان اور حکمائے سلف نے اسے شاخ ریاضی قرار دیا ہے۔ دل کو فرحت اور روح کو عروج دیتا ہے۔ اس واسطے اہل تصوف کے اکثر فرقوں نے اسے بھی عبادت میں شامل کیا ہے۔ چنانچہ معمول تھا کہ ہر مہینے کی دوسری اور ۲۴ کو شہر کے بڑے بڑے کلاونت، ڈوم گویئے اور صاحب کمال اور اہل ذوق جمع ہوتے تھے۔ اور معرفت کی چیزیں گاتے تھے یہ دن ان کے کسی بزرگ کی وفات کے ہیں۔ محرم غم کا مہینا ہے۔ اس میں ۲ کو بجائے گانے کے مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کا گھرانا اور یہ خاندان ایک محلے میں رہتے تھے۔ ان کے والد مرحوم کے زمانے میں شاہ صاحب عالم طفولیت میں تھے۔ ایک دن اس جلسے میں چلے گئے اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ ان کی مرید بہت سی کنچنیاں بھی تھیں۔ اور چونکہ اس وقت رخصت ہوا چاہتی تھیں۔ اس لئے سب سامنے حاضر تھیں باوجودیکہ مولوی صاحب اس وقت بچہ تھے۔ مگر ان کا تبسم اور طرز نظر دیکھ کر خواجہ صاحب اعتراض کو پا گئے۔ اور کہا کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ماں بہنوں کو عوام الناس میں لے کر بیٹھنا کیا مناسب ہے۔ خواجہ صاحب خاموش رہے۔

ان کے ہاں ایک صحبت خاص ہوتی تھی۔ اس میں خواجہ میر درد صاحب نالۂ عندلیب یعنی اپنے والد کی تصنیفات اور اپنے کلام کچھ بیان کرتے تھے۔ ایک دن مرزا رفیع سے سر راہ ملاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب نے تشریف لانے کے لئے فرمائش کی۔ مرزا نے کہا صاحب مجھے یہ نہیں بھاتا کہ سوکوے کائیں کائیں کریں اور بیچ میں ایک پدا بیٹھ کر چوں چوں کرے اس زمانے کے بزرگ ایسے صاحب کمالوں کی بات کا تحمل اور برداشت کرنا لازمہ بزرگی سمجھتے تھے۔ آپ مسکرا کر چپکے ہو رہے۔

مرزائے موصوف نے ایک قصیدہ نواب احمد علی خاں کی تعریف میں کہا ہے اور تمہید میں اکثر شعرا کا ذکر انہیں شوخیوں کے ساتھ کیا ہے۔ جو ان کے معمولی انداز ہیں۔ چنانچہ اسی کے ضمن میں کہتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| درد کس کس طرح بلاتے ہیں | کرکے آواز منحنی د حزیں |
| اور جو احمق ان کے سامع ہیں | دمبدم ان کو یوں کریں تحسین |
| جیسے بسجان من یرانی پر ! | لڑکے مکتب کے سب کہیں آمین |
| کوئی پوچھے ذرا کہ عالم میں | فخر کس چیز کا ہے ان کے تئیں |
| شعر و تقطیع ان کے دیواں کی | جمع ہوئے تو جیسے نقش نگیں |
| اس میں بھی دیکھیے تو آخرکار | یا توارد ہوا ہے یا تضمین |
| اتنی کچھ شاعری یہ کرتے ہیں | میخ در........ آسمان و زمیں |

خیر یہ شاعرانہ شوخیاں ہیں۔ ورنہ عام عظمت ان کی جو عالم پر چھائی ہوئی تھی اس کے اثر سے سودا کا دل بھی بے اثر نہ تھا چنانچہ کہا ہے ؎

سودا بدل کے قافیہ تو اس غزل کو لکھ
اے بے ادب تو درد سے بس دو بدو نہ ہو

نقل ایک شخص لکھنؤ سے دلّی چلے۔ مرزا رفیع کے پاس گئے اور کہا کہ دلّی جاتا ہوں کسی یار آشنا کو کچھ کہنا ہو تو کہہ دیجیے۔ مرزا بولے کہ بھائی میرا دلّی میں کون ہے ہاں خواجہ میر درد کی طرف جا نکلو تو سلام دینا۔

ذرا خیال کرکے دیکھو مرزا رفیع جیسے شخص کو دلّی میں (دلی بھی اس زمانے کی دلّی) کوئی آدمی معلوم نہ ہوا، الّا وہ کیا کیا جواہر تھے اور کیا کیا جوہری۔ سبحان اللہ، استاد مرحوم نے کیا کیا موتی پروئے ہیں ؎

دکھلائے ہم نے آنکھ سے لے کر جو دُرِ اشک
قائل ہماری آنکھ کے سب جوہری ہوئے

(لطیفہ) خواجہ صاحب کا ایک شعر ہے۔

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ
بندہ گر آئے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ

اسی مضمون کا شعر فارسی کا ہے ؎

| | |
|---|---|
| بسکہ در چشم و دلم ہر لحظہ اے یارم توئی | ہر کہ آید در نظر از دور پندارم توئی |

جب یہ شعر شاعر نے جلسے میں پڑھا ملا شیدا ایک شوخ طبع ، دہن دریدہ شاعر تھے انھوں نے کہا کہ اگر سگ در نظر آید۔ شاعر نے کہا۔ پندارم توئی۔ مگر انصاف شرط ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے شعر میں اس پہلو کو خوب بچایا ہے۔

اے درد یہ درد جی کا کھونا معلوم
جو لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
گلزار جہاں ہزار پھولے لیکن
میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

شاہ حاتم کی رباعی بھی اسی مضمون میں لاجواب ہے۔

رباعی ان سیم بروں کے ساتھ سونا معلوم
قسمت میں لکھی ہے خاک سونا معلوم
حاتم افسوس دی و امروز گذشت
فردا کی رہی امید، سونا معلوم

میر تقی اور سودا اور مرزا جان جاناں مظہر ان کے ہمعصر تھے۔ قیام الدین قائم ان کا وہ شاگرد تھا جس پر استاد کو فخر کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ہدایت اللہ خاں ہدایت ثناء اللہ خاں فراق وغیرہ بھی نامی شاگرد تھے۔

خواجہ صاحب ۲۴ صفر یوم جمعہ ۱۱۹۹ھ ۶۸ برس کی عمر میں شہر دہلی میں فوت ہوئے۔ کسی مرید با اعتقاد نے تاریخ کہی کہ

چھٹ دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب

# غزلیات

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی — جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری — آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
زور عاشق مزاج ہے کوئی
درد کو قصہ مختصر دیکھا

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا — پر اسے آہ کچھ اثر نہ کیا
سب کے یاں تم ہوئے کرم فرما — اس طرف کو کبھی گزر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم — نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے پاس میں آیا — جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا
کیوں بھویں تانتے ہو بندہ نواز — سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا — کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
آپ سے ہم گزر گئے کب کے — کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا
کون سا دل ہے جس میں خانہ خراب — خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے دردؔ
بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا — پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور — شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن — میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا
باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے — وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا
پرورشِ غم کی ترے یاں تئیں تو کی دیکھا — کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا
محتسب آج تو مے خانے میں تیرے ہاتھوں — دل نہ تھا کوئی کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا

دردؔ کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانے
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
اس نے قصداً بھی میرے نالے کو — نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا
دیکھیے غم سے اب کے جی میرا — نہ بچے گا بچے گا کیا ہوگا
دل زمانے کے ہاتھ سے سالم — کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
حال مجھ غمزدہ کا جس تس نے — جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا
دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں — کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
یک بیک نام لے اٹھا میرا — جی میں کیا اس کے آ گیا ہوگا
میرے نالوں پہ کوئی دنیا میں — بن کیے آہ کم رہا ہوگا
لیکن اس کو اثر خدا جانے — نہ ہوا ہوگا یا ہوا ہوگا

قتل سے میرے وہ جو باز رہا
کسی بدخواہ نے کہا ہوگا

دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

میرا جی ہے جب تک تری جستجو ہے
زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا
میں بے صبر اتنا ہوں وہ تند خو ہے

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

کیا سیر سب ہم نے گلزارِ دنیا
گلِ دوستی میں عجب رنگ و بو ہے

کسو کو کسو طرح عزت ہے جگ میں
مجھے اپنے رونے سے ہی آبرو ہے

غنیمت ہے یہ دید وا دید یاراں
جہاں مُند گئی آنکھ، میں ہوں نہ تو ہے

نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی رو برو ہے

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے ادھر اودھر چلے

آہ بس مت جی جلا تب جانیے
جب ترا افسوں کوئی اس پہ چلے

شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے
وہ ہی آڑے آ گیا جیدھر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے آپ اسے لے کر چلے

جوں شرر اے ہستیِ بے بود یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے
تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے؟

دل بھی تیرے ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے؟

بے خبر تیغِ یار کہتی ہے
باقی اس نیم جان میں کچھ ہے؟

ان دنوں کچھ عجب ہے دل کا حال
دیکھتا کچھ ہے دھیان میں کچھ ہے

دردؔ جو تو کرے ہے جی کا زیاں
فائدہ اس زیان میں کچھ ہے؟

گلیمِ بختِ سیہ سایہ دار رکھتے ہیں
یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں

بسانِ کاغذِ آتش زدہ مرے گرد
تپ سے جلے بجھنے اور ہی بہار رکھتے ہیں

یہ کس نے ہم سے کیا وعدۂ ہم آغوشی
کہ مثلِ بحرِ سراسر کنار رکھتے ہیں

ہمیشہ فتح نصیبہ ہمیں نصیب رہی
جو کچھوا ابھی ہے جی میں سو مار رکھتے ہیں

بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ
سب اہلِ قبر اسی کا خمار رکھتے ہیں

جہاں کے باغ سے ہم دل سوا نہ پھل پایا
فقط یہی ثمرِ داغ دار رکھتے ہیں

اگرچہ دخترِ رز کے ہے محتسب درپے
جو ہو سو ہو پر اسے اب تو یار رکھتے ہیں

ہر ایک شعلۂ غم عشق ہم سے روشن ہے
کہ بیقراری کو ہم برقرار رکھتے ہیں

ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور گلوگیری
یہ ایک جیب ہے سو تار تار رکھتے ہیں

بتوں کے جور اٹھائے ہزار ہا ہم نے
جو اس پہ بھی نہ ملیں، اختیار رکھتے ہیں

بھری ہے آگے بہتوں میں ہوائے آزادی
حباب وار کلہ بھی اتار رکھتے ہیں

نہ برق ہیں نہ شرر ہم نہ شعلہ نے سیماب
وہ کچھ ہیں پہ کہ سدا اضطرار رکھتے ہیں

جنہوں کے دل میں جگہ کی ہے نقشِ عبرت نے
سدا نظر میں وہ لوحِ مزار رکھتے ہیں

ہر ایک سنگ میں ہے شوخیٔ بتاں پنہاں
خنک یہ سب ہیں پہ دل میں شرار رکھتے ہیں

وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا
اگرچہ دردؔ اسے ہم ہزار رکھتے ہیں

پیدا کرے ہر چند تقدس بندہ
مشکل ہے کہ حرص سے ہو دل برکندہ

جنت میں بھی اکل و شرب سے نہیں ہے نجات
دوزخ کا بہشت میں بھی ہوگا دھندہ

# سیّد محمد میر سوز

سوزؔ تخلص سید محمد میر نام۔ وہی شخص ہیں جنہیں میر تقی نے پادشاہِ شاعر مانا ہے۔ پرانی دلی میں قرادل پورہ ایک محلہ تھا۔ وہاں رہتے تھے۔ مگر اصلی وطن بزرگوں کا بخارا تھا۔ باپ ان کے سید ضیاء الدین بہت بزرگ شخص تھے۔ تیر اندازی میں صاحبِ کمال

مشہور تھے۔ اور حضرت قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے۔ سوز مرحوم پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ جب میر تقی مرحوم میر کے تخلص سے عالمگیر ہوئے تو انہوں سوز اختیار کیا۔ چنانچہ ایک شعر میں دونوں تخلصوں کا اشارہ کرتے ہیں ؎

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ ہوئے ہزار حیف
اب جو کہے ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرد

جو کچھ حال ان کا بزرگوں سے سنا یا تذکروں میں دیکھا۔ اس کی تصدیق ان کا کلام کرتا ہے۔ یعنی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبع موزوں کے آئینے کو جس طرح فصاحت نے صفائی سے جلا کی تھی۔ اسی طرح ظرافت اور خوش طبعی نے اس میں جوہر پیدا کیا تھا۔ ساتھ اس کے جس قدر نیکی و نیک ذاتی نے عزت دی تھی۔ اس سے زیادہ وسعت اخلاق اور شیریں کلامی نے ہر دلعزیز کیا تھا۔ اور خاکساری نے جب جوہر ولی کو زیادہ تر چمکایا تھا۔ آزادگی کے ساتھ وضعداری بھی ضرور تھی۔ جس کا نتیجہ تھا۔ کہ باوجود مفلسی کے ہمیشہ مسند عزت پر صاحب تمکین اور امراء اور رؤسا کے پہلو نشین رہے اور اسی میں معیشت کا گذارہ تھا۔

شاہ عالم کے زمانے میں جب اہل دہلی کی تباہی حد سے گذر گئی تو ۱۱۹۱ھ میں لباس فقیری اختیار کیا اور لکھنو چلے گئے۔ مگر وہاں سے ۱۲۱۲ھ میں ناکام مرشد آباد گئے۔ یہاں بھی نصیب نے یاوری نہ کی۔ پھر لکھنؤ میں آئے۔ اب قسمت رجوع ہوئی۔ اور نواب آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوئے چند روز آرام سے گزرے تھے کہ خود دنیا سے گذر گئے نواب کی غزلوں کو دیکھو انہیں کا انداز ہے۔

صاحب تذکرہ گلزار ابراہیمی لکھتے ہیں۔ اب کہ ۱۱۹۶ھ ہیں، میر موصوف لکھنو ہی ہیں۔ اب تک ان سید والا تبار سے راقم اثم کی ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر اسی برس میں کچھ اپنے شعر اور چند فقرے نثر کے اس خاکسار کو بھیجے ہیں۔ میر سوز شخصے ست کہ ہیچکس را از حلاوتے جز سکوت واکراہ حاصل نہ شود۔ ایں نیز قدرت کمال الٰہی ست کہ ہر یکے بلکہ خار وخسے نیست کہ بکار چند بیاید۔ بس۔ اگر منکرے سوال کند کہ ناکارہ محض بنصادا ست ج۔ ایں ست کہ نامش سوختنی ست

خط شفیعا اور نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ ممالک ایران وخراسان وغیرہ میں قاعدہ ہے کہ جب شرفا ضروریات سے فارغ ہوتے ہیں تو ہم لوگوں کی طرح خالی نہیں بیٹھتے مشق خط کیا کرتے ہیں۔ اسی واسطے علی العموم اکثر خوشنویس ہوتے ہیں۔ پہلے یہاں بھی دستور تھا۔ اب خوشنویسی تو بالائے طاق بدنویسی پر بھی حرف ہے۔

میر موصوف سواری میں شہسوار اور فنون سپاہ گری میں ماہر خصوصاً تیر اندازی میں قدر انداز تھے۔ ورزش کرتے تھے۔ اور طاقت خداداد بھی اس قدر تھی کہ ہر ایک شخص ان کی کمان کو چڑھا نہ سکتا تھا۔ غرض ۱۲۱۳ھ میں شہر لکھنؤ میں ۷۰ برس کی عمر میں فوت ہوئے ان کے بیٹے شاعر تھے۔ اور باپ کے تخلص کی رعائت سے داغ تخلص کرتے تھے۔ جوانی میں اپنے مرنے کا داغ دیا۔ اور اس سے زیادہ افسوس یہ کہ کوئی غزل انکی دستیاب نہ ہوئی۔ خود حسین تھے اور حسینوں کے دیکھنے والے تھے۔ آخر غم فراق میں جان دی۔ میر سوز مرحوم کی زبان عجب میٹھی زبان ہے اور حقیقت میں غزل کی جان ہے۔ چنانچہ غزلیں خود ہی کہے دیتی ہیں۔ ان کی انشا پردازی کا حسن ۔ تکلف اور صناعی مصنوعی سے بالکل پاک ہے۔ اس خوشنمائی کی ایسی مثال ہے۔ جیسے ایک گلاب کا پھول ہری بھری ٹہنی پر کٹورا سا دھرا ہے۔ اور سرسبز پتیوں میں اپنا اصلی جوبن دکھا رہا ہے۔ جن اہل نظر کو خدا نے نظر باز آنکھیں دی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک حسن خداداد کے سامنے ہزاروں بناوٹ کے بناؤ سنگار قربان ہوا کرتے ہیں۔ البتہ غزل میں دو تین شعر کے بعد ایک آدھ پرانا لفظ ضرور کھٹک جاتا ہے۔ خیر اس سے قطع نظر کرنی چاہیئے۔

ع گر معقول بفرما گل بے خار کجاست

غزل۔ لغت میں عورتوں سے باتیں چیتیں ہیں۔ اور اصطلاح میں یہ ہے کہ عاشق اپنے معشوق کے ہجر یا وصل کے خیالات کو وسعت دے کر اس کے بیان سے دل کے ارمان یا غم کا بخار نکالے اور زبان بھی وہ ہو کہ گویا دونوں آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ بس وہ کلام ان کا ہے: معشوق کو بجائے جاناں کے فقط جان یا میاں یا میاں جان کہہ کر خطاب کرنا ان کا خاص محاورہ ہے۔

مجالس رنگین کی بعض مجلسوں سے اور ہمارے عہد سے پہلے کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام صفائی محاورہ اور لطف زبان کے باب میں ہمیشہ سے ضرب المثل ہے۔ ان کے شعر ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی چاہنے والا اپنے چاہتے عزیز سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ اپنی محبت کی باتوں کو اس طرح باندھتے تھے کہ شعر کی موزونیت کے لئے لفظوں کا آگے پیچھے کرنا بھی گوارا نہ سمجھتے تھے۔ میر تقی کہیں کہیں ان کے قریب قریب آ جاتے ہیں۔ پھر بھی بہت فرق ہے۔ وہ بھی محاورہ خوب باندھتے تھے۔ مگر فارسی کو بہت نباہتے تھے اور مضامین بلند لاتے تھے۔ سودا بہت دور ہیں کیونکہ مضامین کو تشبیہ و استعارہ کے رنگ میں غوطے دے کر محاورے میں ترکیب

دیتے تھے اور اپنے زورِ شاعری سے لفظوں کو پس و پیش کر کے اس بندوبست کے ساتھ جڑتے تھے کہ لطف اس کا دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا ہے۔

میر سوز جیسے سیدھے سیدھے مضمون باندھتے تھے۔ ویسے ہی آسان طرحیں بھی لیتے تھے۔ بلکہ اکثر ردیف چھوڑ کر قافیے ہی پر اکتفا کرتے تھے۔ ان کے شعر کا قوام فقط محاورے کی چاشنی پر ہے۔ اضافت۔ تشبیہ۔ استعارہ۔ فارسی ترکیبیں ان کے کلام میں بہت کم ہے۔ ان لحاظوں سے انہیں گویا اردو غزل کا شیخ سعدی کہنا چاہیے۔ اگر اس انداز پہ زبان رہتی۔ یعنی فارسی کے رنگین رنگین خیال اس میں داخل نہ ہوتے۔ اور قوت ایمانی کا مادہ اس میں زیادہ ہوتا تو آج ہمیں اس قدر دشواری نہ ہوتی۔ اب دوہری مشکلیں ہیں اوّل یہ کہ رنگین استعارات اور مبالغے کے خیالات گویا مثل تکیہ کلام کے زبانوں پر چڑھ گئے ہیں۔ یہ عادت چھڑانی چاہیے۔ پھر اس میں نئے انداز اور سادا خیالات کو داخل کرنا چاہیے۔ کیوں کہ سالہا سال سے کہتے کہتے اور سنتے سنتے کہنے والوں کی زبان اور سننے والوں کے کان اس کے انداز سے ایسے آشنا ہو گئے ہیں کہ نہ سادگی میں لطفِ زبان کا حق ادا ہو سکتا ہے اور نہ سننے والوں کو مزا دیتا ہے۔

زیادہ تر سودا اور کچھ میر نے اس طریقے کو بدل کر استعاروں کو ہندی محاوروں کے ساتھ ملا کر ریختہ، متین بنایا۔ اگر میر و سودا اور ان کی زبان میں فرق بیان کرنا ہو تو یہ کہہ دو کہ بہ نسبت عہدِ سودا کے دیوان ہیں اردو کا نوجوان چند سال چھوٹا ہے اور یہی امر باعتبار مضمون اور کیا بلحاظِ محاورۂ قدیم ہر امر میں خیال کر لو۔ چنانچہ کو، کہ علامت مفعول ہے، لہو اور کبھو کا قافیہ بھی باندھ جاتے تھے۔ انہوں نے سوائے غزل کے اور کچھ نہیں کہا اور اس وقت تک اردو کی شاعری کی اتنی ہی بساط تھی۔ ۱۲ سطر کے صفحے سے ۳۰۰ صفحے کا کل دیوان ہے۔ اس میں سے ۲۸۸ صفحہ غزلیات۔ ۱۲ صفحہ مثنوی۔ رباعی۔ مخمس، باقی والسلام آغاز مثنوی کا یہ شعر ہے ؎

دعویٰ بڑا ہے سوز کو اپنے کلام کا
جو غور کیجیے تو ہے کوڑی کے کام کا

نقل۔ ایک دن سودا کے ہاں میر سوز تشریف لائے۔ ان دنوں میں شیخ علی حزیں کی غزل کا چرچا تھا۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

؎ گر قتیم بجاناں سر راہے گاہے
او ہم از لطف نہاں داشت نگاہے گاہے

میر سوز مرحوم نے اپنا مطلع پڑھا ؎

نہیں نکلے ہے مرے دل کی اُپا ہے گا ہے
اے فلک بہر خدا رخصتِ آہے گا ہے

مرزا سن کر بولے کہ میر صاحب بچپن میں ہمارے ہاں پشور کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں تو جب یہ لفظ سُنا تھا یا آج سنا۔ میر سوز بچارے ہنس کر چپکے ہو رہے۔ پھر مرزا نے خود اسی وقت مطلع کہہ کر پڑھا۔

نہیں جوں گل ہوسِ ابر سیا ہے گا ہے
کاہ ہوں خشک میں اے برق نگا ہے گا ہے

میاں جرأت کی ان دنوں میں ابتدا تھی، خود جرأت نہ کر سکے۔ ایک اور شخص نے کہا کہ حضرت! یہ بھی عرض کیا چاہتے ہیں۔ مرزا نے کہا۔ کیوں بھئی کیا؟ جرأت نے پڑھا

سر سری ان سے ملاقات ہے گا ہے گا ہے
صحبت غیر میں گا ہے سرا ہے گا ہے

سب نے تعریف کی اور مرزائے موصوف نے بھی تحسین و آفرین کے ساتھ پسند کیا اسی پر ایک اور مطلع یاد آیا ہے۔ چاہو ظفر کا کہو چاہو ذوق کا سمجھو ؎

اس طرف بھی تمہیں لازم ہے گا ہے گا ہے — دم بدم لحظہ بہ لحظہ تمہیں گا ہے گا ہے

نقل۔ کسی شخص نے ان سے آکر کہا کہ حضرت، ایک شخص آپ کے تخلص پہ آج ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ سوز گوز کیا تخلص رکھا ہے۔ ہمیں پسند نہیں۔ انہوں نے کہنے والے کا نام پوچھا اس نے بعد بہت سے انکار اور اصرار کے بتایا، معلوم ہوا کہ شخص موصوف بھی مشاعرے میں ہمیشہ آتے ہیں۔ میر سوز مرحوم نے کہا خیر کچھ مضائقہ نہیں اب کے صحبت کے مشاعرے میں تم مجھ سے برسر جلسہ یہی سوال کرنا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بآوازِ بلند پوچھا، حضرت آپ کا تخلص کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ صاحب قبلہ فقیر نے تخلص تو میر کیا تھا۔ مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا۔ فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کمال کے سامنے میرا نام نہ روشن ہو سکے گا۔ ناچار سوز تخلص کیا (شخص مذکور کی طرف اشارہ کر کے کہا) سنتا ہوں یہ صاحب گوز کرتے ہیں۔ مشاعرے میں عجیب قہقہہ اڑا۔ لکھنؤ میں ہزاروں آدمی مشاعرے میں جمع ہوتے تھے۔ سب کے کان تک آواز نہ گئی تھی۔ کئی کئی دفعہ کہوا کر سنا۔ ادھر شخص موصوف میر تقی صاحب دونوں چپ بیٹھے سنا کیے۔

انہوں نے علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ کہ جس سے کلام

کا لطف دو چند ہو جاتا تھا۔ شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے۔ کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے۔ اور لوگ بھی نقل اتارتے تھے مگر وہ بات کہاں؟ آواز دردناک تھی شعر نہایت نرمی اور سوز و گداز سے پڑھتے تھے۔ اور اس میں اعضاء سے بھی مدد لیتے تھے مثلاً شمع کا مضمون باندھتے تو پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے شمع اور دوسرے کی اوٹ سے وہیں فانوس تیار کر کے بتاتے۔ بے دماغی یا ناراضی کا مضمون ہوتا تو خود بھی تیوری چڑھا کر وہیں بگڑ جاتے اور تم بھی خیال کر کے دیکھ لو ان کے اشعار اپنے پڑھنے کے لئے ضرور حرکات و انداز کے طالب ہیں۔ چنانچہ یہ قطعہ بھی ایک خاص موقع پر ہوا تھا اور عجیب انداز سے پڑھا گیا ہے

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے
سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پریرو
ارے رے رے ارے رے رے ارے رے

چوتھا مصرع پڑھتے پڑھتے وہیں زمین پر گر پڑے۔ گویا پریزادوں کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو گیا۔ اور ایسے ہی نڈھال ہوئے کہ ارے رے رے کہتے کہتے غش کھا کر بے ہوش ہو گئے۔

ایک غزل میں قطعہ اس انداز سے سنایا تھا کہ سارے مشاعرے کے لوگ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے ؎

او مارِ سیاہ زلف سچ کہہ
تبلا دے دل جہاں چھپا ہو
کنڈلی تلے دیکھیو نہ ہو وئے
کاٹا نہ ہمیں؟ ترا بُرا ہو

پہلے مصرع پہ ڈرتے ڈرتے۔ بگڑ جھکے۔ گویا کنڈلی تلے دیکھنے کو جھکے ہیں۔ اور جس وقت کہا۔ کاٹا نہ ہمیں! بس دفعۃً ہاتھ کو چھاتی تلے مسوس کر، ایسے بے اختیار لوٹ گئے کہ لوگ گھبرا کر سنبھالنے کو کھڑے ہو گئے (یہ صحیح انگی ہے، محاورے میں ہئی کہتے ہیں۔)۔

نوازش ان کے شاگرد کا نام ہم لڑکپن میں سنا کرتے تھے اور کچھ کہتے تھے تو وہی اس انداز میں کہتے تھے۔ مرزا رجب علی سرور صاحب فسانۂ عجائب ان کے شاگرد تھے۔

# مطلعِ سرِ دیوان

سرِ دیوان پر اپنے جو بسم اللہ میں لکھتا / بجائے مدِّ بسم اللہ مدِّ آہ میں لکھتا
مجھ کو تیرے نہیں ہے کچھ خیالِ خوب و زشت / ایک ہے اس کو ہوائے دوزخ و باغِ بہشت
حاجیو! طوفِ دلِ مستاں کرو تو کچھ ملے / ورنہ کعبے میں دھرا کیا ہے بغیر از سنگ و خشت
ناصحا گر یار ہے ہم سے خفا تو تجھ کو کیا / چینِ پیشانی ہی ہے اس کی ہماری سرنوشت

سوز نے دامن جو میں پکڑا تو وہیں چھین کر
کہنے لاگا۔ ان دنوں کچھ زور چل نکلا ہے ہشت

بھلا رے عشق تیری شوکت و شان / بھائی میرے تو اڑ گئے اوسان
ایک ڈر تھا کہ جی بچے نہ بچے / دوسرے غم نے کھائی میری جان
بس غمِ یار ایک دن دو دن / اس سے زیادہ نہ ہو جیو مہمان
نہ کہ بیٹھے ہو پاؤں پھیلا کر / اپنے گھر جاؤ خانہ آباداں
عارضی حسن پر نہ ہو مغرور / میرے پیارے یہ گو ہے یہ میداں
پھر ہے نے زلف و خال زیرِ زلف / چار دن تو بھی کھیل لے چوگاں

اور تو اور کہہ کے دو باتیں
سوز کہلایا صاحبِ دیوان

مرا جان جاتا ہے یارو بچا لو / کلیجے میں کانٹا گڑا ہے نکالو
نہ بھائی، مجھے زندگانی نہ بھائی / مجھے مار ڈالو مجھے مار ڈالو
خدا کے لئے میرے اے ہمنشینو! / وہ بانکا جو جاتا ہے اس کو بلا لو
اگر وہ خفا ہو کے کچھ گالیاں دے / تو دم کھا رہو کچھ نہ بولو نہ چالو
نہ آوے اگر وہ تمہارے کہے سے / تو منت کرو دھیرے دھیرے منالو
کہو ایک بندہ تمہارا مرے ہے / اسے جان کندن سے چل کر بچا لو

جلوں کی بری آہ ہوتی ہے پیارے
تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا لو

ہوا دل کو میں کہتا کہتا دوانا / پر اس بے خبر نے کہا کچھ نہ مانا
کوئی دم تو بیٹھے رہو پاس میرے / میاں! میں بھی چلتا ہوں ٹک رہ کے آنا
مجھے تو تمہاری خوشی چاہیئے ہے / تمہیں گو ہو منظور میرا کڑھانا
گیا ایک دن اس کے کوچے میں ناگاہ / لگا کہنے چل بھاگ رے پھر نہ آنا

کہاں ڈھونڈوں ہے ہے کدھر جاؤں یارب
کہیں جاں کا پاتا نہیں ہیں ٹھکانا

کہوں کس سے حکایت آشنا کی
سنو صاحب یہ باتیں ہیں خدا کی

دعا دی، تو لگا کہنے کہ دُر ہو
سنی [illegible] نے دعا تیری دُعا کی

کہا میں نے کہ کچھ خاطر میں ہو گا
تمہارے ساتھ جو میں نے وفا کی

گریباں میں ذرا منہ ڈال دیکھو
کہ تم نے اس وفا پہ ہم سے کیا کی

تو کتا ہے کہ بس بس چونچ کر بند
وفا لایا ہے، دت تیری وفا کی

عدم سے زندگی لائی تھی بہلا
کہ دنیا جائے ہے اچھی فضا کی

جنازہ دیکھتے ہی سن ہوا دل
کہ ہے ظالم! دغا کی رے دغا کی

تجھے اے سوزؔ کیا مشکل بنی ہے
جو ڈھونڈھے ہے سفارش اغنیا کی

کوئی مشکل نہیں رہتی ہے مشکل
محبت ہے اگر مشکل کشا کی

دل کے ہاتھوں بہت خراب ہوا
جل گیا بل گیا کباب ہوا

اشک آنکھوں سے پل نہیں تھمتا
کیا بلا دل ہے دل میں آب ہوا

جن کو نت دیکھتے تھے اب ان کا
دیکھنا بھی خیال و خواب ہوا

یارا غبار ہو گیا ہیہات
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

سارا دیوانِ زندگی دیکھا
ایک مصرع نہ انتخاب ہوا

سوزؔ بے ہوش ہو گیا جب سے
تیری صحبت سے باریاب ہوا

عاشق ہوا، اسیر ہوا مبتلا ہوا
کیا جانیے کہ دیکھتے ہی دل کو کیا ہوا

سر مشقِ ظلم تو نے کیا مجھ کو واہ واہ
تقصیر یہ ہوئی کہ ترا آشنا ہوا

دل تھا بساط میں سو کوئی اس کو لے گیا
اب کیا کروں گا اے مرے اللہ کیا ہوا

پاتا نہیں سراغ کروں کس طرف تلاش
دلوا نہ دل کدھر کو گیا آہ کیا ہوا

سنتے ہی سوزؔ کی خبرِ مرگ خوش ہوا
کہنے لگا کہ پنڈ تو چھوٹا بھلا ہوا

آج اس رہ سے دلربا گزرا
جی پہ کیا جانیے کہ کیا گزرا

آہ ظالم نے کچھ نہ مانی بات
میں تو اپنا سا جی چلا گزرا

اب تو آیا ہے بس خدا کو مان
پچھلا شکوہ تھا سو گیا گزرا

رات کو نیند ہے نہ دن کو چین
ایسے جینے سے اے خدا گزرا

سوز کے قتل پر کمر مت باندھ
ایسا جانا ہے کیا گیا گزرا

یار گر صاحب وفا ہوتا — کیوں میاں جان! کیا مزا ہوتا
ضبط سے میرے تھم رہا ہے سرشک — ورنہ اب تک تو بہہ گیا ہوتا
جان سے کیا کروں بیاں احسان — یہ نہ ہوتا تو مر گیا ہوتا
روٹھنا تب تجھے مناسب تھا — جو تجھے میں نے کچھ کہا ہوتا

ہاں میاں جانتا تو میری قدر
جو کہیں تیرا دل لگا ہوتا!

بلبل کہیں نہ جائیو زنہار دیکھنا — اپنے ہی من میں پھولے گی گلزار دیکھنا
نازک ہے دل نہ ٹھیس لگانا اسے کہیں — غم سے بھرا ہے اسے مرے غمخوار دیکھنا
شکوہ عبث ہے یار کے جوروں کا ہر گھڑی — غیروں کے ساتھ شوق سے دیدار دیکھنا
سودا کی بات بھول گئی سوز تجھ کو حیف — جو کچھ خدا دکھاوے سو لاچار دیکھنا
کچھ کہہ تو قاصد آتا ہے وہ ماہ — الحمد للہ، الحمد للہ
جھوٹے کے منہ لگے کہوں کیا — استغفر اللہ استغفر اللہ

یار آتا ہے ترے یار کی ایسی تیسی
آزماتا ہے ترے پیار کی ایسی تیسی

# میر محمد تقی میر

میر تخلص، محمد تقی نام خلف میر عبداللہ شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو۔ زبان فارسی کے معتبر مصنف اور مسلم الثبوت محقق ہندوستان میں تھے گلزار ابراہیمی میں لکھا ہے کہ "میر صاحب کا ان سے دور کا رشتہ تھا اور تربیت کی نظر پائی تھی" عوام میں ان کے بھانجے مشہور رہیں۔ درحقیقت بیٹے میر عبداللہ کے تھے۔ مگر ان کی پہلی بی بی سے تھے، وہ مر گئیں۔ تو خان آرزو کی ہمشیر سے شادی کی تھی۔ اس لئے سوتیلے بھانجے ہوئے۔ میر صاحب کو ابتدا سے شعر کا شوق تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد دلی میں آئے اور خان آرزو کے پاس انہوں نے اور ان کی شاعری نے پرورش پائی مگر خان صاحب حنفی مذہب تھے۔ اور میر صاحب شیعہ۔ اس پہ نازک مزاجی غضب غرض کسی مسئلے پر بگڑ کر الگ ہو گئے۔ بدنظر زمانے کا دستور ہے کہ جب کسی نیک نام کے دامن شہرت کو ہوا میں اڑتے دیکھتا ہے تو ایک داغ لگا دیتا ہے۔ چنانچہ "تذکرہ شورش"

میں لکھا ہے کہ خطاب سیادت انہیں شاعری کی درگاہ سے عطا ہوا ہے۔ کہی سال بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ جب انہوں نے میر تخلّص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سیّد ہو جاؤ گے۔ اس وقت انہوں نے خیال نہ کیا۔ رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔ سودا کا ایک قطعہ بھی من رسیدہ لوگوں سے سنا ہے۔ مگر کلیات میں نہیں شاید اس میں یہی اشارہ ہو ؎

بیٹھے تنورِ طبع کو جب گرم کر کے میر
کچھ شیر مال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

اخیر میں کہتے ہیں ؎

میری کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد
بٹیا تو گندنا بنے اور آپ کو تھ میر

پھر بھی اتنا کہنا واجب سمجھتا ہوں کہ ان کی مسکینی و غربت اور صبر و قناعت تقویٰ و طہارت محضر بنا کر ادائے شہادت کرتے ہیں کہ سیادت میں شبہہ نہ کرنا چاہیئے اور زمانے کا کیا ہے کس کس کو کیا نہیں کہتا۔ اگر وہ سیّد نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

غرض ہر چند کہ تخلّص ان کا میر تھا۔ مگر گنجفۂ سخن کی بازی میں آفتاب ہو کر چمکے قدر دانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اُڑایا۔ ہندوستان میں یہ بات انہی کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو تحفے کے طور پر شہر سے شہر میں لے جاتے تھے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ نحوست اور فلاکت قدیم سے اہلِ کمال کے سر پر سایہ کئے ہیں۔ ساتھ اس کے میر صاحب کی بلند نظری اس غضب کی تھی کہ دنیا کی کوئی بڑائی اور کسی کا کمال یا بزرگی انہیں بڑی دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس قباحت نے نازک مزاج بنا کر ہمیشہ دنیا کی راحت اور فارغ البالی سے محروم رکھا۔ اور وہ وضعداری اور قناعت کے دھوکے میں اسے فخر سمجھتے رہے۔ یہ الفاظ گستاخانہ جو زبان سے نکلے ہیں، راقم روسیاہ ان کی روحِ پاک سے عفوِ قصور چاہتا ہے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا فقط اس لئے ہے کہ جن لوگوں کو دنیا میں گزارا کرنا ہے۔ وہ دیکھیں کہ ایک صاحب جوہر کا جوہر یہ باتیں کیوں کر خاک میں ملا دیتی ہیں۔ چنانچہ انہی کے حالات و مقامات عنقریب اس بیان کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ دلّی میں شاہ عالم کا دربار اور امرا و شرفا کی محفلوں میں ادب ہر وقت ان کے لئے جگہ خالی کرتا تھا۔ اور ان کے جوہرِ کمال اور نیکی اطوار و

اعمال کے سبب سے سب عظمت کرتے تھے۔ مگر خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے۔ اور وہاں تو خود خزانۂ سلطنت خالی پڑا تھا۔ اس لئے ۱۱۹۰ھ میں دلی چھوڑنی پڑی۔

جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے تو دلی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی۔ یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اُس نے بات کی میر صاحب چین بجبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بے شک گاڑی میں بیٹھئے۔ مگر باتوں سے کیا تعلق! اُس نے کہا۔ حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب بگڑ کر بولے۔ کہ خیر آپ کا شغل ہے۔ میری زبان خراب ہوتی ہے۔

لکھنؤ میں پہنچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے ایک سرائے میں اترے۔ معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ رہ نہ سکے۔ اسی وقت غزل لکھی۔ اور مشاعرے میں جا کر شامل ہوئے۔ ان کی وضع قدیمانہ کھڑکی دار پگڑی پچاس گز کے گھیر کا جامہ ایک پورا تھان پستولیے کا کمر سے بندھا۔ ایک رومال پٹڑی دار تہ کیا ہوا اُس میں آویزاں مشروع کا پاجامہ۔ جس کے عرض کے پائینچے۔ ناگ پھنی کی انی دار جوتی۔ جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک۔ کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار۔ دوسری طرف کٹار۔ ہاتھ میں جریب۔ غرض جب داخل محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنؤ۔ نئے انداز نئی تراشیں۔ بانکے ٹیڑھے جوان جمع۔ انھیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بیچارے غریب الوطن۔ زمانے کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ تھے اور بھی دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع اُن کے سامنے آئی۔ تو پھر سب کی نظر پڑی۔ اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے۔ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا۔ بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی کمال

کے طالب تھے۔ صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا۔ کہ میر صاحب تشریف لائے رفتہ رفتہ نواب آصف الدّولہ مرحوم نے سُنا اور دو سو روپیہ مہینہ کر دیا۔

عظمت و اعزاز جوہر کمال کے خادم ہیں، اگرچہ اُنھوں نے لکھنؤ میں بھی میر صاحب کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر انھوں نے بد دماغی اور نازک مزاجی کو جوانِ کے ذاتی مصاحب تھے، اپنے دم کے ساتھ ہی رکھا۔ چنانچہ کبھی کبھی نواب کی ملازمت میں جاتے تھے۔

ایک دن نواب مرحوم نے غزل کی فرمائش کی۔ دوسرے۔ تیسرے دِن جو پھر گئے تو پوچھا کہ میر صاحب! ہماری غزل لائے! میر صاحب نے تیوری بدل کر کہا۔ جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی آج غزل حاضر کر دے۔ اُس فرشتہ خصال نے کہا۔ خیر میر صاحب۔ جب طبیعت حاضر ہوگی کہہ دیجئے گا۔

ایک دن نواب نے بُلا بھیجا۔ جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں، ہاتھ میں چھڑی ہے۔ پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میر صاحب کچھ فرمائیے میر صاحب نے غزل سنانی شروع کی۔ نواب صاحب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب چین بجبیں ہوتے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے تھے۔ نواب صاحب کہے جاتے تھے کہ ہاں پڑھیے۔ آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھیر گئے۔ اور بولے کہ پڑھوں کیا آپ مچھلیوں سے کھیلتے ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہوگا۔ آپ متوجہ کر لے گا۔ میر صاحب کو یہ بات زیادہ تر ناگوار گزری۔ غزل جیب میں ڈال کر گھر کو چلے آئے اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے۔ نواب کی سواری سامنے سے آگئی۔ دیکھتے ہی نہایت محبّت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے بالکل ہی ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔ میر صاحب نے کہا۔ بازار میں باتیں کرنا دابِ شرفا نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ غرض بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں گزارتے رہے۔

آخر سنہ ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے اور سو برس کی عمر پائی۔ ناسخ نے تاریخ کہی کہ ع

واویلا مُردشہ شاعراں

تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ چھ دیوان غزلوں کے ہیں۔ چند صفحے ہیں۔ جن میں فارسی کے عمدہ متفرق شعروں پر اردو مصرعے لگا کر مثلث اور مربّع کیا ہے اور یہ ایجاد ان کا ہے۔ رباعیاں، مستزاد چند صفحے۔ ۴ قصیدے منقبت ہیں اور ایک نواب آصف الدّولہ کی تعریف میں۔ چند مخمس اور ترجیع بند مناقب ہیں۔ چند مخمس شکایت زمانہ میں، جن سے

بعض اشخاص کی ہجو مطلوب ہے۔ دو واسوخت ایک ہفت بند ملا حسن کاشی کی طرز پر حضرت شاہِ ولایت کی شان میں ہے۔ بہت سی مثنویاں جن کی تفصیل عنقریب واضح ہوتی ہے تذکرۂ نکات الشعراء شاعران اُردو کے حال کا کہ اب بہت کمیاب ہے۔ ایک رسالہ مسمّٰے بہ فیض میر۔ مصحفی اپنے تذکرۂ فارسی میں لکھتے ہیں۔ دعوے شعر فارسی نہ وارد۔ مگر فارسیش ہم کم از ریختہ نیست، مے گفت کہ سالے ریختہ موقوف کردہ بودم۔ درآں حال دو ہزار شعر گفتہ تدوین کردم۔

معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کو تاریخ گوئی کا شوق نہ تھا۔ علیٰ ہذا القیاس مرثیہ بھی دیوان میں نہیں۔ غزلوں کے دیوان اگرچہ رطب و یابس سے بھرے ہوئے ہیں۔ مگر جو اِن میں انتخاب ہیں وہ فصاحت کے عالم میں انتخاب ہیں اُردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آتے ہیں کہ ستر اور دو بہتر نشتر ہیں۔ باقی میر صاحب کا تبرک ہے۔ لیکن یہ بہتر کی رقم فرضی ہے۔ کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو سخن شناس سے مبالغہ تعریف میں یہی سُنا جاتا ہے۔ کہ دیکھیے! یہ اُنھیں بہتر نشتروں میں سے ہے۔ انہوں نے زبان اور خیالات میں جس قدر فصاحت اور صفائی پیدا کی ہے۔ اُتنا ہی بلاغت کو کم کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل اصُولِ غزلیت کے لحاظ میں سودا سے بہتر ہے۔ اِن کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے۔ اِسی واسطے خواص میں معزز اور عوام میں ہر دلعزیز ہے۔ حقیقت میں یہ انداز میر سوز سے لیا۔ مگر اُن کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں تھیں۔ انہوں نے اس میں مضمون داخل کیا اور گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا۔

چونکہ مطالب کی وقت، مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کی شان و شکوہ، بندش کی چستی لازمہ قصائد کا ہے، وہ طبیعت کی شگفتگی اور جوش و خروش کا ثمر ہوتا ہے۔ اسی واسطے میر صاحب کے قصیدے کم ہیں۔ اور اسی قدر درجے میں بھی کم ہیں اُنھوں نے طالبِ سخن پر روشن کر دیا ہے کہ قصیدے اور غزل کے دو میدانوں میں دِن اور رات کا فرق ہے۔ اور اسی منزل میں آ کر سودا اور میر کے کلام کا حال کھُلتا ہے۔

امرا کی تعریف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی سبب تھا کہ توکل اور قناعت انھیں بندے کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے یا خود پسندی اور خود بینی، جو انھیں اپنے میں آپ غرق کیے دیتی تھی، وہ زبان سے کسی کی تعریف نکلنے نہ دیتی تھی۔ چنانچہ کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں۔

مجھ کو دماغ وصفِ گل و یاسمن نہیں
ہیں جوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں
کل جا کے ہم نے میرؔ کے در پر سُنا جواب
مدّت ہوئی کہ یاں وُہ غریب الوطن نہیں

چند مخمّس شکایتِ زمانہ میں بطور آشوب کے کہے ہیں۔ اور اِن میں بعض اشخاص کے نام بھی لیے ہیں۔ مگر ایسے کمزور کہے ہیں کہ گویا کچھ نہیں ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ قسامِ ازل نے ان کے دسترخوان سے مدح اور قدح کے دو پیالے اُٹھا کر سوداؔ کے ہاں دھر دیتے ہیں۔

واسوخت دو ہیں اور کچھ شک نہیں کہ لاجواب ہیں۔ اہلِ تحقیق نے فغانی یا وحشی کو فارسی میں اور اردو میں انھیں واسوخت کا موجد تسلیم کیا ہے۔ سینکڑوں شاعروں نے واسوخت کہے۔ لیکن خاص خاص محاوروں سے قطع نظر کریں تو آج تک اِس کوچے میں میر صاحب کے خیالات و اندازِ بیان کا جواب نہیں۔

مناقبؔ میں جو مخمّس اور ترجیع بند وغیرہ کہے ہیں حقیقت میں حُسنِ اعتقاد کا حق ادا کر دیا ہے۔ وُہ اِن کے صدقِ دل کی گواہی دیتے ہیں۔

مثنویاں مختلف بحروں میں ہیں۔ اصول مثنوی کے ہیں وُہ میر صاحب کا قدرتی انداز واقع ہُوا ہے۔ اس لیے بعض بعض لُطف سے خالی نہیں۔ اُن میں شعلۂ عشق اور دریائے عشق نے اپنی خوبی کا انعام شہرت کے خزانے سے پایا۔ مگر افسوس یہ کہ میر حسنؔ مرحوم کی مثنوی سے دونوں پیچھے رہیں۔

جوشِ عشق میں لطافت اور نزاکت کا جوش ہے۔ مگر مشہور نہ ہوئی۔
اعجازِ عشق و خواب و خیال مختصر ہیں۔ اور اُس رتبے پر نہیں پہنچیں۔
معاملاتِ عشق اِن سے بڑی ہے۔ مگر رُتبے میں گھٹی ہوئی ہے۔

مثنوی شکار نامہ، نواب آصف الدّولہ کے شکار کا اور اس سفر کا مفصل حال لکھا ہے۔ اس میں جو متفرق غزلیں جا بجا لگائی ہیں وُہ عجیب لُطف دیتی ہیں ساقی نامہ بہاریہ لکھا ہے مگر اعلیٰ درجۂ لطافت و فصاحت پر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی مختصر مختصر مثنویاں ہیں۔ ایک مثنوی اپنے مُرغے کے مرثیے میں لکھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرا پیارا مُرغا تھا۔ بڑا اصیل تھا۔ بُہت خوب تھا۔ اس پر بلی نے حملہ کیا۔ مُرغے نے بڑی دلاوری سے مقابلہ کیا۔ اور آخر کو مارا گیا۔ مثنوی تو جیسی ہے۔ ویسی ہے۔ مگر ایک شعر اس کے وقتِ آخر کا نہیں بُھولتا ؎

جھکا لبوئے قدم سرخروس بیجاں کا
زمیں پہ تاج گرا ہُدہُد سلیماں کا

ایک مثنوی میں کہتے ہیں کہ میری ایک بلی تھی - بڑی وفادار تھی - بڑی قانع تھی - اس کے بچے نہ جیتے تھے - ایک دفعہ ۵ بچے ہوئے پانچوں جیئے ۳ بچے لوگ لے گئے دور ہے - وُہ دونوں مادہ تھے - ایک کا نام مونی تھا - ایک کا نام مانی - موبی ایک میرے دوست کو پسند آئی وہ لے گئے - مانی کے مزاج میں مسکینی اور غربت بہت تھی - اِس لیے فقیر کی رفاقت نہ چھوڑی - اِس کے بیان اور حالات کو بہت طول دیا ہے

ایک کتا اور ایک بلا پالا تھا - اس کی ایک مثنوی لکھی ہے۔

ایک امیر کے ساتھ سفر میں میرٹھ تک گئے تھے - اُس میں برسات کی تکلیف اور رستے کی مصیبت بہت بیان کی ہے - اِس سے یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہم وطن ہمیشہ سے سفر کو کیسی آفت سمجھتے ہیں۔

ایک بکری پالی اِس کے چار تھن تھے بچہ ہُوا تو دُودھ ایک ہی تھن میں اُترا وُہ بھی اتنا تھا کہ بچے کی پُوری نہ پڑتی تھی - بازار کا دُودھ پلا کر پالا - پھر بچے کی سرزوری اور سرشوری کی شکایت ہے۔

ایک مثنوی آصف الدولہ مرحوم کی آرائشِ کتخدائی میں کہی ہے - ایک مختصر مثنوی جھوٹ کی طرف سے خطاب کر کے لکھی ہے اور اس کی بحر مثنوی کی معمولی بحروں سے علیحدہ ہے۔

مثنوی اژدرنامہ کہ اِس کا حال آگے آتا ہے - یا اجگر نامہ۔

ایک مثنوی مختصر برسات کی شکایت میں لکھی ہے - گھر کا گرنا اور مینہ برستے میں گھر والوں کا نکلنا عجب طور سے بیان کیا ہے - اگر خیال کرو تو شاعر کی شورشِ طبع کے لیے یہ بھی موقع خُوب تھا - مگر طبیعت مکان سے بھی پہلے گری ہوئی تھی - وہ یہاں بھی نہیں اُبھری - سودا ہوتے تو طوفان اُٹھاتے۔

مثنوی تنبیہ الخیال اِس میں فنِ شعر کی عزت و توقیر کو بہت سا طول دے کر کہا ہے - اِس فنِ شریف کو شرفا اختیار کرتے تھے - اب پُواج اور اراذل بھی شاعر ہو گئے اس میں ایک بزاز لونڈے کو بہت خراب کیا ہے اس کے علاوہ کئی اور چھوٹی مثنویاں کہ چنداں ذکر کے قابل نہیں۔

نکات الشعراء شائق کے لیے بہت مفید ہے - اِس میں شعرائے اُردو کی

بہت سی باتیں اس زمانے کے لوگوں کے لیے دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے۔ دیباچے میں فرماتے ہیں کہ یہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہے اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا۔ مگر اُن کو نہ لُوں گا۔ جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ اِن ہزار میں ایک بے چارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی کہ نبی نوع شعراء کا آدم ہے۔ اس کے حق میں فرماتے ہیں۔ وے شاعریست از شیطان مشہور تر۔ میر خاں کمترین اسی زمانے میں ایک قدیمی شاعر دِلّی کے تھے۔ انھیں اس فقرے پر بڑا غصّہ آیا۔ ایک نظم میں اوّل بہت کچھ کہا آخر میں آکر کہتے ہیں ؎

ولی پر جو سخن لائے اُسے شیطان کہتے ہیں

یہ بھی مختصر کیفیت میرؔ صاحب کی تصنیفات کی۔ میرؔ صاحب کی زبان شُستہ کلام صاف۔ بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دِل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں۔ محاورے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں۔ اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اسی واسطے اُن میں بہ نسبت اور شعراء کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے۔ بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر بھی اثر زیادہ کرتی ہیں۔ وہ گویا اُردو کے سعدیؔ ہیں۔ ہمارے عاشق مزاج شعرا کی رنگینیاں اور خیالات کی بلند پروازیاں ان کے مبالغوں کے جوش وخروش سب کو معلوم ہیں۔ مگر اِسے قسمت کا لکھا سمجھو کہ اِن میں سے بھی میرؔ صاحب کو شگفتگی یا بہار عیش ونشاط یا کامیابی وصال کا لُطف کبھی نصیب نہ ہُوا۔ رہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے، اس کا دُکھڑا سنانے چلے گئے، جو آج تک دلوں میں اثر اور سینوں میں درد پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مضامین اور شعرا کے لیے خیالی تھے۔ عاشقانہ خیال بھی ناکامی زار نالی۔ حسرت مایوسی، ہجر کے لباس میں خرچ ہوتے۔ اِن کا کلام صاف کہے دیتا ہے کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں، وُہ غم و درد کا پتلا نہیں، حسرت واندوہ کا جنازہ تھا۔ ہمیشہ وہی خیالات لیے رہتے تھے۔ بس جو دل پر گزرتے تھے، وہی زبان سے کہہ دیتے تھے کہ سننے والوں کے لیے نشتر کا کام کر جاتے تھے۔

اِن کی غزلیں ہر بحر میں کہیں شربت اور کہیں شیر وشکر ہیں۔ مگر چھوٹی چھوٹی بحروں میں فقط آبِ حیات بہاتے ہیں۔ جو لفظ مُنہ سے نکلتا ہے، تاثیر میں ڈوبا ہُوا نکلتا ہے۔ مگر یہ بھی بزرگوں سے معلوم ہُوا کہ مشاعرے یا فرمائش کی غزلیں ایسی

نہ ہوتی تھیں، جیسے کہ اپنی طبع زاد طرح میں ہوتی تھیں۔ میر صاحب نے اکثر فارسی کی ترکیبوں کو یا اُن کے ترجموں کو اُردو کی بنیاد میں ڈال کر ریختہ کیا۔ دیکھو صفحہ ۴۳-۴۴ اور اکثروں کو جُوں کا توں رکھا۔ بہت ان میں سے پسندِ عام کے دربار میں رجسٹری ہوئیں اور بعض نامنظور معاصرین نے کہیں برتا، مگر بہت کم۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ہنگامہ گرم کُن جو دلِ ناصبور تھا — پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا
یہ چشم شوق طرفہ جگہ ہے دکھاؤ کی — ٹھیرو بقدر یک مژہ تم اس مکان میں
کیا کہیے حسنِ عشق کے آپ ہی طرف ہوا — دِل نام قطرہ خون یہ ناحق تلف ہوا
دِل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش — ایک عالم کے سر بلا لایا!
ہر دم طرف ہے دل سے مزاج کرخت کا — ٹکڑا مرا جگر ہے کہو سنگ سخت کا
اس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا — اے کبک پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا
اپنے ہی دل کو نہ ہو وا شد تو کیا حاصل نسیم — گو چمن میں غنچۂ پژمردہ تجھ سے کھل گیا
خواہ ہے پیالہ خواہ سبو کر ہمیں کلال — ہم اپنی خاک پر تجھے مختار کر چلے
یاد ایام کہ یاں ترکِ شکیبائی تھا — ہر گلی کوچہ مجھے کوچۂ رسوائی تھا
ہے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائے گا — یہ قافلہ رہے گا نہ زنہار جائے گا

اس کے علاوہ فارسی کے بعض محاوروں اور اس کی خاص خاص رسموں کا اشارہ بھی کر جاتے تھے کہ انھیں بھی پھر کسی نے پسند نہیں کیا۔ چنانچہ دیوانے کو پھول کی چھڑیاں مارنے کا ٹوٹکا انھوں نے بھی کیا ہے اور داغِ جنوں بھی دیا ہے۔

جاتی ہے نظر حُسن پہ گہ چشم پریدن
یاں ہم نے پر کاہ بھی بیکار نہ دیکھا

بعض جگہ قادر الکلامی کے تصرّف کر کے اپنے زورِ زبان کا جوہر دکھایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

ہر چند ناتواں ہوں پر آگیا جو دل میں — دیں گے ملا زمیں سے تیرا فلک قلابا!
داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر — ہو نجات اُس کی بچارا ہم سے بھی تھا آشنا
پر اور شانہ و مسواک و غسل شیخ کرے — ہمارے عندیے میں تو ہے وہ پلیت و خبیث

ردیف ثاء مثلثہ فوقانی کی غزل میں یہ شعر واقع ہوا ہے۔ ایسے تصرّفوں سے نہیں کہہ سکتے کہ انھیں اس لفظ کی صحت کی خبر نہ تھی۔ سمجھنا چاہیے کہ زبان کے مالک تھے اور محاورے کو اصلیت پر مقدم سمجھتے تھے۔

اے خوشا حال اُس کا جس کو وہ
حال عمداً اشتباہ کرتے تھے

ہے نہ دل بتوں کو کیا معلوم
نکلے پردے سے کیا۔ خدا معلوم

میں بیقرار خاک میں کب تک ملا کروں
کچھ ملنے یا نہ ملنے کا تو بھی قرار کر

رہوں جا کے مر حضرتِ یار میں
یہی قصد ہے بندہ درگاہ کا

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اسکی میرؔ
سمند ناز کو اک اور تازیانہ ہوا

آواز ہماری سے نہ رُک ہم ہیں دُعا یاد
آوے گی بہت ہم سے فقیروں کی صدا یاد

سب غلطی رہی بازی طفلانہ کی یک سو
وہ یاد فراموش تھے ہم کو نہ کیا یاد

جزو مرتبہ کل کو حاصل کرے ہے آخر
اک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہو گا

ابر اُٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا مے خانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہیگا شیشے اور پیمانے پر

کسی شخص نے کہا کہ حضرت۔ اصل محاورہ فارسی کا ہے۔ اہل زبان نے ابر قبلہ کہا ہے، ابر کعبہ نہیں کہا۔ میرؔ صاحب نے کہا کہ ہاں قبلہ کا لفظ بھی آ سکتا ہے۔ مگر کعبہ سے ذرا مصرع کی ترکیب گرم ہو جاتی ہے اور یہ سچ فرمایا۔ جنھیں زبان کا مزا ہے، وہی اس لطف کو سمجھتے ہیں۔ خیالؔ کے لفظ میں جو تصرّف میرؔ صاحب نے فرمایا ہے۔ عنقریب واضح ہو گا۔ اکثر الفاظ ہیں کہ اب مؤنث ہیں۔ میرؔ صاحب نے انھیں مذکّر باندھا ہے۔

ملا تے خاک میں کس کس طرح کے عالم یاں
نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا

کل جس کی جاں کنی پر سارا جہان ٹوٹا
آج اُس مریض غم کا ہچکی میں جان ٹوٹا

احوال خوش انھوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے
افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا

بعض جگہ مذکّر کو مونّث بھی کہہ جاتے ہیں ؎

کیا ظلم ہے اس خونیٔ عالم کی گلی میں
جب ہم گئے دو چار نئی دیکھیں مزاریں

مثنوی شعلۂ عشق" میں کہتے ہیں ؎

خلق یک جا ہوئی کنارے پر
حشر برپا ہوئی کنارے پر

میر صاحب میانہ قد۔ لاغر اندام۔ گندمی رنگ تھے۔ ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ۔ بات بہت کم۔ وہ بھی آہستہ۔ آواز میں نرمی اور ملامت ضعیفی نے ان سب صفتوں کو اور بھی

قوی کیا تھا، کیونکہ سو برس کی عمر آخر ایک اثر رکھتی ہے۔ مرزا قتیل مشاعرے سے آ کر کسی دوست کو خط تحریر کرتے ہیں۔ اس میں جلسے کے حالات بھی لکھتے ہیں" خنجرہ میر صاحب باوصف خوش گوئی بدستور بودہ۔ تمام جسم مبارک ایشاں رعشہ داشت۔ آواز ہم کس نے شنید مگر من و خدا کہ غزلہا خوب گفتہ بودند۔" عادات واطوار نہایت سنجیدہ اور متین اور صلاحیت اور پرہیزگاری نے اسے عظمت دی تھی۔ ساتھ اس کے قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اطاعت تو درکنار نوکری کے نام کی برداشت نہ رکھتے تھے لیکن زمانہ، جس کی حکومت سے کوئی سر نہیں اُٹھا سکتا، اس کا قانون بالکل اس کے برخلاف ہے۔ نتیجہ یہ کہ فاقے کرتے تھے۔ دکھ بھرتے تھے اور اپنی بد دماغی کے سایے میں دنیا واہل دنیا سے بیزار گھر میں بیٹھے رہتے تھے ان شکایتوں کے جو لوگوں میں چرچے تھے۔ وہ خود بھی اس سے واقف تھے۔ چنانچہ ایک مخمس شہر آشوب کے مقطع میں کہتے ہیں ؎

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ     دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ     ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

باوجود اس کے اپنے سرمایۂ فصاحت کو دولت لازوال سمجھ کر امیر غریب کسی کی پروا نہ کرتے تھے بلکہ فقر کو دین کی نعمت تصور کرتے تھے اور اسی عالم میں معرفتِ الٰہی پر دل لگاتے تھے چنانچہ ان کی اس ثابت قدمی کا وصف کسی زبان سے نہیں ادا ہو سکتا کہ اپنی بے نیازی اور بے پرواہی کے ساتھ دنیائے فانی کی مصیبتیں جھیلیں اور جو اپنی آن تان تھی۔ اسے لیے دنیا سے چلے گئے۔ اور جس گردن کو خدا نے بلند کیا تھا، سید معاخدا کے ہاں لے گئے۔ چند روز عیش کے لالچ سے یا مفلسی کے دکھ سے اُسے دنیا کے نااہلوں کے سامنے ہرگز نہ جھکایا۔ ان کا کلام کہے دیتا ہے کہ دل کی کلی اور تیوری کی گرہ کبھی کھلی نہیں۔ باوجود اس کے اپنے ملک خیال کے ایک بلند نظر بادشاہ تھے اور جتنی دنیا کی سختی زیادہ ہوتی اسی قدر بلند نظری سے دماغ زیادہ بلند ہوتا تھا۔ سب تذکرے نالاں ہیں کہ اگر یہ غرور اور بے دماغی فقط امرا کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی۔ افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی انہیں دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ امر ایسے شخص کے دامن پر نہایت بدنما دھبا ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نیکوکاری کا خلعت پہنے ہو۔ بزرگوں کی تحریری روایتیں اور تقریری حکایتیں ثابت کرتی ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ کسی اور کی کیا حقیقت ہے۔ جو اشخاص اس زمانے میں قدردانی کے خزانچی تھے، ان کے خیالات اعلیٰ اور حوصلے بڑے تھے اس لیے یہ بے دماغیاں ان کے جوہر کمال پر زیور معلوم ہوتی ہیں، خوش نصیب تھے

کہ آج کا زمانہ نہ دیکھا۔ میر قمر الدین منّت دلّی میں ایک شاعر گزرے ہیں کہ علومِ رسمی کی قابلیت سے عمائدِ دربارِ شاہی میں تھے۔ وہ میر صاحب کے زمانے میں مبتدی تھے۔ شعر کا شوق بہت تھا۔ اصلاح کے لیے اردو کی غزل لے گئے۔ میر صاحب نے وطن پوچھا۔ انہوں نے سونی پت علاقہ پانی پت بتلایا۔ آپ نے فرمایا کہ سید صاحب اردوئے معلّی خاص دلّی کی زبان ہے۔ آپ اس میں تکلیف نہ کیجیے، اپنی فارسی وارسی کہہ لیا کیجیے۔

سعادت یار خاں رنگین نواب طہماسپ بیگ خاں قلعدارِ شاہی کے بیٹے تھے۔ ۱۴-۱۵ برس کی عمر تھی۔ بڑی شان و شوکت سے گئے اور غزل اصلاح کے لیے پیش کی۔ سن کر کہا کہ صاحبزادے آپ خود امیر ہیں اور امیر زادے ہیں، نیزہ بازی۔ تیر اندازی کی کسرت کیجیے۔ شہسواری کی مشق فرمائیے۔ شاعری دل خراشی و جگر سوزی کا کام ہے۔ آپ اس کے درپے نہ ہوں۔ جب انہوں نے بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ آپ کی طبیعت اس فن سے مناسب نہیں، یہ آپ کو نہیں آنے کا۔ خواہ مخواہ میری اور اپنی اوقات ضائع کرنی کیا ضرور ہے۔ یہی معاملہ شیخ ناسخ کے ساتھ گزرا۔

دلّی میں میر صاحب نے ایک مثنوی کہی۔ اپنے تئیں اژدہا قرار دیا اور شعرائے عصر میں سے کسی کو چوہا۔ کسی کو سانپ۔ کسی کو بچھو۔ کسی کو کنکھجورا وغیرہ وغیرہ ٹھہرایا۔ ساتھ اس کے ایک حکایت لکھی کہ دامنِ کوہ میں ایک خونخوار اژدہا رہتا تھا۔ جنگل کے حشرات الارض جمع ہو کر اس سے لڑنے گئے جب سامنا ہوا تو اژدہے نے ایک ایسا دم بھرا کہ سب فنا ہو گئے۔ اس قصیدے کا نام اژدر نامہ قرار دیا اور مشاعرے میں لا کر پڑھا۔ محمد امان نثار، شاہ حاتم کے شاگردوں میں ایک مشتاق موزون طبع تھے انہوں نے وہیں ایک گوشے میں بیٹھ کر چند شعر کا قطعہ لکھا اور اسی وقت سرِ مشاعرہ پڑھا۔ چوں کہ میر صاحب کی یہ بات کسی کو پسند نہ آئی تھی۔ اس لیے اس قطعے پر خوب قہقہے اڑے اور بڑی واہ واہ ہوئی اور میر صاحب پر جو گزرنی تھی سو گزری، چنانچہ مقطع قطعۂ مذکور کا یہ ہے:

حیدرِ کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کیوں حضرت آج کل شاعر کون ہے؟ کہا ایک تو سودا دوسرا یہ خاکسار ہے اور تامل کر کے کہا، آدھے خواجہ میر درد۔ کوئی شخص بولا کہ حضرت۔ اور میر سوز صاحب؟ چیں بجبیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ انہوں نے کہا کہ آخر استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں۔ کہا کہ خیر یہ ہے تو پونے تین سہی۔ مگر شرفا میں ایسے تخلص ہم نے کبھی نہیں سنے۔ میر صاحب کے سامنے مجال کس کی تھی جو کہے کہ ان بیچارے نے میر تخلص کیا تھا، وہ آپ نے چھین لیا۔ ناچار اب انہوں نے ایسا تخلص اختیار کیا کہ نہ آپ کو پسند آئے، نہ آپ اسے چھینیں۔

لکھنؤ کے چند عمائد و اراکین جمع ہو کر ایک دن آئے کہ میر صاحب سے ملاقات کریں اور اشعار سنیں۔ دروازے پر آ کر آواز دی۔ لونڈی یا ماما نکلی۔ حال پوچھ کر اندر گئی ایک بوریا لا کر ڈیوڑھی میں بچھایا۔ انھیں بٹھایا اور ایک پرانا سا حقّہ تازہ کر کے سامنے رکھ گئی۔ میر صاحب اندر سے تشریف لائے۔ مزاج پرسی وغیرہ کے بعد انھوں نے فرمائش اشعار کی۔ میر صاحب نے اوّل کچھ ٹالا۔ پھر صاف جواب دیا کہ صاحب قبلہ میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے۔ اگرچہ ناگوار ہوا۔ مگر بنظرِ آداب و اخلاق انھوں نے اپنی نارسائی طبع کا اقرار کیا۔ اور پھر درخواست کی۔ انھوں نے پھر انکار کیا۔ آخر ان لوگوں نے گراں خاطر ہو کر کہا کہ حضرت انوری و خاقانی کا کلام سمجھتے ہیں، آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے؟ میر صاحب نے کہا کہ یہ درست ہے مگر ان کی شرحیں مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں۔ اور میرے کلام کے لیے فقط محاورۂ اہلِ اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں اور اس سے آپ محروم یہ کہہ کر ایک شعر پڑھا ؎

عشق برے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور کہا آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی یٰ کو ظاہر کرو، پھر کہیں گے۔ کہ یٰ تقطیع میں گرتی ہے۔ مگر یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے۔

جب نواب آصف الدولہ مر گئے، سعادت علی خاں کا دور ہوا تو یہ دربار جانا چھوڑ چکے تھے۔ وہاں کسی نے طلب نہ کیا۔ ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی۔ یہ تحسین کی مسجد پر سرِ راہ بیٹھے تھے۔ سواری سامنے آئی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے، میر صاحب اسی طرح بیٹھے رہے۔ سید انشا خواصی میں تھے۔ نواب نے پوچھا کہ انشاء یہ کون شخص ہے، جس کی تمکنت نے اسے اٹھنے بھی نہ دیا؟ عرض کی جناب عالی یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔ گزارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم۔ آج بھی فاقے ہی سے ہو گا۔ سعادت علی خاں نے آ کر خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا۔ جب چوبدار لے کر گیا۔ میر صاحب نے واپس کر دیا اور کہا کہ مسجد میں بھجوائیے، یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں۔ سعادت علی خاں جواب سن کر متعجب ہوئے۔ مصاحبوں نے پھر سمجھایا۔ غرض نواب کے حکم سے سید انشاء خلعت لے کر گئے اور اپنی طرز پر سمجھایا۔ کہ نہ اپنے حال پر، بلکہ عیال پر رحم کیجیے۔ اور بادشاہِ وقت کا ہدیہ ہے اسے قبول فرمائیے۔ میر صاحب نے کہا کہ صاحب وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں، میں اپنے ملک کا بادشاہ

ہوں۔ کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی، وہ مجھ سے واقف، میرے حال سے واقف، اس پر اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپے کے خدمت گار کے ہاتھ خلعت بھیجا۔ مجھے اپنا فقر و فاقہ قبول ہے، مگر یہ ذلت نہیں اُٹھائی جاتی۔ سید انشاء کی لسانی اور لفاظی کے سامنے کس کی پیش جا سکتی۔ میر صاحب نے قبول فرمایا اور دربار بھی کبھی کبھی جانے لگے۔ نواب سعادت علی خاں مرحوم اُن کی ایسی خاطر کرتے تھے کہ اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دیتے تھے۔ اور اپنا پیچوان پینے کو عنایت فرماتے تھے۔

میر صاحب کو بہت تکلیف میں دیکھ کر لکھنؤ کے ایک نواب انھیں مع عیال اپنے گھر لے گئے اور محل سرا کے پاس ایک معقول مکان رہنے کو دیا کہ نشست کے مکان میں کھڑکیاں باغ کی طرف تھیں۔ مطلب اس سے یہی تھا کہ ہر طرح اُن کی طبیعت خوش اور شگفتہ رہے۔ یہ جس دن وہاں آکر رہے۔ کھڑکیاں بند پڑی تھیں۔ کئی برس گزر گئے، اسی طرح بند پڑی رہیں۔ کبھی کھول کر باغ کی طرف نہ دیکھا۔ ایک دن کوئی دوست آئے۔ اُنھوں نے کہا کہ ادھر باغ ہے۔ آپ کھڑکیاں کھول کر کیوں نہیں بیٹھتے؟ میر صاحب بولے کیا اِدھر باغ بھی ہے؟ انھوں نے کہا کہ اِسی لیے نواب آپ کو یہاں لائے ہیں۔ کہ جی بہلتا رہے۔ اور دل شگفتہ ہو۔ میر صاحب کے پھٹے پُرانے مسودے۔ غزلوں کے پڑے تھے۔ اُن کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوں کہ اِس باغ کی خبر بھی نہیں یہ کہہ کر چپکے ہو رہے۔

کیا محویت ہے! کئی برس گزر جائیں۔ پہلو میں باغ ہو اور کھڑکی تک نہ کھولیں۔ خیر۔ ثمرہ اِس کا یہ ہُوا کہ اُنھوں نے دُنیا کے باغ کی طرف نہ دیکھا۔ خدا نے اُن کے کلام کو وہ بہار دی کہ سالہا سال گزر گئے۔ آج تک لوگ ورق اُلٹتے ہیں اور گلزار سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

اُستاد مرحوم ایک دیرینہ سال شخص کی زبانی بیان کرتے تھے کہ ایک دن میر صاحب کے پاس گئے۔ نکلتے جاڑے تھے۔ بہار کی آمد تھی۔ دیکھا کہ ٹہل رہے ہیں۔ چہرے پر افسردگی کا عالم ہے۔ اور اور وہ کر یہ مصرع پڑھتے تھے۔ ع

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

یہ سلام کر کے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُٹھے۔ اور سلام کر کے چلے آئے۔ میر صاحب کو خبر بھی نہ ہوئی۔ خدا جانے دُوسرے مصرع کے فکر میں تھے۔ یا اِس مصرع کی

کیفیت میں محو تھے۔

گورنر جنرل اور اکثر صاحبانِ عالیشان جب لکھنؤ میں جاتے تو اپنی قدر دانی سے یا اس سبب سے کہ ان کے میر منشی اپنے حوصلہ سے ایک صاحب کمال کی تقریب واجب سمجھتے تھے۔ میر صاحب کو ملاقات کے لیے بُلاتے مگر یہ پہلو تہی کرتے اور کہتے کہ مجھ سے جو کوئی ملتا ہے تو یا مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب سے ملتا ہے۔ صاحب کو خاندان سے غرض نہیں۔ میرا کلام سمجھتے نہیں۔ البتہ کچھ انعام دیں گے۔ ایسی ملاقات سے ذلت کے سوا کیا حاصل۔

محلے کے بازار میں عطار کی دکان تھی۔ آپ بھی کبھی کبھی اس کی دکان پر جا بیٹھتے تھے۔ اس کا نوجوان لڑکا بہت بناؤ سنگار کرتا رہتا تھا۔ میر صاحب کو بُرا معلوم ہوتا تھا۔ اس پر فرماتے ہیں۔ ؎

کیفیتیں عطار کے لونڈے میں بہت ہیں
اس نسخے کی کوئی نہ رہی ہم کو دوا یاد

کسی وقت طبیعت شگفتہ ہو گئی ہو گی، جو فرماتے ہیں ؎

میرؔ کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

اسی عہد میں بقاء اللہ خاں بقاؔ نے دو شعر کہے ؎

اِن آنکھوں کا نت گریہ دستور رہے
دوآبہ جہاں میں یہ مشہور رہے
سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں
ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

میر صاحب نے خدا جانے سُن کر کہا یا توارد ہوا ؎

وے دِن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں     سُوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

اس پر بقاؔ نے بگڑ کر یہ قطعہ کہا ؎

میرؔ نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا     اے بقاؔ تو بھی دُعا دے جو دُعا دینی ہو
یا خدا میرؔ کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے     اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تربینی ہو

لیکن میرؔ صاحب نے اسی کوچے میں ایک مضمون اوڑ نکالا ہے کہ وہ سب سے الگ ہے۔

ہیں راہِ عشق میں تو آگے ہی دو دِلا تھا
پر مُنہ بیچ پیش آیا قسمت سے یہ دوراہا

بقاؔ نے اور مضامین بھی میرؔ صاحب کے باب میں صرف کیے ہیں، اِن میں سے ایک قطعہ ہے۔

ع میرؔ صاحب پھر اُس سے کیا بہتر
اِس میں ہووے جو نام شاعر کا
لے کے دیواں پکارتے پھرتے
ہر گلی کوچے کام شاعر کا

توبہ زاہد کی توبہ تلّی ہے | چلے بیٹھے تو شیخ چلّی ہے
پگڑی اپنی سنبھالیے گا میرؔ | اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

کِسی اُستاد کا شعر فارسی ہے ؎

بہ گرو تربتم امشب ہجومِ بُلبُل بُود
مگر چراغ مزارم ز روغنِ گل بُود

میرؔ صاحب کے شعر میں بھی اِس رنگ کا مضمون ہے مگر خوب بندھا ہے:

ع جائے روغن دیا کرے ہے عشق
خونِ بُلبُل چراغ میں گُل کے!

شیخ سعدی کا شعر ہے ؎

سعدی دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم | باید اوّل بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی
میر صاحب چاہنے کا ہم پہ یہ خوباں جو دھرتے ہیں گناہ | اُن سے بھی پوچھو کوئی تم اتنے کیوں پیارے ہوئے
ناصر علی دست خواہم زد بداماں سکندر روزِ حشر | شور خ لیلیٰ زادہ ام راز شکِ مجنوں کردہ است
میر صاحب دیکھ آئینے کو یار ہُوا محو ناز کا | خانہ خراب ہو جیو آئینہ ساز کا
بیدل زندگی برگردنم افتاد بیدل چارہ نیست | شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن
میر صاحب گوشہ گیری اپنے بس میں ہے نہ ہے آوارگی | کیا کریں اے میر صاحب بندگی بیچارگی

محمد امان نثار میرؔ صاحب کے شعروں پر ہمیشہ شعر کہا کرتے تھے۔ ان کا شعر ہے۔

نثارؔ ؎ ہم آگے ہی سمجھے تھے وُہ گھر کو سدھارے گے | جس وقت گجر باجا ماتھا مرا ٹھنکا تھا
میر صاحب بھووں تئیں تم جس دن سج نکلے تھے اک چہرا | اس دن ہی تمہیں دیکھے ماتھا مرا ٹھنکا تھا

اکثر اشعار میں میر اور مرزا کے مضمون لڑ گئے ہیں۔ اس رُتبے کے شاعروں

کو کون کہہ سکتا ہے کہ سرقہ کیا۔ دوسرے ایک عہد تھا۔ ایک شہر تھا اسی وقت غل مچا۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔ اِن دونوں بزرگوں کے کلام میں چشمکیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ مرزا
فرماتے ہیں۔

نہ پڑھیو یہ غزل سوداؔ تو ہرگز میرؔ کے آگے
وہ اِن طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے اُستاد کی طرف

میر صاحب فرماتے ہیں:

طرف ہونا مرا مشکل ہے میرؔ اس شعر کے فن میں
یوں ہی سوداؔ کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

مرزا رفیع سوداؔ۔ خواجہ میر دردؔ۔ مرزا جانجاناں مظہرؔ۔ قائمؔ۔ یقینؔ وغیرہ اِن کے ہمعصر تھے اور مصحفیؔ۔ جرأتؔ اور میر انشاء اللہ خاں نے آخر عہد میں ظہور کیا۔

میر صاحب کے بیٹے لکھنؤ میں ملے تھے۔ باپ کے برابر نہ تھے۔ مگر بدنصیبی میں فرزندِ خلف تھے۔ ایک پیر مرد بے پروا مستغنی المزاج تھے۔ میر عسکری نام میر کلّو مشہور تھے عرشؔ تخلص تھا۔ خود شاعر صاحبِ دیوان تھے۔ اور چند شاگرد بھی تھے۔ ایک شعر اُن کی غزل مشاعرہ کا لکھنؤ میں زبان زد خاص و عام ہے۔

آسیا کہتی ہے ہر صبح باواز بلند
رزق سے بھرتا ہے رزّاق دہن پتھر کا

# میرؔ صاحب کی غزلیں

بُرقع کو اُٹھا چہرے سے وُہ بُت اگر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر
مجنون زخود رفتہ کبھو راہ پر آوے

ٹک بعد مرے میرے طرفداروں کنے تو
کوئی بھیجیو ظالم کہ تسلّی تو کر آوے

کیا ظرف ہے گردونِ تنگ حوصلہ کا جو!
آشوبِ فغاں کے مرے عہدے سے بر آوے

ممکن نہیں آرام دے بیتابی جگر کی — جب تک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے
مت ممتحن باغ ہو اے غیرت گلزار — گل کیا کہ جسے آگے ترے بات کہ آوے
کھلنے میں ترے منہ کے کلی پھاڑے گریبان — ہلنے میں ترے ہونٹوں کے گلبرگ تر آوے
ہم آپ سے جاتے رہے ہیں ذوقِ خبر میں — اے جانِ بلب آمدہ رہ تا خبر آوے
کہتے ہیں ترے کوچے سے میرؔ آنے کہے ہے — جب جانئے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

ہے جی میں غزل در غزل اے طبع یہ کہیے
شاید کہ نظیریؔ کے بھی عہدے سے بر آوے

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے — اِس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
تلوار کا بھی مارا خدا رکھے ہے ظالم — یہ تو ہو کوئی گورِ غریباں میں در آوے
مے خانہ وہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شیخ — دیوار پہ خورشید کا مستی سے سر آوے
کیا جانیں وہ مرغانِ گرفتارِ چمن کو — جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے
تو صبح قدم رنجہ کرے ٹک تو ہے ورنہ — کِس واسطے عاشق کی شبِ غم بسر آوے
ہر شو سرِ تسلیم رکھے صید حرم ہیں — وہ صید فگن تیغ بکف تا کدھر آوے
دیواروں سے سر مارتے پھرنے کا گیا وقت — اب تو ہی مگر آپ کبھو در سے در آوے
واعظ نہیں کیفیت مے خانہ سے آگاہ — یک جرعہ بدل ورنہ یہ مندیل دھر آوے
صناع ہیں سب خوار ازانجملہ ہوں میں بھی — ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ ہنر آوے
اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سرِ راہ پہ زنہار — کہیو جو کبھو میرؔ بلاکش ادھر آوے

مت دشتِ محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے خطر آوے

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے — ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے
لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر — شوق نے بات کیا بڑھائی ہے
آرزو اُس بلند و بالا کی — کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے
دیدنی ہے شکستگی دِل کی — کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
ہے تصنع کہ لعل ہیں وُہ لب — یعنی ایک بات سی بنائی ہے
دل سے نزدیک اور اتنا دُور — کسے اس کو کچھ آشنائی ہے
بے ستوں کیا ہے کوہ کن کیسا — عشق کی زور آزمائی ہے
جس مرض میں کہ جان جاتی ہے — دلبروں ہی کی وہ جدائی ہے

یاں ہوئے خاک سے برابر ہم
واں وہی ناز خود نمائی ہے

ایسا ہوتا ہے زندۂ جاوید
رفتہ یار تھا جب آئی ہے

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

کعبے میں جاں بلب تھے ہم دوریٔ بتاں سے
آئے ہیں پھر کے یارو اب کے خدا کے یاں سے

تصویر کے سے طائر خاموش رہتے ہیں ہم
جی کچھ اُچٹ گیا ہے اب نالہ و فغاں سے

جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میری خاشاکِ آشیاں سے

کیا خوبی اُس کے منہ کی اے غنچے نقل کریئے
تو تو نہ بول ظالم بو آتی ہے وہاں سے

آنکھوں ہی میں رہے ہو دل سے نہیں گئے ہو
حیران ہوں یہ شوخی آئی تمہیں کہاں سے

سبزانِ باغ سارے دیکھے ہوئے ہیں اپنے
دلچسپ کاہے کو ہیں اِس بیوفا جواں سے

کی شست و شو بدن کی جس دن بہت سی ان نے
دھوتے ہیں ہاتھ میں نے اس دن سے اپنی جاں سے

خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب
ہر اک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے

اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میرؔ تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

اے نوکیلے یہ تھی کہاں کی ادا ؟
کھب گئی جی میں تیری بانکی ادا

جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیچ
ہائے رے چشمِ دلبراں کی ادا

بات کہنے میں گالیاں دے ہے
سُنتے ہو میرے بد زباں کی ادا

دل چلے جاتے ہیں خرام کے ساتھ
دیکھی چلنے میں اِن بتاں کی ادا

خاک میں مل کے میرؔ ہم سمجھے
بے ادائی تھی آسماں کی ادا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
بہت عالم کرے گا غم ہمارا

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

نہیں ہے مرجعِ آدم اگر خاک
کدھر جاتا ہے قدِ خم ہمارا

زمین و آسماں زیر و زبر ہیں
نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا

کسو کے بال پر ہم دیکھنے میرؔ
ہُوا ہے کام دل برہم ہمارا

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا
کچھ ہمارا اسی میں دارا تھا

کون لیتا ہے نام مجنوں کا جب کہ عہد جنوں ہمارا تھا
کوہ وفرہاد سے کہیں آگے سر مرا اور سنگ خارا تھا
ہم تو تھے محو دوستی اُس کے گو کہ دشمن جہاں ہمارا تھا
لُطف سے پوچھتا تھا ہر کوئی جب تلک لُطف کچھ تمہارا تھا
آستاں کی کسو کے خاک ہُوا آسمان کا بھی کیا ستارا تھا
پاؤں چھاتی پہ میرے رکھ چلنا یاں کبھو اس کا یوں گزارا تھا
موسم گل میں ہم نہ چھوٹے حیف گشت تھا دید تھا نظارا تھا
اِس کے ابرو جو ٹک جھکے ایدھر قتل کا تیغ سے اشارا تھا

عشق بازی میں کیا موئے ہیں میرؔ
آگے ہی جی انھوں نے ہارا تھا

آیا ہے ابر جب کا قبلے سے۔تیرا۔تیرا مستی کے ذوق میں ہیں آنکھیں بہت سی خیرا
خجلت سے اُن لبوں کی پانی ہو بہ چلے ہیں قند و نبات کا بھی نکلا ہے خوب شیرا
مجنوں نے حوصلے سے دیوانگی نہیں کی جا گہ سے اپنی جانا اپنا نہیں وطیرا
اُس راہزن سے ملکر دل کیونکہ کھو نہ بیٹھیں انداز و ناز اُچکے غمزہ اُٹھائی گیرا
کیا کم ہے ہولناکی صحرائے عاشقی کی شیروں کو اِس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرا
آئینے کو بھی دیکھو پر ٹک اِدھر بھی دیکھو حیران چشم عاشق دَمکے ہے جیسے ہیرا
نیت پہ سب بنا ہے یاں مسجد اک پڑی تھی پیر مغاں ہوا سو اس کا بنا خطیرا
ہمراہ خوں تلک ہو ٹک پاؤں کے چھوٹے سے ایسا گناہ مجھ سے وہ کیا ہُوا کبیرا

غیرت سے میرؔ صاحب سب جذب ہو گئے تھے
نکلا نہ بوند لوہو سینہ جو اِن کا چیرا

مت صبح و شام تو پلے ایذائے میرؔ ہو ایسا نہ ہو کہ کام ہی اس کا اخیر ہو
ہو کوئی بادشاہ۔کوئی یاں وزیر ہو اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو
جنت کی منت اُن کے دماغوں سے کب اُٹھے خاک رہ اس کی جن کے کفن کا عبیر ہو
کیا ٹوٹو آب و تاب سے ہو بیٹھیں کار عشق سُوکھے جگہ کا خوں تو رواں جوئے شیر ہو
چھاتی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ رشک باغ جوشِ بہار تھا کہ ہم آئے اسیر ہو
یاں برگ گل اُڑاتے ہیں پرکالۂ جگر جا عندلیب تو نہ مری ہم صفیر ہو
اس کے خیال خط میں کسے یاں دماغ حرف کرتی ہے بے مزہ جو قلم کی صریر ہو

زنہار اپنی آنکھ میں آتا نہیں وہ صید — پھوٹا دو سار جس کے جگر کا نہ تیر ہو
ہوتے ہیں میکدے کے جواں شیخ جی بُرے — پھر در گذر یہ کرتے نہیں گو کہ پیر ہو
کس طرح آہ خاکِ مذلت سے میں اُٹھوں — اُفتادہ تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو
حد سے زیادہ جور و ستم خوش نما نہیں — ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو
دم بھر نہ ٹھیرے دِل میں نہ آنکھوں میں ایک پل — اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو
ایسا ہی اس کے گھر کو بھی آباد دیکھیو — جس خان و ماں خراب کا یہ دل مشیر ہو
تسکین دِل کے واسطے ہر کم بغل کے پاس — انصاف کریئے کب تئیں مخلص حقیر ہو

اک وقت خاص حق میں مرے کچھ دُعا کرو
تم بھی تو میرؔ صاحب قبلہ فقیر ہو

دِل پُر خوں کی اک گلابی سے — عمر بھر ہم رہے شرابی سے
جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آج — رات گزرے گی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — اِس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
برقع اُٹھتے ہی چاند سا نکلا — داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

دل عجب شہر تھا خیالوں کا — لوٹا مارا ہے حسن والوں کا
جی کو جنجال دل کو ہے اُلجھاؤ — یار کے حلقہ حلقہ بالوں کا
موئے دلبر سے مشکبو ہے نسیم — حال خوش اس کے خستہ حالوں کا
نہ کہا کچھ نہ آ پھرا نہ ملا — کیا جواب اُن مرے سوالوں کا

دم نہ لے اُس کی زلفوں کا مارا
میر کاٹا جئے نہ کالوں کا

ہے غزل میرؔ یہ شفائی کی — ہم نے بھی طبع آزمائی کی
اُس کے ایفائے عہد تک نہ جئے — عمر نے ہم سے بے وفائی کی
وصل کے دن کی آرزو ہی رہی — شب نہ آخر ہوئی جُدائی کی
اسی تقریب اُس گلی میں رہے — منتیں ہیں شکستہ پائی کی
دِل میں اُس شوخ کے نہ کی تاثیر — آہ نے آہ نارسائی کی
کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس — ہم نے دیدار کی گدائی کی

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میر
کس بھروسے پہ آشنائی کی

ہو گئی شہر شہر رسوائی ۔ اے مری موت تو بھلی آئی
یک بیاباں برنگِ صوتِ جرس ۔ مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی
نہ کھنچے تجھ سے ایک جا نقاش ۔ اس کی تصویر وہ ہے ہرجائی
سر رکھوں اس کے پاؤں پر لیکن ۔ دستِ قدرت یہ میں کہاں پائی

میر جب سے گیا ہے دل تب سے
میں تو کچھ ہو گیا ہوں سودائی

اہلی شیرازی کے شعر پر مصرعے لگا کر مثلث کا ایجاد اپنی زبان میں دکھاتے ہیں ؎

کل تک تو فریبندہ ملاقات تھی پہلی
امروز یقیں شد کہ ندازی سرِ اہلی ۔ بے چارۂ زلفِ تو بدل داشت گماں ہا

کیا کہوں میں عاشق و معشوق کا راز و نیاز
ناقہ را مے راند لیلیٰ سوئے خلوت گاہ ناز ۔ سارباں در رہ حدی مے خواند و مجنوں مے گریست

ایک مثلث سید انشاء کا یاد آگیا۔ کیا خوب مصرع لگایا ہے ؎

اگرچہ سینکڑوں اُس جا پہ تھے کھڑے زن و مرد
نشد قتیل ولیکن کہ ایک کس از بہر دود ۔ سرے بہ نعش من خستہ جان بجنباند

مربع پانچویں دیوان میں سے

جو اے قاصد وہ پوچھے میر بھی ادھر کو چلتا تھا ۔ تو کہیو جب چلا تھا میں تب اس کا دم نکلتا تھا
ہما افسوس بیتابی سے تھا کل قتیل میں میرے ۔ تڑپتا تھا ادھر میں یار اُدھر ہاتھ ملتا تھا

مربع فارسی پر

گذر رہے نہ دارا ہے نہ کسرا ہے نہ قیصر ہے ۔ یہ بیت المال ملک بیوفا بے وارثا گھر ہے
نہ در جانم ہوا باقی نہ اندر دل ہوس ماندہ ۔ بیا ساقی کہ ایں ویرانہ از بسیار کس ماندہ

# خاتمہ

رات آخر ہو گئی مگر جلسہ جما ہوا ہے اور وہ سماں بندھ رہا ہے کہ ہر دل سے صدا آتی ہے

ع یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب

اس مشاعرے کے شعرا کا کچھ شمار نہیں خدا جانے یہ کتنے ہیں اور آسمان پر تارے

کتنے ہیں ۔ سننے والے ایسے مشتاق کہ شمع پر شمع پانی ہوتی ہے ۔ مگر اُن کے شوق کا شعلہ ویسا نہیں ہوتا۔ یہی آواز چلی آتی ہے ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

آزاد بھولتے ہو ؟ دلوں کی نبض کس نے پائی ہے ؟ جانتے نہیں کہ دفعتہً اُکتا جاتے ہیں ۔ پھر ایسے گھبرا جاتے ہیں کہ ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں ۔ بس اب باقی داستان فرداشب ۔ ایلو صبح ہو گئی ملول کلام کو ملتوی کرو ؎

عزیزو مست سخن ہو دیا کہ ہوتے ہو
اُٹھو اُٹھو کہ بس اب سر پہ آفتاب آیا

---

# چوتھا دَور

## : تمہید :

قہقہوں کی آوازیں ۔ دیکھنا اہل مشاعرہ آن پہنچے ۔ یہ کچھ اور لوگ ہیں ۔

ع ہاں کا آنا غضب کا آنا ہے

ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں گے کہ جن کی شوخی اور طرّاری طبع بارِ متانت سے ذرا نہ دبیگی ۔ اتنا ہنسیں اور ہنسائیں گے کہ مُنہ تھک جائیں گے ۔ مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے ۔ نہ اگلی عمارتوں کو بلند اُٹھائیں گے ۔ اُنھیں کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے ۔ ایک مکان کو دوسرے مکان سے سجائیں گے اور ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے ۔ وہی پھول عطر میں بسائیں گے ۔ کبھی ہار بنائیں گے کبھی طرّے سجائیں گے ۔ کبھی انھیں کو پھولوں کی گیندیں بنا لائیں گے اور وہ گلباری کریں گے کہ ہولی کے جیسے گرد ہو جائیں گے ۔ ان خوش نصیبوں کو زمانہ بھی اچھالے گا ۔ ایسے قدر دان ہاتھ آئیں گے کہ ایک پھول اِن کا چمنِ زعفراں کے مول بکے گا ۔

اس دوران میں میاں رنگین سب سے نئے گلدستے بنا کر لائے ۔ اور اہلِ جلسہ کے سامنے سجائے یعنی ریختہ میں سے ریختی نکالی ۔ ہم ضرور کہتے کہ ہندوستان کی عاشقانہ شاعری نے اپنے اصل پر رجوع کی ۔ لیکن چونکہ پہلے کلام کی بنیاد اصلیت پر تھی

اور اس کی بنیاد فقط یاروں کے ہنسنے ہنسانے پر ہے اس لیے سوائے تمسخر کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اگر لکھنؤ کے قیصر باغ اور وہاں کے معاملات کی تخم ریزی دیوان رنگین اور دیوان سید انشا کو کہیں تو کچھ بدگمانی یا تہمت میں داخل نہیں۔ اگرچہ اصل ایجاد میاں رنگین کا ہے۔ مگر سید انشا نے بھی ان سے کچھ زیادہ ہی سگھڑاپا دکھایا ہے۔

ان صاحب کمالوں کے عہد میں صدہا باتیں بزرگوں کی متروک ہو گئیں۔ پھر بھی جس قدر باقی ہیں وہ اشعار مفصلہ ذیل سے معلوم ہوں گی۔ البتہ شیخ مصحفی کے بعض الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بزرگوں کی میراث سے محبت زیادہ ہے۔ سید انشا اور جرأت نے ان میں سے بہت کچھ چھوڑ دیا۔ مگر نت، ٹک، انکھڑیاں، زور (یعنی بہت) بے تکلف بولتے ہیں اور واچھڑے، بھلے رے، جھمکڑا، اجی سید موصوف کا انداز خاص ہے۔ ہاں انھوں نے کلام کا انداز ایسا رکھا گیا ہے کہ جو چاہتے ہیں۔ سو کہہ جاتے ہیں نہیں معلوم ہوتا کہ ان کا روزمرہ یہی ہے یا مسخرہ پن کرتے ہیں بہر حال چند شعر لکھتا ہوں جن سے معلوم ہو کہ اس وقت تک کیا کیا قدیمی محاورے باقی تھے جو اب متروک ہیں اور باقی الفاظ ان بزرگوں کی غزلوں سے معلوم ہوں گے جو ان کے حال کے بعد لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ شیخ مصحفی کہتے ہیں۔

اوہ من اٹھا کے جانے والے ٹک ہم کو بھی خاک سے اٹھالے

تربت پہ میری پائے حنائی نہ رکھ میاں کر رحم اب تو قبر میں آتش فشاں نہ ہو

شب ہجر صحرائے ظلمت سے نکلی میں جب آنکھ کھولی بہت رات نکلی

تو اسے مصحفی اب تو گرم سخن ہو شب آئیں دراز اور بہت رات نکلی

دل مرے سوگ میں مت کر تو برادر میلا یا لیسمھ جاتے ہیں ہوتا ہے جو تیور میلا

ہے لطف سیر شب ماہ ان حسینوں میں جنہوں کے رہتی ہے افشاں چنی جبینوں میں

انھوں کو صاحب حرمن سبھی سمجھتے ہیں
جو مصحفی کے ہیں کہلاتے خوشہ چینوں میں

باغباں ہے مجھے کیا کام ترے گلشن سے ہر تے پھر تے کبھی ادھر بھی آجاتا ہوں

ہوں تو گٹھڑی لوگن کی شکل حباب لیکن آب دھوا کے ہاتھ میں ہوں

تم جو پوچھو ہو سدا حال ریتیاں ہم سے
یہ ہنسی خوب نہیں لیے گل خنداں ہم سے

حیران سی ہائیں رہ جاتیاں ہیں تیری کیا انکھیں آرسی کے ششدرتیاں ہیں تیری

اس گل کی باغ میں جو خنا نے چلائی بات غنچے نے مسکرا کے کہا ہم نے پائی بات
شہرت بزیر آسماں رکھتی تھی حاتم کی سخا اس کا نہیں ملتا نشاں کیا جانئے وہ کیدھر گئی
تن کے نشیمن سے سفر دشوار اسے آیا نظر سو بار جان مضطرب ایدھر گئی ادھر گئی
ناسور داغ سینہ کو ماء الحیات اپنا سمجھ تن خاک کا پھر ڈھیر سے کھلا جو یہ اخگر گئی
گویا زمین کربلا تھی قتل گاہ عاشقاں جو بدلی آئی اس طرف یاراں بچشم تر گئی
بکھیر دے جو وہ زلفوں کو اپنے مکھڑے پر تو مارے شرم کے آئی ہوئی گھٹا پھر جائے

مصحفیؔ نظم غزل میں ہے یہ کس کا مقدور
جو یہ طرزیں کہ ہم ایجاد کیا کرتے ہیں

نرگس نے گل کی دید کو آنکھیں جو کھولیاں کچھ جی میں جو سمجھ گئیں کلیاں نہ بولیاں
دہشت نے حیلہ جو ہی دکھانت مسیح کو آخر نہ پٹیاں مرے زخموں کی کھولیاں
میں ہی جانوں ہوں جو کچھ مجھ سے ادائیں کی ہیں تیری آنکھوں نے جفائیں سی جفائیں کی ہیں
کیا روٹھ گیا مجھ سے مرا یار الٰہی کیوں آنکھ ملاتا وہ نہیں کچھ تو سبب ہے
نہ ترے حسن کے دن اور نہ بہاریں وہ رہیں نہ وہ حالی نہ وہ محرم نہ ازاریں وہ رہیں
منہ نہ کھولے کبھی گھر آ کے مرے حوریوں نے جب تلک بیٹھی رہیں دونٹ ہی مارے وہ رہیں
تیرے بن ہم نے نہ دیکھا کبھی پریوں کی طرف گو خط و خال کو نت اپنے سنوارے وہ رہیں
دم شماری ہے اب انجام ریاکاری شیخ نہ وہ تسبیح کے دانے نہ شماریں وہ رہیں

مل گئے خاک میں کیا کیا نہ ذیشان بزرگ
نہ وہ لوحیں نہ مجرّ نہ مزاریں وہ رہیں

اے خوشا حال انھوں کا کہ جو کوچے میں ترے خاک پنڈے پہ ملے بیٹھے ہیں آن مارے

اور سید انشاء اللہ خاں کہتے ہیں:۔

دشت جنوں میں اسے والے دیلا سونے نہ پائے ٹک پاؤں پھیلا
انکھڑیاں سرخ ہو گئیں جب سے دیکھ لیجئے کمال بوسے کا
ٹک آنکھ ملاتے ہی کیا کام ہمارا تس پر یہ غضب پوچھتے ہو نام ہمارا
ایک چھوڑا نہ زندہ جاں تو نے ٹھور رکھا سبھوں کو ہاں تو نے
بھلا رے یہ دماغ سمجھا ہے آپ کو شاخ زعفراں تو نے
جو ہاتھ اپنے سنبرے کا گھوڑا لگا تو سلفے کا اور اس پہ کوڑا لگا
اجی چشم بددور نام خدا تمہیں کیا بھلا سرخ جوڑا لگا

چہرہ مریض غم کا ترے زرد ہے سو ہے — عیسیٰ کنے دوا نہ رہی درد ہے سو ہے

نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنوں — کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلیٰ

ہے نام خدا دا اچھڑے کچھ اور تماشا — یہ آپ کی رنگت

گات ایسی غضب قہر چھین اور جھگڑا — اللہ کی قدرت

اور جرأت کہتے ہیں

لائے موزوں سے مصرع آہ کا چسپاں ہوا — زور یہ مطلع مرا سر دفتر دیواں ہوا

جنھوں کے نامے پہنچتے ہیں یار تک دن رات — انھیں کا کاش کہ جرأت بھی نامہ بر ہوتا

دو ایک تو ہے بھبھوکا سا تس پہ اے جرأت — اکڑ تکڑ ہے قیامت ہے بانکپن کی سی

دیکھنا تک یاد ہیں ہم کو بھی کیا عیاریاں — تیری خاطر کرتے ہیں غیروں کی خاطر داریاں

بہ گیا جوں شمع تن سارا اگر اچھا ہوا — نت کے رونے سے چھٹی اے چشم تر اچھا ہوا

سبھی انعام نت پاتے ہیں اے شیریں دہن تجھ سے — کبھی تو ایک بوسے سے ہمارا منہ بھی میٹھا کر

خبر اس کو نہیں کرتا کوئی
کہ میاں مفت ہے مرتا کوئی

کسی گل کیلئے تم آپ گل ہو گلی نہ کھاؤ جی — ابھی ننھا کلیجا ہے نہ داغ اس کو لگاؤ جی

آتش عشق کو سینے میں عبث بھڑکایا — اب کہو کھینچوں ہوں میں آہ شرربار کہ تو

کل واقف کار اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات — جرأت کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم

کیا جانے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر — جو بات نہیں تھی ماننے کی مان گئے ہم

تم اور کسی شہر چلے ہو تو بس اپنے — عالم ہی وہ نظروں میں نہیں سارے نگر کا

یا ہم ہی نہیں ہیں یا نہیں غیر
اودھر کو جو تو نظر کرے گا

ہر دم جو اپنے سامنے وہ گلعذار ہے — جیدھر کو آنکھ اٹھاتے ہیں باغ و بہار ہے

کھینچ کر آہ جو ہاتھ جگر پر رکھا — دامن اس نے بھی اٹھا دیدہ تر پر رکھا

تھی مری شکل کل اس بن یہ گلستان کے بیچ — جیسے بیٹھے خفقانی کوئی زنداں کے بیچ

لے چلے غیر کو گھر اپنے بلا سبب سے تم — انکھڑیوں سے کبھی یوں ہم کو اشارہ نہ ہوا

جس پہ نت تیغ کھینچے اور سدا جور رہے — تو ہی انصاف کر اب کیونکہ نہ وہ ٹھور رہے

جرأت یہ غزل سن کے بہ تغییر قوافی — تکلیف سخن گوئی کی دی پھر کسی نے

اس غزل میں اک غزل تو اور جرأت پڑھ سنا — زور ہی لذت ہمیں تو دی ترے اشعار نے

یار کا آستان پایا ہے
زور دل نے مکان پایا ہے

# شیخ قلندر بخش جرأت

جرأت تخلص، شیخ قلندر بخش مشہور، اصلی نام یحیٰی نان تھا۔ اکبر آبادی مشہور ہیں۔ مگر باپ ان کے حافظ امان خاص دلّی کے رہنے والے تھے۔ ہر تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان کے خاندان کا سلسلہ رائے امان شاہی سے ملتا ہے اور امان کا لفظ اکبری زمانہ سے ان کے ناموں کا خلعت چلا آتا ہے۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ ان کے بزرگ دربار شاہی میں دربانی کی خدمت رکھتے تھے۔ لطیفہ۔ بزرگوں کا قول سچ ہے کہ اگر کسی کے والدین اور بزرگوں کی لیاقت اور حیثیت دریافت کرنی ہو تو اس کے نام کو دیکھ لو۔ یعنی جیسی لیاقت ہوگی۔ ویسا ہی نام رکھیں گے حقیقت حال ہے کہ رائے امان محمد شاہی عہد میں دربان تھے۔ اگرچہ اس زمانے کے دربان بھی آج کل کے بڑے بڑے عہدہ داروں سے بہتر ہوتے تھے۔ مگر زیادہ تر وجہ شہرت یہ ہوئی کہ جس وقت نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دیا تو بعض اشخاص نے ننگ و ناموس کا پاس کر کے جان کا خیال نہ کیا اور اپنے اپنے گھر کا بندوبست رکھا۔ نادر کے سپاہی جب وہاں پہنچے تو تلوار کا تلوار سے جواب دیا۔ اس میں طرفین سے جانیں ضائع ہوئیں۔ امن کے بعد جب نادری مقتولوں کی اور ان کے اسباب قتل کی تحقیقات ہوئی تو وہ لوگ پکڑے آئے۔ ان میں رائے امان بھی تھا۔ چنانچہ شال ٹپکوں سے ان کے گلے گھونٹے اور مار ڈالا۔

جرأت میاں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ علاوہ فن شاعری کے نجوم میں ماہر تھے اور موسیقی کا شوق رکھتے تھے۔ چنانچہ ستار کو خوب بجاتے تھے۔ اول نواب محبت خاں خلف حافظ رحمت خاں نواب بریلی کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ میر انشاء اللہ خاں کی اور ان کی صحبتیں بہت گرم رہتی تھیں۔ چنانچہ حسب حال یہ شعر کہا تھا۔

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے
ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ ایک دفعہ تنخواہ کو دیر ہوئی۔ حسن طلب میں ایک غزل کا مطلع لکھا ہے

جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم
کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیماں کب دے

فارسی کی ضرب المثل ہے، تا خدا نہ دہد سلیماں کے دہد۔ میاں جرأت کے حال میں، بلکہ ساری کتاب میں افسوس کی بات ہے تو یہ ہے کہ عین جوانی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ حادثۂ چیچک سے ہوا۔ استاد مرحوم نے ایک دفعہ فرمایا کہ بھائی زمانے کی دو آنکھیں ہیں۔ نیکی کی آنکھ نے ان کے کمال کو بڑی قدردانی سے دیکھا۔ بدی کی آنکھ نہ دیکھ سکی اور ایک بدنما داغ ان کے دامن پر دکھایا۔ مشہور کرتے ہیں کہ پہلے وہ اصلی اندھے نہ تھے، بعض ضرورتوں سے کہ شوخیِ عمر کا مقتضا ہے، خود اندھے بنے، رفتہ رفتہ اندھے ہی ہو گئے۔

بزرگوں کا قول ہے کہ شرافت، نجابت غریبی پر عاشق ہے، دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہیں یہ حق ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شرافت کے اصول و آئین غریبوں ہی سے خوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی قیامت آئی۔ دولت آئی شامت آئی میاں جرأت کی خوش مزاجی، لطیفہ گوئی مسخرہ پن کی عادت حد سے زیادہ گزری ہوئی تھی۔ اور ہندوستان کے امیروں کو نہ اس سے ضروری کوئی کام، نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہے۔ کہتے ہیں، مرزا قتیل، سید انشاء کا اور ان کا یہ حال تھا کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے۔ آج ایک امیر کے ہاں، دوسرے ان دوسرے امیر آئے سوار کیا اور ساتھ لے گئے۔ ۴، ۵ دن وہاں رہے کوئی اور نواب آئے۔ وہاں سے وہ لے گئے جہاں جائیں آرام و آسائش سے زیادہ عیش کے سامان موجود۔ رات دن قہقہے اور چہچہے ایک بیگم صاحب نے گھر میں ان کے چٹکلے اور نقلیں سنیں بہت خوش ہوئیں اور نواب صاحب سے کہا کہ ہم بھی باتیں سنیں گے۔ گھر میں لا کر کھانا کھلاؤ۔ پردے یا چلمنیں چھٹ گئیں، اندر وہ بیٹھیں، باہر یہ بیٹھے۔ چندروز کے بعد خاص خاص بیبیوں کا برائے نام پردہ رہا۔ باقی گھر والے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت ہوئی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں۔ گھر میں کوئی دادا، نانا کوئی ماموں، چچا کہتا۔ شیخ صاحب کی آنکھیں دُکھنے آئیں چندروز ضعف بصر کا بہانہ کر کے ظاہر کیا کہ آنکھیں معذور ہو گئیں۔ مطلب یہ تھا کہ اہل حسن کے دیدار سے آنکھیں سکھ پائیں۔ چنانچہ بے تکلف گھروں میں جانے لگے۔ اب پردے کی ضرورت کیا؟ یہ بھی قاعدہ ہے کہ میاں بیوی جب مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں، نوکر اس سے جلنے لگتے ہیں ایک دن دوپہر کو سو کر اٹھے۔ شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھر لا۔ لونڈی نہ بولی۔ انھوں نے پھر پکارا۔ اس نے کہا کہ بیوی جائے ضرور میں لے گئی ہیں۔ ان کے منہ سے نکل گیا کہ غضب! دوانی ہوئی ہے، سامنے تو رکھا ہے، دیتی کیوں نہیں؟ بیوی دوسرے دالان

میں تھیں۔ لونڈی گئی اور کہا کہ دوتی بیوی یہ موا کہتا ہے کہ وہ بندہ اندھا ہے یہ تو خاصا بجکھا ہے۔ ابھی میرے ساتھ یہ واردات گزری اس وقت یہ راز کھلا۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے سے

ع :- مزن فال بد کا ورد حال بد
مبادا کسے کو زند فال بد

جرأتؔ اگرچہ علوم تحصیلی میں ناتمام تھے، بلکہ عربی زبان سے ناواقف تھے، لیکن اس کوچے کے رستوں سے خوب واقف تھے اور طبع موزوں طوطی و بلبل کی طرح ساتھ لائے تھے۔ آخر عمر تک لکھنؤ میں رہے اور وہیں ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے۔ شیخ ناسخ نے تاریخ کہی۔

جب میاں جرأت کا باغ دہر سے گلشنِ فردوس کو جانا ہوا
مصرع تاریخ ناسخ نے کہا ہائے ہندوستان کا شاعر ہوا

کلام ہر جگہ زبان پر ہے۔ دیوان تلاش سے مل جاتا ہے۔ اس میں ہر طرح کی غزلیں ہیں۔ رباعیاں۔ چند مخمس۔ واسوخت۔ چند ہجویں اور تاریخیں ہیں۔ دیوان میں رطب و یابس بہت نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو استادوں کے طریقے پائے ہیں، انہیں سلیقے سے کام میں لائے ہیں۔ اس پر کثرت مشق نے صفائی کا رنگ دیا ہے کہ سب کوتاہیوں کا پردہ ہو گیا اور انہیں خود صاحب طرز مشہور کر دیا۔ ان کی نکتہ یابی اور سخن فہمی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ قصیدہ وغیرہ اقسام شعر پر ہاتھ نہ ڈالا، بلکہ زبان فارسی کی طرف خیال بھی نہیں کیا۔ مناسب طبع دیکھ کر غزل کو اختیار کیا اور امرا اور ارباب نشاط کی صحبت نے اسے اور بھی چمکایا۔ انہوں نے بالکل میر کے طریقے کو لیا مگر اس کی فصاحت و سادگی پر ایک شوخی اور بانکپن کا انداز ایسا بڑھایا جس سے پسند عام نے شہرت دوام کا فرمان دیا۔ عوام میں کمال کی دھوم مچ گئی اور خواص حیران رہ گئے۔ ان کی طرز انہیں کا ایجاد ہے اور آج تک انہیں کے لئے خاص ہے جیسی اس وقت مقبول خلائق تھی۔ آج تک ویسی ہی چلی آتی ہے۔ خصوصیت اس میں یہ ہے کہ فصاحت اور محاورے کی جان ہے۔ فقط حسن و عشق کے معاملات ہیں اور عاشق و معشوق کے خیالات گویا اس میں شراب ناب کا سرور پیدا کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت غزل کے لئے عین مناسب واقع ہوئی تھی۔ حریف ظریف، خوش طبع، عاشق مزاج تھے۔ البتہ استعداد علمی اور کاوش فکری شاعری کا جزو عظیم ہے۔ ان کی طبیعت بجائے محنت پسند ہونے کے عشرت پسند تھی۔ تعجب یہ ہے کہ زمانے نے شکر خورے کو شکر دے کر تمام عمر قدردان اور ناز بردار امیروں میں بسر کر دی، جہاں رات دن اس کے سوا اور چرچا ہی نہ تھا۔ اگر ان کی طبیعت میں یہ

باتیں نہ ہوتیں اور وہ استعداد علمی سے طبیعت میں زور اور فکر میں قوت خود پیدا کرتے تو اتنا ضرور ہے کہ اوصافِ سخن پر قادر ہو جاتے۔ مگر پھر یہ لطف اور شوخیاں کہاں؟ بُلبُل میں شوریدہ مزاجی نہ ہوتی تو یہ چہچے کب ہوتے؟ نہیں گلہائے بہاری تمہاری ہوا پر ہوتے تو فصلِ بہار کے مزے کب ہوتے؟ یہ بات ہے کہ طبیعت میں تیزی اور طراری تھی۔ مگر نزلے کا زور اور طرف جا گر گرا تھا۔ یہی سبب ہے کہ کلام میں بلند پروازی، لفظوں میں شان و شکوہ اور معنوں میں دقت نہیں جس نے قصیدے تک نہ پہنچنے نہ دیا اور غزل کے کوچے میں لا ڈالا۔ اس عالم میں جو باتیں ان پر اور ان کے دل پر گزرتی تھیں سو کہہ دیتے تھے، مگر ایسی کہتے تھے کہ اب تک دل پھڑک اٹھتے ہیں۔ مشاعرے میں غزل پڑھتے تھے۔ جلسے کے جلسے لوٹ لوٹ جاتے تھے۔ سید انشا باہمہ فضل و کمال رنگارنگ کے بہروپ بدل کر مشاعرے میں دھوم دھام کرتے تھے۔ وہ شخص فقط اپنی سیدھی سادی غزل میں وہ بات حاصل کر لیتا تھا۔

مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اور تمام امرائے نامی و شعرائے گرامی جمع ہوتے تھے۔ میر تقی مرحوم بھی آتے تھے۔ ایک دفعہ جرأت نے غزل پڑھی اور غزل وہ ہوئی کہ تعریفوں کے غل سے شعر تک سنائی نہ دیئے۔ میاں جرأت یا تو اس جوش سرور میں جو کہ اس حالت میں انسان کو سرشار کر دیتا ہے یا شوخیٔ مزاج سے میر صاحب کے چھیڑنے کے ارادے سے ایک شاگرد کا ہاتھ پکڑ کے ان کے پاس آ بیٹھے اور کہا کہ حضرت اگرچہ آپ کے سامنے غزل پڑھنی بے ادبی بے حیائی ہے۔ مگر خیر اس بیہودہ گو نے جو یاوہ گوئی کی، آپ نے سماعت فرمائی؟ میر صاحب تیوری چڑھا کر چپکے ہو رہے۔ جرأت نے پھر کہا۔ میر صاحب کچھ ہوں ہاں کر کے پھر ٹال گئے۔ جب انھوں نے بہ تکرار کہا تو میر صاحب نے جو الفاظ فرمائے وہ یہ ہیں۔ کیفیت اس کی یہ ہے کہ "تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو، اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو"۔ میر صاحب مرحوم شاعروں کے الوالآبا تھے، کیسے ہی الفاظ میں فرمائیں، مگر جوہری کامل تھے۔ جواہر کو خوب پرکھا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ عاشق و معشوق کے راز و نیاز اور حسن و عشق کے معاملوں کو جس شوخی اور چوچلے سے انھوں نے برتا ہے، وہ انہیں کا حصہ تھا۔ آج تک دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ میر اور سودا کی غزلوں پر اکثر غزلیں لکھی ہیں۔ ان کے کلام ملوک الکلام تھے، مگر یہ اپنی شوخی سے جو لطف پیدا کر جاتے ہیں، تڑپا جاتے ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| میر | برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آئے | اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے |
| سودا | اس دل کو تف آہ سے کب شعلہ بر آئے | بجلی کو دم سرد سے جس کے حذر آئے |
| مصحفی | ہرگز نہ مرادِ دل معشوق بر آئے | یارب نہ شب وصل کے پیچھے سحر آئے |

جرأت — اس پردہ نشیں سے کوئی کس طرح برآئے — جو خواب میں بھی آئے تو منہ ڈھانک کر آئے

ذوق — ناقص کا شفا کیش سے مطلب نہ برآئے — جو کور ہو عینک سے اسے کیا نظر آئے

فردوس میں ذکر اس لب شیریں کا گر آئے — پانی دہن چشمہ کوثر میں بھر آئے

اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے — پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کرو گے

میر — جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے — یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

سودا — ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے — لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

میر — مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں — چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں

سودا — تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں — یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

و جرأت — آئینہ رخ کو ترے اہل صفا کہتے ہیں — اس پہ دل اٹکے ہے میرا اسے کیا کہتے ہیں

سودا کا ایک مطلع مشہور ہے۔ استاد مرحوم اس پر جرأت کا مطلع پڑھا کرتے تھے۔ ایک مصرعہ یاد ہے دوسرا بھول گیا۔ اب سارا دیوان چھان مارا نہیں ملتا، معلوم ہوتا ہے کہ زبان بزبان یہاں تک پہنچا۔ وہاں دیوان میں نہ درج ہوا۔ ناسخ اور آتش کے اکثر اشعار کا یہی حال ہے۔ معتبر اشخاص کی زبانی سن چکا ہوں جو کہ خود ان کے مشاعروں میں شامل ہوتے تھے۔ مگر اب دیوانوں میں وہ اشعار نہیں ملتے۔ استاد مرحوم کے صدہا شعروں کا حال راقم آثم جانتا ہے کہ خود یاد ہیں یا ایک دو زبانوں پر ہیں یہ رہیں تو فراموشی کا مال ہے۔ کارساز کریم ان کے مجموعے کو بھی تکمیل کو پہنچاتے۔ سودا کا مطلع ہے۔

سودا — کہہ دیکھ تو رستم سے سر تیغ تلے دھر دے — پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے

جرأت — . . . . . . . . . . — ہر شہرے و ہر رسمے، ہر کارے و ہر مردے

میر — ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

سودا — چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا — صبا نے تیغ کا موج رواں سے کام لیا

جرأت — پاس جا بیٹھا جو میں کل اک ترے ہمنام کے — رہ گیا بس نام سنتے ہی کلیجا تھام کے

میر — چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا — جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

سودا — برابری کا تری گل نے جب خیال کیا — صبا نے مار تھپیڑا منہ اس کا لال کیا

جرأت — جو تیغ یار نے خوں ریزی کا خیال کیا — تو عاشقوں نے بھی منہ اس کا خوب لال کیا

طائر شہرت نے ابھی پر پرواز نہ نکالے تھے جو مرزا رفیع اور میر سوز کے جلسے میں ایک لطیفہ ہوا۔ دیکھو صفحہ ۱۸۶۔ سچ ہے۔ شاعر اپنی شاعری ماں کے پیٹ سے لے کر نکلتا ہے۔

ان کے کلام میں بعض نکتے ایسے بھی ہیں کہ جن پر خاص لوگوں کی نظریں اٹکتی ہیں۔

مثلاً

ہو کے آزردہ جو وہ ہم سے پرے پھرتے ہیں
ہاتھ ہم اپنے کلیجے پہ دھرے پھرتے ہیں

مصرع گرم ہے لیکن پرے پرے پھرتے ہیں کہتے تو محاورہ پورا ہو جاتا۔

کبھی وہ چاند کا ٹکڑا ادھر بھی آ نکلے
ذرا تو دیکھ منجم مرے ستارے دن

دکھادے شکل کہ دیوار و در سے سر اپنا — کہاں تلک کوئی تیرے قرار پر مارے
ہجوم داغ نے یہ کی ہے تن پہ گلکاری — کہ پہنے ہوں تن عریاں لباس پھلکاری

ظہور اللہ خاں نوا سے کسی معاملے میں بگاڑ ہو گیا تھا۔ انہوں نے ان کی ہجو میں ایک ترجیع بند کہا اور حقیقت میں بہت خوب کہا جس کا شعر ترجیع یہ ہے:

ظہور حشر نہ ہو کیوں جو کلچڑی گنجی
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

خاں موصوف نے بھی بہت کچھ کہا۔ اس نے شہرت نہیں پائی۔ چنانچہ ان کے ترجیع بند کا فی الحال یہی ایک شعر یاد ہے۔

رات کو کہنے لگا جورو کے منہ پر ہاتھ پھیر
قدرت حق سے لگی ہے ہاتھ اندھے کے بٹیر

کریلا۔ ایک پرانم بھانڈ دلی کا رہنے والا، نواب شجاع الدولہ کے ساتھ گیا تھا اور اپنے فن میں صاحب کمال تھا۔ ایک دن کسی محفل میں اس کا طائفہ حاضر تھا۔ شیخ جرأت بھی وہاں موجود تھے۔ اس نے نقل کی۔ ایک ہاتھ میں لکڑی لے کر دوسرا ہاتھ اندھوں کی طرح بڑھایا۔ ٹٹول ٹٹول کر پھرنے لگا کہ حضور شاعر بھی اندھا، شعر بھی اندھا، مضمون بھی اندھا

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے — کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے؟

شیخ صاحب بہت خفا ہوئے۔ مگر یہ بھی سید انشاء اور مرزا قتیل کے جتھے کے جزو اعظم تھے، گھر آ کر انھوں نے بھی اس کی ہجو کہہ دی اور خاک خوب اڑائی۔ اسے سن کر کریلا بہت کڑوایا چنانچہ دوسرے جلسے میں پھر اندھے کی نقل کی۔ اسی طرح لاٹھی لے کر پھرنے لگا۔ ان کی ایک غزل ہے۔

امشب تری زلفوں کی حکایات ہے واللہ
کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ

ہر رات کے لفظ پر لکڑی کا سہارا بدلتا تھا۔ کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ

اس غزل کے ہر شعر کا دوسرا مصرع ایک ہی ڈھنگ پر ہے۔ چنانچہ ساری غزل کو اسی طرح محفل میں پڑھتا پھرا۔ شیخ صاحب اور بھی غصے ہوئے اور پھر آکر ایک ہجو کہی ترجیع بند تھا ؂

بگلا بھوے بگلا بھوے ساون ماس کریلا پھولے

ان کو بھی خبر ہوئی۔ بہت بھنا، پھر کسی محفل میں ایک زچہ کا سوانگ بھرا اور ظاہر کیا کہ اسکے پیٹ میں بھتنا گھس گیا ہے۔ خود ملاین کر بیٹھا اور جس طرح جنات اور سیانوں میں لڑائی ہوتی ہے اسی طرح جھگڑتے جھگڑتے بولا کہ ارے نامراد کیوں غریب ماں کی جان کا لاگو ہوا ہے؟ جرأت ہے تو باہر نکل آ کہ ابھی جلا کر خاک کروں۔ آخر آب کی دفعہ انھوں نے ایسی خبر لی کہ کریلا خدمت میں حاضر ہوا خطا معاف کروائی اور کہا کہ میں اگر آسمان کے تارے توڑ لاؤں گا تو بھی اس کا چرچا وہیں تک رہے گا، جہاں تک دائرہ محفل ہے۔ آپ کا کلام منہ سے نکلتے ہی عالم میں مشہور ہو جاتے گا اور پتھر کی لکیر ہوگا کہ قیامت تک نہ مٹے گا۔ بس میری خطا معاف فرمایئے۔

اگرچہ روایت کہن سال لوگوں سے سنی ہے مگر کئی نسخے کلیات کے نظر سے گزرے جو ہجو اس میں ہے وہ ایسی نہیں ہے۔ جس پر ایک بھانڈ اس قدر گھبرا جائے کہ آکر خطا معاف کروائے۔

لطیفہ۔ ایک دن میر انشاء اللہ خاں، جرأت کی ملاقات کو گئے۔ دیکھا تو سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ کس فکر میں بیٹھے ہو۔ جرأت نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا ہے؟ جرأت نے کہا کہ خوب مصرع ہے۔ مگر جب تک دوسرا مصرع نہ ہوگا تب تک نہ سناؤں گا۔ نہیں تو تم مصرع لگا کر اسے بھی چھین لوگے۔ سید انشاء نے بہت اصرار کیا۔ آخر جرأت نے پڑھ دیا۔

ع اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی

سید انشاء نے فوراً کہا کہ ع

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

جرأت ہنس پڑے اور اپنی لکڑی اٹھا کر مارنے کو دوڑے دیر تک سید انشاء آگے آگے بھاگتے پھرے اور یہ پیچھے پیچھے ٹٹولتے پھرے۔ اللہ اکبر! کیا شگفتہ مزاج لوگ تھے، کہ خوش دلی اور فارغ البالی کے زمانے تھے!

سید انشاء نے ان کے نام کا معمہ کہا تھا۔ سر مونڈی نگوڑی گجراتن۔ لطیفہ اس میں گجراتن ان کی ماں کا نام تھا۔

نواب محبت خاں کے مختار نے ایک دفعہ جاڑے میں معمولی پوشاک دینے میں کچھ دیر کی

جرأت نے رباعی کہہ کر کھڑے کھڑے خلعت حاصل کیا:

رباعی

مختاری پہ آپ کیجیے گا نہ گھمنڈ
کہتے ہیں جسے نوکری ہے بیخ ارنڈ
سرمائی دلائیے ہماری ورنہ
تم کھاؤ گے گالیاں جو ہم کھائیں گے ٹھنڈ

# غزل

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں — ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
کیا رک سکے وہ کہے ہے جو ٹک اس سے لگ چلوں — بس بس پرے ہو شوق پہ اپنے تئیں نہیں
پہلو میں کیا کہیں جگر و دل کا کیا ہے رنگ — کس روز اشک خونی سے تر آستیں نہیں
فرصت جو پا کے کہیے کبھو درد دل سو ہائے — وہ بدگماں کہے ہے کہ ہم کو یقیں نہیں
آتش سی پھک رہی ہے مرے تن بدن میں آہ — جب سے کہ روبرو وہ رخِ آتشیں نہیں
اس بن جہاں کچھ نظر آتا ہے اور ہی — گویا وہ آسماں نہیں وہ زمیں نہیں
کیا جانے کیا وہ اس میں ہے ٹوٹے ہے جس پہ دل — یوں اور کیا جہاں میں کوئی حسیں نہیں
سنتا ہے کون کس سے کہوں دردِ بے کسی — ہمدم نہیں ہے کوئی مرا ہمنشیں نہیں
ہر چند ہے یہ لطف شب ماہ سیر باغ — اندھیر پر یہی ہے کہ وہ مہ جبیں نہیں
آنکھوں کی راہ نکلے ہے کیا حسرتوں سے جی — وہ روبرو جو اپنے دم واپسیں نہیں
طوفانِ گریہ کیا کہیں کس وقت ہم نشیں — موج سرشک تا فلکِ ہفتمیں نہیں

حیرت ہے مجھ کو کیوں کہ وہ جرأت ہے چین سے
جس بن قرار جی کو ہمارے کہیں نہیں

امشب کسی کاکل کی حکایات ہے واللہ — کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ
دل چھین لیا اس نے دکھا دستِ حنائی — کیا ہات ہے کیا ہات ہے کیا ہات ہے واللہ
عالم ہے جوانی کا ابھرا ہوا سینہ — کیا گات ہے کیا گات ہے کیا گات ہے واللہ
دشنام کا پایا جو مزہ اس کے لبوں سے — صلوات ہے صلوات ہے صلوات ہے واللہ

جرأت کی غزل جس نے سنی اس نے کہا واہ
کیا بات ہے کیا بات ہے، کیا بات ہے واللہ

طرحِ مشاعرہ کا مستزاد ہے، مصحفی اور سید انشاء نے طبع آزمائی کی ہے ہر ایک کے حال میں دیکھ کر مقابلہ کرو۔ انھوں نے سراپا باندھا ہے۔

جادو ہے نگہ چھب ہے غضب قہر ہے مکھڑا  اور قد ہے قیامت
غارت گر دیں وہ بت کافر ہے سراپا  اللہ کی قدرت

ٹھکیلی ہے رفتار میں گفتار کی کیا بات  ہر بات جگت ہے
اور رنگ رخ یار ہے گویا کہ بھبھوکا  پھر تس پہ ملاحت

ہیں بال یہ بکھرے ہوئے مکھڑے پہ دھواں دھار  جوں دود بہ شعلہ
حسنِ بت کافر ہے خدائی کا جھمکڑا  ٹک دیکھو صورت

ابرو فنِ خونریزی میں اس کے ہیں غضب طاق  شمشیر برہنہ
آنکھوں کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں سے نہ دیکھا  افسوں ہے اثناالت

کان ایسے کہ کانوں سے سنے ویسے نہ اب تک  نے آنکھوں سے دیکھے
بالے کے تصور میں مجھے گھیرے ہے گویا  اک حلقۂ حیرت

بینی یہ خوش اسلوب کہ نتھنوں کی پھڑک دیکھ  تڑپے ہے دو عالم
ہے اس کو لب یار کے بوسے کی تمنا  ارمان ہے حسرت

دانتوں کی صفا کیا کہوں موتی کی لڑی ہے  لب لال کے ٹکڑے
مستی ہے بلا تس پہ رکھے پان کا بیڑا  سو شوخی کی رنگت

دل خوں کرے وہ دست حنا بستہ پھر اس میں  سمرن کی پھین ہلائے
ہے وضع تو سادی سی پہ کیا کیا نہیں پیدا  شوخی و شرارت

اس ابھرے ہوئے گات کی کیا بات جسے دیکھ  سب ہاتھ ملے ہیں
اور ہائے رے ہر بات میں گردن کا وہ ڈورا  بے دام محبت

گلشن میں پھرے ٹک تو ہیں آتش گل کی  گرمی سے عرق آے
ہر گام پہ چلنے میں کمر کھائے ہے لچکا  اللہ رے نزاکت

ہیں قہر سرین گول وہ اور ہائے کہوں کیا  رانوں کی گدازی
فرق اس میں نہیں فرق سے لے تا بہ کف پا  ہے طرفہ لطافت

ہے عشوہ و انداز و ادا ناز و کرشمہ  اور گرمی و شوخی
ہر عضو پہ آنکھ اگے وہ کافر ہے سراپا  اک موہنی مورت

لے ہے جو ہم نام لیں تو رک کے کہے یوں  اس نام کو کم لو

پھر اس میں جو رک جایئے تو جھٹ سے یہ کہنا
بس دیکھ لی چاہت

جرأت یہ غزل گرچہ کہی ایسی ہے تو نے
ہے خوب سراپا
پر کہہ کے وہ اشعار کر اب اس کو دوغزلا
ہو جس سے کہ وحشت

جز بیکسی و یاس نہیں ہے کوئی جس جا
ہے اپنی وہ تربت
افسوس کرے کون بجز دست تمنّا
ہوں کشتہ حیرت

جو میں کہا اس سے دکھا مجھ کو رخ اپنا
بس دے نہ اذیت
تو کیا کہوں کس شکل سے جھنجھلا کے وہ بولا
تو دیکھے گا صورت

یہ راہ تکی اس کی بس چھا گئی اک بار
آنکھوں میں سپیدی
پیماں گسل آیا نہ وہ دے وعدہ فردا
تا صبح قیامت

سودائے محبت جو نہیں ہے تجھے اے دل
تو پھر مجھے بتلا
کیوں چاک کیے اپنے گریباں کو ہے پھرتا
آنکھوں پہ ہے وحشت

سو بار زباں گرچہ مری کٹ گئی جوں شمع
اور پھر ہوئی پیدا
پھر محفل قاتل میں مرے منہ سے نہ نکلا
یک حرف شکایت

اب گھر میں بلانے سے اگر آتی ہیں سو سوچ
بدنام سمجھ کر
آواز ہی تو در پہ مجھے آ کے سنا جا
از راہ مروت

آلودہ ہوا ہوں سے دلا دامن قاتل
بسمل ہو جو تڑپا
افسوس صد افسوس کہ یہ تو نے کیا کیا؟
اے ننگ محبت

جو ولولۂ شوق سے ہو مضطر و بے تاب
نکلا ہی پڑے دل
کیا قہر ہے کیا ظلم ہے محبوب گر اس کا
ہو صاحب عصمت

کیا خاک رہیں چین سے بے چلنی کے مارے
بس ہے یہ پرکھا
ہم ہو گئے جس کے وہ ہوا ہائے نہ اپنا
کیا کہیے قسمت

جب ان دنوں رہتا ہے جو وہ صورت تصویر
کچھ اور ہے خفقان
لگ جائے پھر اس سے مرے کیوں دل کو دھڑکا
ہے موجب حیرت

دل دے کے عجب ہم تو مصیبت میں پھنسے ہیں
اک پردہ نشیں کو
نے جانے کا گھر اس کے ہے مقدور ہمارا
نے رہنے کی طاقت

یا مجھ کو بلاتا تھا وہ یا آئے تھا مجھ پاس
صحبت کی تھی گرمی
اب اس کو خدا جانے دیا کس نے یہ بھڑکا
جو ایسی ہے نفرت

لے نام مرا کوئی تو دے سیکڑوں دشنام — گن گن کے وہ قاتل
بیرحمی و بے دردی سے پروا ہو نہ اصلا — سن مرگ کی حالت
آنا میرا اس در پہ کہیں گھر سے چلا جائے — دیکھوں تو نہ دیکھے
اور کوئی سفارش جو کرے میری تو کیا کیا — کھینچے وہ ندامت
گر خواب میں دیکھے مجھے تو چونک اٹھے اور — پھر موندے نہ آنکھیں
آواز جو میری سی سنے تو وہیں گھبرا — کھانے لگے دہشت
افسوس کہ گردوں نے عجب رنگ دکھایا — نقشہ ہی وہ بدلا
اے جان مری! خانۂ تن سے تو نکل جا — ہو جائے فراغت
کس منہ سے کروں عشوہ گری اسکی بیاں میں — اللہ رے ادائیں
مل بیٹھے ہیں ہم اور وہ جو قسمت سے جو یک جا — طرفہ ہوئی صحبت
تیاب ہو نگ چلنے کا جو میں نے کیا عزم — دے بیٹھے وہ گالی
کچھ اور کیا قصد تو کس ناز سے بولا — بل بے تری جرأت

اجل گر اپنی خیالِ جمالِ یار میں آئے — تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے
بھلا پھر اس کے اٹھانے میں کیوں نہ دیر لگے — کسی کی موت کسی کے جو انتظار میں آئے
پلک کرشمہ جو بے اختیار کر ڈالے — وہ عشوہ ساز کسی کے کب اختیار میں آئے
پس از فنا جو ترے دل جلے کی خاک اٹھے — تو مضطرب سا دھواں اک نظر غبار میں آئے
خراب کیونکہ نہ ہو شہر دل کی آبادی — ہمیشہ لوٹنے والے ہی اس دیار میں آئے
فغاں پھر اس کی ہو لبریز یاس کیونکہ نہ آہ — بزیر دام جو مرغ چمن بہار میں آئے
بلائیں لے لے جو ہونے لگوں نثار تو بس — کہے ہے ہنس کے وہ ایسے جی اب پیار میں آئے
نہ پوچھ مجھ سے وہ عالم کہ صبح نیند سے اٹھ — جب انکھڑیوں کو وہ ملتے ہوئے خمار میں آئے
نہ کیونکہ حد سے فزوں تر ہو رتبۂ گریہ — کہ اب تو حضرتِ دل چشمِ اشکبار میں آئے
ٹلیں نہ واں سے اگر ہم کو گالیاں لاکھوں — وہ دینے غیرتِ گل ایک کیا ہزار میں آئے
مگر نہ کہیے کہ مظفر ہو تو نہ کیوں کہ بھلا — وہ دوڑ دوڑ تمہارے نہ رہگزار میں آئے
اٹھے جہاں سے نہ جرأت اٹھا کے دردِ فراق
الٰہی موت بھی آئے تو وصلِ یار میں آئے

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا — چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا
بات ہی اول تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی — اور جو بولے بھی ہے کچھ منہ سے تو شرمایا ہوا

جا کے پھر آؤں نہ جاؤں اس گلی میں دوڑ دوڑ
پر کروں کیا میں نہیں پھرتا ہے دل آیا ہوا

بے سبب جو مجھ سے ہے تو وہ شعلہ خو سرگرم جنگ
میں تو ہوں حیراں کہ یہ کس کا ہے بھڑکایا ہوا

وہ کرے عزم سفر تو کیجیے دنیا سے کوچ
ہے ارادہ دل میں مدت سے یہ ٹھیرایا ہوا

نوک مژگاں پر دل پژمردہ ہے یوں سرنگوں
شاخ پر جھک آئے ہے جوں پھول مرجھایا ہوا

جاؤں جاؤں کیا لگایا ہے اجی بیٹھے رہو
ہوں میں اپنی زیست سے آگے ہی اکتایا ہوا

تیری دوری ہے یہ حالت ہو گئی اپنی کہ آہ
عنقریب مرگ ہر ایک اپنا ہمسایا ہوا

کیا کہیں اب عشق کیا کیا ہم سے کرتا ہے سلوک
دل پہ بے تابی کا اک پتلا ہے بٹھلایا ہوا

ہے قلق سے دل کی یہ حالت مری اب لوگ میں
چار سو پھرتا ہوں اپنے گھر میں گھبرایا ہوا

حکم بار مجلس اب جرأت کو بھی ہو جائے جی
یہ بچارا کب سے دروازے پہ ہے آیا ہوا

نہ جواب دے کے قاصد جو پھر اشتاب اٹھا
میں زمیں پہ ہاتھ مارا بصد اضطراب اٹھا

دم وصل اس نے رخ سے جو نہ ٹک نقاب اٹھا
ہمیں لگ گیا دم اس دم بصد اضطراب اٹھا

ترے دور میں ہو میکش کوئی کیا فلک کہ تیری
وہ ہے شکل جوں دھرا ہو قدح شراب اٹھا

یہ ادائیں ہیں نے تسپر مجھے کہتے بے وفا ہو
مری بندگی ہے صاحب یہ ملا خطاب اٹھا

مرے بخت ہیں وہ رو کش کہ وہ دے جو وعدۂ شب
تو پہنچ کے تا بمغرب پھرے آفتاب اٹھا

کسی نسخے میں پڑھے تھا وہ مقام دلنوازی
مجھے آتے جوں ہی دیکھا ورق کتاب اٹھا

وہ بہا کے کاسۂ سر مرے خوں میں شکل کشتی
کہے ہے کہ دیکھو نکلا یہ موا حباب اٹھا

مرے دل نے داغ کھایا جو یہ لوٹے سوختہ سے
یہ جلا بس ایک پہلو نہ گیا کباب اٹھا

غزل اور پڑھ تو جرأت کہ گیا جو یاں سے گھر کو
تو کلام سننے تیرا میں پھر اشتاب اٹھا

میں تڑپ کے سنگ تربت بصد اضطراب اٹھا
مری قبر پر وہ آ کر جو پھر اشتاب اٹھا

مرے سو سوال سن کر وہ رہا خاموش بیٹھا
نہیں یہ بھی کہنے کی جا کہ ملا جواب اٹھا

جو رکھے ہے بخت واژوں تو غنی سے مل ہو مفلس
کہ رہے یہ آب دریا قدح حباب اٹھا

شب وصل یہ قلق تھا پہ وہ سو گیا تو منہ سے
نہ ذرا بھی میں ڈوپٹہ ز رہ حجاب اٹھا

ہمیں ہے خیال اس کا کہ جو آیا خواب میں وہ
تو زباں پہ اس کے ڈر سے نہ وہ ہم نے خواب اٹھا

اسی حد تک آ گیا میں کہ نہیں ہے دل بجا میں
مجھے پھیرتے عبث ہو ز رہ عتاب اٹھا

طلب اس سے کل جو مے کی تو بھرا ہوا زمیں پر
مجھے شوخ نے دکھا کر قدح شراب اٹھا

جو کنارِ مقصد اپنی لگے بہ کے ناؤ گا ہے
تو ہوا تھپیڑ مارے لگے بہنے اب اُٹھا

کسی تذکرے میں پڑھنے مرے شعر جو لگا وہ
تو ہوا نے دوں ہی جرأت ورق کتاب اُٹھا

اس ڈھب سے کیا کیجیے ملاقات کہیں اور
دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور

کیا بات کوئی اس بت عیار کی سمجھے
بولے ہے جو ہم سے تو اشارات کہیں اور

اس ابر میں پاؤں میں کہاں دخترِ رز کو
رہتی ہے مدام اب تو وہ بدذات کہیں اور

جس رنگ مری چشم سے برسے ہے پڑا خوں
اس رنگ کی دیکھی نہیں برسات کہیں اور

گھر اس کو بلا نذر کیا دل تو وہ جرأت
بولا کہ یہ بس کیجیے مدارات کہیں اور

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسایے ہیں آپ آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

آپ سے میں تو نہ جاؤں پہ کروں کیا کہ وہیں
دل بیتاب لیے جائے ہے ڈرائے ہوئے

گھر میں بے یار ہے مشکل اپنی یہ دل کے ہمراہ
وہ گنہگار ہوں جوں قید میں بٹھلائے ہوئے

آئے ہو دست بقبضہ ہو تو پھر دیر ہے کیا
سر تسلیم کو ہم بیٹھے ہیں نہوڑائے ہوئے

آج بھی اس کے جو آنے کی نہ ٹھیری تو بس آہ
ہم وہ کر بیٹھیں گے جو دل میں ہیں ٹھیرائے ہوئے

پیرہن چاک ترے در پہ جو کل کرتا تھا
آج لوگ اس کو لیے جاتے ہیں کفنائے ہوئے

مردنی پھر گئی منہ پر مرے جن کی خاطر
رنگ رو کیا وہ پڑے پھرتے ہیں چمکائے ہوئے

ابر تصویر کی مانند ہم اس محفل میں
رو نہیں سکتے پہ آنکھوں میں ہیں اشک آئے ہوئے

لوگ گر ہم سے یہ کہتے ہیں کہ چلتے ہو جی واں
اپنے بیگانے سب اس بزم میں ہیں آئے ہوئے

دل میں تب سوچ کے اس بات کو رو دیتے ہیں
کیا کہیں ان سے کہ ہیں ہم تو نکلوائے ہوئے

کر کے موزوں انہیں جرأت غزل اک اور بھی پڑھ
دل میں جو تازہ مضامین ہوں ٹھیرائے ہوئے

خوف دکھلاتے ہی بیدار ہم اے وائے ہوئے
شب کو تم خواب میں پھر آئے تو گھبرائے ہوئے

بے خودی پر نہ ہماری متحیر ہو کوئی
آج کیا آپ میں جی ہم ہیں کہیں آئے ہوئے

رنگ اور اس میں نظر آئے ہے کچھ حضرتِ دل
اشک سرخ آنکھوں میں پھرتے ہو جو چمکائے ہوئے

رشک کی جا ہے غرض شہر خموشاں بھی کہ واں
سوتے ہیں کہ چین سے ہم پاؤں کو پھیلائے ہوئے

دیکھو شوخی کہ کوچے میں دل عاشق کر
کیسی اٹکھیلی سے جاتا ہے وہ ٹھکرائے ہوئے

جوشِ وحشت سے گریباں کو گر چاک ہم آہ
سرخ آنکھیں کیے کیا بیٹھے ہیں جھنجھلائے ہوئے

جام دیتے نہیں مجھ کو جو دم بادہ کشی — یہ تو فرماؤ کہ تم کس کے ہو بہکاتے ہوئے
حسرت نہ گئی ہمنفساں سیرِ چمن مفت گئی — نخلِ بستاں سے قفس ہیں کئی لٹکائے ہوئے
دور چھوڑا ہمیں گلشن سے یہ رونے کی ہے جا — کہ سزاوارِ اسیری بھی نہ ہم ہائے ہوئے

دم رخصت کہے جرأت کوئی اس کافر سے
اک مسلمان کو کیوں جاتے ہو تڑپائے ہوئے

# میر حسن

حسن تخلص۔ میر غلام حسن نام خاص دہلوی تھے۔ پرانی دلی میں سید واڑہ ایک محلہ تھا۔ وہاں پیدا ہوئے تھے۔ عالم شباب میں والد کے ساتھ فیض آباد گئے اور نواب سرفراز جنگ خلف نواب سالار جنگ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ کچھ مدت مقام مذکور میں رہے پھر لکھنؤ میں آ گئے۔ خندہ جبیں، شگفتہ مزاج، ظریف طبع تھے اور اس میں تہذیب و شائستگی کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ میانہ قد، خوش اندام، گورا رنگ۔ جملہ قوانین شرافت اور آئین خاندان میں اپنے والد کے پابند تھے۔ اتنا تھا کہ داڑھی منڈاتے تھے۔ اللہ اللہ عہد جوانی بھی ایک عالم رکھتا تھا ع

جوانی کجائی کہ یادت بخیر

سر پر بانکی ٹوپی، تن میں تن زیب کا انگرکھا، پھنسی ہوئی آستینیں۔ کمر سے ڈوپٹہ بندھا ہے

رہے اک بانکپن بھی بے دماغی میں تو زیبا ہے
بڑھا دو چین ابرو پر ادائے کج کلاہی کو

جب تک دلی میں رہے، پہلے اپنے والد سے پھر خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے اودھ میں جا کر میر ضیاء الدین ضیاء کے شاگرد ہوئے اور مرزا رفیع سودا کو بھی غزل دکھائی۔ لکھنؤ میں آ کر ان کے کلام نے شہرت کا رنگ اڑایا۔ ان کے اشعار غزل کے اصول میں گلاب کے پھول ہیں اور محاورات کی خوش بیانی مضامین عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ میر سوز کا انداز بہت ملتا ہے۔ اہل تذکرہ کہتے ہیں کہ قصیدہ اس رتبے پر نہ تھا اور کچھ اس کا تعجب نہیں کیونکہ دونوں کوچوں میں مسافت بعید کا فاصلہ ہے۔

حقیقت سحر البیان بے نظیر اور بدر منیر کا قصہ بے نظیر لکھا۔ اور اس مثنوی کا نام

سحر البیان" رکھا ہے۔ زمانے نے اس کی سحر البیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوا لیا۔ اس کی صفائی بیان اور لطافت محاورہ اور شوخی مضمون اور طرز ادا اور ادا کی نزاکت اور جواب سوال کی نوک جھوک حد توصیف سے باہر ہے۔ اس کی فصاحت کے کانوں میں قدرت نے کسی ستارٹ رکھی تھی کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں؟ کہ جو کچھ اس وقت کہا، صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے۔ جو آج ہم تم بول رہے ہیں۔ اس عہد کے شعرا کا کلام دیکھو! ہر صفحے میں بہت سے الفاظ اور ترکیبیں ایسی ہیں کہ آج متروک اور مکروہ سمجھی جاتی ہیں، اس کا کلام (سوا چند الفاظ کے) جیسا جب تھا، ویسا ہی آج دل پذیر و دلکش ہے۔ کیا کہتا ہوں! آج کس کا منہ ہے جو ان خوبیوں کے ساتھ پانچ شعر بھی موزون کر سکے، خصوصاً ضرب المثل و کہاوت، کو اس خوبصورتی سے شعر میں مسلسل کر جاتے ہیں کہ زبان چٹخارے بھرتی ہے اور نہیں کہہ سکتی ہے کہ یہ کیا میوہ ہے۔ عالم سخن کے جگت گرو مرزا رفیع سودا اور شاعروں کے سرتاج میر تقی میر نے بھی کئی کئی مثنویاں لکھیں فصاحت کے کتب خانے میں اس کی الماری پر جگہ نہ پائی۔ کتاب مذکور ہر گھر، ہر دکان، بلکہ اس کے اشعار ہر زبان پر جاری ہیں، اس لئے یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں۔

ہمارے ملک سخن میں سیکڑوں مثنویاں لکھی گئیں، مگر ان میں فقط دو نسخے ایسے نکلے جنھوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی ایک سحر البیان، دوسرے گلزار نسیم اور تعجب یہ کہ دونوں کے رستے بالکل الگ الگ ہیں۔ اس واسطے آزاد کو واجب ہے کہ کچھ لکھے اور اہل سخن سے اپنی رائے کی صحت و سقم کا حال پوچھے۔ مثنوی حقیقت میں ایک سرگزشت یا بیان ماجرا ہے، جسے تاریخ کا شعبہ سمجھنا چاہیئے، اس واسطے اس کے اصول میں لکھا ہے کہ چاہیئے، نہایت سلیس گفتگو میں ہو جس طرح ہم تم باتیں کرتے ہیں۔

میر حسن مرحوم نے لکھا اور ایسی صاف زبان، فصیح محاورے اور میٹھی گفتگو میں اور اس کیفیت کے ساتھ ادا کیا، جیسے آب رواں۔ اصل واقعے کا نقشہ آنکھوں میں کھچ گیا۔ اور ان ہی باتوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں، جو اس وقت وہاں ہو رہی تھیں۔ باوجود اس کے اصول فن سے بال بھر ادھر یا اُدھر نہ گرے۔ قبول عام نے اُسے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں پر رکھا اور آنکھوں نے دل و زبان کے حوالے کیا اُس نے خواص اہل سخن کی تعریف پر قناعت نہ کی۔ بلکہ عوام، جو حروف تہجی بھی نہ پہچانتے تھے، وظیفوں کی طرح حفظ کرنے لگے۔ ارباب نشاط نے محفلوں میں اس کی نغمہ سرائی کر کے لوگوں کو تڑپایا اور رلایا۔

پنڈت دیا شنکر نے گلزار نسیم لکھی اور بہت خوب لکھی۔ اس کا رستہ اس سے بالکل

الگ تھا، کیونکہ پنڈت صاحب نے ہر مضمون کو تشبیہ کے پردے اور استعارے کے پیچ میں ادا کیا اور وہ ادا معشوقانہ خوش ادائی نظر آئی۔ اس کے پیچ وہی بانکپن اور مروڑیں، جو پریزادیں بانکا ڈوپٹہ اوڑھ کر دکھاتی ہیں اور اکثر مطالب کو بھی اشاروں اور کنایوں کے رنگ میں دکھایا ہے۔ باوجود اس کے زبان فصیح اور کلام شستہ اور پاک ہے۔ اختصار بھی اس مثنوی کا ایک خاص وصف ہے، جس کا ذکر کرنا واجب ہے، کیونکہ ہر معاملے کو اس قدر مختصر کر کے ادا کیا ہے، جس سے زیادہ ہو نہیں سکتا اور ایک شعر بیچ میں سے نکال لو تو داستان برہم ہو جاتی ہے۔ ان باتوں کے لحاظ سے واجب تھا کہ کتاب خاص پسند ہوتی۔ باوجود اس کے عام و خاص سب میں شہرت پائی۔ اس کے نکتوں اور باریکیوں کو سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ مگر سب لیتے ہیں اور پڑھتے ہیں جتنی سمجھ میں آتی ہے اسی پر خوش ہوتے ہیں اور لوٹے جاتے ہیں۔ مثنوی مذکور جب پہلے انہوں نے لکھی تو بہت بڑی تھی خواجہ آتش اپنے استاد کے پاس اصلاح کو لے گئے۔ انہوں نے کہا، بھیا اتنی بڑی کتاب کو دیکھے گا کون؟ وہ اپنا دہ یک کا قانون یہاں بھی جاری کرو (اس کنایے میں یہ اشارہ تھا کہ پنڈت صاحب فوج شاہی میں منشی تھے۔ اور بموجب قانونِ حکومت کے سب کی تنخواہوں میں سے وہ یکی کاٹ لیے تھے۔ گھر گھر میں اس شکایت کا چرچا تھا۔ یہ مثنوی مذکور لے گئے اور اختصار کیا تو ایسا نچوڑا کہ عطر نکال لیا) ایک موقع پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مطابق پڑا، چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو کی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی اور چھڑیوں کے اور جانے والوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے۔ میں نے یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی، اب نہیں ملتی لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں، مگر حق یہ ہے کہ بدر منیر کو نہیں پہنچتی۔ تیسری مثنوی اور بھی تھی مگر مشہور نہ ہوئی۔

دیوان اب نہیں ملتا، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ انواع سخن سے لبریز ہے۔ صاحب گلزار ابراہیمی، ۱۱۹۲ھ میں کہتے ہیں کہ سید موصوف نے کلام مجھے بھیجا ہے اور جو خط لکھا ہے، اس کی اصل عبارت یہ ہے "از صائر اقسام اشعار ابیات مدوّنہ من ہشت ہزار بیت است، تذکرہ در ریختہ ہم نوشتہ و اصلاح سخن از میر ضیا گرفتہ ام۔ مدتیست کہ از دہلی وارد لکھنؤ گشتہ با نواب سالار جنگ و خلف الصدق ایشاں ملقب بہ نوازش علی خاں۔ سرفراز جنگ بہادر میگذرانم۔ افسوس خدا نے رشید اولاد دی، مگر کسی نے اپنے بزرگ کے نام کو روشن کرنے کا خیال نہ کیا۔ اس کے کئی سبب ہوئے۔ بیٹوں کو نہ زمانے نے

وسعت دی، نہ حصول ثواب نے فرصت دی اور اس وقت چھاپا بھی کلکتہ سے اس طرف نہ آیا تھا۔ پوتے میر انیس وغیرہ ہوئے۔ انہیں ان کے پاک اعتقاد اور حسن نیت نے مبارک زمانہ دیا اور زمانے نے ایسے بلند درجے پر بٹھایا، جہاں سے دادا کا کمال بہت چھوٹا نظر آیا۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہمارا ذاتی کمال دادا کی تعریف اور شہرت سے بے نیاز ہے۔ یہ سب درست لیکن موجودہ نسل چند روز کے بعد اور آئندہ نسلیں مدت تک افسوس کریں گی۔ زمانہ بدل گیا اور بدلتا جاتا ہے۔ وقت تو گیا، پھر یہ وقت بھی نہ پائیں گے۔ آج یہ نوبت ہے کہ پانچ غزلیں بھی پوری نہ ملیں جو اس کتاب میں درج کرتا۔ خلاصہ کمال کا یہ کہ ۱۲۰۰ھ اول محرم کو دار فانی سے رحلت کی۔ مفتی گنج میں نواب قاسم علی خاں کے باغ کے پچھواڑے دفن ہوئے عمر کا حال نہ کھلا۔ لکھتے ہیں کہ ۵۰ برس سے زیادہ عمر پائی۔ دو صاحبزادوں نے نام پایا۔ میر خلیق، میر خُلق۔ شیخ مصحفیؔ نے تاریخ کہہ کر حق آشنائی ادا کیا۔ تاریخ

چوں حسن آں بلبل خوش داستاں
رو ازیں گلزار رنگ و بو بتافت
بسکہ شیریں بو نطقش مصحفیؔ
"شاعر شیریں بیاں" تاریخ یافت

## غزل

جو چاہے آپ کو تو اسے کیا نہ چاہیئے
انصاف کر تو چاہیئے پھر یا نہ چاہیئے
مجھ ایسا تجھ کو چاہے نہ چاہے عجب نہیں
تجھ سا جو چاہے مجھ کو تو پھر کیا نہ چاہیئے
کس کو سنا کے کہتے ہو میں چاہتا نہیں
اب کیوں جی، برے ہوئے اچھا نہ چاہیئے
گر پاس تیرے بیٹھوں تو معذور رکھ مجھے
جس جا پہ شمع ہوئے تو پروانہ چاہیئے
عیش و وصال و صحبت یاراں، فراغ دل
اس ایک جان کے لیے کیا کیا نہ چاہیئے
دیتے ہو تم دکھائی جو ہمراہ غیر کے
اس طرح سے غرض تمہیں دیکھا نہ چاہیئے
اب جیسے اگلے حسنؔ سے ہنستے تھے تو ہنس لیے
پر اس طرح ہر ایک سے ٹھٹھا نہ چاہیئے

یہ طرفہ تر کہ تیری سنبھلتی نہیں زباں
اور تیرے سامنے مری چلتی نہیں زباں
میرا تو دل جلا تری باتوں سے شمع رو
تو بھی دیکھ کیا تری جلتی نہیں زباں
کل عہد کچھ کیا تھا، دیا قول آج کچھ!
پھر کہو تو کہ میری بدلتی نہیں زباں
سرگرم سوز عشق ہے یہ مثل شمع
تن گھل گیا ہے اور پگھلتی نہیں زباں
سو سو طرح سے کرتا ہوں تقریر میں حسنؔ
عہدے سے حال دل کے نکلتی نہیں زباں

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا ... کھڑا اس پہ میں جان وارا کیا
ابھی دل کو ٹکڑے کر گیا میرے آہ ... وہ چلتا رہا میں پکارا کیا
قمار محبت میں بازی سدا ... وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا
کیا قتل اور جاں بخشی بھی کی
حسن اس نے احساں دوبارا کیا

# سیّد انشاء اللہ خاں

انشا تخلص سید انشاءاللہ خاں نام، بیٹے حکیم میر پاشا اللہ خاں کے تھے۔ اگرچہ خاندان کے اعتبار سے بھی نامی گرامی شخص تھے۔ مگر ان کی اپنی ناموری نے باپ کے نام کو بلکہ تمام خاندان کو نئی شہرت سے جلوہ دیا۔ بزرگ ان کے ہندوستان میں نجف اشرف سے آئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ خطہ کشمیر کے سادات صحیح النسب سے ہیں۔ وہ کسی زمانے میں سمرقند سے آئے تھے۔ پھر دلّی میں آ کر سکونت اختیار کی۔ رفتہ رفتہ امرائے شاہی میں داخل ہوئے اور بعض ان میں طبل و نقارہ سے بلند آواز ہوئے۔ بموجب پیشہ خاندانی کے میر پاشا اللہ خاں دربار شاہی میں طبیب تھے اور زمرہ امرا میں داخل تھے۔ ان کے خاندان کی خوبیوں اور گھر کے چال چلن کو دلی اور لکھنو کے شرفا سب مانتے تھے۔ ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ ان کے ہاں عورتوں کی پوشاک گھر میں دھوتے تھے یا جلا دیتے تھے، دھوبی کو نہ دیتے تھے کہ نامحرم کے ہاتھ میں عورتوں کا لباس نہ جائے۔

غرض سلطنت چغتائیہ کے ضعف میں میر پاشا اللہ خاں کو مرشد آباد جانا پڑا۔ وہاں بھی اعزاز و اکرام سے رہے اور جس طرح اگلے وقتوں میں خاندانی امیرزادے تعلیم پاتے تھے اسی طرح سید انشاء کو سب ضروری علوم و فنون سے ماہر کیا۔ باپ کے لئے مثال دے سکتے ہیں کہ عزیز بیٹے کو اس خوبصورتی سے تعلیم کیا۔ مگر بیٹا جو جوہر دار طبیعت اپنے ساتھ لایا تھا اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ جب یہ ہونہار نونہال تعلیم کے چمن سے نکلا تو ہر لہ لیتے ہیں کونپل اپنے پھول، پھل کے قرائن مختلفہ موجود تھیں۔ اس طرح کہ جس سرزمین پر لگے وہیں کی آب و ہوا کے بموجب بہار دکھلانے لگے۔ ایسا طباع اور عالی دماغ آدمی ہندوستان میں کم پیدا ہوا ہوگا۔ وہ اگر علوم میں سے کسی ایک فن کی طرف متوجہ ہوتے تو صدہا سال تک وحید عصر گنے جاتے۔ طبیعت ایک ہیولیٰ تھی کہ ہر قسم کی صورت پکڑ سکتی تھی۔ باوجود اس کے شوخی اس

قدر کہ سیماب کی طرح ایک جا قرار نہ تھا۔ چنانچہ کلیات ان سب مراتب کے لئے محض شہادت ہے۔ ان کی طبیعت جو شیر کی طرح کسی کا جھوٹا شکار نہ کھاتی تھی۔ پیشۂ آبائی پر مائل نہ ہوتی، لیکن چونکہ ایسے رنگارنگ خیالات کا سوائے شاعری کے اور فن میں گزارا نہیں، اس لئے شاعری کی طرف جھکے، جس سے انہیں ربط خداداد تھا۔ اس کوچے میں بھی اپنا رستہ سب سے جدا نکال کر داخل ہوئے۔

انہوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ والد کو ابتدا میں کلام دکھایا۔ حق یہ ہے کہ شاعری کا کوچہ جہان سے نرالا ہے۔ جو لوگ ذہن کے بھدّے ہیں ان کے لئے تو استاد کی محنت ہی برباد ہے، مگر یاد رہے کہ جس قدر مبتدی زیادہ تیز و طباع ہو، اتنا ہی زیادہ استاد کا محتاج ہے۔ جیسے ہونہار بچھڑا کہ اچھے چابک سوار کے گھوڑے تلے نکلتا ہے۔ جب ہی جوہر نکالتا ہے۔ نہیں تو بے ڈھنگ ہاتھ پاؤں مارتا ہے، بلکہ بد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تیز اور نوجوان طبیعت زبردست استاد کے قلم کے نیچے نہ نکلے تو گمراہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پرکھنے والوں نے عُرفی کے کلام میں یہی کھوٹ نکالی ہے۔ الغرض جب ہندوستان میں تباہی عام ہوئی تو سید انشاء مرشد آباد سے دِلّی میں آئے۔ اس وقت دِلّی کا دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ اور سجادہ نشین اس کے شاہ عالم بادشاہ تھے۔ شاہ موصوف نے کہ خود بھی شاعر تھے، خواہ قدردانی شاعرانہ سے، خواہ اس نظر شفقت سے، جو بادشاہوں کو اپنے خانہ زادوں سے چاہیے (اور یہ خاندان تیموریہ کا خاصا تھا) اس نوجوان پر خلعت عزّت کے ساتھ شفقت کا دامن اڑھایا۔ سید انشاء اہل دربار میں داخل ہوئے۔ چنانچہ اپنے اشعار کے ساتھ لطائف و ظرائف سے کہ ایک چمن زعفران تھا، گل افشانی کر کے محفل کو لٹا لٹا دیتے تھے اور یہ عالم ہوا کہ شاہ عالم کو ایک دم جدائی ان کی ناگوار ہو گئی۔

دِلّی میں اس وقت سودا اور میر جیسے لوگ نہ تھے مگر بڈھے بڈھے شوقین تھے۔ کہ ان ہی بزرگوں کے نام لینے والے تھے۔ مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراق شاگردِ میر درد، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم شاگردِ خواجہ میر درد، شاہ ہدایت، میاں شکیبا شاگرد میر، مرزا عظیم بیگ شاگرد سودا، میر قمر الدین منت والد میر ممنون ساکن سونی پت، شیخ ولی اللہ محب وغیرہ حضرات تھے کہ دربار شاہی سے خاندانی اعزاز رکھتے تھے اور خاص و عام انہیں چشم ادب سے دیکھتے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ نوشت و خواند میں پختہ اور بعض ان میں سے اپنے اپنے فن میں بھی کامل ہوں، مگر وہ جامعیت کہاں۔ اور جامعیت بھی ہو تو وہ بچارے بڈھے پرانی لکیروں کے فقیر، یہ طبیعت کی شوخی، زبان کی طراری، تراشوں کی نئی پھبن،

ایجادوں کا بانکپن کہاں سے لائیں۔ غرض رشک بھی تلامیذ رحمانی کا خاصہ ہے یا غریب الوطن نوجوان کو بے رفیق و بے یار سمجھ کر کہن سال مشاقوں نے کچھ تعریفیں کیں یا یہ کہ مشاعرے میں اس بلند نظر کے حسب دل خواہ اس کے کلام کی عزت نہ ہوئی۔ بہرحال سید انشاء کو شبہ ہوا کہ میری مخالفت پر سب بڈھی داے موافق ہو گئے۔

اگرچہ یہ بزرگ بھی پرانے مشاق تھے۔ مگر وہ نوجوان شہباز جس کے سینے میں علوم وفنون کے زور بھرے تھے اور طراری اور براقی کے باز وا ڑائے لئے جاتے تھے کسی کو خاطر میں کب لاتا تھا۔ خدا جانے طرفین نے زبان سے کیا کچھ کہا ہوگا، مگر غزلوں کے مقطع میں فخریہ چشمکیں ہونے لگیں اور ساتھ ہی نکتہ چینی کی عینکیں لگ گئیں۔ ان میں مرزا عظیم بگ تھے کہ سودا کے دعوی شاگردی اور پرانی مشق کے گھمنڈ نے ان کا دماغ بہت بلند کر دیا تھا۔ وہ لفظ شد بود کا علم رکھتے تھے۔ مگر اپنے تئیں ہندوستان کا صائب کہتے تھے اور خصوصاً ان معرکوں میں سب سے بڑھ کر قدم مارتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک دن میر ماشاء اللہ خاں کے پاس آئے اور غزل سنائی کہ بحر رجز میں تھی، مگر ناواقفیت سے کچھ شعر رمل میں جا پڑے تھے۔ سید انشاء بھی موجود تھے تاڑ گئے۔ حد سے زیادہ تعریف کی اور اصرار سے کہا کہ مرزا صاحب اسے آپ مشاعرے میں ضرور پڑھیں۔ مدعی کمال کہ مغز سخن سے بے خبر تھا۔ اس نے مشاعرہ عام میں غزل پڑھ دی۔ سید انشاء نے وہیں تقطیع کی فرمائش کی۔ اس وقت اس غریب پر جو کچھ گزری سو گزری، مگر سید انشاء نے اس کے ساتھ سب کو لے ڈالا اور کوئی دم نہ مار سکا، بلکہ ایک مخمس بھی پڑھا، جس کا مطلع یہ ہے۔

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے     کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے     پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

اگرچہ مرزا عظیم بگ نے بھی گھر جا کر اسی مخمس کی طرح میں اپنی بساط بموجب دل کا بخار نکالا مگر وہ مشت بعد از جنگ تھی چند بند اس کے انتخاباً لکھتا ہوں، کیونکہ اور بند بسبب بے لطفی اور نادرستی کے قابل تحریر بھی نہیں، مرزا عظیم بگ کہتے ہیں۔

وہ فاضل زمانہ ہو تم جامع علوم     تحصیل صرف ونحو سے جنکی مچی ہے دھوم
رمل و ریاضی حکمت و ہیت جفر نجوم     منطق بیان معانی کہیں سب زمیں کو جوم
تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

اک دو غزل کے کہنے سے بن بیٹھے الیطاق     دیوانی شاعروں کی نظر سے رہے بہ طاق

ناصر جلی نظیری کی طاقت ہوئی ہے طاق | ہر چند ابھی نہ آئی ہاہے ہنید جفت و طاق
ٹنگوڑی سے عرفی و قدسی نکل چلے

تھا رو ز فکر میں کہ کہوں معنی و مثال | تجنیس و ہم رعایت لفظی و ہم خیال
فرقِ رجز رمل نہ لیا میں نے گو سنبھال | نادانی کا مرے نہ ہو دانا کو احتمال
گو تم بقدر فکر یہی کر حمل چلے

نزدیک اپنے آپ کو کتنا ہی سمجھو دور | پر خوب جانتے ہیں تجھے جو ہیں ذی شعور
وہ بحر کو لعنی ہا ہے، انہیں جس پہ یاں عبور | کب میری شاعری میں پڑے بنیہے سے قصور
بن کر قمل نکالنے کو تم خلل چلے

موزونی و معانی ہیں پایا نہ تم نے فرق | تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق | شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

کم ظرفی سے تمہیں تو یہی آئی ہے امنگ | کیجیے نمود خلق میں اب کر سخن کیا جنگ
اپنے تئیں تو بخشنے آتا ہے یار ننگ | اتنا بھی رکھیے حوصلہ نوارہ ساں نہ تنگ
چلو ہی بھر جو پانی میں گو بصد اچھل چلے

کیوں جنگ گفتگو کو تم اٹھ دوڑے اس قماش | کرتے جو ہماری پانچہ ہوتا نہ پردہ فاش
پر سمجھیں کب یہ بات جو کندے ہوں ناتراش | تیغ زباں کو میاں میں رکھتے تم اپنے کاش
ناحق جو تم ازار سے باہر نکل چلے

اب سید انشاء کے طائر فخر کی بلند پروازی اور بھی زیادہ ہوئی۔ ہر غزل میں مضامین فخریہ کا جوش ہونے لگا۔ یہاں تک کہا کہ میرا اور ان لوگوں کا کلام ایسا ہے جیسے کلام الٰہی اور مسیلمہ کذاب کا الفیل، ماالفیل۔

مشاعرے میں بادشاہ بھی اپنی غزل بھیجا کرتے تھے اور بادشاہوں کا کلام جیسا ہوتا تھا وہ ظاہر ہے۔ سید انشاء نے حضور میں عرض کی کہ فلاں فلاں اشخاص حضور کی غزل پر تمسخر اور مضحکہ کرتے ہیں۔ بادشاہ اگرچہ ان خانہ زادوان قدیم پر ہر طرح قدرت رکھتے تھے۔ مگر اتنا کیا کہ مشاعرے میں غزل بھیجنی موقوف کر دی۔ یاروں کو بھی خبر لگ گئی۔ نہایت رنج ہوا۔ چنانچہ بعد اس کے جو مشاعرہ ہوا تو اس میں کمریں باندھ باندھ کر آئے اور ولی اللہ محب نے یہ قطعہ پڑھا۔

مجلس میں چکے چاہیے جگہ اشعار کا | ویسے ہی کسی صاحب توقیر کے آگے

یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا　　اکبر تئیں یا شاہ جہانگیر کے آگے

مرزا عظیم بیگ نے کہا، بابا میں نے اپنی عرضِ حال میں اپنے استاد کے ایک شعر پر قناعت کی ہے کہ ابھی تضمین ہو گیا ہے

عظیم اب گو ہمیشہ سے ہے یہ شعر کہنا شعار اپنا　　طرف ہر اک سے ہو بحث کرنا نہیں ہے کچھ افتخار اپنا
کئی سکھن باز کھنڈ گولیوں میں ہو نہ ہو اعتبار اپنا　　جنہوں کی نظروں میں ہم سبک ہیں دیا انہی کو وقار اپنا
عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پر ڈالا جو بار اپنا

دریائے مواج کے آگے گھاس پھوس کی کیا حقیقت تھی۔ سید انشاء غزل فخریہ کہہ کر لائے تھے، وہ پڑھی، جس کا ہر شعر دلوں پر توپ کے گولے کا کام کرتا تھا۔

اک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے　　کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے
کیا مال بھلا قصرِ فریدوں مرے آگے　　کانپے ہے پڑا گنبدِ گردوں مرے آگے
مرغانِ اولی اجنحہ مانندِ کبوتر　　کرتے ہیں سدا عجز سے غوں غوں مرے آگے
منہ دیکھو تو نقارچیِ پیلِ فلک بھی　　نقارے بجا کر کہے دوں دوں مرے آگے
ہوں وہ جبروتی کہ گروہ حکما سب　　چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں مرے آگے
بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں　　بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے
مجرے کو مرے خسرو پرویز ہو حاضر　　شیریں بھی کہے آ کے بلا لوں مرے آگے
کیا آ کے ڈرا دے مجھے زلفِ شبِ یلدا　　ہے دیوِ سفید سحری جوں مرے آگے
وہ مارِ فلک کاہکشاں نام ہے جس کا　　کیا دخل جو بل کھا کے کرے فوں مرے آگے

بعد اُن کے حکیم میر قدرت اللہ خاں قاسم کے سامنے شمع آئی۔ انھوں نے اتنا کہا کہ سید صاحب ذرا الفیل مالفیل کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ میر مشاعرہ کو خیال ہوا کہ سید انشاء کی ہجو کہی ہو گی۔ مبادا اثر فا ہیں بے لطفی حد سے بڑھ جائے۔ اسی وقت اٹھے کہ دونوں میں صلح کروا دی۔ سید انشاء نے بھی شرافت خاندانی اور علو حوصلہ کا کام کیا۔ اٹھ کر حکیم صاحب کے گلے لپٹ گئے اور کہا کہ حضرت حکیم صاحب آپ میرے بنی عم، اس پر صاحب علم، صاحب فضل۔ خاک بدہنم۔ بھلا آپ پر طنز کروں گا۔ البتہ مرزا عظیم بیگ سے شکایت ہے کہ وہ خواہ مخواہ بد دماغی کرتے ہیں اور داد دینی تو در کنار، شعر پر سر تک نہیں ہلاتے آخر کس برتے پر؟ غرض کہ سب کی صلح پر خاتمہ ہو گیا۔

دلی میں اگرچہ بادشاہ اس وقت فقط بادشاہ شطرنج تھا، یہاں تک کہ مال و دولت کے ساتھ غلام قادر نقدِ بصارت تک بھی لے گیا تھا۔ مگر یہ اپنا مطلب ہزار طرح سے نکال

لیتے تھے مثلاً جمعرات کا دن ہوتا تو باتیں کرتے کرتے دفعتہً خاموش ہوتے اور کہتے کہ پیر و مرشد غلام کو اجازت ہے؟ بادشاہ کہتے خیر باشد کہاں؟ کہاں؟ یہ کہتے حضور آج جمعرات ہے، غلام، نبی کریمؐ جائے۔ شاہ دین و دنیا کا دربار ہے، کچھ عرض کرے۔ شاہ عالم بہ ادب کہتے کہ ہاں بھئی ضرور چاہیئے۔ سید انشاء اللہ خاں ہمارے لیے بھی کچھ عرض کرنا۔ یہ عرض کرتے کہ حضور! غلام کی اور آرزو کونسی ہے۔ یہی دین کی آرزو یہی دنیا کی مراد، یہ کہہ کر پھر خاموش ہوتے۔ بادشاہ کچھ اور بات کرنے لگتے۔ ایک لمحہ کے بعد پھر یہ کہتے کہ پیر و مرشد! پھر غلام کو اجازت ہو۔ بادشاہ کہتے ہیں اے بھئی میر انشاء اللہ خاں ابھی تم گئے نہیں؟ یہ کہتے، حضور! بادشاہ عالی جاہ کے دربار میں غلام خالی ہاتھ کیونکر جائے؟ کچھ نذر نیاز، کچھ چراغی کو تو مرحمت ہو! بادشاہ کہتے:

ہاں بھئی درست، درست! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ جیب میں ہاتھ ڈالتے اور کچھ روپے نکال کر دیتے۔ میر انشاء اللہ خاں لیتے اور ایک دو فقرے دعائیہ کہہ کر پھر کہتے کہ حضور دوسری جیب میں دست مبارک جائے تو فدوی کا کام چلے۔ کیونکہ وہاں سے پھر کر بھی تو آنا ہے۔ بادشاہ کہتے کہ ہیں! ہاں بھئی! سچ ہے، سچ ہے۔ بھلا وہاں سے دو دو کھجوریں تو کسی کو لا کر دو، بال بچے کیا جانیں گے کہ تم آج کہاں گئے تھے۔ اگرچہ ان فقروں سے یہ کام نکال لیتے تھے۔ لیکن پھر کب تک؟ آخر دلی سے دل اُچاٹ ہوا۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ کی سخاوتوں نے حاتم کے نام کا خاتمہ کر دیا اور لوگ بھی کمال کے ایسے جویا تھے کہ جو دلی سے گیا، پھر نہ آیا۔ اس لیے ادھر کا رخ کیا۔ جاتے ہی علم و فضل کے زور اور کمال کے شور سے توپ خانے لگا دیئے کہ تمام مشاعرے گونج اٹھے اور اسی نمک خواری قدیم کے سلسلے سے مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں پہنچے۔ وہ شاہ عالم کے بیٹے تھے۔ باپ دادا کے خانہ زادوں پر شفقت واجب تھی۔ اس کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ چنانچہ عام اہل دلی کے علاوہ شعرا کا مجمع دونوں وقت ان کے ہاں رہتا تھا۔ سودا، میر ضاحک، میر سوز وغیرہ کا ورق الٹ چکا تھا۔ مصحفی و جرأت، مرزا قتیل وغیرہ شاعروں اور شعر فہموں کے جلسے رہتے تھے۔ جو محفل ایسے گلشن فصاحت کے گلدستوں سے سجائی جاوے، وہاں کی رنگینیاں کیا کچھ ہوں گی۔ جی چاہتا تھا کہ ان کی باتوں سے گلزار کھلا دوں، مگر اکثر پھول ایسے نقش کانٹوں میں الجھے ہوئے ہیں کہ کاغذ کے پرزے ہوئے جاتے ہیں، اس لیے صفحہ پھیلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

پہلے مرزا سلیمان شکوہ مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے، جب سید انشاء پہنچے تو مصحفی

کا مصحف طاق پر رکھا گیا۔ بزرگوں سے سنا اور طرز کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ موصوف کے سر دیوان کی غزل اور غزلیں بھی سید ممدوح کی اصلاح کی ہوئی یا کبھی ہوئی ہیں۔ چنانچہ پہلا ہی مطلع اس مطلب کو روشن کرتا ہے

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا

تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ تَعَالیٰ

کیونکہ سید انشاء ایسی تضمینوں کے بادشاہ تھے۔

سید انشاء اگرچہ شہزادہ موصوف اور تمام امراء و رؤسا کے درباروں میں معزز و مکرم تھے، مگر ہمت عالی کا عقاب ہمیشہ اپنے پروں کو دیکھتا رہتا ہے۔ وہاں تفضل حسین خاں ایک شخص تھے کہ بعد ابوالفضل اور سعد اللہ خاں شاہجہانی کے علامہ کا خطاب اگر ہوا تو ان کے لیے تسلیم ہوا ہے۔ وہ اپنے علم اور حسن تدبیر سے ادھر معتمد سرکار انگریزی کے، ادھر رکن سلطنت لکھنؤ کے اور مشیر تدبیر سعادت علی خاں کے تھے۔ ان کی صحبت، ایک مجموعۂ فضل و کمال کا تھا۔ وہاں سید انشاء بھی جایا کرتے تھے۔ وہ بھی ان کی لیاقت اور خاندان کے لحاظ سے پہلوئے عزت میں جگہ دیتے تھے اور فکر میں تھے۔ کہ کوئی مناسب حال صورت نکالیں۔ ایک دن جوش تقریر میں سید انشاء ایک لفظ بول گئے کہ اس کے دو معنی تھے مگر اردو میں جو معنی ہیں، وہ اس قابل نہیں کہ ایسے جلسوں میں ذکر آئے۔ چونکہ یہ خود بھی مزاج شناسی کے ارسطو تھے۔ اس لیے کہتے تو کہہ گئے، مگر خاں علامہ کی نظر تاڑ کر بولے کہ زبان مارواڑی میں بے وقوف کو کہتے ہیں۔ انہوں نے کچھ سوچ کر کہا کہ خیر خاں صاحب! انداز معلوم ہو گیا، جلد کوئی صورت ہو جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ دوسرے ہی دن سعادت علی خاں سے ان کی بزرگی اور ان کے ذاتی کمالات کا ذکر کر کے کہا کہ آپ کی صحبت میں ان کا ہونا شغل صغریٰ و کبریٰ سے بہتر ہوگا۔ وہ سن کر مشتاق ہوئے دوسرے دن خاں صاحب سید انشاء کو لے گئے اور ملازمت ہوتے ہی ایسے شیر و شکر ہوئے کہ پھر نواب کو ان کے سوا کسی کی بات میں مزا ہی نہیں آتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ تہذیب طبعی کی آگ اور شوق انتظام نے نواب کے دماغ کو خشک کر دیا تھا، مگر جیتی جان کے لیے شگفتگی کا بھی ایک وقت ضرور ہوتا ہے اور سید انشاء تو وہ شخص تھے کہ ہر بزم میں گلدستہ اور ہر چمن میں پھول، چنانچہ کوئی خاص خدمت نہیں حاصل، مگر دربار داری کے ساتھ ہر دم کی مصاحبت تھی۔ اس عالم میں انہوں نے عامۂ خلائق خصوصاً اہل کمال اور اہل خاندان کی کار برآری سے نیکی اور نیک نامی کی دولت کمائی کہ جس سے

زیادہ کوئی خزانہ نہیں ہو سکتا، ہزاروں کو مراتب اعلیٰ پر پہنچا دیا، مگر آپ شاعر ہی رہے چنانچہ عنقریب ان کے حال سے کچھ اشارے معلوم ہوں گے۔

زمانے کا دستور ہے کہ صحت میں سے بیماری اور زندگی میں سے موت پیدا کر دیتا ہے۔ اسی مصاحبت سے ہنسی ہنسی میں مخالفت پیدا ہو گئی جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ چہکتا ہوا بلبل اپنے گھر کے پنجرے میں بند کیا گیا اور وہاں سے اس گمنامی کے ساتھ زمین کا پیوند ہوا کہ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۳۳ھ میں فوت ہوئے۔

خبر انتقال میر انشاء

دل غم دیدہ تا نشاط شگفت

سال تاریخ او ز جان اجل

عربی وقت بود انشاء گفت

۳ ۱۲۳۰ ۱۲۳۳ھ

ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تصنیفات کا ذخیرہ بہت کچھ ہوگا مگر جو کچھ میری نظر سے گزرا ہے، ان میں سے ایک کلیات ہے۔ اس میں (۱) اردو غزلوں کا دیوان تمام و کمال (۲) دیوان ریختی اور ریختی میں پہیلیاں اور متزاد طلسمات کے نسخے قواعد پشتو (۳)، قصائد اردو۔ حمد۔ نعت۔ مدح بزرگان دین، مدح بادشاہ اور تعریف امرا میں (۴) قصائد زبان فارسی (۵) دیوان غزل ہائے فارسی تمام ہے مگر مختصر ہے (۶) مثنوی شیر برنج فارسی میں (۷) مثنوی فارسی بے نقط اس کی سرخیوں کے مصرعے بھی بے نقط ہیں (۸) شکار نامہ نواب سعادت علی خاں کا بزبان فارسی ہجویں۔ گرمی۔ بھڑوں۔ کھٹملوں، مکھیوں، پسوؤں وغیرہ کی شکایت میں اور متفرق اشخاص کی ہجویں (۱۰) مثنوی عاشقانہ (۱۱) ہاتھی اور چنچل پیاری ہتھنی کی شادی (۱۲) متفرق اشعار معمے رباعیاں، قطعے، فارسی اردو وغیرہ تاریخیں جن میں اکثر مادے قابل یاد رکھنے کے ہیں پہیلیاں۔ چیستانیں (۱۳) دیوان بے نقط (۱۴) مائتہ عامل زبان عربی کی فارسی میں (۱۵) مرغ نامہ اردو میں مرغ بازی کے قواعد مثنوی کے طور پر لکھے ہیں۔ مگر جو اپنے تمسخر کے قواعد ہیں وہ اس میں نہیں بھولے۔

(۲) دریائے لطافت: قواعد اردو۔ منطق۔ معانی۔ بیان وغیرہ میں۔

(۳) ایک داستان: نثر اردو میں ایسی لکھی ہے کہ ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہیں آنے دیا۔ باوجود اس کے اردو کے رتبے سے کلام نہیں گرا۔ وہی چوچلے وہی چہلیں اس میں بھی چلی جاتی ہیں۔ مقدار میں ۵۰ صفحے کی ہوگی۔ تھوڑی عبارت نمونے

کے طور پر لکھتا ہوں۔

اب یہاں سے کہنے والا یوں کہتا ہے، ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان چڑھی کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندی چھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے۔ باہر کی گولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو۔ تب میرا جی پھول کر کلی کے روپ میں کھلے۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پرانے ڈھرانے ٹھاگ بڑے ڈھاگ پر کھڑا لگ لائے۔ سر ہلا کر منہ تھتھا کر، ناک بھوں چڑھا کر گلا پھلا کر۔ لال لال آنکھیں پتھرا کر کہنے لگے۔ یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکھاپن بھی نہ ٹھس جائے۔ جیسے بھلے مانس اچھوں سے اچھے لوگ آپس میں بولتے چالتے ہیں۔ جوں کا توں وہی سب ڈول رہے اور چھاؤں کسی کی نہ پڑے۔ یہ نہیں ہونے کا۔ میں نے ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹہوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا۔ میں کچھ ایسا بڑا بڑبولا نہیں جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کر انگلیاں نچاؤں اور بے سری بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی تانیں لیے جاؤں۔ مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا منہ سے کیوں نکالتا۔ جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔ اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ لوگ اسے پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے۔ اپنا ہاتھ منہ پر پھیر کر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جتاتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور راؤ چاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں۔ آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچلاہٹ میں ہے دیکھتے ہی ہرن کے روپ اپنی چوکڑی بھول جائے۔ چونکا۔

گھوڑے پہ اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں
کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی
کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

غزلوں کا دیوان۔ عجب طلسمات کا عالم ہے زبان پر قدرت کامل۔ بیان کا لطف محاوروں کی نمکینی۔ ترکیبوں کی خوش نمائیاں دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ ہیں۔ ابھی کچھ ہیں۔ جو غزلیں یا غزلوں میں اشعار با اصول ہو گئے، وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی وہاں ٹھکانا نہیں۔ غزلوں میں غزلیت کے اصول کی پابندی نہیں۔ سبب یہ ہے کہ وہ سخن آفرین ایک ذخیرہ وافر مضامین و الفاظ کا اپنے پاس رکھتا تھا اس سے جس قسم کی مخلوق چاہتا تھا پیدا کر لیتا تھا۔ جس مشاعرے میں انہوں یہ غزل طرح کی پڑھی ہے ؎

لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا
جگر کی آگ بجھے جلد جس سے وہ شے لا

کل پانچ شعر کی غزل تھی۔ جرأت اور مصحفی تک سب موجود تھے، مگر سب نے غزلیں ہاتھ سے رکھ دیں کہ اب پڑھنا بے حاصل ہے۔ ایک مستزاد کی طرح میں جب انہوں نے مسلسل تین غزلیں پڑھیں تو مشاعرے میں ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔ مصحفی و جرأت جب بھی موجود تھے اور غزلیں اب بھی حاضر ہیں۔ یہ عالم ہے، جیسے مرصع زیور کے سامنے تنکوں کا کھیل جرأت ایک موقع پر کہتے ہیں ؎

اب تلک آنکھوں میں ساقی ہے نشہ چھایا ہوا
چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

اور سید انشاء کہتے ہیں

برق چشمک زن ہے ساقی ابر ہے آیا ہوا
جام مے دے تو کدھر جاتا ہے مچلایا ہوا

ریختی کا شوخ رنگ سعادت یار خاں رنگین کا ایجاد ہے۔ مگر سید انشاء کی طبع رنگین نے بھی موجد سے کم سگھڑاپا نہیں دکھایا۔ یہ ظاہر ہے کہ عیش و نشاط اور صحبت ارباب نشاط ایسی پلید باتوں کے حق میں وہ تاثیر رکھتی ہے، جو نباتات کے حق میں کھاد اثر کرتی ہے۔ چنانچہ دلّی کے فاقہ مستوں میں کم اور لکھنؤ میں قرار واقعی ترقی اس کی ہوئی۔ قطع نظر وضع اور لباس کے، جان صاحب کا دیوان اس کا نمونہ موجود ہے۔ اس صورت میں زنانہ مزاجی اور بے ہمتی اور بزدلی جو عام لوگوں میں پیدا ہوئی۔ اس کا ایک محرک اسی ایجاد کو سمجھنا چاہیئے۔ اس انداز میں جو پہیلیاں اور طلسمات کے نسخے لکھے ہیں۔ ان کا انداز بیان عجب لطف دکھاتا ہے۔

ہندوستان کی مختلف زبانیں ان کے گھر کی لونڈی ہیں۔ ابھی پنجاب میں کھڑے ہیں۔ ابھی پورب میں بیٹھے باتیں کرتے ہیں۔ ابھی برج بھاشی ہیں، ابھی مرہٹے۔ ابھی کشمیری، ابھی افغان، سب زبانوں میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ یہاں پوربی کے دو شعر ہیں، وہ لکھتا ہوں کہ قریب الفہم ہیں۔ مطلع و مقطع پوربی زبان میں:

میٹھکری میں پھکر بھئی مہنت آئے کے
بھاؤمیاں کو بھنوپہ جو چڈھس گھمائے نکے

انشاء کھاں میاں بڑے بھاجل جین ہیں
صدرہ پڑھیں ہیں جن سینتی طالبعلم آئے کے

ان کے الفاظ جو موتی کی طرح ریشم پر ڈھلکتے آتے ہیں۔ اس کا سبب یہی کہہ سکتے ہیں کہ قدرتی فصاحت اور صفائی کلام کے سبب سے ہے اور کلام کا بندوبست جو ارگن باجے کی گساوٹ رکھتا ہے، یہ بندش کی چستی اور استخواں بندیٔ الفاظ کی خوبی سے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کی زبان جو فصاحت کا سانچا ہے، اس سے اگر بے معنی الفاظ بھی ترکیب کھا کر نکلتے ہیں تو مزہ ہی دیتے ہیں۔ یہ زیادہ تر ان ہجوؤں سے ثابت ہوتا ہے، جو شیخ مصحفی کے معرکوں میں لکھیں اور یہاں شدت فحش کے سبب سے قلم انداز ہوئیں۔

قصائد بڑی دھوم دھام کے ہیں۔ الفاظ کی شکوہ، طبیعت کی بلند پروازی کی کوئی حد نہیں، مگر سیدھے چلتے چلتے ایک ایسی چال بدلتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ وہ یہی بات ہے کہ اپنی زبان دانی کے جوش اور قوت بیانی کے مزے میں اگر کبھی کوئی شوخ مضمون، کبھی کوئی خوش آئند ترکیب اور نئی تراش ایسی سوجھ جاتی ہے کہ اسے باندھے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہاں قصیدے کی متانت اور وقار کے اصول ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں۔ اس میں کبھی تو کلام میں شوخی اور ایک قسم کا بانکپن پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی متبذل ہو جاتا ہے۔ مگر پھر لطف یہ ہے کہ قدرتی لذت جو زبان میں ہے، وہ کلام کو بدمزہ نہیں ہونے دیتی اور اسی واسطے جس دربار یا جلسے میں قصیدہ پڑھتے تھے، سبحان اللہ اور واہ وا کہنے کے سوا سننے والوں کو ہوش نہ ہوتا تھا۔ اس بے اعتدالی کا یہ سبب تھا کہ طبیعت میں طاقت بہت تھی۔ مگر اس پر قابو نہ تھا۔ ان قصیدوں میں مزہ وہاں آتا ہے، جہاں ممدوح کی تعریف کرتے کرتے دفعۃً کہتے کر وا اسئے ایران تجھے ایران میں بیٹھا کہہ رہا ہے اور جھٹ چند شعر فارسی کے اس طرح کہہ جاتے ہیں، گویا ایک آغائے تازہ ولایت آیا اور اپنی چنیں وچناں کے ساتھ شیرہ شیراز کے دو دو گھونٹ سب کو پلا گیا۔ اس کے برابر گویا ایک عرب العربا جبہ پہنے، عبا اور عمامہ سجے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ پھر شاہ بخارا ترکستان سے ترکی میں آواز دیتا ہے اور ساتھ ہی عالی جاہ کابل اپنی افغانی میں کہتا ہے اور برج کی گوپیاں یوں یوں کہتی ہیں اور پنجاب میں جھنگ سیالے کی جٹیاں یوں کہتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس بیان کی کیفیت ان کے دیوان کے دیکھنے سے معلوم ہوتی ہے۔ فارسی میں انتہائی درجے کی قدرت رکھتے تھے اس میں جب نظم یا نثر کہتے تو یہی معلوم ہوتا تھا گویا بلبل شیراز سامنے بول رہا ہے۔ اگر قباحت مذکور کا پردہ یہاں زیادہ تر کھلتا ہے، کیونکہ لفاظی کا لشکر ان کے آگے مسلح حاضر ہے۔ مضمون چاہیں تو آسمان سے تارے اتار لائیں۔ مگر فارسی قصائد میں بھی طبیعت کو روک سکتے نہیں قصیدے کے اصول کو کھو کر، محاورے کی نمکینی اور بول چال کی شوخی سے کلام میں مزہ پیدا

کرتے ہیں اور بے شک اس مطلب میں کامیاب ہوتے ہیں، کیونکہ ادائے مطلب اور فصاحت کلام کے لحاظ سے اس زبان پر بھی قدرت کامل رکھتے تھے۔ ایک قصیدہ بے نقط کو بہت سی صنعتوں سے مرصع کرکے زور طبع دکھایا ہے۔ بلکہ بڑے فخر کے ساتھ اس کا نام طور الکلام رکھا ہے اور اس پر انہیں خود بھی بڑا ناز ہے۔

دیوان فارسی کا یہی حال ہے۔ باتوں ہی باتوں کا مزہ ہے جس غزل کو دیکھو، گویا دو ایرانی ہیں کہ کھڑے باتیں کر رہے ہیں اور فقط مسخرہ پن، مضمون کو دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر لطفِ زبان اور خوبی بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اگر چند ساعت کے لئے اپنے رفیق طبعی یعنی تمسخر سے جدا ہوتے اور ذرا زبان کو قابو میں رکھتے تو خدا جانے اپنے زمانے کے خاقانی و انوری ہوتے یا سعدی و خسرو۔ چنانچہ ایک ایرانی تازہ وارد کو کسی موقع پر نظم ہی میں رقعہ لکھ کر بھیجا ہے۔ اس سے قدرت زبان اور لطف بیان کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت گھر سے نکلنا بند تھا۔

رقعۂ منظوم:

تو اے نسیم سحر گر زجانب انشاء
برو بخدمت حاجب علی شیرازی

سلام شوق دهان و بگو بعجز و نیاز
کہ مے سزد بہ کمالِ تو ہر قدر نازی

بلے ز نفخۂ روح القدس مدد داری
ازاں مسیح زمان و سراسر اعجازی

ہمائے عالم قدسی سہیم تو عنقا ست
چو طائرانِ بہشت بریں خوش آوازی

قصیدہ و غزل فی البدیہہ ات دیدم
علو مرتبہ داری بلند پروازی

کسے بہ پیش تو دیگر چہ لاف شعر زند
بفکر سعدی شیراز را تو انبازی

بسان رستم دستانی اے نکو کردار
بہر طرف کہ کنی قصد رخش فے تازی

ہنوز قید نہ داری چو سرو آزادی
بہر کجا کہ دلت مے کشد سرافرازی

تو سر بمہر بہ ہم چو نامۂ شاہان
اگرچہ فقرۂ مخصوص مطلب رازی

بایں بہ جوید کہ حاضر بخدمتت نشدم
توقع اینکہ ز چشم خودم نیندازی

بدون حکم وزیر الممالک اے آغا
چساں کنم حرکت نوکری ست یا بازی

نماز و روزہ معاف است عذر اگر باشد
بگو برائے چہ دیگر بشکوہ پردازی

بعید نیست بے سیر اگر بخانہ من
قدم گزاری و گاہے ز لطف بنوازی

عربی میں بھی وہ خاموش نہ تھے، چنانچہ یہ قطعے نمونہ دکھاتے ہیں۔ قطعہ

سکت الحبیبُ مَتانةً بقیِ اللّذُ ذسادِ یا

جُلسائہ یستحسنون ویرعمون محاکمیا

رَبِّ علیٰ رحمتِکَ الوافیہ اَسئلکَ الصحۃَ والعافیہ

اَنتَ مُغیثُ الفقراھب لَنا عافیۃً کافیۃً شافیہ

عربی فقرے اِس خوبی سے تضمین کرتے ہیں، جیسے انگوٹھی پر نگینہ۔ چنانچہ سرِ دیوان غزل کا مطلع ہے:

صنما بربّ کریم یاں وہ ہر ایک تیرا ہے مبتلا — کہ اگر اَلستُ بِربّکُم تو کہے تو کردیں ابھی بلیٰ

اے عشق مجھے شاہد اصلی کو دکھلا — قم خذی بیدی وفقلُ اللہ نعم

مجھے کیا ملائک عرش سے مجھے عشق تیرا ہے اے خدا — بہت اُنکو لکھوں تو والسّلام علیٰ من اتّبع الھدیٰ

بھاتا ہے یہ بھوک پیاس سب کچھ سہنا — اور روزوں میں انتظارِ مغرب رہنا

آپس میں سحرگہی کی چھیلیں اور پھر — بالصوم غدٍ نویتُ ۂ اُن کا کہنا

آرام و نشاط وعیش کردند ہجوم — ایجاب و قبول جلگی شد معلوم

با دخترِ رز پیرِ مغاں عقد م بست — قد قلتُ بلتُ بالصداق المعلوم

میں کوچۂ عشق کی جو کرتا ہوں سیر — آرام میں اور اس میں تو ذاتی ہے بیر

ہر گام مری زبان پہ جاری انشاء — رَبِّ یَسِّرلِی اور تمّم بالخیر

مثنوئ شیر برنج فارسی زبان میں مولانا روم کی طرز میں لکھی ہے، مگر نہیں معلوم ہوتا کہ تمسخر کرتے ہیں یا تصنّع کرتے ہیں، کیونکہ زبان کہیں فقط روزمرہ ہے، کہیں عالم جبروت و لاہوت سے پرے کے الفاظ لفاظی کرتے ہیں اور جا بجا عربی زبان کہیں شعر کہیں مصرعے ہوتے ہیں۔ مضامین فقط ظرافت کی باتیں اور حکایاتیں ہیں۔ انھیں نظم کرکے معرفت و طریقت میں لاتے ہیں۔

غرض کھیر میں لون ڈال کر تصوّف کو تمسخر کردیا ہے مگر یہ بچپن کا کلام معلوم ہوتا ہے۔

شکار نامہ سعادت علی خاں کا فارسی میں ہے۔ زبان کی شیرینی اور ترکیب کی چستی اور اس میں طبیعت کی شوخیوں نے جو لطف پیدا کیا ہے، دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مقام پر چند شعر لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

## شکار نامہ

ایں کہ کنوں مے گزرد در شمار — بست فزوں از دو صد و یک ہزار

ساختہ در خانۂ انشاء وطن — چند ہزار آہوئے مشکِ ختن

بہ کہ کنوں صیدِ مضامیں کنم / بارگیِ ناطقہ رازیں کنم

## در تمہیدِ کلام

ازمددِ شیرِ خدائے ودود / صورتِ عنقائے طرب پرکشود
ذہن وذکا رقص چو طاؤس کرد / مست شدہ آہوئے صحرانورد
طائرِ اقبال بہ نشو ونما / سایہ فگن گشت بسانِ ہما
خیز دلا صبحِ سعادت دمید / فصلِ گل و بادِ بہاری وزید

## در تعریفِ حضورِ پُرنُور

اشرفِ خیلِ وزرائے زماں / ناظمِ ملکِ ہمہ ہندوستان
صفدر و منصور و سخی و شجاع / بست کمر از پئے قتلِ سباع
تاختہ از خانہ بعزمِ شکار / کرد برو بُرجِ اسد جاں نثار

## در تعریفِ خیمہ و خرگاہ نوبت و نقارہ و ما یتعلّق بذالک

تاکہ بردخیمۂ زرّیں طناب / آمدہ در بُرجِ حمل آفتاب
گشت ز نقارہ صدائے بلند / زندہ بماں، زندہ بماں بے گزند
وز دُہلِ نقرہ برآمد بجوش / تا بتواں، تا بتواں، ہاں خروش
حلّتِ صید است درآئینِ من / دینِ من، دینِ من، دینِ من
واشدہ زیں ساں دہنِ کرّنا / باد بدہ، باد بدہ، باد دُعا
دشمنِ ایں خانہ جگرخوں بود / دوں بود و دوں بود و دوں بُود
عیش بروں از حد و اندازہ شُد / رسمِ کہن از سرِ نو تازہ شُد
غلغلۂ کوس بہ کیواں رسید / آب شدہ زہرۂ دیوِ سفید
کوہ چو غرّیدنِ پیلش شنید / صُورتِ خرطومِ دے از دُور دید
گفت بروں آمدہ از زیرِ ابر / صورِ سرافیل پئے صیدِ ببر
وقت ہمانست کہ سیمرغِ قاف / بگذرد از قلّۂ لاف و گزاف
آنچہ ندیدست فریدوں بخواب / جملہ مہیّاست و را در رکاب
چونکہ بدید ایں ہمہ عزم و شکوہ / لرزہ برافتاد براندامِ کوہ

## تاریخ

فوجِ ظفر موج باین عزّ و جاہ
گرد رسانید چو بر اوج ماہ

شوکتش انشا بخطِ زر نوشت
فقرۂ تاریخ مظفر ۱۲۲۰ھ نوشت

## تعریفِ اسپ

خود چو بر اسپِ عربی بر نشسپ
آمدہ بر فوجِ غزالاں شکست

اسپ چہ اسپ اشہبِ بادِ صبا
اسپ مگو شہ رُخ گلگوں قبا

اسپ باین شوخیِ دلچسپ کو
حور بگو، اسپ مگو، اسپ کو؟

اسپ مداں لمعۂ شرق است ایں
اسپ کجا چشمکِ برق است ایں

پیش روِ جودتِ طبعِ سلیم
گام نہد بر بر و دوشِ نسیم

زیب دہِ کوہ و بیابانِ نجد
قیس اگر بنگرد آید بہ وجد

سیرتِ لیلیٰ رسدش در خیال
باہمہ چالاکیِ و حُسن و جمال

بلندش از نادرِ کشورستاں
وصف کُند باہمہ ایرانیاں

---

آگے نادر کی زبانی جو اشعار ہیں وہ ترکی میں کہے ہیں اور پھر مطلب شروع کیا ہے۔ ہجریں اُردو میں ہیں۔ خیال کر لینا چاہیے کہ جنھیں بانکپن غزل اور قصیدے میں سیدھا سیدھا نہیں چلنے دیتا، اُنھوں نے وہاں کیسا کچھ رنگ اُڑایا ہوگا۔

مثنوی عاشقانہ مختصر ہے اور کوئی بات اِس کی قابل اظہار نہیں۔ ایک ہاتھی اور چنچل پیاری ہتھنی کی حکایت کہیں انگریزی سے اُن کے ہاتھ آگئی ہے، نظر باز کی آنکھ خود ایسے مضامین کی تاک میں رہتی تھی۔ یہ تو تیار مال تھا۔ غرض اُس کی شادی جس سامان سے کی ہے، وُہ تماشا دیکھنے کے قابل ہے۔

متفرق اشعار قطعے۔ خطوطِ منظوم اور رباعیاں اور پہیلیاں۔ چیستانیں لطائف سے دیوان مالا مال ہیں۔ مگر بنیاد سب کی تمسخر پر ہے۔ طالب علم کو سمجھ چاہیے کہ بہت کچھ اس میں قابل لینے کے ہے اور بہت کچھ مہملات۔

دیوانِ بے نقط ایک معمولی طبع آزمائی ہے، اس میں کوئی بات قابل تحریر نہیں۔

مثنوی مائۃ عامل۔ زبان عربی کی نظم فارسی میں ہے، اگرچہ وہ بڈّھے ہو کر بھی بچوں

نسے آگے دوڑتے تھے۔ مگر یہ بھی اوائل عمر کی معلوم ہوتی ہے۔

دریائے لطافت: قواعدِ اُردو میں ہے اس کتاب میں بھی اگرچہ اندازِ کلام میں وہی تمسخر اور شوخی ہے مگر یہ پہلی کتاب قواعد اردو کی ہے، جو ہمارے اہل زبان نے اُردو میں لکھی ہے۔ اس میں اول اُردو بولنے والے کے مختلف فرقوں کی زبانوں کے نمونے دکھائے ہیں۔ اُردو واُن میں حق زباندانی اور سخن فہمی کا ادا کیا ہے، پھر قواعد بیان کئے ہیں۔ اور ظرافت سے لے کر فحش تک کوئی بات باقی نہیں چھوڑی۔ لیکن طالبِ فن اس میں سے بھی اکثر نکتے ایسے حاصل کر سکتا ہے کہ چند روز کے بعد ڈھونڈھے گا۔ اور نہ پائے گا۔

بعد اس کے کئی بابوں میں عروض قافیہ منطق۔ معانی۔ بیان وغیرہ فروع بلاغت کو زبان اُردو میں لائے ہیں۔ یہ مرزا قتیل کی تصنیف ہے مگر اِس حمام میں سب ننگے تھے۔ اِن کے ہاں بھی سوا شہدپن کے دُوسری بات نہیں۔ پھر بھی حق یہی ہے کہ جو کچھ ہے لطف سے خالی نہیں ہے۔ عروض میں اُن کے اصُول اور قواعد لکھے ہیں۔ مگر تقطیع میں مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن کی جگہ کہتے ہیں۔ پری خانم۔ پری خانم۔ پری خانم اور فاعلن۔ فاعلن۔ فاعلن۔ چت لگن۔ چت لگن۔ چت لگن چت لگن اور

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن — بی جان پری خانم بی جان پری خانم

اور فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن — چت لگن پری خانم چت لگن پری خانم

اصطلاحیں بھی نئی نئی رکھی ہیں چنانچہ نظم کی قسموں میں مثلث کا نام ٹکڑا اور مربع کا نام چوکڑا رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ منطق میں بھی اپنی اصطلاحیں الگ نکالی ہیں۔ چنانچہ

| | | | |
|---|---|---|---|
| علم | گیان | نسبتِ ثبوتیہ | مان لینا |
| علم حصولی | پردھیان | نسبتِ سلبی | پورا توڑ |
| علم حضوری | آپ گیان | بدیہی | پرگھٹ |
| تصور | دھیان | نظری | گپت |
| تصدیق | جوں کا توں | تسلسل | اُلجھا سوت |
| موضوع | بول | دَور | ہیر پھیر |
| محمول | بھرپور | مطابقت | ٹھیک ٹھیک |
| رابطہ | جوڑ | تضمنی | کہسر |

| | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|
| نسبت | : | : | : | ملاپ | التزامی | : اُوپری لگاؤ |
| قضیہ | : | : | : | بات | : | : |

اسی طرح معانی بیان وغیرہ ہیں۔

ہندی اور مُلکی خصوصیتوں کے مضامین کو سودا نے بہت اچھی طرح سے باندھا ہے۔ مگر سید انشاء نے بھی اُچھلتے کودتے خوب قدم مارے ہیں اور یہ بات لُطف سے خالی نہیں۔ کیونکہ اپنے ملک کے ہوتے، عرب سے نجد، ایران سے بے ستون اور قصرِ شیریں توران سے جیحون وسیحون کو ہندوستان میں لانا کیا ضرور ہے۔ ایسی باتوں سے فصاحت میں دشواری اور اشکال پیدا ہوتے ہیں۔ سید موصوف کہتے ہیں۔

لیا گہ عقل نے مُنہ میں دِل بیتاب کا گٹکا — تو جوگی جی دھرا رہ جائے گا سیماب کا گٹکا
صنم خانے میں جب دیکھا بُت وناقوس کا جوڑا — لگا ٹھاکر کے آگے ناچنے طاؤس کا جوڑا
ملے پارے سے جو ہڑتال کر کے راکھ کا جوڑا — تو تا نبے سُرجی اگلیں کوئی تو بے لاکھ کا جوڑا
نہیں کچھ بھید سے خالی یہ تلسی داس جی صاحب — لگا یا ہے جو اک بھونرے سے تم نے آنکھ کا جوڑا
پلٹ کر کشن جی سے رادھکا ہنسکر لگیں کہنے — بلا ہے چاند سے ایلو اندھیرے ماکھ کا جوڑا
یہ سچ سمجھو کہ انشاؔ ہے جگت سیٹھ اس زمانے کا — نہیں شعر و سخن میں کوئی اِس کے ساکھ کا جوڑا

اے عشق اجی آؤ مہاراجوں کے راجہ ڈنڈوت ہے تم کو
کر بیٹھے ہو تم لاکھوں کروڑوں ہی کے سر چپٹ اک آن میں چٹ پٹ

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کُنڈ پر — اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھُنڈ پر

ہے نُورِ بصر مردمکِ دیدہ میں پنہاں، مانندِ کنھیا
سَو اشک کے قطروں سے پڑا کھیلے ہے جھرمٹ اور آنکھیں ہیں گُھپٹ

دِل ستم زدہ بیتابیوں نے لُوٹ لیا — ہمارے قبلے کو وہابیوں نے لُوٹ لیا
سُنا یار رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا — تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لُوٹ لیا

یوں چلے مژگاں سے اشکِ خونفشاں کی میدنی — جیسے بھڑ ابیچ چلے بالے میاں کی میدنی

اور مقطع کی اکڑ تکڑ دیکھنے کے قابل ہے۔

رُستمانہ دیکھ انشاء کو قشونِ شاہ میں — سب یہ کہتے ہیں کہ آئی سیستان کی میدنی

پھبن۔ اکڑ۔ چھب۔ نگاہ۔ سج دھج۔ جمال و طرزِ خرام آٹھوں
نہ ہو دیں اس بُت کے گر پجاری تو کیوں ہو میلے کا نام آٹھوں

غرض کل تصنیفات کی ہیئتِ مجموعی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ نئے نئے تصرف اور

ایجادوں کے لحاظ سے سید انشاء فنِ انشاء کی قلمرو میں بادشاہِ علی الاطلاق تھے اور اس اعتبار سے انھیں اُردو کا امیر خسرو کہیں تو بے جا نہیں بلکہ قصیدۂ "طور الکلام" میں جہاں صنائع مختلفہ کی ذیل میں انھوں نے ایک مصرع لکھا ہے کہ تین زبانوں میں پڑھا جاتا ہے۔ وہاں فخر کی موچھوں پر خوب تاؤ دیے ہیں اور کہا ہے کہ امیر خسرو نے تین لفظ کا ایک جملہ ایسا لکھا تھا اور فخر کیا تھا، مجھے ایسا پورا مصرع ہاتھ آیا۔ یہ فقط ممدوح کی مدح کی برکت ہے اگرچہ آج یہ صنعتیں بیکار ہیں۔ مگر اس احسان کا شکر یہ کس زبان سے ہو کہ ہماری زبان میں نئی نئی تشبیہیں۔ شگفتہ استعاروں کے رستے کھولے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اُن میں فارسی اضافت کی گرہ کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھولا ہے۔ غزلوں میں اس کے اشارے معلوم ہوں گے۔

اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ جو جو تصرف یا ایجاد کیے اُن میں بعض جگہ سینہ زوری بھی ہے، مگر خوش نمائی اور خوش ادائی میں کچھ شبہہ نہیں۔ درحقیقت اِن کی تیزیِ طبع نے عالمِ وجود میں آنے کے لیے بھی تیزی دکھائی۔ اگر وہ سو برس بعد پیدا ہوتے۔ تو ہماری زبان کا فیشن نہایت خوبصورتی سے بدلتے۔ دیکھو وہ قصیدہ جو اُنھوں نے جارج سوم کی تہنیتِ جشن میں کہا ہے۔

# قصیدہ در تہنیتِ جشن

بگیاں پھولوں کی تیار کرا لے ہوتے سمن
کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن

عالمِ اطفالِ نباتات پہ ہوگا کچھ اور
گورے گالے بھی بنٹھیں گے نئے کپڑے پہن

کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر
کرسیِ ناز پہ جلوے کی دکھاوے گا پھبن

شاخِ نازک سے کوئی ہاتھ میں لے کراک گیت
ہو الگ سب سے نکالے گا نرالا جوبن

نسترن بھی نئی صورت کا دکھاوے گا رنگ
کوچ پر ناز کی جب پاؤں رکھے گا بن ٹھن

اپنے گیلاس شگوفے بھی کریں گے حاضر
آکے جب غنچۂ گل کھولیں گے بوتل کے دہن

اہلِ نظارہ کی آنکھوں میں نظر آویں گے
باغ میں نرگسِ شہلا کے ہوا سے چتون

اور ہی جلوے نگاہوں کو لگیں گے دینے
اودی بانات کی کرسی سے شکوہِ سوسن

پتّے مل مل کے بجادیں گے فرنگی طنبور — لالہ لادے گا سلامی کو بنا کر پلٹن
کھینچ کر تارِ رگ ابرِ بہاری سے کبھی — خود نسیمِ سحر آوے گی بجاتی ارگن
اپنی نگینیں چمکتی ہوئی دکھلادیں گے — آپڑے گی جو کہیں نہر پہ سورج کی کرن
نے نوازی کے لیے کھول کر اپنی منقار — آگے دکھلاویگی بلبل بھی جو ہے اس کا فن
اردلی کے جو گراں ڈیل ہیں ہونگے سب جمع — آن کر اپنا بگل پھونکیگا جب سکھدرشن
آئیگا نذر کو شیشے کی گھڑی لے کے حباب — یاسمیں پتّوں کی پینس میں چلے گی بن ٹھن
نگہت آوے گی نکل کھول کلی کا کمرا — ساتھ ہولے گی نزاکت بھی جو ہے اس کی بہن
حوضِ صندوقِ فرنگی سے مشابہ ہوں گے — اس میں ہوویں گے پریزاد بھی سب عکس فگن

ایک جگہ گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں۔

ہے اس آفت کا بک سیر کہ راکب اُس کا
حاضری کھاتے جو کلکتہ تو لنڈن میں ٹفن

ان کا پڑھنا بھی ایک اندازِ خاص رکھتا تھا۔ جس سے شعر کی شان اور لطفِ کلام دوبالا ہوجاتا تھا۔ یہاں تک کہ اکثر اشخاص مشاعرے میں اپنی غزل اُن سے پڑھوایا کرتے تھے، کیونکہ ان کی زبان آتشِ تاثیر کی چقماق تھی۔ اِس سے نکل کر گرمیِ سخن ایک سے دوچند ہوجاتی تھی۔ بیشک انھیں میر و مرزا کے صاف کیے ہوئے رستے ہاتھ آئے مگر ان رستوں میں اُچھلتے کودتے ایسے بے باک اور بے لاگ جاتے ہیں جیسے کوئی اچھا پھکیت منجھے ہوئے ہاتھ تلوار کے پھینکتا جاتا ہے۔

دیوان دیکھنے سے اِن کے حالات و عادات کی تصویر سامنے کھچ جاتی ہے۔ جب کہ وہ مشاعرے میں آتے تھے۔ یا دربار کو جاتے تھے۔ ایک طرف آداب معقولیت سے سلام کیا۔ ایک طرف مسکرادیا۔ ایک طرف مُنہ کو چڑھادیا۔ کبھی مقطع مردِ معقول کبھی دِلّی کے بانکے۔ کبھی آدھی داڑھی اُڑادی۔ کبھی چارابرو کی صفائی بتادی۔

کلیات کو دیکھو تو یہی حالت اشعار کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ تفریح و تضحیک کے اعتبار سے کسی جلسے میں اُن کا آنا بھانڈ کے آنے سے کم نہ تھا۔ پس مصحفی نے انکی ہجویات کے ضمن میں کچھ جھوٹ نہیں کہا ؏

واللہ کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے

اگرچہ جس محدود دائرے میں ہمارے فارس و ہند کے شعرا پابزنجیر پھر رہے ہیں، یہ بچارے بھی دوڑتے پھرتے ہیں۔ پھر بھی وہ شعرائے رائج الوقت کے اصُولِ مفروضہ میں

عاشقانہ مضامین کے پابند نہیں۔ اس کا سبب ایک یہ بھی تھا کہ اول تو اکثر غزلیں اور قصائد ان کے سنگلاخ زمین میں ہوتے تھے۔ پھر اس میں قافیے ایسے کڈھب لیتے تھے کہ عاشقانہ مضمون کم آ سکتے تھے۔ اسی واسطے قانون کلام یہ رکھا تھا کہ کیسا ہی قافیہ ہو اور کیسا ہی مضمون، جس پر جستہ پہلو سے بندھ جائے، چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ ساتھ اس کے یہ ہے کہ شاعر کو زیادہ تر کام عوام سے ہوتا ہے۔ جنہیں مضامین عشقیہ کے بعد کچھ لطف ہے تو ظرافت میں ہے اس لئے ان کی طبیعت جو اسی آسمان کی زہرہ ہے، ہر آن نیا جلوہ دیتی ہے۔ چنانچہ پابندانِ رسوم وقیود کے اپنے گھر بیٹھ کر جو چاہیں سو کہیں، وہ جب یاروں کے جلسے میں یا مشاعرے کے معرکے میں آ کر فانوسِ جادو روشن کرتے تھے تو تحسین اور واہ ولے دھواں دھار ہو کر محفل بیلون ہو جاتی تھی۔ حق یہ ہے کہ وہ اپنی طرز کے آپ بانی تھے اور آپ ہی اس کا خاتمہ کر گئے۔

لوگ کہتے ہیں کہ سید انشاء کا کلام ہر ایک مقام پر قابلِ سند نہیں۔ یہ بات درست ہے مگر ان کی بے اعتدالیاں کچھ جہالت کے سبب سے نہ تھیں۔ بلکہ عمداً تھیں یا بے پروائی کے سبب سے تھیں کہ اپنی طبع وقّاد اور جامعیت استعداد کے سامنے قواعد اور اہلِ قواعد کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ سچ ہے کہ ان کے جوشِ کمال نے تیزی کے تیزاب سے اصول اور قواعد کو پانی پانی کر دیا۔ الفاظ اور محاورات میں بہت سے تصرف کئے۔ یہ تصرف اگر صرف معدود مقاموں میں ہوتے تو شکایتیں نہ ہوتیں۔ کیونکہ اس زبان آور سے زیادہ قادرِ زبان اور زبان داں کون ہے۔ خصوصاً جبکہ استعدادِ علمی سے مسلح ہو۔ لیکن افراط نے ہمیں بھی خاموش کر دیا ہے اور یہ نشۂ کمال کا مست کسی کے کہنے کی پرواہ بھی نہ کرتا تھا۔ بلکہ جب کوئی شامت کا مارا گرفت کر بیٹھتا تھا تو کبھی سند سے کبھی دلائل بجا و بے جا سے اور ساتھ ہی ہجوؤں کے توپ خانوں سے چاند ماری کا نشانہ بن جاتا تھا۔ بہر حال ان کے کلام سے واقفِ حال اور طالبِ کمال بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اکثر اچھوتے ایجاد ہیں کہ گلِ نوبہار کی طرح سر پر رکھنے کے قابل ہیں۔ بہت سی تھوڑی تبدیلی یا تراش سے انوکھے ہو جاتے ہیں۔ بہت سے وہ ہیں، جن پر سوا اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ع

خطائے بزرگان گرفتن خطاست

لوگ کہتے ہیں کہ سید انشاء کا کلام رندانہ ہے اور جو اس میں ہزل ہے نہ بقدر نمک ہے بلکہ غذا کی مقدار سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے مگر اس کا سبب یہ ہے کہ وقت حاکم جابر ہے اور پسندِ عام اس کا واضع قانون ہے۔ اس وقت شاہ وامرا سے لے

کہ گداؤں اور غرباتک انہیں باتوں سے خوش ہوتے تھے اور قدر دانی یہ کہ ادنیٰ ادنیٰ نظموں پر وہ کچھ دیتے تھے، جو آج کل کے مصنفوں کو کتابوں پر نصیب نہیں ہوتا۔ سید انشاء اگر یہ نہ کرتے تو کیا کرتے؛ پیٹ کو کاٹ کر کہاں پھینک دیتے؛ ہنگامہ ہستی کے جوانمرد اسے بھی ایک قسم کا کمال سمجھتے ہیں کہ کسی رستے میں درماندہ نہ رہیں۔ جو پتھر سدِ راہ ہو اسے ٹھوکر مار کر ہٹائیں اور آگے نکل جائیں۔ انصاف کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ جو کچھ کامل ہزار فن کر گیا ہے ہر ایک کا کام نہ تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا گلشن بے خار جب دیکھتا ہوں تو خار نہیں کٹار کا زخم دل پر لگتا ہے۔ سید موصوف کے حال میں لکھتے ہیں "ہیچ صنف را بطریقۂ ناسخۂ شعرانہ گفت"۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے رستوں میں قدم کیوں رکھا، جو ایسے کیچڑ میں دامن آلودہ ہوئے۔ لیکن شہرستان تجارب کے سیر کرنے والے جانتے ہیں کہ جب رواج عام کا راجہ ہولی کھیلتا ہے تو بڑے بڑے معقول وضعدار اشخاص اس کی چھینٹیں فخر سمجھ کر سر دستار پر لیتے ہیں۔ پس وہ اور ان کے معاصر ملک چھوڑ کر کہاں نکل جاتے؛ یہیں رہنا تھا اور انہیں لوگوں سے بسر گزران کرنی تھی اور لطف یہ تھا کہ اس میں بھی آن بان اور عظمتِ خاندان قائم تھی۔ ان کے آقا بھی ان سے اپنایت کے طریقے سے پیش آتے تھے اور انہی چاہنے والوں کی فرمائشیں ہوتی تھیں، جو نہ دھری جاتی تھیں۔ نہ اٹھائی جاتی تھیں اور وہ کچھ چھوٹے لوگ نہ تھے جو سمجھانے سے سمجھ جائیں یا ٹالے سے ٹل جائیں۔ کبھی تو شاہ عالم بادشاہ دہلی تھے، کبھی مرزا سلیمان شکوہ تھے، کبھی سعادت علی خاں والیٔ اودھ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اکثر غزلیں ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عالم میں سعادت علی خاں کی زبان سے ایک مصرع نکل گیا۔ اس کی غزل کا پورا کرنا ان کا کام تھا۔ ایک دفعہ کسی شخص کی پگڑی بے ڈھنگی بندھی تھی۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ

ع پگڑی تو نہیں ہے یہ فرانسیس کی ٹوپی

تمام غزل دیکھو ان کی غزلوں میں۔

سعادت علی خاں نواڑے میں لیٹے ہوئے میر انشاء اللہ خاں کی گود میں سر دھرا ہوا سرور کے عالم میں دریا کی سیر کرنے چلے جاتے تھے۔ لبِ دریا ایک حویلی پر لکھا دیکھا حویلی علی نقی بہادر کی۔ کہا کہ انشاء دیکھو کسی نے تاریخ کہی، اگر نظم نہ کر سکا۔ بھئی تم نے دیکھا، بہت خوب مادہ ہے، اسے رباعی کر دو۔ اسی وقت عرض کی ؎

| | |
|---|---|
| نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی | نہ سم کی نہ تال کی نہ سر کی |
| یہ تاریخ کہی ہے کسی لڑکی | حویلی علی نقی خاں بہادر کی |

تائید اس کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ جب شاہ نصیر دہلوی لکھنؤ میں گئے اور زمین سنگلاخ میں گلزار لگا کر مشاعروں کو رونق دی تو سید انشاء سے بھی ملے، جو کہ دہلی والوں کے رواج کار کا بیڑا اٹھائے بیٹھے تھے اور کہا کہ بھئی میر انشاء اللہ خاں میں فقط تمہارے خیال سے یہاں آیا ہوں، ورنہ لکھنؤ میں میرا کون بیٹھا تھا۔ جس کے پاس میں آتا۔ اس وقت بہت رات گئی تھی۔ میر انشاء اللہ خاں نے کہا کہ شاہ صاحب یہاں کے دربار کا عالم کچھ اور ہے، کیا کہوں۔ لوگ جانتے ہیں کہ میں شاعری کر کے نوکری بجا لاتا ہوں، مگر میں خود نہیں جانتا کیا کر رہا ہوں؟ دیکھو صبح کا گیا گیا شام کو آیا تھا۔ کمر کھول رہا تھا، جو چوبدار آیا کہ جناب عالی پھر یاد فرماتے ہیں۔ گیا تو دیکھتا ہوں کہ کوٹھے پر فرش ہے۔ چاندنی رات ہے پہیے دار چھپر کھٹ میں آپ بیٹھے ہیں۔ پھولوں کا گہنا سامنے دھرا ہے ایک گجرا ہاتھ میں ہے۔ اسے اچھالتے ہیں اور پاؤں کے اشارے سے چھپر کھٹ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ میں نے سلام کیا۔ حکم ہوا کہ انشاء کوئی شعر تو پڑھو۔ اب فرمائیے ایسی حالت میں کہ اپنا ہی قافیہ تنگ ہو، شعر کیا خاک یاد آئے۔ خیر اس وقت یہی سمجھ میں آیا، وہیں کہہ کر پڑھ دیا؂

لگا چھپر کھٹ میں چار پہیے اُچھالا تو نے جو لے کے گجرا\
تو موج دریائے چاندنی میں وہ ایسا چلتا تھا جیسے بجرا

یہ مطلع سن کر خوش ہو گئے۔ فرمائیے اسے شاعری کہتے ہیں، اسی طرح کی اور تقریبیں اکثر پیش آتی تھیں کہ بیان آئندہ سے واضح ہوگا۔ غرض اس معاملے میں میاں بیتاب کا قول لکھ رکھنے کے قابل ہے کہ سید انشاء کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبو دیا۔

ایک دن نواب صاحب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور گرمی سے گھبرا کر دستار سر سے رکھ دی تھی۔ منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب کی طبیعت میں چہل آئی، ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری۔ آپ نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھ لی اور کہا۔ سبحان اللہ! بچپن میں بزرگ سمجھایا کرتے تھے۔ وہ بات سچ ہے کہ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں تو شیطان دھولیں مارا کرتا ہے۔

سعادت علی خاں کہ ہر امر میں سلیقے اور صفائی کا پابند تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ اہل دفتر خوشخط لکھیں اور فی غلطی ایک روپیہ جرمانہ۔ اتفاقاً اعلیٰ درجے کے اہل انشاء میں ایک مولوی صاحب بھی تھے۔ انہوں نے فرد حساب میں اجناس کو اجناس لکھ دیا۔ سعادت علی خاں

تو ہر شے پر خود نظر رکھتے تھے۔ ان کی بھی نگاہ پڑی۔ مولویوں کو جواب دینے میں کمال ہوتا ہے۔ انہوں نے کچھ قاموس، کچھ صراح سے اجنا کے معنی بتائے، کچھ قواعد نحو سے ترخیم میں لے گئے۔ نواب نے انہیں اشارہ کیا۔ انہوں نے مارے رباعیوں اور قطعوں کے اُتو کر دیا۔

## رباعی

اجناس کی فرد پیدا اجنا کیسا؟ | یاں ابر لغات کا گرجنا کیسا؟
گو ہوں اجنا کے معنی جو چیز اُگے | لیکن یہ نئی اُپج اپجنا کیسا؟

ان مولوی صاحب کا نام مولوی سجن تھا چنانچہ اس کا اشارہ کرتے ہیں۔

ترخیم کے قاعدے سے سجنا لکھیے | اور لفظ خرد جنا کو خبجنا لکھیے
گر ہم کو اجی نہ لکھیے ہوئے لکھنا | تو کر کے مرخم اس کو اجنا لکھیے
اجناس کے بدلے لکھیے اجنا کیا خوب | قاموس کی رعد کا گرجنا کیا خوب؛
از روے لغت نئی اپج کی لی ہے | اس تان کے بیچ کا اپجنا کیا خوب؛

## پوربی لہجے میں

اجناس کے موقع میں اجنا آیا | سلمائے علوم کا یہ سجنا آیا
اجنا چیز نیست بر ویذ زز میں | یہ تخم لغت کا لو اُپجنا آیا

رات بہت گئی تھی اور ان کے لطائف و ظرائف کی آتشبازی چھٹ رہی تھی۔ یہ رخصت چاہتے تھے اور موقع نہ پاتے تھے۔ نواب کے ایک مصاحب باہر کے رہنے والے اکثر اہل شہر کی باتوں پر طعن کیا کرتے تھے اور نواب صاحب سے کہا کرتے تھے کہ آپ خواہ مخواہ سید انشاء کے کمال کو بڑھاتے چڑھاتے ہیں۔ حقیقت میں وہ اتنے نہیں۔ اس وقت انہوں نے بقا کا یہ مطلع نہایت تعریف کے ساتھ پڑھا:

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں
اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

سب نے تعریف کی۔ نواب نے بھی پسند کیا۔ انہوں نے کہا کہ حضور سید انشاء سے اس مطلع کو کہوائیں۔ نواب نے ان کی طرف دیکھا۔ مطلع حقیقت میں لاجواب تھا انہوں نے بھی ذہن لڑایا۔ فکر نے کام نہ کیا۔ انہوں نے پھر تقاضا کیا۔ سید موصوف نے فوراً عرض کی کہ جناب عالی مطلع تو نہیں ہوا مگر شعر حسب حال ہو گیا ہے حکم ہو تو عرض کروں ؎

ایک ملک کھڑا دروازے پہ کہتا تھا رات
آپ تو بھیتر ہے جا پاڑہ لہے باہر ہیں

بہت سے لطائف ان کے بباعث شدت بے اعتدالی کے قلم انداز کرنے پڑے جو کچھ کہ لکھتا ہوں، یہ بھی لائق تحریر نہیں سمجھتا۔ لیکن اس نظر سے بے جا نہیں کہ جو لوگ خارِ حنظل سے گلِ عبرت چنتے ہیں۔ انہیں اس میں سے ایک مشہور مصنف کی شوخیٔ طبع کا نمونہ معلوم ہوگا۔ اور دیکھیں گے کہ اس صاحب کمال کو زمانہ شناسی اور اہل زمانہ سے مطلب برآری کا کیسا ڈھپ تھا۔ ایک دن نواب نے روزہ رکھا اور حکم دیا، کوئی آنے نہ پائے۔ سید انشاء کو ضروری کام تھا یہ پہنچے۔ پہرہ دار نے کہا کہ آج حکم نہیں۔ آگے آپ مالک ہیں۔ باوجود انتہائے مرحمت کے یہ بھی مزاج سے ہشیار رہتے تھے۔ تھوڑی دیر تامل کیا۔ آخر کمر کھول دستار سر سے بڑھا قبا اتار ڈالی اور دوپٹہ عورتوں کی طرح سے اوڑھ کر ایک ناز و انداز کے ساتھ سامنے جا کھڑے ہوئے۔ جونہی ان کی نظر پڑی، آپ انگلی ناک پر دھر کر بولے:

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

نواب بے اختیار ہنس پڑے۔ جو کچھ کہنا سننا تھا، وہ کہا اور ہنستے کھیلتے چلے آئے۔

ان کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عامہ خلائق خصوصاً اہل دہلی کی رفاقت اور رواجِ کار کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ میں میر علی صاحب ایک مرثیہ خواں تھے کہ علم موسیقی میں انہوں نے حکماء کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ مگر اپنے گھر ہی میں مجلس کرکے پڑھتے تھے کہیں جا کر نہ پڑھتے تھے۔ نواب نے ان کے شہرہ کمال سے مشتاق ہو کر طلب کیا۔ انہوں نے انکار کیا اور کئی بار پیغام سلام کے بعد یہ بھی کہا کہ اگر وہ حاکم وقت ہیں تو میں بھی سیادت کے اعتبار سے شہزادہ ہوں۔ انہیں میرے ہاں آنے سے عذر کیا ہے؟ نواب نے کہا کہ سید میرے ہاں ہزاروں سے زیادہ ہیں۔ میر صاحب نے اگر فخر پیدا کیا تو یہی کیا کہ سید تھے؛ اب ڈوم بھی ہو گئے۔ خیر انہیں اختیار ہے۔ میر علی صاحب نے یہ سن کر خیالات چند در چند سے فوراً دکن کا ارادہ کیا۔ سید انشاء جو شام کو گھر آئے تو دیکھا کہ کچھ سامان سفر ہو رہا ہے۔ سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ میر علی صاحب لکھنؤ سے جاتے ہیں چونکہ آپ کے بھتیجے بھانجے بھی ان کے شاگرد ہیں۔ وہ بھی استاد کی رفاقت کرتے ہیں۔ میر علی صاحب کے جانے کا سبب پوچھا تو یہ معلوم ہوا۔ اسی وقت کمر باندھ کر پہنچے۔

سعادت علی خاں نے متحیر ہو کر پوچھا کہ خیر باشد! پھر کیوں آئے؟ انہوں نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے:

دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا

یا رب بنا بنی ہیں ہمیشہ بنی رہے

پھر کہا حضور! غلام جو اس وقت رخصت ہو کر چلا تو دل نے کہا کہ اپنے دولہا کی دلہن (عروس سلطنت) کو ذرا دیکھوں! حضور! واقعی بارہ ابھرن سولہ سنگار سے سجی تھی۔ سر پر جھومر۔ وہ کون؟ مولوی دلدار علی صاحب۔ کانوں میں جھمکے وہ کون؟ دونوں صاحبزادے۔ گلے میں نولکھا ہار۔ وہ کون؟ خان علامہ۔ غرض اسی طرح چند زیوروں کا نام لے کر کہا کہ حضور غور جو کرتا ہوں تو ناک میں نتھ نہیں۔ دل دھک سے ہو گیا کہ اللہ سہاگ کو قائم رکھے یہ کیا! نواب نے پوچھا کہ پھر وہ کون؟ کہا حضور! نتھ میر علی صاحب! بعد اس کے کیفیت مفصل بیان کی۔ نواب نے ہنس کر کہا کہ ان کی دوراندیشیاں بے جا ہیں، میں ایسے صاحب کمال کو فخر لکھنو سمجھتا ہوں۔ غرض اس شہرت بے اصل کے لیے ترقی کا پروانہ اور ۵۰۰ روپے کا خلعت لیکر وہاں سے پھرے۔

جان بیلی صاحب کہ اس عہد میں ریذیڈنٹ اودھ تھے۔ اگرچہ سید انشاء کا نام اور شہرۂ عام سنتے تھے، مگر دیکھا نہ تھا۔ جب سید انشاء نواب سعادت علی خاں کے پاس ملازم ہوئے تو ایک دن صاحب کے آنے کی خبر ہوئی۔ نواب نے کہا انشاء آج ہم تمہیں بھی صاحب سے ملائیں گے۔ عرض کی کہ حضور کی ہر طرح پرورش ہے۔ مگر فدوی کے باب میں کچھ تقریب ملاقات کی ضرورت نہیں۔ غرض جس وقت صاحب ممدوح آئے، نواب اور وہ آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے۔ سید انشاء نواب کے پیچھے کھڑے ہو کر رومال ہلاتے تھے۔ باتیں کرتے کرتے صاحب نے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ایک چہرے کی لی۔ انہوں نے آنکھیں نیچی کر لیں، مگر دل میں حیران ہوئے کہ اس آدمی کی کیسی صورت ہے! یہ خیال کرتے ہی پھر نظر پڑی۔ اب کی دفعہ انہوں نے ایسا چہرہ بدلا کہ اس سے بھی عجیب وہ شرما کر اور طرف دیکھنے لگے۔ پھر جو دیکھا تو انہوں نے ایسا منہ بنایا کہ اس سے بھی الگ تھا۔ آخر نواب سے پوچھا کہ یہ مصاحب آپ کے پاس کب ملازمت میں آئے، میں نے آج ہی انہیں دیکھا ہے۔ نواب نے کہا کہ ہاں آپ نے نہیں دیکھا، سید انشاء اللہ خاں یہی ہیں۔ جان بیلی صاحب بہت ہنسے۔ ان سے ملاقات کی۔ پھر ان کی جادو بیانی نے ایسا تسخیر کیا کہ جب آتے پہلے پوچھتے کہ سید انشاء کجا است؟ جان بیلی صاحب کے ساتھ علی نقی خاں میر منشی ریذیڈنٹی بھی آیا کرتے تھے۔ ان کی اُن کی عجب لطف کی چوٹیں ہوتی تھیں۔ ایک دن اثنائے گفتگو میں کسی کی زبان سے نکلا:

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

انہوں نے کہا کہ گلستان کے ہر شعر میں مختلف روایتیں ہیں اور لطف یہ ہے کہ کوئی کیفیت

سے خالی نہیں۔ چنانچہ ہو سکتا ہے۔

شاید کہ پلنگ خفیہ باشد

سعادت علی خاں نے سید انشاء کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور! میر منشی صاحب بجا فرماتے ہیں۔ غلام نے بھی ایک نسخہ گلستان میں یہی دیکھا تھا:

تا مرد سخن نگفتہ باشد — عیب و ہنرش نہفتہ باشد

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست — شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

بلکہ وہ نسخہ بہت صحیح اور محشی تھا۔ اس میں گفتہ اور نہفتہ کے کچھ معنی بھی لکھے تھے۔ میر منشی صاحب! آپ کو یاد ہیں؟ وہ نہایت شرمندہ ہوئے۔ جب وہ رخصت ہوتے تو سید انشاء کہا کرتے، امیر منشی صاحب کا اللہ بیلی۔

ایک دن اسی جلسے میں کچھ ایسا تذکرہ آیا کہ سعادت علی خاں نے کہا، ہجر بالفتح بھی درست ہے۔ جان بیلی صاحب نے کہا کہ خلاف محاورہ ہے۔ سعادت علی خاں بولے کہ خیر لغت کے اعتبار سے جب درست ہے تو استعمال میں کیا مضایقہ۔ اتنے میں سید انشاء آ گئے۔ جان بیلی صاحب نے کہا کیوں سید انشاء ہجر اور ہجر میں تم کیا کہتے ہو۔ انہیں یہاں کی خبر نہ تھی۔ بے ساختہ کہہ بیٹھے کہ ہجر بالکسر! مگر سعادت علی خاں کی تیوری تاڑ گئے اور فوراً بولے کہ حضور جب ہی تو جامی فرماتے ہیں۔

شب وصل است و طے شد نامہ ہجر

سلامٌ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْر

یہ سنتے ہی سعادت علی خاں شگفتہ ہو گئے اور اہل دربار ہنس پڑے۔

مرزا سلیمان شکوہ کا مکان لب دریا تھا۔ معلوم ہوا کہ کل یہاں ایک اشنان کا میلا ہے۔ سید انشاء نے کہ رنگت کے گورے، بدن کے فربہ، صورت کے جامہ زیب تھے پنڈتانِ کشمیر کا لباس درست کر کے سب سامان پوجا پاٹ کا تیار کیا۔ صبح کو سب سے پہلے دریا کے کنارے ایک ٹھنت دھرم مورت بن کر جا بیٹھے اور خوب زور شور سے اشلوک پڑھنے اور منتر جپنے شروع کر دیے۔ لوگ اشنان کے لئے آنے لگے۔ مگر عورت، مرد، بچہ، بوڑھا جو آتا، الغرض خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھ کر انہیں کی طرف جھکتا۔ یہ انہیں پوجا کرواتے تھے، تلک لگاتے تھے۔ جن دوستوں سے یہ راز کہہ رکھا تھا۔ انہوں نے مرزا سلیمان شکوہ کو خبر کی۔ وہ مع جلسہ اسی وقت لب بام آئے دیکھیں تو فی الحقیقت اناج، آٹا، پیسے، کوڑیوں کے ڈھیر لگے ہیں، وہ بھی اس قدر کہ سب سے زیادہ۔ اس میں تفریح طبع یا لیاقت ہر فنی کے اظہار کے

ساتھ نکتہ یہ تھا کہ حضور خانہ زاد کو وبال دوش نہ سمجھیں، نہ اس شاعری کا پابند جانیں، جس کو چپے میں جائے گا۔ اوروں سے کچھ اچھا ہی نکلے گا۔ فائق تخلص ایک فلک زدہ شاعر تھا۔ خدا جانے کس بات پر خفا ہوا کہ ان کی ہجو کہی اور خود لا کر سنائی۔ انہوں نے بہت تعریف کی۔ بہت اچھلے بہت کودے اور پانچ روپے بھی دیئے۔ جب وہ چلا تو بولے ذرا ٹھہریئے گا۔ ابھی آپ کا حق باقی ہے اقلم اٹھا کر یہ قطعہ لکھا اور حوالے کیا:

فائق بے حیا چو ہجوم گفت  دل من سوخت سوختہ بہ

صلہ اش پنج روپیہ وادم  دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

دلی میں حافظ احمد یار ایک معقول صحبت یافتہ نامور حافظ تھے اور سرکار شاہی میں حافظان قرآن میں نوکر تھے۔ اگرچہ دنیا میں ایسا کون تھا، جس سے سید انشاء یارانہ برتیں مگر حافظ احمد یار کے بڑے یار تھے۔ ان کا سجع کہا تھا۔

ع  اللہ حافظ احمد یار

حافظ صاحب ایک دن ملنے گئے۔ رستے میں مینہ آگیا اور وہاں پہنچتے تک موسلا دھار برسنے لگا۔ یہ جا کر بیٹھے ہی تھے۔ جو حرم سرا سے ننگے منگے ایک کھاروے کی لنگی باندھے، آپ دوڑے آئے۔ انہیں دیکھتے ہی اچھلنے لگے۔ ہاتھ پھیلا پھیلا کر گرد پھرتے تھے اور کہے جاتے تھے۔

بھر بھر چھاجوں برست نور  ردبلائاں دشمن دور

حافظ مذکور جب رخصت ہوتے تھے تو ہمیشہ کہا کرتے تھے ع اللہ حافظ احمد یار ایسے ایسے معاملے ہزاروں تھے کہ دن رات بات بات میں ہوتے رہتے تھے۔

نہایت افسوس کے قابل یہ بات ہے کہ سعادت علی خاں کے ہاتھوں سید انشاء کا انجام اچھا نہ ہوا۔ اس کے مختلف سبب ہیں۔ اول تو یہ کہ اگرچہ اپنی ہمہ رنگ طبیعت کے زور سے انہوں نے انہیں پرچا لیا تھا۔ مگر درحقیقت ان کے اور ان کے معاملے کا مصداق ان کا مطلع تھا:

رات وہ بولے مجھ سے ہنس کر چاہ میاں کچھ کھیل نہیں

میں ہوں ہنسوڑ اور تو ہے مقطّع میرا تیرا میل نہیں

مثلاً اکثر میلوں تماشوں میں چلنے کے لئے کچھ احباب کا تقاضا، کچھ ان کی طبیعت اصلی کا تقاضا، غرض انہیں جانا ضرور اور سعادت علی خاں کی طبع کے بالکل مخالف، اکثر ایسا ہوا کہ وہ اپنے کاغذات دیکھ رہے ہیں۔ مصاحبوں کے ساتھ یہ بھی حاضر ہیں۔ اس میں ایک

آدھ لطیفہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ انہوں نے عرض کی حضور غلام کو اجازت ہے؟ وہ بولے کہ ہوں کہاں؟ انہوں نے کہا کہ حضور آج آٹھواں میلہ ہے۔ انہوں نے کہا، لاحول ولاقوۃ۔ سید انشا بولے کہ مناسب تو یہ تھا کہ حضور بھی تشریف لے چلتے۔ نواب نے کہا انشا ایسے ناروا مقاموں میں جانا ہمیں کس نے بتایا ہے؟ عرض کی حضور وہاں تو جانا ایک اعتبار سے فرض عین ہے اور ایک نظر سے واجب کفائی ہے۔ ایک لحاظ سے سنت ہے۔ پھر سب کی توجیہیں بھی الگ الگ بیان کیں۔ آخر اسی عالم مصروفیت میں سنتے سنتے دق ہو کر نواب نے کہہ دیا، قصہ مختصر کرو اور جلدی سدھارو۔ اسی وقت مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے: کون ہے آج سوا سید انشا کے، جو کچھ کہے، اسے عقل سے نقل سے، آیت سے، روایت سے ثابت کر دے۔ ایسی باتیں بعض موقع پر نواب کو موجب تفریح ہوتی تھیں۔ بعض دفعہ بمقتضائے طبیعت اصلی مکدر ہو جاتے تھے، خصوصاً جب کہ رخصت کے وقت خرچ مانگتے تھے، کیونکہ وہ شاہ عالم نہ تھا سعادت علی خاں تھا۔

گر جاں طلبی مضائقہ نیست
زر مے طلبی سخن درین ست

غضب یہ ہوا کہ ایک دن سر دربار بعض شرفائے خاندانی کی شرافت و نجابت کے تذکرے ہو رہے تھے۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں۔ اسے اتفاق تقدیر کہو یا زیادہ گوئی کا ثمرہ سمجھو۔ سید انشا بول اٹھے کہ حضور بلکہ انجب سعادت علی خاں حرم کے شکم سے تھے۔ وہ چپ اور تمام دربار درہم ہو گیا۔ اگرچہ انہوں نے پھر اور باتیں بنا بنا کر بات کو ٹالنا چاہا۔ مگر کمان تقدیر سے تیر نکل چکا تھا۔ وہ کھٹک دل سے نہ نکلی کہ (ولد الجاریۃ انجب)

اب نواب کے انداز بدلنے لگے اور اس فکر میں رہنے لگے کہ کوئی بہانہ ان کی سخت گیری کے لیے ہاتھ آئے۔ یہ بھی انواع و اقسام کے چٹکلوں سے اس کے آئینہ عنایت کو چمکاتے، مگر دل کی کدورت صفائی کی صورت نہ بننے دیتی تھی۔ ایک دن سید انشا نے بہت ہی گرم لطیفہ سنایا۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ انشا جب کہتا ہے، ایسی بات کہتا ہے کہ نہ دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ یہ مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے کہ حضور کے اقبال سے قیامت تک ایسے ہی کہے جاؤں گا کہ نہ دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ نواب تو تاک میں تھے چیں بجبیں ہو کر بولے کہ بھلا زیادہ نہیں، فقط دو لطیفے روز سنایا کیجیے۔ مگر شرط ہے کہ نہ دیکھے ہوں نہ سنے ہوں۔ نہیں تو خیر نہ ہوگی۔ سید انشا سمجھ گئے کہ یہ انداز کچھ اور ہیں۔ خیر اس دن سے دو لطیفے روز تو

انہوں نے سنانے شروع کر دیئے، مگر چند روز میں یہ عالم ہوگیا کہ دربار کو جانے لگتے تو جو پاس بیٹھا ہوتا، اسی سے کہتے کہ کوئی نقل کوئی چٹکلا یاد ہو تو بتاؤ۔ نواب کو سنائیں وہ کہتا کہ جناب بھلا آپ کے سامنے اور ہم چٹکلے کہیں۔ یہ کہتے کہ میاں کوئی بات چڑیا کے چنونے کی جو تمہیں یاد ہو کہہ دو، میں نون مرچ لگا کر اسے خوش کر لوں گا۔

اسی اثنا میں ایک دن ایسا ہوا کہ سعادت علی خاں نے انہیں آ بلا بھیجا یہ کسی اور امیر کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ چوبدار نے آ کر عرض کی کہ گھر نہیں ملے۔ خفا ہو کر حکم دیا کہ ہمارے سوا کسی اور کے ہاں نہ جایا کرو۔ اس قید بے زنجیر نے انہیں بہت دق کیا۔ زیادہ مصیبت یہ ہوئی کہ تعالیٰ اللہ خاں نوجوان بیٹا مر گیا۔ اس صدمے سے حواس میں فرق آ گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن سعادت علی خاں کی سواری ان کے مکان کی طرف سے نکلی۔ کچھ غم و غصہ، کچھ دل بے قابو غرض سر راہ کھڑے ہو کر سخت و سست کہا۔ سعادت علی خاں نے جا کر تنخواہ بند کر دی اب جنوں میں کیا کسر رہی؟

سعادت یار خاں رنگین ان کے بڑے یار تھے اور دستار بدل بھائی تھے چنانچہ سید انشاء خود کہتے ہیں:

عجب رنگینیاں ہوتی ہیں کچھ باتوں میں اے انشاء
بہم مل بیٹھتے ہیں جب سعادت یار خاں اور ہم

خاں موصوف کہا کرتے تھے کہ لکھنؤ میں سید انشاء کے وہ رنگ دیکھے، جن کا خیال کر کے دنیا سے جی بیزار ہوتا ہے۔ ایک تو وہ آج کا زمانہ تھا کہ سعادت علی خاں کی ناک کے بال تھے۔ اپنی کمال لیاقت اور شگفتہ مزاجی کے سبب سے مرجع خلائق تھے۔ دروازے پر گھوڑے، ہاتھی، پالکی، نالکی کے ہجوم سے رستہ نہ ملتا تھا۔ دوسری وہ حالت کہ پھر میں لکھنؤ گیا تو دیکھا کہ ظاہر درست تھا۔ مگر درخت اقبال کی جڑ کو دیمک لگ گئی تھی میں ایک شخص کی ملاقات کو گیا۔ وہ اثنائے گفتگو میں دوستان دنیا کی آشنائی اور بے وفائی کی شکایت کرنے لگے۔ میں نے کہا، البتہ ایسا ہے، مگر پھر بھی زمانہ خالی نہیں۔ انہوں نے زیادہ مبالغہ کیا۔ میں نے کہا کہ ایک ہمارا دوست انشاء ہے کہ دوست کے نام پر جان دینے کو موجود ہے وہ خاموش ہوئے اور کہا کہ اچھا زیادہ نہیں۔ آج آپ ان کے پاس جایئے اور کہیے ہمیں ایک تربوز خود بازار سے لا کر کھلا دو۔ موسم کا میوہ ہے۔ کچھ بڑی بات بھی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ بھلا یہ بھی کچھ فرمائش ہے، وہ بولے بس یہی فرمائش ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ خود لا کر کھلائیں۔ بلکہ مہر کے پیسے بھی آپ مجھ سے لے جائیں میں اسی وقت

اٹھ کر پہنچا۔ انشا رعادتِ قدیم کے بموجب دیکھتے ہی دوڑے، صدقے قربان گئے، اجم جم آیئے نت نت آیئے بلائیں لینے لگے۔ میں نے کہا یہ ناز و انداز ذرا طاق میں رکھو۔ پہلے ایک تربوزہ تو لا کر کھلاؤ، گرمی نے مجھے جلا دیا۔ انہوں نے آدمی کو پکارا۔ میں نے کہا کہ آدمی کی سہی نہیں، تم آپ جاؤ اور ایک اچھا سا قنبیدی تربوز دیکھ کر لاؤ۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، آدمی معقول ہے۔ اچھا ہی لائے گا۔ میں نے کہا نہیں کھاؤں گا۔ تو تمہارا ہی لایا ہوا کھاؤں گا۔ انہوں نے کہا، تو دیوانہ ہوا ہے یہ بات کیا ہے؟ تب میں نے داستان سنائی۔ اس وقت انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا، بھائی! وہ شخص سچا اور ہم تم دونوں جھوٹے۔ کیا کروں؟ ظالم کی قید میں ہوں۔ سوا دربار کے گھر سے نکلنے کا حکم نہیں۔ تیسرا رنگ میاں رنگین بیان کرتے ہیں کہ میں سوداگری کے لیے گھوڑے لے کر لکھنؤ گیا اور سرا میں اترا۔ شام ہوئی تو معلوم ہوا کہ قریب ہی مشاعرہ ہوتا ہے۔ کھانا کھا کر میں بھی جلسے میں پہنچا۔ ابھی دو تین سو آدمی آئے تھے۔ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے، حقے پی رہے تھے۔ میں بھی بیٹھا ہوں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے سر پر ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں پکیوں کا توبڑا ڈالے ایک لکڑ حقہ ہاتھ میں لیے آیا اور سلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا۔ کسی کسی نے اس سے مزاج پرسی بھی کی۔ اس نے اپنے توبڑے میں ہاتھ ڈال کر تمباکو نکالا اور اپنی چلم پر سلفا جا کر کہا کہ بھئی ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا۔ اسی وقت آوازیں بلند ہوئیں اور گڑگڑی، شٹک، پیچواں سے لوگ تواضع کرنے لگے۔ وہ بے دماغ ہو کر بولا کہ صاحب! ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو، نہیں تو ہم جاتے ہیں۔ سب نے اس کی بات کے لیے تسلیم اور تعمیل کی۔ دم بھر کے بعد پھر بولا کہ کیوں صاحب! ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا؟ لوگوں نے کہا جناب! لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں سب صاحب آجائیں تو شروع ہو۔ وہ بولا کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھے دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کر دی۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں — بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر — غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں — نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمل، آہ ننگ و نام کیا شے ہے — میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو — جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء!
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

وہ تو غزل پڑھ، کاغذ پھینک، سلام علیک کہہ کر چلے گئے، مگر زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا اور دیر تک دلوں پر ایک عالم رہا جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ غزل پڑھتے میں میں نے بھی پہچانا۔ حال معلوم کیا تو بہت رنج ہوا اور گھر پر جا کر پھر ملاقات کی۔ چوتھی دفعہ جو لکھنؤ گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا۔ افسوس، جس دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے۔ وہاں دیکھا کہ خاک اُڑتی ہے اور کتّے لوٹتے ہیں۔ ڈیوڑھی پر دستک دی۔ اندر سے کسی بڑھیا نے پوچھا کہ کون ہے۔ بھائی؟ (وہ ان کی بی بی تھیں) میں نے کہا کہ سعادت یار خاں دلّی سے آیا ہے۔ چونکہ سید انشاء سے انتہائی درجے کا اتحاد تھا، اِس عفیفہ نے پہچانا۔ دروازے پر آکر بہت روئیں اور کہا کہ بھیّا! ان کی تو عجب حالت ہے۔ اے لو، میں ہٹ جاتی ہوں، تم اندر آؤ اور دیکھو۔ تو میں اندر گیا۔ دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھے ہیں، تن برہنہ ہے، دونوں زانوؤں پر سر دھرا ہے، آگے راکھ کے ڈھیر ہیں، ایک ٹوٹا سا حقّہ پاس رکھا ہے۔ یا تو وہ شان و شکوہ کے جمگھٹ دیکھے تھے، وہ گرم جوشی اور چہلوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ یا یہ حالت دیکھی، بے اختیار دل بھر آیا۔ میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اور دیر تک رویا۔ جب جی ہلکا ہوا تو میں نے پکارا کہ سید انشاء! سید انشاء! سر اُٹھا کر نظرِ حسرت سے دیکھا، جو کہتی تھی، کیا کروں، آنکھوں میں آنسو نہیں۔ میں نے کہا، کیا حال ہے، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ شکر ہے پھر اس طرح سر کو گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اُٹھایا۔

بعض فلاسفۂ یونان کا قول ہے کہ مدّتِ حیات ہر انسان کی سانسوں کے شمار پر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہر شخص جس قدر سانس یا جتنا رزق اپنا حصّہ لایا ہے، اسی طرح ہر شے کہ جس میں خوشی کی مقدار اور ہنسی کا اندازہ بھی داخل ہے، وہ لکھوا کر لایا ہے۔ سید موصوف نے اِس ہنسی کی مقدار کو جو عمر بھر کے لیے تھی، تھوڑے وقت میں صرف کر دیا، باقی وقت یا خالی رہا یا غم کا حصّہ ہو گیا۔

---

# غزلیات

جھڑکی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی — یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی
مرنا مرا جو چاہے تو لگ جا گلے سے ٹک — اب کا ہی دم یہ میرا دمِ واپسیں سہی
گز نازنیں کے کہنے سے مانا برا ہو کچھ — میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی
آگے بڑھے جو جاتے ہو کیوں کون ہے یہاں — جو بات ہم کو کہنی ہے تم سے نہیں سہی

منظور دوستی جو تمھیں ہے ہر ایک سے
اچھا تو کیا مضائقہ انشاؔ سے کیں سہی

یہ نہیں برق ایک فرنگی ہے — رعد و باراں قشونِ جنگی ہے
کوئی دنیا سے کیا بھلا مانگے ؟ — وہ تو بیچاری آپ ننگی ہے
واہ دِلی کی مسجدِ جامع — جس میں براق فرش سنگی ہے
حوصلہ ہے فراخ رندوں کا — خرچ کی پر بہت سی تنگی ہے
لگ گئے عیب سارے اسکے ساتھ — یوں کہا جس کو مردِ بھنگی ہے
ڈر و وحشت کی دھوم دھام سے تم — وہ تو اک ڈیڑنی ڈ ینگی ہے
جوگی جی صاحب آپ کی بھی واہ — دھرم مورت عجب کڈھنگی ہے
آپ ہی آپ ہے پکار اٹھتا — دل بھی جیسے گھڑی فرنگی ہے
چشم بد دور شیخ جی صاحب — کیا ازار آپ کی اُڑنگی ہے
شیخ سعدیِ وقت ہے انشاؔ — تو ابو بکرِ سعدِ زنگی ہے

خیال کیجیے کیا آج کام میں نے کیا — جب اُن نے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا
کہا یہ صبر نے دل سے کہ لو خدا حافظ — کہ حقِ بندگی اپنا تمام میں نے کیا
جنوں یہ آپ کی دولت ہوا نصیب مجھے — کہ ننگ و نام کو چھوڑا یہ نام میں نے کیا
لگا یہ کہنے کہ خیر، اختلاط کی خو . بی — حوالے یار کے خالی جو جام میں نے کیا
جھڑک کے کہنے لگے لگ چلے بہت اب تم — کبھی جو بھول کے اُن سے کلام میں نے کیا
کہا زبانیٔ دل کر یہاں کہ کہتا ہے — صنم کو اپنے غرض اب تو رام میں نے کیا
کہیں نہ مانیو، بہتان ہے یہ سب اُس پر — ہنسی کے واسطے یہ اتہام میں نے کیا

تمہارے واسطے تم اپنے دل میں غور کرو — کبھی کسی سے نہ ہو جو مدام میں نے کیا
مقیم کعبۂ دل جب ہوا تو زاہد کو — روانہ جانبِ بیت الحرام میں نے کیا
مزا یہ دیکھیے گا شیخ جی رُکے اُلٹے — جو اِن کا بزم میں کل احترام میں نے کیا
عجب طرح کے مزے چاندنی میں دیکھے رات — قرار جا کے جو بر پشتِ بام میں نے کیا

ہوس یہ رہ گئی صاحب نے پر کبھی نہ کہا
کہ آج سے تجھے انشاؔ غلام میں نے کیا

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا — جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا
ہمسایہ آپ کے میں لیتا ہوں اِک حویلی — اِس شہر میں ہوا گر چندے مقام میرا
جو کچھ کہ عرض کی ہے سو کر دکھاؤں گا میں — واہی نہ آپ سمجھیں یونہیں کلام میرا
اچھا مجھے ستاؤ جتنا کہ چاہو میں بھی — سمجھوں گا گر ہے انشاء اللہ نام میرا
میں غش ہوا کہا جو ساقی نے مجھ سے ہنس کر — یہ سبز جام تیرا اور سُرخ جام میرا
پوچھا کسی نے مجھ کو اُن سے کہ کون ہے یہ — تو بولے ہنس کے یہ بھی ہے اِک غلام میرا

محشر کی تشنگی سے کیا خوف سیدؔ انشاء
کوثر کا جام دے گا مجھ کو امام میرا

ہیں زورِ حُسن سے وہ نہایت گھمنڈ پر — نامِ خدا نگاہ پڑے کیوں نہ ڈنڈ پر
تعویذ لعل ہی کے نہ پھر پیٹے گھمنڈ پر — اک نیلا ڈورا باندھیے اس گورے ڈنڈ پر
یارب سدا سہاگ کی مہندی رچا کرے — پتے پچیس کھچیں رہے آفت اڈنڈ پر
یہ بار میری کاٹ کے دی کس نے اِسقدر — جو تم رگڑ رہے ہو سرد ہی کر نڈ پر
دو تین دن تو ہو چکے اب پھر چلو وہیں — فیروزشہ کی لاٹھ کے اس چوتھے کھنڈ پر
وہ پہلوان سادہ لب جُو پہ ڈنڈ پیل — بولا کہ کوئی غش ہو تو ایسے بھُشنڈ پر
گلبرگِ تر سمجھ کے لگا بیٹھی ایک چونچ — بُلبل ہمارے زخمِ جگر کے کھرُنڈ پر

انشاؔ بدل کے قافیے رکھ چھیڑ چھاڑ کے
چڑھ بیٹھ ایک اور پچھیرے اکنڈ پر

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کُنڈ پر — اَوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھُنڈ پر
اے موسمِ خزاں لگے آنے کو تیرے آگ — بُلبُل اداس بیٹھی ہے اک سوکھے مُنڈ پر
شِو کے گلے سے پاربتی جی لپٹ گئیں — کیا ہی بہار آج ہے برمھا کے رُنڈ پر
راجہ جی ایک جوگی کے چیلے پہ غش ہیں آپ — عاشق ہوئے ہیں واہ عجب لُنڈ مُنڈ پر

انشاؔ نے سن کے قصہ فرہادؔ یوں کہا
کرتا ہے عشق چوٹ تو ایسے ہی مُنڈ پر

## غزل آزادوں کے لہجے میں

جو چاہے تو مجھ سے ہنسوڑے کی خیر — تو یوں دیکھ اس گھوڑے جوڑے کی خیر
کُدا دے نشے کے مرے رخش کو — میاں ساقی اس سلفے کوڑے کی خیر
دکھائی مجھے سیرِ باغِ اِرم — الٰہی ہو اس بنرے گھوڑنے کی خیر
ہنسایا جو میں نے تو بولے نہیں — نظر آتی کچھ اس نگوڑے کی خیر

لگا بیٹھ انشاؔء کو ٹھوکر تو ایک
ارے اپنے سونے کے توڑے کی خیر

## مستزاد

کو صولتِ اسکندر و کو حشمتِ دارا — اے صاحبِ فطرت
پڑھ فاعتبروا یا اولی الابصار کا آیا — تا ہو تجھے عبرت
مستانہ جو میں نے قدح بنگ چڑھایا — در عالمِ وحشت
تب خضر پکارا کہ ھَنِیًٔا وَمَرِیًٔا — اب دیکھ حلاوت
ہے جی میں فقیروں کی طرح کھینچ لنگوٹا — اور باندھ کے تہمت
جا کُنجِ خرابات میں ٹک گھونٹیے سبزا — یوں کیجئے عبادت
اے حضرتِ عشق آئیے سائیں اجی مولا — یاں کیجئے عنایت
مُرشد مرے مالک مرے ہادی مرے داتا — دیجیے مجھے نعمت
ماتھے پہ مرے خط الف اللہ کا کھینچو — سونپو مجھے بستر
تم مونڈ گرو پیر، یہ بندہ ہُوا چیلا — جی سے کرے خدمت
میں خاک نشیں ہوں گا گروہِ فقراء سے — کیا سمجھے ہو مجھ کو

رُومال چھڑی لیکے جو ٹک کھینچوں ادا سا
دکھلاؤں کرامت

گر سیر کناں دَیر میں جا نکلوں تو بولوں
ناقوس کو سُن کر

ہاں برہمنِ بتکدہ عشق است صدا را
ہے تجھ سے بھی اُلفت

خوش رہتے ہیں چار ابرو کی تبلا کے صفائی
مانندِ قلندر

نہ ہم کو غمِ وُزد نہ اندیشہء کالا
ہے خوب فراغت

درویشِ بلا نوش بلا چٹ ہیں میاں وست
پلنگ میں جو آویں

افعی کو مسل کر کریں افیون کا گھولا !
ہیں ایسے ہی آفت

گاڑھے ہیں ہم اس سے بھی کہ جھٹکے کہ ہلا کر
للکارے تھا یوہیں

دیتا ہوں ہلا کنگرۂ عرشِ معلّیٰ
رکھتا ہوں یہ طاقت

آزادوں کے لہجے میں غزل تُو نے سُنائی
از بہرِ تفنن

اب اپنی تو بولی کے کچھ اشعار کہہ انشاءؔ
ہو جس میں ظرافت

ہے نامِ خدا داچھڑے کچھ زور ہمت ثنا
یہ آپ کی رنگت

گات ایسی غضب قہرِ پھبن اور جھمکڑا
اللہ کی قدرت

میں نے جو کہا ہوں میں ترا عاشقِ شیدا
اے کانِ ملاحت

فرمانے لگے ہنس کے سُنو اور تماشا
یہ شکل یہ صورت

الحاد و تصوّف میں جو تھا فرق بہم یاں
اصلا نہ رہا کچھ

پردہ جو تعیّن کا محبت نے اُٹھایا
کثرت ہوئی وحدت

تاثیر ہے کیا خاک میں اس نجد کی کہدے
تُو مجھ کو تو بارے

ہر پھر کے جو آنکلے ہے یاں ناقۂ لیلیٰ
اے جذبِ محبت

کعبے کا کروں طوف کہ بُت خانے کو جاؤں
کیا حکم ہے مجھ کو

ارشاد مرے حق میں بھی کچھ ہوئے گا آیا
اے پیرِ طریقت

ہوں پر تو رُوح القدس اس عہد میں میں بھی
عیسیٰ کی طرح سے

یوں چاہیئے بے ساختہ رہبانِ کلیسا
میری کرے بیعت

آتے جو مرے گھر میں وُہ شب راہِ کرم سے
میں موندی کُنڈی

مُنہ پھیر لگے کہنے تعجب سے کہ یہ کیا؟
ایں تیری یہ طاقت

ٹُونا کریں اس طور مرے غیر ہمیشہ
ٹک سوچ تو دل میں

ترسا کرے ہر وقت یہ بندہ ہی تمہارا
اللہ کی قدرت

دیوارِ چمن پھاند کے پہنچے جو ہم اُن تک ... اِک تاک کی اوجھل
ترساں ہو یہ فرمانے لگے کُوٹ کے ماتھا ... اے وائے فضیحت

خورشید چھپا شام ہوئی شیخ جیو صاحب ... اب دیکھتے کیا ہو
چڑیوں نے لیا آکے درختوں پہ بسیرا ... چوں چوں کرو حضرت

لے برق کی زنجیر کو ٹک سُونڈ میں اپنی ... اے ابر کے ہاتھی
سیندور لگا ماتھے پہ اس رنگِ شفق کا ... با عظمت و شوکت

چل آٹھوں کے میلے کی ذرا دید کریں ہم ... ہے سیر کی جاگہ
سم بیٹھ چڑھا یاروں کے پھیر میل رکھدوا ... مت رعد کی سن دھت

شب محفلِ ہولی میں جو وارد ہُوا زاہد ... رندوں نے لپیٹ کر
داڑھی کو دیا اس کی لگا بذر قطونا ... اور بجنے لگی گت

تب مغبچے کہنے لگے ٹک پر بلونا چھو ... رکھ ناک پُر انگلی
اور آنے جی آتے سے بُرا مانے سو بھڑوا ... ہے موسم عشرت

کشمیری معلّم کو جو اِک طفل نے ناگہ ... انگور کے دانے
لاکر دیئے اور اُن سے کہا کھائیے میوا ... ہے قسمِ ولایت

لہجے میں تکشمر کے مقطع ہو یہ بولے ... شاگرد سے اپنے
چل سامنے سے میرے اتا کر ینیں لیجا ... نیمیں نہیں لذت

لیسیاتھ انگر ناک ہے، بررو جیسے تجھ کو ... سو کوڑی کے دس ہیں
بابا یہ تا کیا ہے۔ چھٹا زانت ہے اُس کا ... کانا نہ بیلے مت

اب اور ردیف اور قوافی میں غزل پڑھ ... لیکن اِسی ڈھب سے
تا شاعروں کے آگے ہو اِس بزم میں انشاء ... ظاہر تری شوکت

لینے جو بلائیں لگے ہم آپ کی چٹ پٹ ... تو بول اُٹھے جھٹ
چل جا ابے رے واوَ زبردہ ہو پرے ہٹ ... ہے یہ بھی بناوٹ

اِن آنکھوں کو میں حلقۂ زنجیر کروں گا ... ایسا ہی بلا ہوں
چھوڑوں ہوں کوئی آپکے دروازے کی چوکھٹ ... جب تک نہ کھُلے پٹ

مرجائیے لہو چھانٹ نہ گو نگا ہو وُہ کیونکر ... جو شخص کہ دیکھے
سہ ختی تری آنکھوں کی اور ابرو کی کھچاوٹ ... سُرمے کی گھلاوٹ

ہے معدنِ انوارِ الٰہی دِلِ عاشق
اِس چھوٹی سی جاگہ میں یہ وسعت یہ سماوٹ
سوچو تو عزیزو
اللہ رے جمگھٹ

کیا پھبتی ہے اے نامِ خدا اچھڑے آہا
اک بوسے کے صدمے سے دھواں دھار بلاہٹ
ہونٹوں پہ تمہارے
مِسّی کی اُوداہٹ

میں رُوپ بدل اور ہی چپکے سے جو پہنچا
سُن کہنے لگے میرے دبے پاؤں کی آہٹ
بیٹھے تھے جہاں وہ
ہے ایک تو نٹ کھٹ

تھی گرم یہ کچھ مجلسِ مے رات کہ ساقی
ہے توبہ شکن آج صراحی کی غٹاغٹ
سب کہتے تھے زاہد
بھلّا رے جماوٹ

اے واہ رے بالیدگی اور چمپئی رنگت
اور جامۂ شبنم کی وُہ چولی کی پھساوٹ
یہ گات یہ سج دھج
بازو کی گلاوٹ

مت چھیڑو مجھے دیکھو ابھی کہنے لگوگے
چولی مری ٹکڑے ہوتی دامن بھی گیا پھٹ
اچھا کیا تم نے
لگ جائے گی یہ رٹ

ہے نورِ بصر مردمکِ دیدہ میں پنہاں
سو اشک کے قطروں سے پڑا کھیلے ہے جھرمٹ
یُوں جیسے کنھیّا
اور آنکھیں ہیں پنگھٹ

اے عشق اجی آؤ مہاراجوں کے راجہ
کر بیٹھے ہو تم لاکھوں کروڑوں ہی کے سر چٹ
ڈنڈوت ہے تم کو
اک آن میں جھٹ پھٹ

پھرتا ہے سما آنکھوں میں اب تک وہی اِنشاؔ
باہم وہ لپٹ سونے میں آجانی رکاوٹ
ہے ظالم ارے کیوں
وہ پیار کی کروٹ

وُہ سیج بھری پھولوں کی مخمل کے وہ تکیے
پردے وہ تمامی کے وہ سونے کا چھپر کھٹ
کمخاب کی پوشش
اور اس کی سجاوٹ

ہے یہ اُس مہ جبین کی تصویر — یا کسی حورِ عین کی تصویر
بن گئی دُودِ آہ مجنوں میں — ایک محمل نشین کی تصویر
اپنے داغِ جگر میں سُوجھی ہے — مجھ کو اِس نازنین کی تصویر
دیکھ لے اُس کی چینِ پیشانی — ہے یہ خاقانِ چین کی تصویر
نظر آتی ہے اشکِ اِنشاؔ میں
جبرئیل ع امین کی تصویر

مِل گئے سینے سے سینے پھر یہ کیسا اضطراب — مر مٹے پر بھی گیا اپنے نہ دل کا اضطراب

کیوں پڑی ٹھلکیں نہ آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے / ہے دلِ صد پارہ کو سیماب کا سا اضطراب
روح کا یہ حال ہے یاں قافلے سے پڑ کے دور / کر رہی ہو جس طرح محمل میں لیلیٰ اضطراب
پوچھتے کیا ہو کہ تیرے دل میں کیا ہے مجھ سے پوچھ / اور کیا یاں خاک ہوگی جوشش ہے یا اضطراب
دم لگا گھٹنے اجی میں کیا کہوں کل رات کو / تم نہ آئے تو کیا یاں جی نے کیا کیا اضطراب
کیا غضب تھا پھاند کر دیوار آدھی رات کو / دھم سے میرا کودنا اور وہ تمہارا اضطراب
تھا وہ دھڑکا پڑنے کے ساتھ صدقے اُسکے جی / پھر کرے اپنے نصیب اللہ ولیا اضطراب
اُس کی چاہت میں بجانِ اپنی جو تھی چل بسی / ہے پر اب تک جی کو اک جیسے کا تیسا اضطراب

پیر و مرشد کا یہ مصرع حسب حال انشاء کے ہے
مر مٹے پر بھی گیا اپنے نہ دل کا اضطراب

پگڑی تو نہیں ہے یہ فراسیس کی ٹوپی / یاں وقتِ اسلام اُڑتی ہے ابلیس کی ٹوپی
ہے شیخ کے سر ایسی ہی تلبیس کی ٹوپی / جس سے کہ بڑی کانپے ہے ابلیس کی ٹوپی
دیتے ہیں کلہ اپنے مریدوں کو جو صوفی / کہتے ہیں یہی تھی سرِ جرجیس کی ٹوپی
سو چکٹی ہوئی ہے یہ منغص کہ جہاں میں / ایسی تو نہ ہوگی کسی سائیس کی ٹوپی
ہدہد کو خوشی تب ہوئی جس دم نظر آئی / ہاتھوں میں سلیمان ع کے بلقیس کی ٹوپی
کل سوزنِ عیسیٰ ع سے ہیں پر وخطِ شعاعی / خورشید نے سی حضرت ادریس کی ٹوپی
کیوں واسطے جبرائیل کے میری نہ ہو حاضر / غلمان کی اور حور فرادیس ع کی ٹوپی
پریوں کے گھروں میں وہی چور بجی مزے لیں / جن پاس ہو جنوں کے جواسیس کی ٹوپی
ممکن ہو تو دھر دیکھیے بنا کر ترے سر پہ / زر بفت مہ و زہرہ و برجیس کی ٹوپی
انگریز کے اقبال کی ہے ایسی ہی رتی / آویختہ ہے جس میں فراسیس کی ٹوپی

انشاء مرے آغا کی سلامی کو جھکے ہے
سکانِ سراپردۂ تقدیس کی ٹوپی

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب اُلٹا / کہ پڑا ہے آج خم میں قدحِ شراب اُلٹا
عجب اُلٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے / کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب اُلٹا
چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے ایک صنم کے عاشق / نہ ہوا ثواب حاصل یہ ملا عذاب اُلٹا
یہ شبِ گذشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا / کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب اُلٹا
ابھی جھڑ لگا دے بارش کوئی مست بھر کے نعرہ / جو نہ میں یہ پھینک مارے قدحِ شراب اُلٹا
یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قرباں / وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

ہوئے وعدے پر جو جھوٹے تو نہیں ہٹاتے تیور — اے لو دیکھا کچھ تماشا یہ سُو عتاب اُٹھا
کھڑے چپ ہو دیکھتے کیا مرے دل اجڑ گئے کو — وہ گنہ تو کہہ دو جس سے یہ وہ خواب اُٹھا

غزل اور قافیوں میں نہ کہے سو کیونکر انشا
کہ ہوئے خود بخود آ ورقِ کتاب اُٹھا

مجھے چھیڑنے کو ساقی نے دیا جو جام اُلٹا — تو کیا بہک کے میں نے اُسے اک سلام اُلٹا
سحر ایک ماش پھینکا مجھے جو دکھا کے اُن نے — تو اشارہ میں نے تاڑا کہ ہے لفظِ شام اُلٹا
یہ بلا دھواں نشہ ہے مجھے اِس گھڑی تو ساقی — کہ نظر پڑے ہے سارا صحن و بام اُلٹا
بڑھوں اس گلی سے کیونکر کہ وہاں تو میرے دل کو — کوئی کھینچتا ہے ایسا کہ پڑے ہے گام اُلٹا
درِ میکدہ سے آتی مہک ایسی ہی مزے کی — کہ پچھاڑ کھا گرا واں دلِ تشنہ کام اُلٹا
نہیں اب جو دیتے بوسہ تو سلام کیوں لیا تھا — مجھے آپ پھیر دیجئے۔ وہ مرا سلام اُلٹا
لگے کہنے اب توقع تجھے ہم کہا کریں گے — کہیں اُن کے گھر سے بڑھ کر جو پھرا غلام اُلٹا
مجھے کیوں نہ مار ڈالے تری زلف اُلٹ کے کافر — کہ سکھا رکھا ہے تو نے اُسے لفظ رام اُلٹا
ترے سیدھے سادھے ہم تو بھلے آدمی ہیں یارو — ہمیں کج جو سمجھے سو خود ولد الحرام اُلٹا
تو جو باتوں میں رُکیگا تو یہ جانوں گا کہ سمجھا — مرے جان و دل کے مالک نے مرا کلام اُلٹا

فقط اِس لفافے پر ہے کہ خط آشنا کو پہنچے
تو لکھا ہے اُس لے اِنشا یہ ترا ہی نام اُلٹا

پرتو سے چاندنی کے ہے صحنِ باغ ٹھنڈا — پھولوں کی سیج پر آ کر دے چراغ ٹھنڈا
شفقت سے ہاتھ تو دھر ٹک دل پہ میرے تا ہو — یہ آگ سا دہکتا سینے کا داغ ٹھنڈا
مے کی صراحی ایسی لا برف میں لگا کر — جس کے دھوئیں سے ساقی ہووے دماغ ٹھنڈا
تجنیس جس دنی کی ہو جوششِ چشمِ یارو — ہم نے مدام پایا اُس کا اوجاغ ٹھنڈا

ہیں ایک شخص لاتے خس کی شراب انشا
دھو دھا گلاب سے تو کر رکھا ایاغ ٹھنڈا

---

# شیخ غلام ہمدانی مصحفی

مصحفی تخلص، غلام ہمدانی نام، باپ کا نام ولی محمد امروہہ کے رہنے والے تھے۔ آغازِ جوانی تھا، جو دِلّی میں آکر طالب علمی کی طبیعت میں موزونیت خدا داد تھی۔ اس میں قوت بہم پہنچائی۔ ابتداء سے غربت اور مسکینی اور ادب کی پابندی طبیعت میں تھی۔ ساتھ اس کے خوش خلقی اور خوش مزاجی تھی، جس نے بزرگانِ دہلی کی صحبتوں تک رسائی دی تھی۔ مشاعرہ بھی کیا کرتے تھے۔ انہی سامانوں کا سبب تھا کہ سب شاعر اور معزز اشخاص اس میں شامل ہوتے تھے۔ دِلّی کا اس وقت یہ عالم تھا کہ خود وہاں کے گھرانے گھر چھوڑ چھوڑ کر نکلے جاتے تھے، اِس لیے اُنھیں بھی شہر چھوڑنا پڑا۔ وطن یہاں نہ تھا۔ مگر دِلّی میں خدا جانے کیا میٹھا ہے کہ خود کہتے ہیں۔

دِلّی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی
میں رہنے والا ہوں اُسی اُجڑے دیار کا

اِسی طرح اپنے کلام میں اکثر جگہ دِلّی کے رہنے کا فخر کیا کرتے ہیں۔ غرض آصف الدولہ کا زمانہ تھا کہ لکھنؤ پہنچے۔ اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں (جو دِلّی والوں کا معمولی ٹھکانا تھا) ملازم ہوئے۔ چنانچہ اکثر غزلوں میں بھی اس کے اشارے ہیں۔ ایک شعر اُن میں سے ہے۔

تختِ طاؤس پہ جب ہووے سلیمان کا جلوس
مورچھل ہاتھ میں ہیں بالِ ہما کا لے لوں

غرض وہاں کثرتِ مشق سے اپنی اُستادی کو خاص و عام میں مسلم الثبوت کیا۔ علمیت کا حال معلوم نہیں، مگر تذکروں سے اور خود اُن کے دیوانوں سے ثابت ہے کہ زبانِ فارسی اور ضروریات شعری سے باخبر تھے اور نظم و نثر کی کتابوں کو اچھی طرح دیکھ کر معلوماتِ وسیع اور نظرِ بلند حاصل کی تھی۔

شوقِ کمال کا یہ حال تھا کہ لکھنؤ میں ایک شخص کے پاس کلیاتِ نظیری تھا۔ اُس زمانے میں کتاب کی قدر بہت تھی۔ مالک اس کا بہ سبب نایابی کے کسی کو عاریتہً بھی نہ دیتا تھا۔

اُن سے اتنی بات پر راضی ہوا کہ خود آ کر ایک جزو لے جایا کرو۔ وہ دیکھ لو تو واپس کر کے اور لے جایا کرو۔ اِن کا گھر شہر کے اِس کنارے پر تھا اور وہ اُس کنارے پر۔ چنانچہ معمول تھا کہ ایک دن درمیان وہاں جاتے، جزو بدل کر لے آتے۔ ایک دفعہ جب وہاں سے لاتے تو پڑھنے آتے۔ گھر پر آ کر نقل یا خلاصہ کرتے اور جاتے ہوئے پھر پڑھتے جاتے۔ ہم لوگوں کے حال پر افسوس ہے کہ آج چھاپے کی بدولت وہ وہ کتابیں دکانوں میں پڑی ہیں، جو ایک زمانے میں دیکھنے کو نصیب نہ ہوتی تھیں، مگر بے پروائی ہمیں آنکھیں اُٹھا کر نہیں دیکھنے دیتی۔ تعجب ہے۔ اُن لوگوں سے جو شکایت کرتے ہیں کہ پہلے بزرگوں کی طرح اب لوگ صاحب کمال نہیں ہوتے۔ پہلے جو لوگ کتاب دیکھتے تھے تو اس کے مضمون کو اس طرح دل و دماغ میں لیتے تھے، جس سے اُس کے اثر دلوں میں نقش ہوتے تھے۔ آج کل کے لوگ پڑھتے بھی ہیں تو اِس طرح صفحوں سے عبور کر جاتے ہیں، گویا بکریاں ہیں کہ باغ میں گھس گئی ہیں۔ جہاں مُنہ پڑ گیا ایک بکٹا بھر لیا، باقی کچھ خبر نہیں۔ ہوس کا چروا ہا ان کی گردن پر سوار ہے، وہ دبائے لیے جاتا ہے یعنی امتحان پاس کر کے ایک سند لو اور کوئی نوکری لے کر بیٹھ رہو اور افسوس یہ ہے کہ نوکری بھی نصیب نہیں۔

محاورات قدیم میں انھیں میر سوز۔ سودا اور میر کا ایک آخری ہمزبان سمجھنا چاہیئے۔ وہ سید انشا اور جرأت کی نسبت دیرینہ سال تھے۔ یا تو بڑھاپے نے پرواز کے بازو ضعیف کر دیئے تھے یا قدامت کی محبت نئی شے کے حُسن کو حسین کر کے نہ دکھاتی تھی جیسے آزاد نا قابل کہ ہزار طرح چاہتا ہے، مگر اس کا دل نئی شائستگی سے کسی عنوان اثر پذیر نہیں ہوتا۔ شیخ موصوف نے لکھنؤ میں صدہا شاگرد کیے، مگر یہ اب تک کسی تذکرے سے ثابت نہیں ہُوا کہ وہ خود کس کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے بڑی عمر پائی اور اپنے کلام میں اشارے بھی کیے ہیں۔ بڑھاپے میں پھر شادی کی تھی۔ طبیعت کی رنگینی نے مسّی کی مدد سے دانتوں کو رنگین کیا تھا۔ چنانچہ سید انشا نے اُن کی ہجو میں سب اشارے کیے ہیں۔ غرض جب تک زندہ رہے لکھنؤ میں رہے اور وہیں سنہ ۱۲۴۰ھ میں فوت ہوئے۔ سید انشا، جرأت، میر حسن وغیرہ شعرا ان کے ہمعصر ہیں ؎

عام تذکرے گواہی دیتے ہیں کہ ان کی تصنیفات میں پچھ دیوان اُردو کے تمام و کمال ہیں۔ جن میں ہزاروں غزلیں اور بہت سے قصیدے اور ابیات اور رُباعیاں اور معمولی تضمینیں ہیں۔ چنانچہ ایک قصیدے کے دُعائیے میں کہتے ہیں:

مصحفی آج دُعا مانگے ہے تجھ سے یارب
اے کہ ہے ذات تری سب پہ غفور اور رحیم

یہ جو دیوان چھپوں اس کے ہیں مانندِ سہیل
بزمِ شاہاں میں لباس اِن کا رہے جلد ادیم

دو تذکرے شعرائے اُردو کے، ایک تذکرہ فارسی کا اور ایک دیوان فارسی لکھا، مگر راقم کے پاس جو اُن کے دیوان ہیں، اُن میں سے ایک پر دیوان ہفتم لکھا ہے اور ایک دیوان اور ہے ۔ اس میں سید انشاء کے جھگڑے بھی ہیں۔ یہ آٹھواں ہوگا کہ سب سے آخر ہے ؂

دیوان اِن کی اُستادی کو مسلم الثبوت کرتے ہیں ۔ انواع و اقسام کی صدہا غزلیں ہیں۔ جو غزلیں نہایت سنگلاخ زمینوں میں لکھی ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرتِ مشق سے کلام پر قدرتِ کامل پائی ہے ۔ الفاظ کو پس وپیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے اِس دروبست کے ساتھ شعر میں کھپایا ہے کہ جو حق اُستادی کا ہے، ادا ہو گیا ہے۔ ساتھ اس کے اصل محاورے کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ ایسے موقع پر کچھ کچھ سودا کا سایہ پڑتا ہے ۔ جہاں سادگی ہے، وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر سوز کے انداز پر چلتے ہیں ۔ اِسی کوچے میں اکثر شعر میر صاحب کی بھی جھلک دکھاتے ہیں، مگر جو اُن کے جوہر ہیں، وہ انہی کے ساتھ ہیں ۔ یہ اس ڈھنگ میں کہتے ہیں تو پھسپھسے ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ طبیعت رواں تھی۔ پُرگوئی کے سبب سے وہ لُطف کلام میں پیدا نہ ہوا ۔ غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے۔ کسی طرز خاص کی خصوصیت نہیں۔ بعض تو صفائی اور برجستگی میں لاجواب ہیں۔ بعض میں یہی معمولی باتیں ہیں۔ جنہیں ڈھیلی ڈھیلی بندشوں میں باندھ کر پھسپھسے برابر کہتے چلے گئے ہیں ۔ اس کا سبب یا تو پُرگوئی ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے ۔ یا دلّی اور امروہہ کا فرق ہے ؂

قصیدے خوب ہیں اور اکثر اُن میں نہایت مشکل زمینوں میں ہیں۔ کچھ حمد و نعت، کچھ مرزا سلیمان شکوہ اور حکام لکھنؤ کی شان میں ہیں ۔ ان میں بڑے بڑے الفاظ، بلند مضمون، فارسی کی عمدہ ترکیبیں، اُن کی درست نشستیں، جو جو اُس کے لوازم ہیں، سب موجود ہیں، البتہ بندشوں کی چُستی اور جوش و خروش کی تاثیر کم ہے ۔ شاید کثرتِ کلام نے اسے دھیما کر دیا، کیونکہ دریا کا پانی دو پہاڑوں کے بیچ میں گھٹ کر بہتا ہے تو بڑے زور شور سے بہتا ہے، جہاں پھیل کر بہتا ہے، وہاں زور کچھ نہیں رہتا ۔ یا شاید ضروری فرمائشیں اتنی مہلت نہ دیتی ہوں گی کہ طبیعت کو روک کر غور سے کام سرانجام کریں ۔

فارسی دیوان ہند کے شعرائے ما بجا الوقت سے کچھ زیادہ نہیں ۔

تذکرے خوب لکھے ہیں اور چونکہ اُستادوں کے زمانے سے قریب تھے، اور

سن رسیدہ لوگوں کی صحبت کے مواقع حاصل تھے، اس لیے اچھے اچھے حالات بہم پہنچائے ہیں اور اُن میں اپنے کل شاگردوں کی بھی فہرست دی ہے۔

اکثر واقعات کی تاریخیں لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔

غرض شعر کی ہر شاخ کو لیا ہے اور جو قواعد و ضوابط اُس کے اُستادوں نے باندھے ہیں، اُن کا حق حرف بحرف بلکہ لفظ بلفظ پورا ادا کیا ہے۔ ہاں اپنے معصروں کی طرح طبیعت میں چلبلاہٹ اور بات میں شوخی نہیں پائی جاتی کہ یہ کچھ اپنے اختیار میں نہیں، خداداد بات ہے۔ سید انشا ہمیشہ قواعد کے رستے سے ترچھے ہو کر چلتے ہیں، مگر وہ اُن کا ترچھا پن بھی عجب بانکپن دکھاتا ہے۔ یہ بھی مطلب کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں، مگر کیا کریں کہ وہ امرو ہہ پن نہیں جاتا۔ ذرا اکڑ کر چلتے ہیں تو اِن کی شوخی بڑھاپے کا ناز بے نمک معلوم ہوتا ہے۔ سید انشاء سیدھی سادی باتیں بھی کہتے ہیں تو اس انداز سے کہتے ہیں کہ کہتا اور سُنتا گھڑیوں رقص کرتا ہے اور چٹخارے بھرتا ہے۔ ان کا یہ حال ہے کہ اصول سے ماپ کر اور قواعد سے تول کر بات کہتے ہیں۔ پھر بھی دیکھو تو کہیں پھیکے ہیں اور کہیں سیٹھے ہیں۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ فصاحت اور بلاغت کے لیے کوئی قاعدہ نہیں، جس کی زبان میں خدا مزہ دے دے ہزار اصول و قواعد کی کتابیں اُن پہ قربان ہیں

شعر مے گویم بہ از آبِ حیات
من ندانم فاعلاتن فاعلات

ایک سقنی کو دیکھ کر شیخ صاحب کی شوخی طبع کے مُنہ میں پانی بھر آیا ہے۔ اُس غزل کے چند شعر کہ ظریفانہ انداز میں ہیں ملاحظہ فرمایئے:

پانی بھرے ہے یار دیاں قرمزی دوشالا
لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا

کاندھے پہ مشک لے کر جب قد کو خم کرے ہے
کافر کا نشۂ حسن ہو جائے ہے دو بالا

دریائے خوں میں کیونکر ہم نیم قد نہ ڈوبیں
لنگی کے رنگ سے جب یوں تا کمر ہو لالا

یہ سب کچھ صحیح ہے مگر جس شخص کا قلم آٹھ دیوان لکھ کر ڈال دے اُس کی اُستادی میں کلام کرنا انصاف کی جان پہ ستم کرنا ہے۔

ان کی مشاقی اور پرگوئی کو سب تذکروں میں تسلیم کیا ہے۔ سن رسیدہ لوگوں کی زبانی

سنا کہ دو تین تختیاں پاس دھری رہتی تھیں - جب مشاعرہ قریب ہوتا تو ان پر اور مختلف کاغذوں پر طرح مشاعرہ میں شعر لکھنے شروع کرتے تھے اور برابر لکھے جاتے تھے۔ لکھنؤ شہر تھا عین مشاعرے کے دن لوگ آتے - ۸ روپے سے عہ تک اور جہاں تک کسی کا شوق مدد کرتا وہ دیتا۔ یہ اس میں سے ۹ - ۱۱ - ۲۱ شعر کی غزل نکال کر حوالے کر دیتے تھے اُن کے نام کا مقطع کر دیتے تھے اور اصل سبب کمزوری کا یہ تھا کہ بڑھاپے میں شادی بھی کی تھی چنانچہ سب سے پہلے تو ایک سالا تھا وہ شعر چُن کر لے جاتا - پھر سب کو دے لے کر جو کچھ بچتا وہ خود لیتے اور اس میں لون مرچ لگا کر مشاعرے میں پڑھ دیتے - وہی غزلیں دیوانوں میں لکھی چلی آتی ہیں۔ بلکہ ایک مشاعرے میں جب شعروں پر بالکل تعریف نہ ہوئی تو انھوں نے تنگ ہو کر غزل زمین پر دے ماری اور کہا کہ رُوے فلاکت سیاہ جس کی بدولت کلام کی یہ نوبت پہنچی ہے کہ اب کوئی سنتا بھی نہیں - اس بات کا چرچا ہوا تو یہ عقدہ کھُلا کہ اِن کی غزلیں بکتی ہیں - اچھے شعر تو لوگ مول لے جاتے ہیں جو رہ جاتے ہیں وہ ان کے حصے میں آتے ہیں ؏

پانی پت کے ایک شخص اس زمانے میں چکلہ داری کے سبب سے لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اِن کے ہاں شیخ مصحفی بھی آیا کرتے تھے - ایک دن کاغذ کا جز ہاتھ میں لیے آئے اور الگ بیٹھ کر کچھ کہنے لگے - سامنے ایک ورق رکھا تھا اسے دیکھ دیکھ کر اس طرح لکھے جاتے تھے ؛ جیسے کوئی نقل کرتا ہے - ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہے ، جس کی آپ نقل کر رہے ہیں ، لایئے میں لکھ دوں - انھوں نے کہا کہ ایک شخص نے کچھ مضمون مثنوی میں لکھوانے کے لیے فرمائش کی تھی - اس کا تقاضا مدت سے تھا - کچھ تو مجھے یاد نہ رہتا تھا ، کچھ فرصت نہ ہوتی تھی - آج اس نے بہت شکایت کی اور مطلب لکھ کر دے دیا - وہ نظم کر رہا ہوں - اس سے روانی طبع اور مشق سخن کو قیاس کرنا چاہیے ؏

ایک مشاعرے میں میر تقی مرحوم بھی موجود تھے ، شیخ مصحفی نے غزل پڑھی :

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو
مکھڑے کو چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

جب یہ شعر پڑھا

یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ اُدھر زلف اُڑا لے گئی دل کو

تو میر صاحب قبلہ نے بھی فرمایا کہ بھئی ذرا اس شعر کو پھر پڑھنا - ان کا اتنا کہنا ہزار تعریفوں کے برابر تھا - شیخ موصوف اسی قدر الفاظ کو فرمان آل تمغا اپنے کمال کا سمجھے بلکہ کئی دفعہ اُٹھ اُٹھ سلام کیے اور کہا کہ میں اس شعر پر اپنے دیوان میں ضرور لکھوں گا کہ حضرت نے دوبارہ پڑھوایا

وہ اپنی غزلوں میں ملکی خصوصیتوں کے مضمون بھی لیتے ہیں، مگر نہ اپنے ہمعصر سید انشا کی طرح بہتان سے نہ جرأت کی طرح کمی سے، چنانچہ کہتے ہیں:

دیکھا نہ میں نے ہند میں جب ختکۂ پیشاوری | لینے بریخ اے مصحفی اروح اپنی پیشاور گئی

نہ کیوں کہ سیر کرے شہر دل کے سینے میں | جو خالِ چشم کہ برسوں رہا ہو مینوں میں

کیوں نہ دل نظارگی کا جائے لوٹ | لکھنؤ میں حسن کی بندھنی ہے پوٹ

تختۂ آب چمن کیوں نہ نظر آئے سپاٹ | یاد آئے مجھے جمن وہ نگینوں کا گھاٹ

بعض جگہ اپنے وطن کا محاورہ یاد آجاتا ہے اور کہہ دیتے ہیں۔

تیغ نے اس کی کلیجا کھا لیا
اس نے آتے ہی مجھے سنگوا لیا

چمن میں چل کے کراے مصحفی تو نالہ و آہ | جو جی چلا ہو ترا امتحان بلبل کو

نہ میں صحرا میں نہ گلشن میں نکل جاؤں گا | خوگرِ شہر ہوں یاں خاک میں رل جاؤں گا

انھیں عادت تھی، اکثر جگہ معاصرین پر چوٹ کر جاتے ہیں، چنانچہ کہا ہے:

کچھ میں جرأت نہیں ہوں مصحفی سحر بیان | میر و مرزا سے لڑانے یہ غزل جاؤں گا

اور تو ثانی کوئی اس کا نہیں
مصحفی کا ہے قتیل البتہ چوٹ

اکثر غزلوں کے مقطع میں اپنے فخریے اور ملکِ سخن کی بادشاہی کا دعویٰ اور مشاعرے کا اپنے دم قدم سے قائم ہونا اور سب شعراء کو اپنا خوشہ چین کر دینا ایک بات تھی اور یہ دعویٰ کچھ بے جا بھی نہ تھا، مگر جب سید انشاء اور جرأت وہاں پہنچے تو نتیجہ بہت برا ظاہر ہوا، چنانچہ ان معرکوں کے بعض حالاتِ مناسب حال لکھتا ہوں۔ اگرچہ ان میں بھی اکثر باتیں خلاف تہذیب ہیں۔ مگر فن زبان کے طلب گاروں کا خیال اس معاملے میں کچھ اور ہے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ نظم اردو میں چند خیالات معمولی ہیں اور بس۔ عام مطالب کے ادا کرنے میں قوتِ بیانیہ کا اثر نہایت ضعیف ہے۔ ہاں ہجو کا کوچہ ہے کہ اس میں ایک چٹیک جو شاعر کے دل کو لگی ہوتی ہے تو وہ تاثیر کلام سے مل کر سوتے دلوں کی بغل میں ذرا گدگدی کر جاتی ہے۔ بیان میں صفائی اور زبان میں گرمی و طراری پیدا کرنی چاہو تو ایسے کلاموں کا پڑھنا ایک عمدہ اوزار زبان کے تیز کرنے کا ہے۔ مرزا رفیع کی ہجویں اُن کی کلیات میں موجود ہیں، مگر شیخ مصحفی، سید انشا کی ہجویں فقط چند بڈھوں کی زبانوں پر رہ گئی ہیں جن کی نظم حیات عنقریب نثر ہوا چاہتی ہے۔ علاوہ برآں اس صورت حال کا حال دکھانا بھی واجب ہے کہ وہ کیا موقعے ہوتے تھے، جو انھیں ایسی حرکات ناروا پر مجبور

کرتے تھے۔ یہ روایتیں بھی مختلف ہیں اور مختلف زبانوں پر پریشان ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ انھوں نے ان ہجووں میں فحش اور گالیوں سے انتہائی درجے کی کثافتیں بھری ہیں۔ خیر ہمیں چاہیے کہ تھوڑی دیر کے لیے شہد کی مکھی بن جائیں۔ جہاں رسیلا پھول دیکھیں، جا بیٹھیں۔ جالے اور میلے میلے پتوں سے بچیں۔ جب رس لے چکیں، فوراً اُڑ جائیں۔ اب اِن کے اور سید انشا کے معرکوں کا تماشا دیکھو۔ واضح ہو کہ اوّل تو مرزا سلیمان شکوہ کی غزل کو مصحفی بنایا کرتے تھے، جب سید انشاء پہنچے تو اِن کے کلام کے سامنے اِن کے شعر کب مزا دیتے تھے۔ غزل سید موصوف کے پاس آنے لگی۔ چند روز کے بعد شیخ صاحب کی تنخواہ میں تخفیف ہوئی۔ اس وقت انھوں نے کہا:

؎ چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق — تھا مردِ معمر کہیں دس بیس کے لائق؟
اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے — ہم بھی تھے کبھی روزوں میں پچیس کے لائق
استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر — ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

چارے کے لگانے سے ہوا دو کا اضافہ
پھر وہ نہ جلے جی میں کہ ہو تیس کے لائق

پھر بھی آمد و رفت جاری تھی۔ اکثر غزلوں میں دونوں باکمال طبع آزمائی کرتے تھے اور کچھ چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی مگر اس طرح کہ کوئی سمجھے، کوئی نہ سمجھے۔ ایک دن شیخ مصحفی نے مرزا سلیمان شکوہ کے جلسے میں یہ غزل پڑھی:

زہرہ کی جو آئی کفِ ہاروت میں انگلی — کی رشک نے جا دیدۂ ماروت میں انگلی
بن دودھ انگوٹھے کی طرح چوسے ہے کودک — رکھتی ہے تصرف عجب اک قوت میں انگلی
غرفے کے ترے حال پہ از بہرِ تاسف — ہر موج سے تھی گل دہنِ حوت میں انگلی
مہندی کے یہ چھلّے نہیں، پوروں پہ بنائے — ہے اس کی ہر اک حلقۂ یاقوت میں انگلی
. . . . . . — ناچی ہے تری عالمِ لاہوت میں انگلی
شہتوت ہے یا صانعِ عالم نے لگا دی — شیریں کی یہ شاخِ شجرِ توت میں انگلی
. . . . . . — حائک کی گرفتار ہو جوں سوت میں انگلی
تھا مصحفی وہ مائلِ گریہ کہ پس از مرگ — تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

اسی طرح میں سید انشاء کی غزل کا مطلع تھا ؎

؎ دیکھ اس کی بڑی خاتمِ یاقوت میں انگلی
ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی

اور بعض شخصوں کی بھی غزلیں تھیں۔ چنانچہ جب مصحفی چلے گئے تو یاروں میں اُن کے بعض

اشعار پر بہت چرچے ہوئے اور غزل کو اُلٹ کر بڈھے بیچارے کے کلام کو خراب کیا۔ چند شعر اس کے خیال میں ہیں، جو فحش قبیح کے سبب سے خیال میں رکھنے کے قابل بھی نہیں۔ مقطع البتہ صاف ہے، اس لیے لکھتا ہوں:

تھا مصحفی کا ناجو چھپانے کو لیس از مرگ
رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

یہیں سے فساد کی بنیاد قائم ہوئی اور طرفین سے ہجویں ہو کر وہ خاکہ اُڑا کہ شائستگی نے کبھی آنکھیں بند کر لیں اور کبھی کانوں میں انگلیاں دے لیں۔

غرض اس غزل کی خبر شیخ مصحفی کو پہنچی۔ وہ پرانا مشاق، لکھنؤ بھر کا اُستاد کچھ چھوٹا آدمی نہ تھا۔ باوجود بڑھاپے کے بگڑ کھڑا ہوا اور یہ غزل فخریہ کہی۔ اب خواہ اُسے بڑھاپے کی سُستی کہو، خواہ طبیعت کا امروہہ پن کہو، خواہ آئینِ متانت کی پابندی سمجھو، غرض اپنی وضع کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اور اپنے انداز میں خوب کہا۔ غزل فخریہ:

مُدت سے ہوں میں سرخوشِ صہبائے شاعری
ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری

میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ شعر کو
برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری

پھبتا نہیں ہے بزمِ امیرانِ دہر میں
شاعر کو میرے سامنے غوغائے شاعری

اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے
سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

ہے شاعروں کی اب کے زمانے کی یہ معاش
پھرتے ہیں بیچتے ہوئے کالائے شاعری

لیتا نہیں جو مول کوئی مفت بھی اُسے
خفت اُٹھا کے آتے ہیں گھر لائے شاعری

اے مصحفی ز گوشۂ خلوت برون خرام
خالی ست از برائے تو خود جائے شاعری

ہر سفلہ را زبان و بیان تو کے رسد
آرے توئی فغانی و بابائے شاعری

مجنوں منم چرا دگرے رنج مے برد
در حصۂ من آمدہ لیلائے شاعری

اس کے علاوہ اور غزلیں بھی کہیں کہ جن میں اس قسم کے اشارے کنایے ہیں۔ چونکہ سید انشاء صاحب عالم کے ہاں ہر صحبت میں صدر نشین تھے، انھیں خیال ہوا کہ مصحفی میرا بھی یار ہے، مبادا اُسے کچھ خیال ہو، خود پالکی میں سوار ہو کر پہنچے اور کہا کہ جلسے میں اس طرح گفتگو ہوئی ہے، بھئی تمھیں میری طرف سے کچھ ملال نہ ہو۔ شیخ مصحفی نے نہایت بے پروائی سے کہا کہ نہیں بھئی مجھے ایسی باتوں کا خیال بھی نہیں اور اگر تم کہتے تو کیا تھا۔ اخیر کا فقرہ سید انشاء کو کھٹکا۔ آتے ہی یاروں کو اور بھی چمکا دیا۔ ادھر سے انھوں نے کچھ اور کہا، ادھر سید انشاء نے بحرِ طویل میں یہ شعر کہے:

# ہجو در بحرِ طویل

بخداوندیٔ ذاتے کہ رحیم است و کریم است و علیم است و حلیم است و حکیم است و عظیم است و سلیم است و قدیم است و شریف است و لطیف است و خبیر است و بصیر است نصیر است و کبیر است و رؤف است و غفور است و شکور است و ودود است و مرا خلق نمود است و بود خالقِ آفاق ـ قسم میخورم اکنوں کہ مرا ہیچ نہ ہجو تو سرو کار نبود است ولے از طرفت گشت شروع اینہمہ اقوالِ مزخرف ـ شنوائے مردک ناداں اندرہ دہنت شاشۂ عالم غزل پوچ تو و مثنوی ہرزہ کہ مجموعہ دشنام غلاظ است و شدادا است گزشت از نظراں لحظہ بناچار ترا ہجو نمودم کہ دلم خون شد و جوشید و بلرزید و بہ پیچید و طپید و جگر آتش شدہ در سینہ سوزانِ منِ خستہ دلِ مضطر و حیران ـ اندرہ دہنت شاشۂ عالم اگر از نطفۂ ابلیس نباشی دل ہجو من سید نخراشی کہ از اولادِ حسین است و نجیب الطرفین است و شریف است و نظیف است و لطیف است و فصیح است و بلیغ است و بود محسن ہر حیکہ بجز لطف و کرم بخشی و تعریفِ کمال و صفت پیش کسے گاہ بیان ہیچ نکردہ است و ترا بود ثنا خواں ـ الخ

انہی دنوں میں مشاعرے میں غزل طرح ہوئی ـ اس میں اِن سب صاحبوں نے غزلیں کہیں، مُصحفی نے بھی آٹھ شعر کی غزل لکھی ـ غزل مصحفی:

سر مُشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن
نے موے پری ایسے نہ یہ حوُر کی گردن

مچھلی نہیں ساعد میں ترے بلکہ نہاں ہے
وہ ہاتھ میں ماہیِ سقنقور کی گردن

یوں مُرغِ دل اس زُلف کے پھندے میں پھنسا ہے
جوں رشتۂ صیاد میں عصفور کی گردن

دل کیوں کہ پری حوُر کا پھر اس پہ نہ پھسلے
صانع نے بنائی تری بلّور کی گردن

اک ہاتھ میں گردن ہو صراحی کی تو ہاں ہے
اور دوسرے میں ساقیِ مخمور کی گردن

ہر چند میں جُھک جُھک کے کیے سیکڑوں مُجرے
پر خم نہ ہوئی اُس بُتِ مغرور کی گردن

کیا جانیے کیا حال ہُوا صبح کو اس کا
ڈھلکی ہوئی تھی شب ترے رنجور کی گردن

یوں زلف کے حلقے میں پھنسا مُصحفی اے وائے
جوں طوق میں ہووے کسی مجبور کی گردن

سید انشا نے اس غزل پر اعتراض کیے اور ایک قطعہ بھی نظم کیا ـ اُن کی غزل اور قطعہ درج ہوتا ہے:

# سیّد انشاء کی غزل مصحفی کے جواب میں

توڑوں گا خُمِ بادۂ انگور کی گردن
رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

خود دار کی بن شکل الفہائے انا الحق
نِت چاہتے ہیں اک نئے منصور کی گردن

کیوں ساقیِ خورشید جبیں کیا ہی نشے ہوں
سب یونہی چڑھا جاؤں مے نور کی گردن

اُچھلی ہوئی ورزش سے تری ڈنڈ پہ مچھلی
ہے نامِ خدا جیسے سقنقور کی گردن

تھا شخص جو گردن زدنی اس سے یہ بولے
اب دیکھئے جو دینی ہے منظور کی گردن

آئینے کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سر خرس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن

یوں پنجۂ مژگاں میں پڑا ہے یہ مرا دل
جوں چنگلِ شہباز میں عصفور کی گردن

تب عالمِ مستی کا مزا ہے کہ پڑی ہو
گردن پہ مری اس بتِ مخمور کی گردن

بیٹھا ہو جہاں پاس سلیمان کے آصف
واں کیوں نہ جھکے قیصر و فغفور کی گردن

بھینچے ہے بغل اپنی میں اس زور سے جو عشق
تو توڑنے پر ہے کسی مجبور کی گردن

اے مست یہ کیا قہر ہے خشتِ سرِ خم سے
کیوں تو نے صراحی کی بھلا چُور کی گردن

محفل میں تری شمع بنی موم کی مریم
پگھلی پڑی ہے اُس کی وہ کافور کی گردن

اے دیوِ سفیدِ سحری کاش تو توڑے
اِک مُکے سے خود کے شبِ دیجور کی گردن

جب کشتۂ اُلفت کو اٹھایا تو الم سے
بس ہل گئی اس قاتلِ مغرور کی گردن

بے ساختہ بولا کہ ارے ہاتھ تو ٹک دو
ڈھلکے نہ مرے عاشقِ مغفور کی گردن

حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصد جو انشاء
تو توڑ دے جھٹ بلعم با عور کی گردن

# قطعہ در ہجو مشتمل بر اعتراضات

سُن لیجئے گوشِ دل سے مرے مشفقا یہ عرض
بطور گو درست ہو، لیکن ضرور کیا

دستور و نور و طور یہ ہیں قافیے بہت
مانندِ بید غصے سے مت تھرتھرائیے

یہ تو غضب ہے کہیے غزل آٹھ بیت کی
خواہی نخواہی اُس کو غزل میں کھپائیے

کیا لُطف ہے کہ گردن کافور باندھ کر
اس میں جو چاہیے تو قصیدہ سنائیے

یوں خاطرِ شریف میں گزرا کہ بزم میں
اور اس میں ردیف ایسے انوکھے دکھائیے

ایسے نجس کثیف قوافی سے نظم میں
مُردے کی باس زندوں کو لا کر سنگھائیے

گچگلا ہوا شریفہ غزل کو بنائیے
دندانِ ریختہ پہ پھپھوندی جمائیے

بگڑے ہیں آپ ہی کے یہ آتی ہے شاعری — بس منہ ہی منہ میں رکھیے اسے مت سراہیے
گردن کا دخل کیا ہے سقنقور میں بھلا — سانڈے کی طرح آپ نہ گردن ہلائیے
مشفق کڑی کمان کو کڑی نہ بولیے — چلّا کے مفت تیر ملامت نہ کھائیے
اُردو کی بولی ہے یہ بھلا کھائیے قسم — اس بات پر اب آپ ہی مصحف اُٹھائیے
اُستاد گرچہ ٹھہرے ہیں صاحب یوہیں سہی — لیکن ڈھکی ہی رکھیے بس اس کو چھپائیے
جھٹ لکھیئے روپ رام کٹارا کو ایک خط — بھلّو کی مہر سے سند اس کی منگائیے
اپنی کمک کے واسطے جا بھرت پور میں — رنجیت سنگھ جاٹ کو ہمراہ لائیے
یا گرد و پیش کے قصباتی جو لوگ ہیں — اک پلوا باندھیے انھیں جلدی بلائیے
مخلص کا التماس یہ ہے ہو سوچ کر — کہنے سے ایسے ریختہ کے باز آئیے
سرکار کی یہاں نہیں گلنے کی دال کچھ — رو ڈی جو کھائی ہووے تو پنجاب جائیے
ستلج بیاس راوی جہلم کی سیر کر — پنجاب والے لوگوں کو یہ کچھ سنائیے
خشکا گدھوں کو دیجئے لوزینہ گاڑ کر — واں جا کے بین بھینس کے آگے بجائیے
اس رمز کا یہاں شنوا کون ہے بھلا — اب بھیرویں کا ٹپّا کوئی آپ گائیے

مصحفی نے اس کا جواب اسی غزل میں دیا:

## قطعہ جواب شیخ مصحفی کی طرف سے

اے آنکہ معارض ہو مری تیغ زبان سے — تو نے سپر عذر میں مستور کی گردن!
ہے آدم خاکی کا بنا خاک کا پُتلا — گر نور کا سر ہووے تو ہو نور کی گردن
میں لفظ سقنقور مجرد نہیں دیکھا — ایجاد ہے تیرا یہ سقنقور کی گردن
لنگور کو شاعر تو نہ باندھے گا غزل میں — کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن
گردن تو صراحی کے لیے وضع ہے ناداں — لے جا ہے خُم بادۂ انگور کی گردن
اس سے بھی میں گزرا غلطی اور یہ سنیئے — باندھے ہے کوئی خوشۂ انگور کی گردن
کافور سے مطلب ہے مرا اُس کی سفیدی — ٹھنڈی تو میں باندھی نہیں کافور کی گردن
یہ لفظ مشدّد بھی درست آیا ہے تجھ سے — خم ہوتی ہے کوئی مری بلور کی گردن
اتنی تو تمیز آئی تجھے ربط بھی کچھ ہے — ہر قافیے میں تو نے جو منظور کی گردن
یوں سینکڑوں گردن تو گیا باندھ تو کیا ہے — سوجھی نہ تجھے حیف کہ مزدور کی گردن
جو گردنیں میں باندھی ہیں لا تجھ کو دکھا دوں — تو مجھ کو دکھا دے شب دیجور کی گردن

گردن کے تئیں چاہیئے اک شکل کشیدہ
خم کر کے سمجھ ٹک سرِ مغرور کی گردن

مضمون تو میرا ہی ہے گو اور طرح سے
باندھے تو گماں اپنے ہیں رنجور کی گردن

گر قافیہ پیمائی ہی منظور تھی تجھ کو
تو باندھی نہ کس واسطے مقدور کی گردن

لاکھوں ہی معافی کو کیا قتل پر افسوس
سوجھی نہ تجھے دشنہ و ساطور کی گردن

منصف ہو تو پھر نام نہ لے دعوے کا ہرگز
یہ بوجھ اُٹھا سکتی نہیں مور کی گردن

منظور ہی کی ... ... تو باللہ
باندھی نہ گر اب خانۂ زنبور کی گردن

ٹوٹے ہوئے پنجے کی طرح میرے قلم سے
جاتی ہے پچک شاعرِ مغرور کی گردن

انصاف تو کر دل میں کہ اک تیغ میں کیسے
میں کاٹ دی دعوے کی ترے زور کی گردن

کھڑاگ یہ گایا پہ ترے ہاتھ نہ آئی
افسوس کہ اس تان پہ طنبور کی گردن

سوجھا نہ تجھے ورنہ بتاتا تو اسی دم
ناسور کی پٹی کو بھی ناسور کی گردن

انصاف کیا اس کا ہیں اب شہ کے حوالے
جھکتی ہے جہاں مار سے لے مور کی گردن

وہ شاہِ سلیماں کہ اگر تیغِ عدالت
ٹک کھینچیں تو دو ہو وہیں فغفور کی گردن

جس سر پہ ٹک اپنا وہ رکھے دستِ نوازش
اُس سر کے لیے تکیہ ہو پھر حور کی گردن

اس در کا جو سجدہ انھیں منظور نہ ہوتا
ملتی نہ فرشتوں کو کبھی نور کی ... گردن

اے مصحفی خامش بسخن طول نہ کھچ جائے
یاں کو تہ ہی بہتر سرِ پر شور کی گردن

ان دونوں قطعوں کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ دونوں باکمال ادائے مطلب پر کس قدر قدرت رکھتے تھے۔ بے شک عام لطفِ بیان اور خاص طنزوں کے نشتر سید انشاؔ کی ترجیح کے لیے سفارش کریں گے، مگر بڈھے دیرینہ سال نے، جو اسی غزل کی زمین میں مطالب مطلوبہ کو ادا کر دیا۔ یہ قدرتِ کلام شاید اُسے پیچھے نہ رہنے دے ؁

شیخ مصحفی کے شاگردوں میں منتظر اور گرم دو بڑے چلتے طپنچے تھے۔ وہ نواب صاحب کی سرکار میں توپ خانہ وغیرہ کی خدمت رکھتے تھے۔ انھوں نے زبان سے، تدبیروں سے، معرکوں سے اُستادی کی اُستادی کے مورچے باندھے۔ ایک مثنوی لکھ کر گرم طمانچہ نام رکھا۔ میر انشاء اللہ خاں نے جب مشاعرے میں یہ گردن کی غزل پڑھی اور اس میں یہ شعر پڑھا:

آئینے کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سرِ خرس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن

مقطع میں بلعم باعور کا اشارہ بھی اُن کی کہن سالی پر چوٹ کرتا ہے، کیونکہ وہ حضرت موسیٰ

کے عہد میں ایک عابد تھا، جو بڑھاپے اور ریاضت سے اس قدر تحلیل ہو گیا تھا کہ شاگرد پوٹلی میں باندھ کر کبھی بغل میں مارے پھرتے تھے، کبھی کندھے پر ڈال لیتے تھے اور جہاں چاہتے تھے لے جاتے تھے تو منتظر نے بھی اپنی غزل میں سید موصوف پر چوٹیں کیں، اُن میں سے ایک مصرع یاد ہے۔

ع باندھی دُم لنگور میں لنگور کی گردن

کیونکہ سید انشاء اکثر دوپٹہ گلے میں ڈالے رہتے تھے۔ اس کا ایک سرا آگے اور دوسرا سرا پیچھے پڑا رہتا تھا۔ چنانچہ سید انشاء نے اسی وقت ایک شعر اور کہا:

سفرے پہ ظرافت کے ذرا شیخ کو دیکھو
سر لون کا، منہ پیاز کا اچھر سکی گردن

بڈھے بے چارے کا سر بھی سفید تھا۔ گوری رنگت بڑھاپے میں خون جم کر سُرخ ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ بہت جواب و سوال زبانی بھی طے ہوئے۔ مگر اُن کا اب پتا لگنا ممکن نہیں۔ اُستاد مرحوم فرماتے تھے کہ منجملہ اور اعتراضوں کے مصحفی کی غزل میں ماہی سقنقور میں جوی بہ تشدید پڑھی جاتی ہے۔ سید انشاء نے اس پر بھی تمسخر کیا اور شیخ مصحفی نے یہ شعر سند میں

مائیم فقیری سیہ روئی کونین
رخسا سفیدا مرارا نہ شناسیم

سید انشا پر جو اعتراض ہے کہ فقط سقنقور کیوں کہا؟ یہ شیخ مصحفی کا کہنا بے جا ہے، کیونکہ سقنقور ایک جانور کا نام ہے اور یہ لفظ اصل میں یونانی ہے، مچھلی کو اس سے کچھ خصوصیت نہیں ہے۔

سید انشاء کی طبیعت کی شوخی اور زبان کی بے باکی محتاج بیان نہیں۔ چنانچہ بہت سی زٹلی اور فحش ہجویں کہیں کہ جن کا ایک ایک مصرع ہزار قمچی اور چابک کا طراقا تھا۔ بڈھا بیچارا ابھی اپنی تیخی کی جریب اور عصائے غرور کے سہارے کھڑا ہو کر جتنا کمر میں بوتا تھا، مقابلہ کرتا رہا۔ جب نوبت حد سے گزر گئی تو اس کے شاگردوں سے بھی لکھنؤ بھرا پڑا تھا۔ منتظر اور گرم سب کو لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور جو کچھ ہو سکا، شاگردی کا حق ادا کیا۔ ایک دن سب اکٹھے ہوئے۔ شہدوں کا سوانگ بھرا اور ایک ہجو کہہ کر اس کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشا کی طرف روانہ ہوئے اور مستعد تھے کہ زد و کشت سے بھی دریغ نہ ہو۔ سید انشاء کو ایک دن پہلے خبر لگ گئی۔ اب ان کی طبع رنگین کی شوخی دیکھیے کہ مکان کو فرش و فروش، جھاڑ و فانوس سے سجایا اور امرائے

شہر اور اپنے یاروں کو بُلایا۔ بہت سی شیرینی منگا کر خوان لگائے۔ کشتیوں میں گلوریاں، چنگیروں میں پھولوں کے ہار سب تیار کیے۔ جب سُنا کہ حریف کا مجمع قریب آپہنچا، اس وقت یہاں سے سب کو لے کر استقبال کو چلے۔ ساتھ خود تعریفیں کرتے۔ سُبحان اللہ واہ وا سے داد دیتے اپنے مکان پر لائے۔ سب کو بٹھایا اور خود دوبارہ پڑھوایا۔ آپ بھی بہت اُچھلے کُودے، شیرینیاں کھلائیں، شربت پلائے، پان کھلائے، ہار پہنائے، ہنس بول کر عزت و احترام سے رُخصت کیا۔

لیکن سید انشاء نے جو اس کا جواب حاضر کیا، وہ قیامت تھا۔ یعنی ایک انبوہ کثیر برات کے سامان سے ترتیب دیا اور عجیب و غریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں۔ کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے، کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک ہاتھ میں گڈا، ایک میں گڑیا دونوں کو لڑاتے تھے۔ زبانی ہجو پڑھتے جاتے تھے، جس کا ایک شعر یہ ہے۔

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن
لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

اِن معرکوں میں مرزا سلیمان شکوہ بلکہ اکثر امرا نے سید انشاء کا ساتھ دیا اور حریف کے سوانگ کو کوتوال سے کہہ کر ایک دفعہ رکوا دیا۔ اس بات نے شیخ مصحفی کو بہت شکستہ خاطر کر دیا۔ چنانچہ اکثر غزلوں میں رنگ جھلکتا ہے، اِن میں سے غزل کا مقطع و مطلع لکھتا ہوں:

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں | کچھ اس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں

اے مصحفی بے لُطف ہے اس شہر میں رہنا
سچ یہ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

اِن جھگڑوں میں بعض شعروں پر مرزا سلیمان شکوہ کو شبہ ہُوا کہ ہم پر بھی شیخ مصحفی نے چوٹ کی۔ اس کے ضمن میں انھوں نے کہا:

## قصیدہ در معذرت اتہام انشاء شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ بہادر

قسم بذاتِ خدا کے کہ ہے سمیع و بصیر | کہ مجھ سے حضرتِ شہ کی ہوئی نہیں تقصیر
سوائے اس کے کہ حال اپنا کچھ کیا تھا میں عرض | سو وہ بطور شکایت نہ تھی اندکے تقریر
گر اس سے خاطر اقدس پہ کچھ ملال آیا | اور اس گنہ سے ہوا بندہ واجب التعزیر
عوض روپوں کے ملیں مجھ کو گالیاں لاکھوں | عوض دوشالے کے خلعت بشکل نقش حریر
سلف میں تھا کوئی شاعر نواز ایسا کب؟ | جو ہے تو شاہ سلیمان شکوہ عرش سریر

مزاج میں یہ صفائی کہ کر لیا باور — کسی کے حق میں کسی نے جو کچھ کہ کی تقریر
مصاحب ایسے کہ گر کچھ کسی سے لغزش ہو — تو اس کے رفع کی ہرگز نہ کر سکیں تدبیر
دگر کریں تو پھر ایسی کہ نارِ طیش و غضب — مزاجِ شاہ میں ہو مشتعل بقصدِ تشہیر
سو نابِ ذرّہ کہاں نورِ آفتاب کہاں — کہاں وہ سطوتِ شاہی، کہاں عجزِ فقیر
مقابلہ جو برابر کا ہو تو کچھ کہیے — کہاں وہ پیقی و دیبا کہاں پلاس و حصیر
میں اک فقیرِ غریب الوطن مسافر نام — رہے ہے آٹھ پہر جس کو قوت کی تدبیر
مرا دہن ہے کہ مدحِ حضورِ اقدس کو — اُلٹ کے پھیر بحرفِ ذمیمہ دوں تغیر
یہ افترا ہے بنایا ہوا سب انشاء کا — کہ بزم و رزم میں ہے پائے تخت کا وہ مشیر
مزاجِ شاہ ہو یوں منحرف تو مجھ کو بھی — یہ چاہیے کہ کروں شکوہ اس کا پیشِ وزیر
اگر وزیر بھی بولے نہ کچھ خدا لگتی — تو جاؤں پیشِ محمدؐ کہ ہے بشیر و نذیر
شفیعِ روزِ جزا پادشاہ اَوْادنی — نہ کہ وہ جرم پہ جس نے نہیں لکھی تعزیر
کہوں یہ اس سے کہ اے جُرم بخشِ جُرم گنہاں — تری غلامی میں آیا ہے دادخواہ فقیر
خطا ہو میری پہلے تو کرا اسیر مجھے — وگرنہ عدو کی پنہا اس کو طوق اور زنجیر
اگرچہ بازیِ انشائے بے حمیت کو — رہا خموش سمجھ کر میں بازیٔ تصویر
سو میں ملک نہیں ایسا بشر ہوں تا کے وچند — کہے سے اس کے کروں گا نہ ماجرا تحریر
کیا میں فرض کہ میں آپ اس سے درگزرا — پھرے گا مجھ سے کوئی گر کرم و منتقل کا ضمیر
اور ان پہ بھی جو کیا میں نے تازیانہ دمنع — تو ہو سکے ہے کوئی ان کے دفع کی تدبیر
ہزار شہدوں میں بیٹھیں ہزار جا پہ ملیں — پھریں ہمیشہ لیے جمع ساتھ اپنے کثیر
نہ مانیں تیغِ سیاست نہ قہرِ سلطانی — نہ سمجھیں قتل کا وعدہ نہ ضربتِ شمشیر
مزاج ان کا ٹھٹھول اس قدر پڑا ہے کہ وہ — ہنسی ہی سمجھتے ہیں اس بات کو نہ جرمِ کبیر
پھر اس پہ یہ بھی ہے یعنی کہ اس ہنگام کے بیچ — جو ہووے منشی تو کچھ نثر میں کرے تسطیر
فکیت جن کو خدا نے کیا ہو موزوں طبع — اور اپنے فضل سے بخشی ہو شعر میں توقیر
یہ کوئی بات ہے سو ان کے وہ خوش رہیں — ہوا ہے مصلحتہً گو کہ تصغیر یہ آخر
مگر یہ بات میں مانی کہ سوانگ کا پانی — اگر میں ہوں تو مجھے دیجئے بدتریں تعزیر
میں آپ فاقہ کش اتنا مجھے کہاں مقدور — کہ فکر اور کروں کچھ بغیر آتشِ شعیر
مرے حواس پریشاں ہائے پریشانی — ہو جیسے لشکرِ بشکستہ کی خراب ابتر
گر اس پہ صلح کی ٹھہری رہے تو صلح سہی — اگر وہ پھیر شرارت بشر ہوں میں بھی شریر

جواب ایک کے یاں دس ہیں اور دس کے سو — نگاہ کرتے تھے اوّل بائیں تقلیل و کثیر!
حصول یہ ہے کہ جب کوتوال تک قضیہ — گیا ہو از پئے تہدیدِ شاعرانِ شریر
تو کوتوال ہی بس اُن سے اب سمجھ لے گا — یہ دمبدم کی شکایت کی ہے عبث تحریر
یہ وہ مثل ہے کہ جس طرح سالے شہر کے بیچ — بلند قامتی اپنی سے متہم ہو بعیر
سو متہم مجھے ناداں نے ہجو سے کیا — قباحت اس کی جو بر سمجھے تو اُس کو دے تعزیر
دے مزاجِ مقدس جو لااُبالی ہے — نہیں خیال میں آتا خیال حرفِ حقیر
جو کچھ ہوا سو ہوا مصحفی بس اب چپ رہ — زیادہ کر نہ صداقت کا ماجرا تحریر

خدا پہ چھوڑ دے اس بات کو وہ مالک ہے
کرے جو چاہے، جو چاہا کیا بہ حکمِ قدیر

سید انشاء پھرتے چلتے دِلّی میں آئے تھے اور کچھ عرصہ رہے تھے اور جو لوگ ان معرکوں میں اُن کے رفیق تھے۔ ان میں سے اکثروں نے دِلّی کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ چنانچہ ایک موقع پر شیخ مصحفی نے یہ قطعہ کہا، جس کے چند شعر ساتویں دیوان میں ہیں۔ قطعہ

بعضوں کا گماں ہے یہ کہ ہم اہلِ زباں ہیں — دِلّی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں
پھر تس پہ ستم اور یہ دیکھو کہ عروضی — کہتے ہیں سدا آپ کو اور لاف زناں ہیں
سیفی کے رسالے پہ بناں اُن کی ہے ساری — سو اُس کو بھی گھر بیٹھے وہ آپ ہی نگراں ہیں
اِک ڈیڑھ ورق پڑھ کے وہ جامی کا رسالہ — کرتے ہیں گھمنڈ اپنا کہ ہم قافیہ داں ہیں
نہ حرف جو وہ قافیے کے لکھتے ہیں اُس میں — دانا جو انھیں سنتے ہیں یہ کہتے ہیں ہاں ہیں
تعقید سے واقف نہ تنافر سے ہیں آگاہ — نہ حرف یہی قافیے کے ورد زباں ہیں
کرتے ہیں کبھی ذکر وہ ایطائے خفی کا — ایطائے جلی سے کبھی پھر حرف زناں ہیں
اوّل تو ہے کیا شعر میں ان باتوں سے حاصل — بالفرض جو کچھ ہو بھی تو یہ سب پہ عیاں ہیں
حاصل ہے زمانے میں جنھیں نظم طبیعی — نظم اُن کی کے اشعار بہ از آبِ رواں ہیں
پرواہ انھیں کب ہے ردیف اور روی کی — کب قافیے کی قید میں آتش نفساں ہیں
مجھ کو نہ عروض آتی ہے نہ قافیہ چنداں — اِک شعر سے گرویدہ مرے پیر و جواں ہیں

اس قطعے کے مطلع پر خیال کرو کہ دِلّی اس وقت کیا شے تھی چند روز وہاں رہ جانا گویا زباندانی کا سرٹیفکیٹ ہوتا تھا۔ خیر اب شیخ صاحب کے اقسامِ سخن سے لطف حاصل کرنا چاہیئے۔ باوجودیکہ شیخ مصحفی بہت سن رسیدہ تھے، مگر سید انشا کے مرنے کا انھیں افسوس کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک غزل کے مقطع میں کہا ہے:

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں
یاد ہے مرگِ قتیلؔ و مردنِ انشاؔ مجھے

کیا کیا فساد، کیا کیا شور و شر ہوئے — کیسے کیسے خاک کے اُڑے، انجام یہ کہ خاک

## شیخ مصحفی کا قصیدہ نعت میں

حنا سے ہے یہ تری سُرخ اے نگار انگشت — کہ ہو نہ پنجۂ مرجاں کی زینہار انگشت
ضعیف اتنا ہوا ہوں کہ میرے ہاتھوں میں — نہیں یہ پنجۂ طاقت سے بھلہ دار انگشت
ہلال و بدر ہوں یک جا عرق فشانی کو — رکھے جبیں پہ جو تُو کر کے تاب دار انگشت
فراقِ مو کمراں سے میں یہ ہُوا باریک — کہ ہو گئیں مری سوزن صفت ہزار انگشت
زبسکہ زشت ہے دُنیا میں ہاتھ پھیلانا — رکھے ہے سمٹی ہوئی اپنی پشت خار انگشت
وہ جب لگائے ہے فندق تو دیکھ دیکھ مجھے — رکھے ہے مُنہ میں تاسّف کی روزگار انگشت
شمار داغ سے کب اتنی مجھ کو فرصت ہے — کہ رکھ سکوں بسرِ چشمِ اشکبار انگشت

چند شعر کے بعد گریز کرتے ہیں

بیاں ضرور ہے اب دہشت و تیغ کا اُس کی — نکل گئی سپرِ مہ سے جس کی پار انگشت
محمدؐ عربی معجزوں کا جس کے کبھی — نہ کر سکے فلکِ پیر کی شمار انگشت
چمن میں اُس کی رسالت کا جب آئے ہے ذکر — عَلَم کرے ہے شہادت کی شاخسار انگشت
وظیفہ جس کا پڑھے ہے یہ دانۂ شبنم — دُعا میں جس کی ہے کھولے ہوئے چنار انگشت
اگر ہو مہرۂ گہوارہ سنگ فرش اس کا — نہ چُوسے اپنی کبھی طفلِ شیر خوار انگشت
اٹھا دے گر کفِ افسوس ملنے کی وُہ رسم — نہ ہو دے پھر کبھی انگشت سے دوچار انگشت
کرے جو وصف وہ اس تاجِ انبیاء کے رقم — قلم کی جوں نئے نرگس، ہو تاجدار انگشت

## غزلیات

دن جوانی کے گئے موسمِ پیری آیا — آبرو خواب ہے اب وقتِ حقیری آیا
تاب و طاقت رہے کیا خاک کہ اعضا کے تئیں — حاکمِ ضعف سے فرمانِ تغیری آیا
سبق نالہ تو بُلبُل نے پڑھا مجھ سے ولے — نہ اُسے قاعدۂ تازہ صفیری آیا
شاعری پر کبھی اپنی جو گئی اپنی نظر — نہ ضمیر اپنے میں اس وقت ضمیری آیا
ورد پڑھنے جو اُٹھا صبح کو سب سے پہلے — مکتبِ عشق میں ہونے کو وہ میری آیا

اس کے در پر میں گیا سوانگ بنائے تو کہا
چل بے چل دور ہو کیا لے کے فقیری آیا

پوچھ مت معرکۂ عشق کا ہنگامہ کہ واں
قیس مارا گیا وامق باسیری آیا

اے سلیماں ہو مبارک تجھے یہ شاہی و تخت
تیرا آصف بھی بسامان وزیری آیا

چشمِ کم سے نہ نظر مصحفیِ خستہ پہ کر
وہ اگر آیا تو مجلس میں نظیری آیا

غزل مذکورۂ ذیل سید انشاء کی غزل پر ہے :

پیری سے ہو گیا یوں اس دل کا داغ ٹھنڈا
جس طرح صبح ہوتے کر دیں چراغ ٹھنڈا

سر گرمِ سیرِ گلشن کیا خاک ہوں کہ اپنا
نزلے سے ہو رہا ہے آپ ہی دماغ ٹھنڈا

بلبل کے گرم نالے جب سے سنے ہیں اس نے
دیوارِ گلستان پر بولے ہے زاغ ٹھنڈا

کیا کیا خوشامدی نت پنکھا لگے ہلانے
کشتی سے جب ہوا وہ کر کے فراغ ٹھنڈا

صرصر سے کم نہیں کچھ وہ تیغِ تیز جس نے
لاکھوں کا کر دیا ہے دم میں چراغ ٹھنڈا

کشمیری ٹولے میں ہم جاتے تھے روز لیکن
جی آج تک ہوا ہے کر کے سراغ ٹھنڈا

گرمی کی رت ہے ساقی اور اشکِ بلبلاں نے
چھڑکاؤ سے کیا ہے سب صحنِ باغ ٹھنڈا

ایسے میں اک صراحی شورے لگی منگا کر
لبریز کر کے مجھ کو بھر دے ایاغ ٹھنڈا

کیا ہم ٹکڑ گدا ہیں جو مصحفی یہ سوچیں
ہے گرم اس کا چولھا اس کا اجاغ ٹھنڈا

جرأت اور سید انشاء کے مستزاد بھی دیکھو کہ مشاعرے کے معرکے میں پڑھے گئے تھے ؛

# غزل مستزاد

خوشبوئی سے جن کی ہو خجل عنبر سارا
ہم مشک کی نکہت
بال الجھے ہوئے ہیں نہ کہ ریشم کا ہے لچھا
اللہ دی نزاکت

پاؤں میں کفک اور لگے ہاتھوں میں مہندی
از خونِ محبان
چہرا وہ پری کہیے جسے نور کا بکا
رنگ اگ کی صورت

تلوار لیے ابروسے کج قتل پہ مائل
اے خ[illegible] کے پیاسے
پھولوں کی چھڑی ہاتھ میں اور کان میں بالا
چتون میں شرارت

مسی کی دھڑی اک تو جمی ہونٹوں پہ کافر
اور تمرشی سے پونچھے
پھر تس پہ ستم اس کا وہ پاؤں کا انگوٹھا
جوں خوں کی ہو رنگت

پاؤں میں انی دار پڑی کفش زری کی ۔۔۔ دل جس سے ہو زخمی
اور سر پہ شرارت سے بندھا بالوں کا جوڑا ۔۔۔ سج دھج سوا اک آفت
خونخوار نگہ عربدہ جو آپ سو کیفی! ۔۔۔ سرشار نشے میں
اک ہاتھ میں ساغر تو پھر اک ہاتھ میں مینا ۔۔۔ مستوں کی سی حالت
آیا مرے گھر، دی مرے دروازے پہ دستک ۔۔۔ میں گھر سے نکل کر
دیکھوں تو سر کوچہ اک آشوب ہے پیدا ۔۔۔ آئی ہے قیامت
تب میں نے کہا اس سے کہ اے مایۂ خوبی ۔۔۔ کیا جی میں یہ آیا
اس وقت جو آیا تو مرے پاس اکیلا ۔۔۔ سمجھا نہ قباحت
تو سن کے لگا کہنے کہ اے مصحفی سن بات ۔۔۔ گھر سے مرے مجھ کو
لایا ہے ترا جاذبہ ہی کھینچ کے اس جا ۔۔۔ تھی کس کو یہ قدرت

سر شام اس نے منہ سے جو رخ نقاب الٹا ۔۔۔ نہ غروب ہونے پایا وہیں آفتاب الٹا
جو کسی نے "ولیس راایس" اسے لا کے دی مصوّرہ ۔۔۔ نہ حیا کے مارے اس نے ورق کتاب الٹا
ہیں حساب بوسہ جی میں کہیں اپنے کر رہا تھا ۔۔۔ وہ لگا مجھی سے کرنے طلب اور حساب الٹا
مہ چار دہ کا عالم میں دکھاؤں گا فلک کو ۔۔۔ اگر اس نے پردہ منہ سے شب ماہتاب الٹا
جو خفا ہوا میں جی میں کسی بات پر شب وصل ۔۔۔ سحر اٹھ کے میرے آگے وہی اس نے خواب الٹا
بسوال بوسہ اس نے مجھے ترک کردی جو گالی ۔۔۔ میں ادب کے مارے اس کو نہ دیا جواب الٹا
کہیں چشم مہر اس پہ تو نہ پڑ گئی ہو یا رب ۔۔۔ جو نکلتے صبح گھر سے وہ پھرا شتاب الٹا
میں ہوا ہوں جس پہ عاشق یہ شگرف ماجرا ہے ۔۔۔ کہ مرے عوض لگا ہے اسے اضطراب الٹا
کسی مست کی لگی ہے مگر اس کے سر کو ٹھوکر ۔۔۔ جو پڑا ہے مے کدے میں یہ خم شراب الٹا

یہ مقام آفریں ہے کہ بزور مصحفی نے
انہی قافیوں کو پھر بھی بصد آب و تاب الٹا

جو پھرا کے اس نے منہ کو بقصد نقاب الٹا ۔۔۔ ادھر آسمان الٹا ادھر آفتاب الٹا
نہ قفس میں ایسے مجھ کو تو اسیر کیجیو صیاد ۔۔۔ کہ گھڑی گھڑی وہ ہووے دم اضطراب الٹا
مرے حال پہ مغاں نے یہ کرم کیا کہ سن سن ۔۔۔ مرے پی کے سر پہ رکھا قدح شراب الٹا
ز تشنہ لب جہاں سے جو گیا لحد پہ اس کی ۔۔۔ پس مرگ بھی کسی نے نہ سبوئے آب الٹا
مری آہ نے جو کھولی بعیوق آہ کی برق ۔۔۔ وہیں برق رعد لے کر علم سحاب الٹا
جو خیال میں کسو کے شب ہجر سو گیا ہو ۔۔۔ نہ ہو صبح کو الٰہی کبھی اس کا خواب الٹا

مرے دم اُلٹنے کی جو خبر اُسکو دی کبھی نے ۔۔۔ وہیں نیم رہ سے قاصد بصد اضطراب اُلٹا
جو علی کا حکم نافذ نہ فلک پہ تھا تو پھر کیوں؟ ۔۔۔ بگہِ غروب آیا نکل آفتاب اُلٹا

اب اِسی میں تو سہ غزلہ جو کہے تو کام بھی ہے
نہیں مصحفی مزا کیا جو دو رو کتاب اُلٹا

یہ دم اس کے وقت رخصت بصد اضطراب اُلٹا ۔۔۔ کہ لہو ٹپے دل مژہ سے وہیں خونِ ناب اُلٹا
سرِ لوح اس کی صورت کہیں لکھ گیا تھا مانی ۔۔۔ اُسے دیکھ کر نہ میں نے ورق کتاب اُلٹا
میں عجب یہ رسم دیکھی مجھے روزِ عید قرباں ۔۔۔ وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا
یہ عجب ہے میری قسمت کہ جو دل کسی کو دوں میں ۔۔۔ وہ مرے ہی سر سے مارے اُسے کر خراب اُلٹا
یہ نقاب پوش قاتل کوئی زور ہے کہ جس نے ۔۔۔ کیے خون سیکڑوں اور نہ ذرا نقاب اُلٹا
جو بوقتِ غسل اپنا وہ پھرا لے واں سے مُنہ کو ۔۔۔ تو پھرتے ہی مُنہ اُس کے لگے بہنے آب اُلٹا
میں لکھا ہے خط تو قاصد پہ یہ ہو گا مجھ پہ احسان ۔۔۔ انھیں پاؤں پھر کے تو آ جو ملے جواب اُلٹا
ترے آگے مہر تاباں ہے زمیں پہ سر بسجدہ ۔۔۔ یہ ورق ہے گنجفے کا نہیں آفتاب اُلٹا

نہیں جائے شکوہ اس سے ہمیں مصحفی ہمیشہ
کہ زمانے کا رہا ہے یونہیں انقلاب اُلٹا

غزل ہائے مرقومہ ذیل پر شاہ نصیر کی بھی غزل دیکھو ۔

صاف چولی سے عیاں ہے بدن سُرخ ترا ۔۔۔ نہیں چھپتا تہِ شبنم چمنِ سُرخ ترا
یہی عالم ہے اگر اُس کا تو دکھلا دے گا ۔۔۔ بارشِ خوں کا سماں پیرہنِ سُرخ ترا
وائے ناکامی کہ عاشق کو ترے موت آئی ۔۔۔ قابلِ بوسہ ہوا جب دہنِ سُرخ ترا
تا کمر خون شہیدوں کے بہے گلیوں میں ۔۔۔ جب سے پاجامہ بنا گلبدن سُرخ ترا
خون سے آلودہ ہوا آتا ہے تو اے اشک سفید ۔۔۔ نام ہم کیوں نہ رکھیں یاسمن سُرخ ترا
آتشِ تیز بھی ٹھیرا ہے کہیں یوں بھی سپند؟ ۔۔۔ کہہ رہا ہے یہی خالِ ذقن سُرخ ترا

مصحفی خوش ہو کہ مانگے گا ترے قاتل سے
خوں بہا روزِ قیامت کفنِ سُرخ ترا

کیسہ نالی سے ہوا گل بدن سُرخ ترا ۔۔۔ طالبِ آب نہ ہو کیوں چمن سُرخ ترا
یہی پوشاک کا ہے رنگ تو اے گل ہو گا ۔۔۔ تشنۂ خونِ چمن پیرہن سُرخ ترا
کیوں نہ ہو مردہ بوس زندہ، بنے جب اے شوخ ۔۔۔ پان سے بیر بہٹی دہن سُرخ ترا
مجھ سے اُلٹا ستم فائدہ اے گرگ فلک ۔۔۔ وال ہے بچہ خوری پر دہن سُرخ ترا

کاش اے کشتہ تو محشر میں اُٹھے ہو کے فقیر
گیروا مٹی میں ہووے کفنِ سُرخ ترا

لبِ پان خوردہ کی اس گل کے جو سُرخی دیکھی
رنگ اُڑ جائے گا اے نارونِ سُرخ ترا

سر پہ تابش میں تو رکھے تو دلِ عاشق میں
آگ بھڑکائے نہ کیوں بادزنِ سُرخ ترا

مصحفی چاہیئے کیا اس کو دلیلِ قاطع
سبز ہے خود بہ تخلص سخنِ سُرخ ترا

اک تو تھا آتشِ سوزاں بدنِ سُرخ ترا
شعلہ بر شعلہ ہوا پیرہنِ سُرخ ترا

پان کھانے کی ادا یہ ہے تو اک عالم کو
خوں رلا وے گا مری جان دہنِ سُرخ ترا

گو سے خورشیدِ شفق رنگ کو دیتا ہے فشار
پنجۂ رشک سے سیبِ ذقنِ سُرخ ترا

شمعِ گلگوں غمِ پروانہ میں خوں آشنا نہ رو
طشتِ آتش تو بنا ہے لگنِ سُرخ ترا

سُرخ عیار سے تو کم نہیں اے دُزدِ حنا
کفِ رنگینِ بتاں ہے وطنِ سُرخ ترا

یوہیں اے کشتہ جو آیا تو صفِ محشر میں
آگ دیوے گا لگا واں کفنِ سُرخ ترا

تو اگر نالۂ آہو ہے تو اے عقدۂ زلف
ہے وہ رخسارۂ رنگیں ختنِ سُرخ ترا

اس کے موباف سے بھی تار نے کل شب پوچھا تھا
دامِ شب رنگ ہے کیوں اے رسنِ سُرخ ترا

ہر پری چہرہ ہے پوشیدہ لباسِ گلگوں
میں تو دیوانہ ہوں اے انجمنِ سُرخ ترا

مصحفی زخم ہے تیشے کا ترے ہر مو پہ
نام ہم کیوں نہ رکھیں کوہکنِ سُرخ ترا

رنگ پان سے جو ہوا گل دہنِ سُرخ ترا
مر گئی دیکھ کے بلبل دہنِ سُرخ ترا

پان کھا کر جو مِسی زیب کئے تو نے دو لب
بن گیا مزرعِ سنبل دہنِ سُرخ ترا

سُرخ تو تھا ہی و لے اور ہوا گلناری
پی کے اے گل قدحِ مُل دہنِ سُرخ ترا

تب ہو عاشق کی شبِ وصل تسلی اے گل
مصرفِ بوسہ ہو جب کُل دہنِ سُرخ ترا

غنچہ ساں وا نہ ہوا عالمِ مے نوشی میں
سُن کے شیشے کی بھی قلقل دہنِ سُرخ ترا

شانہ کرتے جو سرِ جعد تو دانتوں میں رکھے
ہو نہ خونخوارۂ کاکل دہنِ سُرخ ترا

تیغِ مریخ پہ چھٹتی ہے ہوائی اب تک
کہیں دیکھا تھا سرِ پل دہنِ سُرخ ترا

مصحفی تو نے زبس گل کے لیے ہیں بوسے
رشک سے دیکھے ہے بلبل دہنِ سُرخ ترا

جو گستاخانہ کچھ اُس سے میں بولا
تو بس ابرو نے تیغا دوہیں تولا

چُھٹے عاشق نہ کیوں اُس کے مُوئے سے
کہ چشمِ شوخ ہے اُس کی ممولا

جزاک اللہ بنایا تو نے صیاد  قفس میں از پئے بلبل ہنڈولا
نہ مارے وست و پا تا اس کا بسمل  الٰہی مار جاوے اس کو جھولا
لب اس گل کے ہیں جام بادۂ لعل  مسی نے ان میں آکر زہر گھولا
یہ وہ گلشن ہے جس میں غم کے مارے  تبسم سے کلی نے منہ نہ کھولا
مری پتلی نے اشکِ خیرہ سر کو  بنایا ہے ہتھیلی کا پھپھولا

کہیں ملتے ہیں ایسے مصحفی یار
نہ آوے دِل کے مرنے کا ممولا

آتش کی غزل کو بھی دیکھنا :

نگاہِ لطف کے کرتے ہی رنگِ انجمن بگڑا  محبت میں تری ہم سے ہر اک اہلِ وطن بگڑا
کچھ اس کی وضع بگڑی کچھ ہے وہ پیماں شکن بگڑا  یہ سج دھج ہے تو دیکھو گے زمانے کا چلن بگڑا
خدا کہتا تھا روزِ حشر میں تجھ سے سمجھ لوں گا  ترے تیشے سے گر شیریں کا نقش اے کوہکن بگڑا
میں سمجھا گریہ سے تاثیر اس دم شمعِ مجلس کی  یہ موتی اشک کا جاتے ہوئے جب تا لگن بگڑا
جو چنگ نالہ کو ہم نے اڑایا ہجر کی شب میں  کہیں گے سب کہ تیرا کھیل اب چرخِ کہن بگڑا
جسے سب بانکے اور ٹیڑھے کریں جھکے دور سے مجرا  وہی رستے میں آخر ہم سے کر کے بانکپن بگڑا
تری مژگاں کی راوت چڑھ گئی جب ان پہ لڑنے کو  بڑی پونہ کے اندر کھلبلی سارا دکن بگڑا
بری صورت سے رہنا ننگ ہے دنیا میں انساں کو  وہ گر جاتا ہے خود جیتا جو کوڑھی کا بدن بگڑا
ہمیشہ شعر کہنا کام تھا والا نژادوں کا  جنھوں نے دیا ہے دخل جب سے بس یہ فن بگڑا
مکانِ تنگ میں پائی نہ جا کلکِ تخیل نے  بنا سب خال و خط مانی سے اس کا پیرہن بگڑا

نہیں تقصیر کچھ درزی کی اس میں مصحفی ہرگز
ہماری نادرستی سے بدن کی پیرہن بگڑا

دعا دینے سے میرے شب وہ ترکِ تیغ زن بگڑا  سیا ہی زادوں کا بھی کچھ میں دیکھوں ہوں چلن بگڑا
سخن سیدھی طرح اور وضع سادی بے مسّی دنداں  بھلا کتنا لگے ہے مجھ کو اس کا سادہ پن بگڑا
کیا تاراج یوں پیری نے حسنِ نوجوانی کو  بوقتِ صبح آرائش کا ہووے جوں چمن بگڑا
سوئی جس کو لگائی نہ زید کی معشوقہ نے اپنی  سبھی سبزی وہی مجنوں کا بس اک پیرہن بگڑا
کمالِ حسن خالق نے دیا ہے اس پری رو کو  نہ چتون کج ہوئی اس کی نہ گانے میں دہن بگڑا
یہ تصویریں عجب نواب نے کوٹھی میں بنوائیں  کسی کی ہے بھیر ٹھوڑی کسی کا ہے دہن بگڑا
نہ مارے حق کسی کو کر کے مفلس وائے رسوائی  جہاں کر کے موا کپڑا کفن کا وہ کفن بگڑا

رواج اُس نے نہ پایا بلکہ عہدِ زلفِ مشکیں میں
دھرا نافے میں جو برسوں رہا مشکِ ختن بگڑا

عجائب اور غرائب باتیں اب سننے میں آتی ہیں
خمِ نیلی تماشا شاید کہ اے چرخِ کہن بگڑا

خلل انداز جو لکنت ہوئی اُس کی فصاحت میں
زباں پر اُس بُتِ الکن کی آیا جو سخن بگڑا

ہمیں تکلیفِ نظمِ شعر کی دینے سے کیا حاصل
زمانہ ہم سے اِن روزوں ہے یارانِ وطن بگڑا

یہ بہت جس سے شکلِ کافرِ شیریں بنائی تھی
اُسی تیشے سے پھر آخر کو کارِ کوہکن بگڑا

رہی اے مصحفیؔ تا صبح اُس کی اس پہ جھنجھلاہٹ
بنانے میں جو مشاطہ سے شب خالِ ذقن بگڑا

نہ گیا کوئی عدم کو دلِ شاداں لے کر
یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و ارماں لے کر

جی ہی جی بیچ بہت شاد ہوا کرتی ہیں
تیرے عارض کی بلائیں تری مژگاں لے کر

کیا خطا مجھ سے ہوئی رات کو اس کافر کا
میں نے خود چھوڑ دیا ہاتھ میں داماں لے کر

باغ وہ دشتِ جنوں تھا کہ کبھی جس میں سے
لالہ و گل گئے ثابت نہ گریباں لے کر

طرفہ سوجھی یہ جنوں کو ترے دیوانے کی
راہ میں پھینک دئے خارِ مغیلاں لے کر

زلف و رخسار کا عالم ہے غضب ہی اس کے
شاد ہو کیوں نہ دلِ گبر و مسلماں لے کر

پردۂ خاک میں سو سو رہے جا کر افسوس
پر وہ رخسار پہ کیا کیا مہِ تاباں لے کر

ابر کی طرح سے کر دیویں گے عالم کو نہال
ہم جدھر جاویں گے یہ دیدۂ گریاں لے کر

پھر گئی سوئے اسیرانِ قفس بادِ صبا
خبرِ آمدِ ایامِ بہاراں لے کر

دوستی تھی مجھے ہر اک سے گئے تا درِ قبر
دوش پر نعش مری گبر و مسلماں لے کر

رنج پہ رنج جو دینے کی ہے خو قاتل کو
ساتھ آیا ہے ہم تیغ و نمک داں لے کر

مصحفیؔ گوشۂ عزلت کو سمجھ تختِ شہی
کیا کرے گا تو عبث ملکِ سلیماں لے کر

یار بن باغ سے ہم آتے ہیں دکھ پائے ہوئے
اشک آنکھوں میں بھرے ہاتھ میں گل کھائے ہوئے

آنکھ سیدھی نہیں کرتا کہ مقابل ہوں نگاہ
آرسی ناز سے وہ دیکھے ہے شرمائے ہوئے

کس کے آنے کی خبر ہے جو چمن میں گلچیں
جوں صبا چار طرف پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

ہم تو ترسے ہیں صنم اِک نگہ دور کو بھی!
بخت ان کے ہیں جو ہر دم ترے ہمسائے ہوئے

حُسنِ خجلت زدہ کیا رنگ دکھاتا ہے نئے
آرسی بھی اسے اب دیکھے ہے للچائے ہوئے

اُس کے کوچے سے جو اُٹھ آتے ہیں ہم دیوانے
پھر اُنھیں پاؤں چلے جاتے ہیں بورائے ہوئے

مصحفیؔ کیونکہ عناں گیر ہو اُس کا جوں برق
توسنِ ناز کو جب جائے وہ چمکائے ہوئے

خاموش ہیں ارسطو و فلاطوں مرے آگے
دعویٰ نہیں کرتا کوئی موزوں مرے آگے

دانش پہ گھمنڈ اپنی جو کرتا ہے بشدت
واللہ کہ وہ شخص ہے مجنوں مرے آگے

لاتا نہیں خاطر میں سخن بیہودہ گو کا
اعجازِ مسیحا بھی ہے افسوں مرے آگے

دشوار ہے رتبے کو پیمبر کے پہنچنا
ہے موسیٰ عمران بھی ہاروں مرے آگے

باندھے ہوئے ہاتھوں کو باُمیدِ اجابت
رہتے ہیں کھڑے سیکڑوں مضموں مرے آگے

جب موج پہ آجائے ہے دریائے طبیعت
قطرے سے بھی کم ٹھیرے ہے جیحوں مرے آگے

بدبینی پہ آؤں تو ابھی اہلِ صفا کے
ہو جاویں شبہ سب درِ مکنوں مرے آگے

اُستاد ہوں میں مصحفی حکمت کے بھی فن میں
ہے کودک نو درس فلاطوں مرے آگے

ہے جامِ طرب ساغرِ پرخوں مرے آگے
ساقی تو نہ لانا مے گلگوں مرے آگے

ٹک لب کے ہلانے میں حسّانِ عجم کا
ہو جاوے ہے احوال دگرگوں مرے آگے

سمجھوں ہوں اُسے مہرۂ بازیچۂ طفلاں
کس کام کا ہے گنبدِ گردوں مرے آگے

جب تیزی پہ آتا ہے مرا توسنِ خامہ
بن جاویں ہیں تب کوہ بھی ہاموں مرے آگے

میں گوز سمجھتا ہوں سدا اُس کی صدا کو
گو بول اُٹھے آدھی کی چوں چوں مرے آگے

سب خوشہ رُبا ہیں مرے خرمن کے جہاں میں
کہ شعر پڑھے گا کوئی موزوں مرے آگے

قدرت ہے خدا کی ہوئے آج وہ شاعر
طفلی میں جو کل کرتے تھے غاں غوں مرے آگے

موسیٰ کا عصا مصحفی ہے خامہ مرا بھی
گو خصم بنے اسود افیون مرے آگے

# خاتمہ

اے فلک نہ یہ جلسہ برہم ہونے کے قابل تھا، نہ آج رات کا سماں صبح ہونے کے قابل تھا۔ پھر ایسے لوگ کہاں! اور ایسے زمانے کہاں! سید انشا اور جرأت جیسے زندہ دل شوخ طبع باکمال کہاں سے آئیں گے۔ شیخ مصحفی جیسے مشاق کیونکر زندہ ہو جائیں گے۔ اور آئیں تو ایسے اور قدردان کہاں؟ اچھے لوگ تھے کہ اچھا زمانہ پایا، اور اچھی گزار گئے۔ وہ جوش خروش، وہ شوخیاں، وہ جلسیں اب کہاں:

گیا حسن خوبانِ دل خواہ کا
ہمیشہ رہے نام اللہ کا

میرا دل خدا جانے کس مٹی کا بنا ہے۔ کسی کی جدائی کا نام لیا یہ پگھل گیا۔ کسی عزیز کا ذکر کیا، اس سے خون ٹپک پڑا اور سخت جانی دیکھو کہ نہ پانی ہو کر بہ جاتا ہے، نہ خاک ہو کر رہ جاتا ہے۔ تماشا یہ ہے کہ کتنے کتنے صدمے اُٹھا چکا ہے، پھر بھی ہر داغ نیا ہی صدمہ دیتا ہے۔ مگر انصاف کرو، وہ عزیز بھی تو دیکھو کیسے تھے اور کون تھے (عالم کے عزیز تھے) اور ہر دل کے عزیز تھے۔ اپنی باتوں سے عزیز تھے۔ آزاد! بس، رونا دھونا موقوف، اب آنسو پونچھ ڈالو، ادب کی آنکھیں کھولو اور سامنے نگاہ کرو۔

# پانچواں دور

## تمہید

دیکھنا وہ لالٹینیں جگمگانے لگیں۔ اُٹھو اُٹھو استقبال کرکے لاؤ۔ اِس مشاعرے میں وہ بزرگ آتے ہیں، جن کے دیدار ہماری آنکھوں کا سُرمہ ہوئے۔ اس میں دو قسم کے باکمال نظر آئیں گے، ایک وہ کہ جنہوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کو دین آئین سمجھا۔ یہ اُن کے باغوں میں پھریں گے۔ پرانی شاخیں زرد پتے کاٹیں چھانٹیں گے اور نئے رنگ نئے ڈھنگ کے گلدستے بنا بنا کر گلدانوں سے طاق وایوان سجائیں گے۔ دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کے دخان سے ایجاد کی ہوائیں اڑائیں گے اور برج آتشبازی کی طرح اُس سے رُتبہ عالی پائیں گے۔ اُنھوں نے اس ہوا سے بڑے بڑے کام لیے، مگر یہ غضب کیا کہ گرد و پیش جو وسعت بے انتہا پڑی تھی، اُس میں سے کسی جانب میں نہ گئے، بالاخانوں میں سے بالا بالا اُڑ گئے۔ چنانچہ تم دیکھو گے کہ بعض بلند پرواز ایسے اوج پر جائیں گے جہاں آفتاب تارا ہو جائے گا اور بعض ایسے اُڑیں گے کہ اُڑ ہی جائیں گے۔ وہ اپنے آئین کا نام خیال بندی اور نازک خیالی رکھیں گے، مگر حق یہ ہے کہ شاعری اُن کی ساحری اور خود اپنے وقت کے سامری ہوں گے۔ ساتھ اس کے صاحبِ اقبال ایسے ہوں گے کہ اُنھیں پرستش کرنے والے بھی ایسے ہی ہاتھ آئیں گے۔ اِن بزرگوں کی نازک خیالی میں کچھ کلام نہیں۔ لیکن اتنا ہے کہ اب تک مضمون کا پھول اپنے حُسنِ خداداد کے جوبن سے فصاحت کے چمن میں لہلہاتا تھا، یہ اس کی پنکھڑیاں لیں گے اور اُن پر مُو قلم سے ایسی نقاشی کریں گے کہ بے عینک کے نہ دکھائی دیگی۔ اس خیال بندی میں یہ صاحبِ کمال اُس قدرتی لطافت کی بھی پروا نہ کریں گے، جسے تم حُسنِ خداداد سمجھتے ہو، کیونکہ اِن کی صنعت لیے اس کے اپنا رنگ نہیں دکھا سکتی۔

پہلے بزرگ گرد و پیش کے باغوں کا پتا پتا کام میں لا چکے تھے، اب نئے پھول کہاں سے لاتے۔ آگے جانے کی سڑک نہ تھی اور سڑک نکالنے کے سامان نہ تھے۔ ناچار اس طرح اُستادی کا نقارہ بجایا، اور ہمعصروں میں تاجِ افتخار پایا۔ یہ آخری دور کی مصیبت کچھ ہماری ہی زبان پر نہیں پڑی۔ فارسی کے متقدمین کو اس کے متاخرین سے مطابق کرلو۔ شعرائے جاہلیت کو متاخرین عرب سے مقابلہ کرو۔ انگریزی اگرچہ میں نہیں جانتا، مگر اتنا جانتا ہوں کہ اِس کے متاخرین بھی اس درد سے نالاں ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ زبان جب

تک عالمِ طفولیت میں رہتی ہے، تبھی تک شیر و شربت کے پیالے لنڈھاتی ہے۔ جب پختہ سال ہوتی ہے تو خوشبو عرق اس میں ملاتی ہے۔ تکلّف کے عطر ڈھونڈھ کر لاتی ہے۔ پھر سادگی اور شیریں ادائی تک خاک میں مل جاتی ہے۔ ہاں دو اداؤں کے پیالے ہوتے ہیں، جس کا جی چاہے، پیا کرے ۔

اس موقع پر یہ کہنا واجب ہے کہ اِن سے پہلے جو صاحبِ کمال لکھنؤ میں تھے، وہ دِلّی کے خانہ برباد تھے۔ وہ یا اُن کی اولاد اس وقت تک دِلّی کو اپنا وطن سمجھتے تھے اور اہلِ لکھنؤ ان کی تقلید کو فخر سمجھتے تھے نہ کہ عیب، کیونکہ وہاں اب تک کوئی صاحبِ کمال اس درجے کا پیدا نہ ہُوا تھا۔ اب وہ زمانہ آتا ہے کہ انھیں خود صاحبِ زبانی کا دعویٰ ہوگا اور زیبا ہوگا اور جب اِن کے اور دِلّی کے محاورے میں اختلاف ہوگا تو اپنے محاورے کی فصاحت اور دِلّی کی عدمِ فصاحت پر دلائل قائم کریں گے، بلکہ انھی کے بعض بعض نکتوں کو دِلّی کے اہلِ انصاف بھی تسلیم کریں گے۔ اِن بزرگوں نے بہت قدیمی الفاظ چھوڑ دیئے، جن کی تفصیل چوتھے دیباچے میں لکھی گئی اور اب جو زبان دِلّی اور لکھنؤ میں بولی جاتی ہے، وہ گویا انھی کی زبان ہے، البتہ شیخ ناسخ کے دیوان میں ایک جگہ زور کا لفظ بہت کے معنوں میں دیکھا گیا، شاید یہ ابتدائی کلام ہوگا۔

عابد و زاہد چلے جاتے ہیں پیتا ہے شراب
اب تو ناسخ زور رندِ لااُبالی ہوگیا

اساتذہ دہلی کے کلام میں آئے ہے اور جائے ہے، اکثر ہے، مگر آخر کی غزلوں میں انھوں نے بھی بچاؤ کیا ہے۔

شاہ نصیر مرحوم بن رسیدہ شخص تھے۔ آغازِ شاعری کا کنارہ جرأت اور سید انشا سے ملا تھا اور انجام کی سرحد ناسخ، آتش اور ذوق میں واقع ہوئی تھی۔ اس لیے ابتدائی غزلوں میں کہیں ٹک بول جاتے ہیں اور جس طرح جمع مؤنث کے فعلوں کو الف نون کے ساتھ چوتھے طبقے میں بے تکلّف بولتے تھے، اِن کی ابتدائی غزلوں میں کہیں کہیں ہے، چنانچہ میر کی غزل کا مطلع ہے۔

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

کبھی نہ اُس رُخِ روشن پہ چھائیاں دیکھیں
گھٹائیں چاند پہ سو بار آئیاں دیکھیں

اِسی طرح موصوف جمع ہو اور صفت لفظ ہندی ہو تو اب موصوف کی مطابقت کے لیے صفت کو جمع بولنا خلافِ فصاحت سمجھتے ہیں، مگر خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

عہدِ طفلی میں بھی تھا میں بسکہ سودائی مزاج
بیڑیاں منت کی بھی پہنیں تو میں نے بھاریاں

# تمہیدِ شیخ امام بخش ناسخ کے حال کی

بزرگانِ قدیم کی عمدہ یادگار مخدومی مولوی محمد عظیم اللہ صاحب ایک صاحب فضل وعاشق کمال غازی پور زمینہ (زمانیہ) کے رئیس ہیں۔ اگرچہ بزرگوں کا حال بہ تفصیل معلوم نہیں، مگر اتنا جانتا ہوں کہ قاضی القضاۃ مفتی اسد اللہ صاحب کی ہمشیرہ یعنی شاہ اجمل صاحب کی نواسی سے ان کی شادی ہوئی۔ مولوی صاحب موصوف کے والد کو شیخ امام بخش ناسخ سے نہایت دوستی تھی۔ میرے دوستو اگلے وقتوں کی دوستیاں کچھ اور دوستیاں تھیں۔ آج تمہارے روشنی کے زمانے میں ان کی کیفیت بیان کرنے کو لفظ نہیں ملتے، جن سے اُن کے خیالوں کا دلوں میں عکس جماؤں۔ ہائے اُستاد ذوق:

اب زباں پر بھی نہیں آتا کہیں الفت کا نام
اگلے مکتوبوں میں کچھ رسمِ کتابت ہو تو ہو

غرض جذب جنسیت اور اتحاد طبیعت ہمیشہ مولوی صاحب کے والد کو غازی پور سے لکھنؤ کھینچ کر لے جاتا تھا۔ مہینوں وہیں رہتے تھے۔ مولوی صاحب کا پانچ برس کا سن تھا۔ یہ بھی والد کے ساتھ ہوتے تھے۔ اس وقت سے شیخ ناسخ کی خدمت میں رہے اور سالہا سال فیض حضوری سے بہرہ یاب ہوئے۔ زخمی تخلص انہی نے عنایت فرمایا، جس سے ۱۲۵۰ھ سال تلمذ نکلتے ہیں۔ عربی فارسی کی کتب تحصیلی الہ آباد اور لکھنؤ میں حاصل کیں۔ اردو فارسی کی انشا پردازی میں کئی جلد لکھ کر رکھ چھوڑے ہیں۔ جانتے ہیں کہ ان کی فصل اب بالکل نئی نکل گئی۔ ہوا مخالف ہے، اس لیے نہ آپ گوشۂ عافیت سے نکلتے ہیں۔ نہ انھیں نکالتے ہیں۔ عہدِ جوانی میں سرکار سے بھی با اقتدار اور معزز عہدے حاصل کیے، اب بڑھاپے نے پنشن خوار بنا کر خانہ نشین کر دیا ہے۔

بندہ آزاد کو اسی آبِ حیات کی بدولت اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ انھوں نے بہت حالات شیخ موصوف کے لکھ کر گرانبار احسان فرمایا۔ جو کہ اب طبع ثانی میں

درج ہوتے ہیں - آزاد اُن کا صدق دل سے ممنون احسان ہے - ہمیشہ عنایت ناموں سے ممنون فرماتے رہتے ہیں، جن کے حرف حرف سے محبت کے آبِ حیات ٹپکتے ہیں - بات یہ ہے کہ ہم لوگ اس زمانے کے لیے بالکل اجنبی ہیں - نئی روشنی والے کہتے ہیں کہ روشنی نہیں، روشنی نہیں، جناب رغمیؔ اور بندہ آزاد کی آنکھوں سے کوئی دیکھے کہ دُنیا اندھیر ہے ؎

سُراغِ یک نگاہِ آشنا از کس نمے یابم
جہاں چوں نرگستاں بے تو شہر کورے باشد

اب تک زیارت نہیں ہوئی، مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی انجان آدمی ایک نئے ملک میں جا پڑے، جہاں وہ نہ کسی کی سمجھے نہ کوئی اس کی - اور وہ ہکا بکا ایک ایک کا مُنہ دیکھے - اس طرح وہ بھی آج کل کے لوگوں کا منہ دیکھ رہے ہیں - کجا ناسخؔ و آتشؔ کے مشاعرے اور کجا کمیٹیوں کے جلسے - شیخ صاحب اور خواجہ صاحب کے حالات جو انھوں نے لکھ کر بھیجے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کے آنسو تھے، حرفوں کے رنگ میں بہ نکلے ہیں - یہ درد کوئی آزاد کے دل سے پوچھے کہ جب ابراہیم ذوقؔ کا نام آتا ہے - چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا ہے -

بنالِ بلبل اگر بامنت سرِ یاری ست
کہ ما دو عاشقِ زار دیم و کارِ ما زاری است

شیخ ناسخؔ کا حال لکھتے لکھتے کہتے ہیں - کیا کہوں کہ میرے حال پر کیسی شفقت فرماتے تھے - دو دیوان خود لکھ کر مجھے دیے - ایک مہر عقیق پر کھدوا کر مجھے دی اب موجود ہے - رغمیؔ سلمہ اللہ نے جو نوؔر اور غازی پور وغیرہ حالات بھی بھیجے ہیں - جن کی بدولت "دربارِ اکبری" ہمیشہ شکر گزار رہے گا - خدا کرے کہ جلد وہ مرقع سج کر اہلِ نظر کی پیش گاہ میں جلوہ گر ہو ؁

**شیخ امام بخش ناسخؔ کا حال:** شیخ صاحب کی شاعری کا وطن لکھنؤ ہے، مگر کمال سے لاہور کو فخر کرنا چاہیئے، جو اُن کے والد کا وطن تھا - خاندان کے باب میں فقط اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے - اور بعض اشخاص کہتے ہیں کہ اس دولت مند لاولد نے متبنیٰ کیا تھا - اصلی والد عالم غربت میں مغرب سے مشرق کو گئے - فیض آباد میں اُن کی قسمت سے یہ ستارہ چمکا کہ فلکِ نظم کا آفتاب ہُوا ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے جائیں پیمبری مل جائے

غریب باپ سے صاحب نصیب بیٹے کے سوا وہاں بھی نصیبے نے رفاقت نہ کی، مگر اُس دولت مند سوداگر نے کہ لاولد تھا بلند اقبال لڑکے کو فرزندی میں لے کر ایسا تعلیم و تربیت کیا کہ، بڑے ہو کر شیخ امام بخش ناسخ ہو گئے۔ اور اس مجازی باپ کی بدولت دُنیا کی ضروریات سے بے نیاز رہے۔ وہ مر گیا تو اُس کے بھائیوں نے دعویٰ کیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے مال و دولت سے کچھ غرض نہیں، جس طرح اُن کو باپ سمجھتا تھا، آپ کو سمجھتا ہوں، کہ جس طرح وہ میری ضروریات کی خبر گیری کرتے تھے۔ اُسی طرح آپ فرمایئے۔ اُنھوں نے قبول کیا ؁

ناسخ فسادِ خون کے سبب سے ایک موقع پر فقط بیسنی روٹی گھی میں چُور کر کے کھایا کرتے تھے۔ بدنیت چچانے اس میں زہر دیا۔ لوگوں نے یہ مصالح لگایا کہ ایک جن اُن کا دوست ہے، اُس نے آگاہ کیا (حکایت عنقریب روایت کی جاتی ہے) بہر حال کسی قرینے سے انھیں معلوم ہو گیا۔ اُسی وقت چند دوستوں کو بُلا کر اُن کے سامنے ٹکڑا کُتّے کو دیا۔ آخر ثابت ہُوا کہ فی الحقیقۃ اس میں زہر تھا۔ چند روز کے بعد وراثت کا جھگڑا عدالت شاہی تک پہنچا، جس کا فیصلہ شیخ مرحوم کی جیت پر ہوا۔ اُس وقت انھوں نے چند رباعیاں کہہ کر دل خالی کیا، دو ان میں سے یہ ہیں :

رُباعی

مشہور ہے گرچہ افترائے اعمام — پر کرتے نہیں غور خواص اور عوام
وارث ہونا دلیل فرزندی ہے — میراث نہ پا سکا کبھی کوئی غلام

رُباعی

کہتے رہے اعمام عداوت سے غلام — میراث پدر پائی مگر میں نے تمام
اس دعوئے باطل سے ستمگاروں کو — حاصل یہ ہُوا کر گئے مجھ کو بدنام

غور کرو تو متبنّیٰ ہونا کچھ عیب کی بات نہیں۔ دُنیا کی غریبی۔ امیری جاڑے اور گرمی کی طرح بدلتی رہتی ہے۔ ایک امیر الامراء کو صرف چند پشت کے اندر دیکھو تو ممکن نہیں ایک وقت اس کے گھر میں افلاس کا گزر نہ ہُوا ہو۔ البتہ وہ بے استقلال قابل ملامت ہے کہ اس عالم میں رحمت الٰہی کا انتظار نہ کر سکے اور ایسے کام کر گزرے جو نام پر داغ دے جائیں۔ غرض شیخ صاحب کے اس معاملے کو حریفوں نے بدرنگ لباسوں میں دکھایا ہے، جس کا ذکر عنقریب آتا ہے۔ وہ فیض آباد میں تھے۔ لکھنؤ کے دارالخلافہ ہو جانے سے وہاں آئے اور وہیں عمر بسر کی۔ ٹکسال ایک محلہ مشہور ہے، اُس میں بیٹھ کر شعر کے چاندی سونے پر سکہ لگاتے تھے اور کھوٹے کھرے مضمون کو پرکھتے تھے ؁

فارسی کی کتابیں حافظ وارث علی لکھنوی سے پڑھی تھیں اور علمائے فرنگی محلی سے بھی تحصیلی کتابیں حاصل کی تھیں۔ اگرچہ عربی استعداد فاضلانہ نہ تھی، مگر رواج علمی اور صحبت کی برکت سے فن شاعری کی ضروریات سے پوری واقفیت تھی اور نظم سخن میں اُن کی نہایت پابندی کرتے تھے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے، مگر ابتدا سے شعر کا عشق تھا (مولانا رغمی) فرماتے ہیں، مجھ

سے خود شیخ صاحب نے آغازِ شاعری کا حال نقل فرمایا کہ میر تقی مرحوم ابھی زندہ تھے، جو مجھے ذوقِ سخن نے بے اختیار کیا۔ ایک دن اغیار کی نظر بچا کر کئی غزلیں خدمت میں لے گیا۔ انھوں نے اصلاح نہ دی۔ دل میں شکستہ ہو کر چلا آیا۔ اور کہا، میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں، فرشتہ تو نہیں، اپنے کلام کو آپ ہی اصلاح دوں گا۔ چنانچہ کہتا تھا اور رکھ چھوڑتا تھا۔ چند روز کے بعد پھر دیکھتا۔ جو سمجھ میں آتا اصلاح کرتا اور رکھ دیتا۔ کچھ عرصے کے بعد پھر فرصت میں نظرِ ثانی کرتا اور بناتا۔ غرض مشق کا سلسلہ جاری تھا، لیکن کسی کو سناتا نہ تھا۔ جب تک خوب اطمینان نہ ہوا، مشاعرے میں غزل نہ پڑھی، نہ کسی کو سنائی۔ مرزا حاجی صاحب کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ سید انشاؔ، مرزا قتیلؔ، جرأتؔ، مصحفیؔ وغیرہ سب شعرا جمع ہوتے تھے۔ میں جاتا تھا۔ سب کو سنتا تھا، مگر وہاں کچھ نہ کہتا تھا۔ ان لوگوں میں جو لُون مرچ سید انشاؔء اور جرأتؔ کے کلام میں ہوتا تھا وہ کسی زبان میں نہ تھا۔

غرض سید انشاؔء اور مصحفیؔ کے معرکے بھی ہو چکے۔ جرأت اور ظہور اللہ خاں نوا کے ہنگامے بھی طے ہو گئے۔ جب زمانہ سارے ورق الٹ چکا اور میدان صاف ہو گیا تو میں نے غزل پڑھنی شروع کی۔ اس موقع پر مرزا حاجی صاحب۔ مرزا قتیلؔ اور حاجی محمد صادق خاں اخترؔ نے بڑی قدردانی کی اور ان کے دل بڑھانے سے کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا۔ لوگوں کے دلوں میں بھی یہاں تک شوق پیدا ہوا کہ جو غزل کہہ کر پڑھتا تھا، پھر بھی مشتاق رہ جاتے تھے۔ منتظر اور گرم کو موت نے ٹھنڈا کیا۔ خواجہ حیدر علی آتشؔ۔ شیخ مصحفیؔ کے ارشد تلامذہ نے محاورہ بندی میں نام نکالا۔ ایک دفعہ کئی مہینے بعد فیض آباد سے آئے۔ مشاعرے میں جو میری غزلیں سنیں تو سانپ کی طرح پیچ و تاب کھایا اور اسی دن سے بگاڑ شروع ہوا۔ انھوں نے آتشِ رشک کی جلن میں اس جانکاہی اور سینہ خراشی سے غزلیں کہیں کہ سینے سے خون آنے لگا۔

غرض شیخ صاحب کا شوق مشاعرے میں لے جا کر دل میں امنگ اور طبیعت میں جوش بڑھاتا تھا۔ اور آسودہ حالی اکثر شعرا، اہل فہم اور اہل کمال کو ان کے گھر کھینچ لاتی تھی۔ ان کی صحبتوں میں طبیعت خود بخود اصلاح پا گئی۔ رفتہ رفتہ خود اصلاحیں دینے لگے۔ بعض سن رسیدہ اشخاص سے سنا گیا کہ ابتدا میں شیخ مصحفیؔ سے اصلاح لیتے تھے، مگر کسی شعر پر تکرار ہوئی کہ انھوں نے ان کا آنا بند کر دیا۔ یہ بطور خود غزلیں کہتے رہے اور تنہاؔ تخلص ایک شخص تھے۔ ان سے تنہائی میں مشورت کرتے رہے۔ جب اطمینان ہوا تو مشاعروں میں غزل پڑھنے لگے، لیکن مصحفیؔ والی روایت قابلِ اعتبار نہیں۔ کیونکہ انھوں نے اپنے تذکرہ میں تمام شاگردوں کے نام لکھ دیے ہیں، ان کا نام نہیں ہے۔ (مولانا رغمی فرماتے ہیں)

پہلوانِ سخن کو ابتدائے عمر سے ورزش کا شوق تھا۔ خود ورزش کرتے تھے، بلکہ احباب کے

نوجوانوں میں جو حاضر خدمت ہوتے اور ان میں کسی ہونہار کو ورزش کا شوق دیکھتے تو خوش ہوتے اور چونپ دلاتے۔ ۷، ۹ ۱۲ ڈنڑ کا معمول تھا کہ یا غفور کے عدد ہیں۔ یہ وظیفہ قضا نہ ہوتا تھا، البتہ موقع اور موسم پر زیادہ ہو جاتے تھے۔ انہیں جیسا ریاضت کا شوق تھا، ویسا ہی ڈیل ڈول بھی لائے تھے۔ بلند بالا، فراخ سینہ، منڈا ہوا سر کھار وے کا لنگ باندھے بیٹھے رہتے تھے، جیسے شیر بیٹھا ہے۔ جاڑے میں تن زیب کا کُرتا، بہت ہو تو لکھنؤ کی چھینٹ کا دُہرا کرتا پہن لیا۔

دن رات میں ایک دفعہ کھانا کھاتے تھے۔ ظہر کے وقت دسترخوان پر بیٹھتے تھے اور کئی وقتوں کی کسر نکال لیتے تھے۔ پان سیر پختہ وزن شاہجہانی کی خوراک تھی۔ خاص خاص میووں کی فصل ہوتی۔ تو جس دن کسی میوے کو جی چاہتا، اُس دن کھانا موقوف۔ مثلاً جامنوں کو جی چاہا، لگن اور سینیاں بھر کر بیٹھ گئے، ۴۔ ۵ سیر وہی کھا ڈالیں۔ آموں کا موسم آیا تو ایک دن کئی ٹوکرے منگا کر سامنے رکھ لیے، ناندوں میں پانی ڈلوا لیا، اُن میں بھرے اور خالی کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بھٹے کھانے بیٹھے تو گُٹھیوں کے ڈھیر لگا دیئے اور یہ اکثر کھایا کرتے تھے۔ دُودھیا بھٹے چُنے جاتے بچاتو سے دانوں پر خط ڈال کر نون مرچ لگتا۔ سامنے بُھنتے ہیں، لیموں چھڑکتے ہیں، اور کھاتے جاتے ہیں۔ میوہ خوری ہر فصل میں دو تین دفعہ، بس۔ اور اس میں دو چار دوست بھی شامل ہو جاتے تھے۔

کھانا اکثر تخلیے میں کھاتے تھے۔ سب کو وقت معلوم تھا جب ظہر کا وقت قریب ہوتا تھا تو رخصت ہو جاتے تھے (رغمی سلمہ اللہ فرماتے ہیں) مجھے چند مرتبہ ان کے ساتھ کھانے کا اتفاق ہوا۔ اس دن نہاری اور نان تافتان بھی بازار سے منگائی تھی۔ پانچ چار پیالوں میں قورمہ، کباب، ایک میں کسی پرندے کا کباب تھا۔ شلغم تھے، چقندر تھے، ارہر کی دال، دھوئی ماش کی دال تھی۔ اور وہ دسترخوان کا شیر اکیلا تھا، مگر سب کو فنا کر دیا۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ ایک پیالے میں سے جتنا کھانا ہے، خوب کھا لو، اُسے خدمتگار اُٹھا لے گا، دوسرا سامنے کر دے گا۔ یہ نہ ہو سکتا تھا کہ ایک نوالے کو دو سالنوں میں ڈال کر کھا لو، کہا کرتے تھے کہ رلا مِلا کر کھانے میں پھر کا مزا جاتا رہتا ہے۔ اخیر میں پلاؤ یا چلاؤ یا خشکہ کھاتے تھے۔ پھر دال اور ۵ - ۶ نوالوں کے بعد ایک نوالہ چٹنی یا اچار یا مربے کا۔ کہا کرتے تھے کہ تم جوانوں سے تو میں بڈھا ہی اچھا کھاتا ہوں۔ دسترخوان اُٹھتا تھا۔ تو خوان فقط خالی باسنوں کے بھرے اُٹھتے تھے۔ قوی ہیکل بلونت جوان تھے۔ اُن کی صورت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ۴۔ ۵ سیر کھانا اُن کے لیے کیا مال ہے۔

زمانے کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ بے ادب گستاخ دُم کٹے بھینسے کی پھبتی کہا کرتے تھے۔ اسی رنگ و روغن کی رعایت سے خواجہ صاحب نے چوٹ کی ہے

رُوسیہ دُشمن کا یوں پاپوش سے کیجئے فگار
جیسے سلہٹ کی سپر پہ زخم ہو شمشیر کا

شیخ صاحب نے خود بھی اس کا عذر کیا ہے اور شاگرد بھی روغن قاز مل مل کر اُستاد کے رنگ کو چمکاتے تھے اور حریف کے رنگ کو مٹاتے تھے۔ فقیر محمد خاں گویا نے کہا تھا:

ہے یقیں گُل ہو جو دیکھے گیسوئے دلبر چراغ
آگے کالے کے بھلا روشن رہے کیونکر چراغ
میں گو کہ حسن سے ظاہر میں مثل ماہ نہیں
ہزار شکر کہ باطن مرا سیاہ نہیں
فروغ حسن پہ کب زورِ زلف چلتا ہے
یہ وہ چراغ ہے کالے کے آگے جلتا ہے

پہلوانِ سخن زور آزمائی کے چرچے اور ورزش کی باتوں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ راقم سلمہم اللہ کے والد بھی اِس میدان کے جوانمرد تھے۔ رغبتوں کے اتحاد ہمیشہ موافقت صحبت کے لیے سبب ہوتے ہیں، اِس لیے محبت کے ہنگامے گرم رہتے تھے۔

لطیفہ: آغا کلب حسین خاں مرحوم انھیں اکثر بلایا کرتے تھے اور مہینوں مہمان رکھتے تھے۔ ان سے بھی فقط ذوقِ شعر کا تعلق نہ تھا، وہ بھی ایک شہزور، شاہ سوار ورزشی جوان تھے۔ سامانِ امیرانہ اور مزاج دوستانہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر کہ آغا صاحب سورام سرحد نوابی پر تحصیل دار ہو کر آئے، شیخ صاحب کو بُلا بھیجا کہ چند روز سبزہ و صحرا کی سیر سے طبیعت کو سیراب فرمائیے۔ ایک دن بعض اقسام کے کھانے خاص شیخ صاحب کی نیت سے پکوائے تھے، اس لیے وقت معمولی سے کچھ دیر ہوگئی۔ شیخ صاحب نے دیکھا کہ حرم سرا کی ڈیوڑھی سے نوکر اپنے اپنے کھانے لے کر نکلے۔ بُلا کر پوچھا کہ یہ کس کے لیے ہے؟ عرض کی، ہمارا کھانا ہے۔ فرمایا، اِدھر لاؤ۔ ان میں سے ۴۔ ۵ کا کھانا سامنے رکھوا لیا۔ چاٹ پونچھ کر باسن حوالے کئے اور کہا کہ ہمارا کھانا آئے گا تو تم کھا لینا۔ آغا صاحب کو خبر جا پہنچی۔ اتنے میں وہ آئے، یہاں کام ختم ہو چکا تھا۔

جناب مخدوم و مکرم آغا کلب عابد خاں صاحب نے بھی اس حکایت کی تصدیق فرمائی اور کہا کہ اِن کے مزاج میں شوریدگی ضرور تھی۔ اگرچہ اِن دنوں خُردسال تھا، مگر ان کا بار بار آنا اور رہنا اور اُن صحبتوں کی شعر خوانیاں، خصوصاً مقام سورام کی کیفیتیں سب ہو بہو پیش نظر ہیں۔ انھیں بالاخانے پر اُتارا تھا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ بیٹھے ہیں، کھاتے کھاتے سالن کا پیالہ اُٹھایا اور کھڑکی میں سے پھینک کر مارا کہ وہ جا پڑا۔ سبب دیکھا تو کچھ نہ تھا:

یہ بھی معمول تھا کہ پہر رات رہے سے ورزش شروع کرتے تھے۔ صبح تک اُس سے فارغ ہوتے تھے۔ مکان مردانہ تھا۔ عیال کا جنجال رکھا ہی نہ تھا۔ اوّل نہائیے اور پھر صحن میں کہ صفائی سے آئینہ رہتا تھا، مونڈھے بچھے ہیں۔ اندر ہیں تو فرش اور سامانِ آرائش سے آراستہ ہے۔ صبح سے احباب اور شاگرد آنے شروع ہوتے تھے، دوپہر کو سب رخصت اور دروازہ بند۔ حضرت دسترخوان پر بیٹھے۔ یہ بڑا کام تھا، چنانچہ اس بھاری بوجھ کو اُٹھا کر آرام فرمایا۔ عصر سے پھر آمد شروع ہوئی۔ مغرب کے وقت سب رخصت۔ دروازہ معمور۔ خدمت گار کو بھی باہر کیا اور اندر سے قفل جڑ دیا۔ کوٹھے پہ ایک کمرہ خلوت کا تھا، وہاں گئے، کچھ سو رہے اور تھوڑی دیر اُٹھ کر فکرِ سخن میں مصروف ہوئے۔ عالمِ خوابِ غفلت میں پڑا سوتا تھا۔ اور وُہ خوابِ راحت کے عوض کاغذ پر خونِ جگر ٹپکاتے تھے (اُستاد مرحوم کا ایک مطلع یاد آگیا، جس کا مصرعِ آخر اس انگوٹھی پر نگینہ ہو گیا۔)

میرا گریہ ترے رُخسار کو چمکاتا ہے
تیل اس آگ پہ تِل آنکھ کا ٹپکاتا ہے

شاگرد جو غزلیں اصلاح کو دیتے تھے، نوکر انھیں ایک کہاروے کی تھیلی میں بھر کر پہلو میں رکھ دیتا تھا۔ وہ بھی نباتے تھے۔ جب پچھلا پہر ہوا تو کاغذ تہ ہوئے اور پھر وہی ورزش۔ حقّے کا بہت شوق تھا، عمدہ عمدہ حقّے منگاتے تھے۔ تحفوں میں آتے تھے۔ انہیں موزوں نیچوں سے سجاتے تھے۔ کلیاں، گڑگڑیاں، ٹشک، پیچواں، جوگاتی، مدریے وغیرہ وغیرہ، ایک کوٹھڑی بھری ہوئی تھی۔ یہ نہ تھا کہ جلسے میں دو حقّے ہیں، وہ دَورہ کرتے ہیں، ہر ایک کے موافقِ طبع الگ اس کے سامنے آتا تھا۔ ان صحبتوں میں بھی شاگردوں کے لیے اصلاح اور افادہ ہو جاتا تھا۔

آدابِ محفل کا بہت خیال تھا۔ آپ تکیے سے لگے بیٹھے رہتے تھے۔ شاگرد، جن میں اکثر امیرزادے شرفا ہوتے تھے، باادب بچھونے کے حاشیے پہ بیٹھتے جاتے، دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ شیخ صاحب کچھ سوچتے، کچھ لکھتے۔ جب کاغذ ہاتھ سے رکھتے تو کہتے ہوں! ایک شخص غزل سُنانی شروع کرتا۔ کسی شعر میں کوئی لفظ قابلِ تبدیل ہوتا یا پس و پیش کے تغیر سے کام نکلتا تو اصلاح فرماتے، نہیں تو کہہ دیتے یہ کچھ نہیں نکال ڈالو یا اس کا پہلا یا دوسرا مصرعہ اچھا نہیں، اسے بدلو۔ یہ قافیہ خوب ہے۔ مگر اچھے پہلو سے نہیں بندھا۔ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ جب وہ شخص پڑھ چکتا تو دوسرا پڑھتا اور کوئی بول نہ سکتا تھا۔

لکھنؤ کے میرزادے، جنھیں کھانے کے ہضم کرنے سے زیادہ کوئی کام دشوار

نہیں ہوتا، اُن کے وقت گزارنے کے لیے مصاحبوں نے ایک عجیب چورن تیار کیا۔
اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شیخ صاحب سے ایک جن کو محبت تھی۔ ان کا معمول تھا،
ورزش کے بعد صبح کو ایک مینی پراٹھا گھی میں تر تراتا کھایا کرتے تھے۔ اوّل اوّل ایسا
ہوتا رہا۔ جب کھانے بیٹھتے، پراٹھا برابر غائب ہوتا چلا جاتا۔ یہ سوچتے، مگر کوئی بات
سمجھ میں نہ آتی۔ بالاخانے میں دروازہ بند کر کے اکیلے ورزش کیا کرتے تھے۔ ایک
دن مگدر ہلا رہے تھے۔ دیکھتے ہیں، ایک شخص اور سامنے کھڑا مگدر ہلا رہا ہے۔
حیران ہوئے۔ بدن میں جوانی اور پہلوانی کا بل تھا، لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر زور
ہوتا رہا۔ اسی عالم میں پوچھا کہ تو کون ہے۔ اس نے کہا کہ تمھاری ورزش کا انداز
پسند آیا ہے، اس لیے کبھی کبھی اِدھر آ نکلتا ہوں۔ اکثر کھانے میں بھی شریک ہوتا
ہوں، مگر بغیر اظہار کے محبت کا مزا نہیں آتا، آج ظاہر کیا۔ اس دن سے ان کی
اُن کی راہ ہوگئی۔ اُسی نے زہر کے راز سے بھی آگاہ کیا تھا۔
بعض اشخاص کہتے ہیں۔ پُرخوری کے سبب سے لوگ کہتے تھے۔ کہ ان کے پیٹ میں
جن ہے۔

کسی کی نوکری نہیں کی۔ سرمایہ خداداد اور جوہر شناسیوں کی قدردانی سے نہایت خوشحالی
کے ساتھ زندگی بسر کی۔ پہلی دفعہ الٰہ آباد میں آئے ہوئے تھے، جو راجہ چندو لال نے ۱۲ ہزار روپے
بھیج کر بلا بھیجا۔ انھوں نے لکھا کہ اب میں نے سید کا دامن پکڑا ہے، اُسے چھوڑ نہیں سکتا یہاں سے
جاؤں گا تو لکھنؤ جاؤں گا۔ راجہ موصوف نے پھر خط لکھا، بلکہ پندرہ ہزار روپے بھیج کر بڑے
اصرار سے کہا کہ یہاں تشریف لائیے گا تو ملک الشعرا خطاب دلاؤں گا۔ حاضریٔ دربار کی قید نہ ہوگی۔
مُلاقات آپ کی خوشی پر رہے گی۔ اُنھوں نے منظور کیا۔ اور روپے آغا کلب حسین خاں کے پاس
رکھوا دیئے۔ جب ضرورت ہوتی، منگا لیتے اور ان پر کیا منحصر، نواب معتمد الدولہ اور ان کے بیٹے
ہمیشہ خدمت کو حاضر تھے، تحفے نذرانے جابجا سے آتے رہتے تھے۔ یہ بھی کھاتے اور کھلاتے بھی
رہتے تھے۔ سادات، اہلِ حج، اہلِ زیارت کو دیتے تھے اور آزادی کے عالم میں جہاں جی چاہتا
وہاں جا بیٹھتے، جس کے ہاں جاتے، وہ اپنا فخر سمجھتا تھا۔
سیاحی کی مسافت فیض آباد سے لکھنؤ اور وہاں سے الٰہ آباد، بنارس، عظیم آباد، پٹنہ تک
رہی۔ چاہتا تھا کہ شیخ علی حزیں کی طرح بنارس میں بیٹھ جائیں۔ چنانچہ الٰہ آباد سے وہیں گئے،
مگر اپنی ملّت کے لوگ نہ پائے، اس لیے دل برداشتہ ہو کر عظیم آباد گئے۔ وہاں کے لوگ نہایت
مروّت اور عظمت سے پیش آئے، مگر ان کا جی نہ لگا۔ گھبرا کر بھاگے اور کہا یہاں میری زبان خراب

ہو جائے گی۔ الٰہ آباد میں آئے، پھر شاہ اجمل کے دائرے میں مرکز پکڑا اور کہا ؎

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

لکھنؤ سے نکلنے کا سبب یہ ہوا تھا کہ غازی الدین حیدر کے عہد میں جب اِن کی تعریفوں کی آوازیں بہت بلند ہوئیں تو اُنھوں نے نواب معتمد الدولہ آغا میر اپنے وزیر سے کہا کہ اگر شیخ ناسخ ہمارے دربار میں آئیں اور قصیدہ سنائیں تو ہم انھیں ملک الشعرا خطاب دیں۔ معتمد الدولہ اِن کے با اخلاص شاگرد تھے۔ جب یہ پیغام پہنچایا تو انھوں نے بگڑ کر جواب دیا کہ مرزا سلیمان شکوہ بادشاہ ہو جائیں تو وہ خطاب دیں یا گورنمنٹ انگلشیہ خطاب دے، اِن کا خطاب لے کر میں کیا کروں گا۔ نواب کے مزاج میں کچھ وحشت بھی تھی۔ حسب الحکم شیخ صاحب کو نکلنا پڑا اور چند روز الٰہ آباد میں جا کر رہے۔ نواب مر گئے تو پھر لکھنؤ میں آئے۔ چند روز کے بعد حکیم مہدی، جن کے بزرگ کشمیری تھے، شاہ اودھ کی سرکار میں مختار تھے، وہ ایک بدگمانی میں معزول ہو کر نکلے۔ چونکہ وہ نواب آغا میر کے رقیب تھے، شیخ صاحب نے تاریخ کہی، جس کا مادہ ہے:

ع کاشو برائے پختنِ شلغم گریختہ

مشکل یہ کہ چند روز کے بعد وہ پھر بحال ہو گئے۔ شاعر نے الٰہ آباد کو گریز کی، لیکن اکثر غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب لکھنؤ سے جدا ہوئے، تڑپتے اور دن ہی گنتے رہے۔ ایک شعر میں بھی لکھتا ہوں ؎

دشت سے کب وطن کو پہنچوں گا
کہ چھٹا اب تو سال آ پہنچا

حکیم مہدی کو دوبارہ زوال ہوا تو اُنھوں نے پھر تاریخ کہی۔ نیا انداز ہے، اس لیے لکھتا ہوں:

از جائے حکیم ہشت بر گیر
سہ مرتبہ نصفت نصفت کم کن ۱۲۴۸ھ

اب کی دفعہ جو آئے تو ایسے گھر میں بیٹھے کہ مر کر بھی نہ اُٹھے، گھر میں ہی دفن ہوئے۔ میر علی اوسط رشک اُن کے شاگرد رشید نے تاریخ کہی ع

وا شعر گوئی اُٹھی لکھنؤ سے

لوگ کہتے ہیں ۶۴-۶۵ برس کی عمر تھی، مگر رغمی سلمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تقریباً سو برس کی عمر ہو گی۔ اکثر عہد سلف کے معرکے اور نواب شجاع الدولہ کی باتیں آنکھوں سے

دیکھی بیان کرتے تھے ؎

دیوان تین ہیں، مگر دو مشہور ہیں۔ ایک الہ آباد میں مرتب کیا تھا۔ بے وطنی کا عالم، دل پریشان، غزلیں خاطر خواہ بہم نہ پہنچیں، اس لیے دفتر پریشاں نام رکھا۔ ان میں غزلوں، رباعیوں اور تاریخوں کے سوا اور قسم کی نظم نہیں۔ قصائد کا شوق نہ تھا۔ چنانچہ نواب لکھنؤ کی تاریخ و تہنیت میں بھی کچھ کہا ہے۔ تو بطور قطعہ ہے، ہجو کے کانٹوں سے ان کا باغ پاک ہے ؎

ایک مثنوی۔ حدیث مفصل کا ترجمہ ہے۔ میر علی اوسط رشک نے اُسے ترتیب دیا اور اس کا تاریخی نام نظم سراج بھی رکھا ہے اور ایک مولود شریف بھی شیخ صاحب کی تصنیف ہے۔ عموماً کلام ان کا شاعری کے ظاہر عیبوں اور لفظی سقموں سے بہت پاک ہے۔ اور اس امر میں انہیں اتنی کوشش ہے کہ اگرچہ ترکیب کی چستی یا کلام کی گرمی میں فرق آ جائے۔ مگر اصول ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور یہ سلامت روی قرین مصلحت ہے، کیونکہ نئے تصرف اور ایجاد انسان کو اکثر ایسے اعتراضوں کے نشانے پر لا ڈالتے ہیں، جہاں سے سرکنا بھی مشکل ہو جاتا ہے ؎

غزلوں میں شوکتِ الفاظ اور بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم۔ صائب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں ترکیب دے کر ایسی دست کاری اور مینا نگاری فرمائی کہ بعض موقع پر بیدل اور ناصر علی کی حد میں جا پڑے اور اُردو میں وہ اس سے صاحب طرز قرار پائے۔ انھیں ناسخ کہنا بجا ہے، کیونکہ طرزِ قدیم کو نسخ کیا، جس کا خود بھی انہیں فخر تھا ؎

دیوان ؂ کے اخیر میں بہت سی تاریخیں ہیں اور اکثروں میں نہایت عمدہ اور برجستہ مادے نکالے ہیں۔ شوکت الفاظ کہتی ہے کہ اگر وہ قصیدہ کہتے تو خوب کہتے، مگر افسوس کہ اس طرف توجہ نہ کی۔

نظم سراج کی نظم لوگوں کی رائے میں ان کے رتبۂ عالی سے گری ہوئی ہے۔ اور چونکہ پابندی ترجمہ حدیث کی ہے، اس لیے اس پر گرفت بے جا ہے۔ چند شعر نمونے کے طور پر ہیں۔ ؎

کی خدا نے جو یہ زبان عطا — ہے بلا شک عطیۂ عظمیٰ
اِس سے ہے مختلف مزوں کی تمیز — اس سے پاتے ہیں لذّتِ ہر چیز
کوئی کڑوی ہے کوئی ہے میٹھی — نمکیں کوئی، کوئی کھٹ مِٹھی
سب مزوں سے زبان واقف ہے — مزے سب چیزوں کے ہیں گوناگوں
سب مزوں سے زبان واقف ہے — نہیں اسرار کی یہ کاشف ہے
جو نہ ہو ... تو کچھ نہ ہو معلوم — نہ ہو کوئی مزا کبھی مفہوم
اور بھی ہوتے ہیں زبان سے کام — ہے مدد قوت ... طعام
اس سے احکام بہر دنداں ہے — قوتِ تام بہر دنداں ہے

کوئی ناواقف شخص شائق کلام آتا تو چند بے معنی غزلیں بنا رکھی تھیں۔ ان میں سے کوئی شعر پڑھتے یا اُسی وقت چند بے ربط الفاظ جوڑ کر موزوں کر لیتے اور سناتے۔ اگر وہ سوچ میں جاتا اور چپ رہ جاتا تو سمجھتے تھے کہ کچھ سمجھتا ہے، اُسے اور سناتے تھے اور اگر اس نے بے تحاشا تعریف کرنی شروع کر دی تو اس طرح کے ایک دو شعر پڑھ کر چپکے ہو رہتے تھے۔ مثلاً:

آدمی مخمل میں دیکھے، مورچے بادام ہیں — ٹوکی دریا کی کلائی زلف اُلجھی دام ہیں

تو نے ناسخ وہ غزل آج لکھی ہے کہ ہوا — سب کو مشکل ید بیضا میں سخنداں ہونا

بلکہ اکثر خود سناتے بھی نہ تھے۔ جب کوئی آتا اور شعر کی فرمائش کرتا تو دیوان اُٹھا کر سامنے رکھ دیتے تھے کہ اس میں سے دیکھ لیجئے۔ دو تین خوشنویس کاتب بھی نوکر رہتے تھے۔ دیوان کی نقلیں جاری تھیں۔ جس دوست یا شاگرد کو لائق اور شائق دیکھتے اُسے عنایت فرماتے تھے۔

انھوں نے اور ان کے ہمعصر خواجہ حیدر علی آتش نے خوبیٔ اقبال سے ایسا زمانہ پایا، جس نے ان کے نقش ونگار کو تصاویر مانی و بہزاد کا جلوہ دیا۔ ہزاروں صاحب فہم دونوں کے طرفدار ہو گئے اور طرفین کو چمکا چمکا کر تماشے دیکھنے لگے، لیکن حق پوچھو تو ان فتنہ انگیزوں کا احسان مند ہونا چاہیئے کیونکہ روشنی طبع کو اشتعال دیتے تھے۔

اِن دونوں صاحبوں کے طریقوں میں بالکل اختلاف ہے۔ شیخ صاحب کے پیرو مضمون دقیق ڈھونڈتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے معتقد محاورے کی صفائی، کلام کی سادگی کے بندے ہیں۔ اور شعر کی تڑپ اور کلام کی تاثیر پر جان قربان کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو شیخ صاحب کے کلام پر چند قسم کے اعتراض ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض باتوں میں سینہ زوری اور شدت ہے، لیکن مورخ کو ہر امر کا اظہار واجب ہے۔ اس لیے قلم انداز بھی نہیں ہو سکتا۔

اوّل کہتے ہیں کہ شیخ صاحب کی اکثر نازک خیالیاں ایسی ہیں کہ کوہ کندن و کاہ برآوردن، چنانچہ اشعار مفصلہ ذیل نمونۂ نازک خیالی ہیں:

میری آنکھوں نے تجھے دیکھ کے وہ کچھ دیکھا
کہ زبانِ مژہ پر شکوہ ہے بینائی کا

کھل گیا ہم پہ عناصر جب ہوئے بے اعتدال — رابطہ واجب ہے ممکن دوست دشمن میں نہیں

کی خدا نے کافروں پر اے صنم جنت حرام — ورنہ کس کی آنکھ پڑتی تیرے ہوتے حور پر

کوئے جاناں میں ہوں پر محروم ہوں دیدار سے — پائے خفتہ خندہ زن ہیں دیدۂ بیدار پر

وہ آفتاب نہ ہو کس طرح سے بے سایہ — ہُوا نہ سر سے کبھی سایۂ سحاب جُدا

خواجہ صاحب کے معتقد کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کے اصول کو سمجھا ہے، یعنی فارسی میں

خواجہ حافظ اور شیخ سعدی سے اور اردو میں سوزؔ، میرؔ اور جرأتؔ سے سند پائی، وہ اُسے غزل نہ کہیں گے۔ مگر یہ بات ایسی گرفت کے قابل نہیں، کیونکہ فارسی میں بھی جلال اسیرؔ، قاسم مشہدیؔ، بیدلؔ اور ناصر علی وغیرہ اُستاد ہو گزرے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے نازک خیالوں کی بدولت خیال بند اور معنی یاب لقب حاصل کیا ہے۔ شیخ صاحب نے اُن کی طرز اختیار کی تو کیا بُرا ہے۔ یہ بھی واضح ہو کہ جن لوگوں کی طبیعت میں ایسی خیال بندیوں کا انداز پیدا ہوا ہے، اس کے کئی سبب ہوئے ہیں۔ اوّل یہ کہ بعض طبیعتیں ابتدا ہی سے پُرزور ہوتی ہیں، فکر اُن کے تیز اور خیالات بلند ہوتے ہیں، مگر اُستاد نہیں ہوتا، جو اس ہونہار بچھیرے کو روک کر نکالے اور اُصول کی باگوں پر لگائے۔ پھر اس خود سری کو اُن کی آسودہ حالی اور بے احتیاطی زیادہ قوت دیتی ہے، جو کسی جوہر شناس یا سخن فہم کی پروا نہیں رکھتی۔ وہ اپنی تصویریں آپ کھینچتے ہیں اور آپ اُن پر قربان ہوتے ہیں، بلکہ شوقین، داد دینے والے جو کھرے کھوٹے کے پرکھنے والے ہیں اور حقیقت میں پسندِ عام کے وکیل بھی وہی ہیں۔ ان نازک خیالوں کو ان کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ ان کی دولت مندی اپنے گھر پر اپنا دربار الگ لگاتی ہے۔ جس میں بعض اشخاص دقت پسندی اور باریک بینی میں ان کے ہم مزاج ہوتے ہیں۔ بعض فقط باتوں ہی باتوں میں خوش کر دینے کا شوق رکھتے ہیں۔ بعض کو اپنی گرہ کی عقل نہیں ہوتی، جس طرف لوگوں کو دوڑتے دیکھا، آپ بھی دوڑنے لگتے ہیں۔ غرض ایسے ایسے سبب ہوتے ہیں، جو چنگے بھلے آدمی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر خود پسندی کے ناہموار میدانوں میں دھکیل دیتے ہیں۔

دوسرا اعتراض ان کے حریفوں کا اُن سخت اور سنگین الفاظ پر ہے، جن کے بھاری وزن کا بوجھ غزل کی نزاکت و لطافت ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ اور کلام بھدّا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ اشعار اِس قبیل کے بھی لکھے جاتے ہیں:

؎ بے خطر لیں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پر
دوڑتا تھا جس طرح ثعبانِ موسیٰؑ مار پر

تو وہ خورشید ہے اُٹھے جو گلستاں میں نقاب — چہرۂ گل میں تلوّن ہو وہیں حربا کا
برنگِ گل جگر ہوتا ہے ٹکڑے سیرِ گلشن میں — ہوا ہے تیغِ غم بے یار نظارہ سپر غم کا
آگے مجھ کامل کے ناقص ہے کمالِ مدّعی — درمیاں ہے فرقِ استدراج اور اعجاز کا
مِل گیا ہے عشق کا آزار قسمت سے مجھے — ہوں جو عیسیٰؑ بھی ارادہ ہو نہ استعلاج کا
انڈا اکھِڑنگ کے نِکلی ہے باہر تو کیسا ہوا — بُلبُل کو جسم بیضہ فولاد ہو گیا
ناسخ تمام جس تناسخ سے پاک ہے — وہ شمع ہو گیا تو وہ پروانہ ہو گیا
قمر ہی کیا ترے آگے محاق میں آیا — کہ آفتاب بھی تو احتراق میں آیا

سوئے کعبہ تیرے عاشق سجدے کرتے میں کوئی — تیرے ابرو کی طرف قبلہ محوّل ہوگیا

بڑا اشکال ہے نا سنج غم عالم فراہم کر — ارادہ ہے اگر اے چرخ اُس کی بھانی کا

نہ باطل خشک زاہد ہے نہ عاطل رند تر دامن — خدا نے اپنی حکمت سے کیا ہے خشک و تر پیدا

کسی حالت میں مجھے ہوش سے کچھ کام نہیں — چڑھ گئے ابخرے نشے کے جو سودا اُترا

آغاز خط میں اژدرِ فرعون ہے جو زلف — افسونِ خطِ مارہی افسانہ ہوگیا

غیر کوثر کسی دریا کا میں سیّاح نہیں — بیشۂ شیرِ خدا بن کہیں سیّاح نہیں

ہے ہوس ہم سے ملے یار کرے غیر کو ترک — مطلب اپنا وہ ہے جو قابل اخراج نہیں

ظلم طولِ شب فرقت کے تطاول نے کہا — داد رس کوئی بجز فالق الاصباح نہیں

روشنائی سے ہوئی روشنی خلوت فکر — جز قلم اور مری بزم میں مصباح نہیں

بال توڑے تیری زلفوں کے نہ بیدردی ہے — جس مرے ہاتھ کی مانند ہو گر شانے میں

خیال بند طباع اور مشکل پسند لوگ اگرچہ اپنے خیالوں میں مست رہتے ہیں، مگر چونکہ فیض سخن خالی نہیں جاتا اور مشق کو بڑی تاثیر ہے، اس لیے مشکل کلام میں بھی ایک لطف پیدا ہو جاتا ہے، جس سے اِن کے اور اُن کے طرف داروں کے دعوؤں کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے۔

تیسرے اِن کے حریف کہتے ہیں کہ شیخ صاحب بھی خیال بندی اور دشوار پسندی کی قباحت کو سمجھ گئے تھے اور آخر کو اس کوچے میں آنے کا ارادہ کرتے تھے۔ انھی دنوں کا ایک مطلع شیخ صاحب کا ہے۔ خواجہ صاحب کے سامنے کسی نے پڑھا اور اُنھوں نے لطفِ زبان کی تعریف کی:

جنوں پسند ہے مجھ کو ہوا بگولوں کی — عجب بہار ہے اِن زرد زرد پھولوں کی

مگر اوّل تو طبیعت کی مناسبت، دوسرے عمر بھر کی وہی مشق تھی، اس لیے جب محاورے کے کوچے میں آکر صاف صاف کہنا چاہتے تھے تو پھُس پھُس بندش اور پھسپھسے الفاظ بولنے لگتے تھے۔ چنانچہ اس کی سند میں اکثر اشعار پیش کرتے ہیں، جن میں سے چند شعر یہ ہیں:

ناک رگڑے ہر گھڑی کیونکر نہ اُس کے سامنے — بدلے نتھنی کے سلیماں کی ہے خاتم ناک میں

رنگ لالے میں اگر ہے تو نہیں نام کو بُو — یاسمن میں ترے پنڈے سی ہے بُو رنگ نہیں

ساقی بغیر مے یہ لہو تھوکتا نہیں — منہ سے شراب وصل نکلتی ہے ہجر میں

کیا ہی حاسد ہے فلک جس نے کہ نوبت پائی

دم میں مانندِ حباب اُس نے نقارہ توڑا

ان کے حریفوں کو اس لفظ پر بھی اعتراض ہے، کیونکہ نقّارہ مشدّد ہے، تخفیف کے ساتھ نہیں آیا۔ اور جب اُن سے کہا گیا کہ نقارہ بھی بہ تشدید ہے، مگر تخفیف کے ساتھ فارسی

اور ریختہ میں آیا ہے۔ تو انھوں نے کہا کہ غیر زبان کے لفظ میں قیاس نہیں چل سکتا، اہلِ زبان کی سند دینی چاہیئے۔ منصفوں کے نزدیک یہ بھی ان کی سینہ زوری ہے ؎ (نظامی)

بذوقِ جشنِ نوروزی نقارہ
گلوئے خویش کردہ پارہ پارہ

مجھ سے رہتا ہے رمیدہ وہ غزالِ شہری
صاف سیکھا ہے چلن آہوئے صحرائی کا

غزالِ شہری کے لیے فارسی کی سند چاہیئے، کیونکہ وحشی کے مقابل میں اہلی بولتے ہیں۔ شہری نہیں بولتے، مگر اسے فارسی کے کوچے میں نہیں ڈالنا چاہیئے، بلکہ اُردو کے نادر الکلام کا تصرف سمجھنا چاہیئے ؎

ذبح وہ کرتا تو ہے پر چاہیئے اے مُرغ دل
دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھ کر صیاد کا

یہ تعقید نہایت بے طور واقع ہوئی ہے۔ اِن کے حریف اس قسم کے اشعار اور بھی بہت پڑھتے ہیں، مگر ان جزوی باتوں پر توجہ بے حاصل ہے، اِس لیے اشعار مذکور قلم انداز کیے گئے ؎

اِن کے کلام میں تصوف بھی ہے، مگر اس کا رستہ کچھ اور ہے، جس سے وہ واقف نہیں:

تو بھی آغوشِ تصور سے جُدا ہوتا نہیں
اے صنم جس طرح دُور اک دم خدا ہوتا نہیں

بحرِ وحدت میں ہوں میں، گو سر گیا مثلِ حباب
چوب کیا تلوار سے پانی جُدا ہوتا نہیں

نشہ عرفاں نہیں جب تک دلا ہے قیل و قال
تا نہ ہو لبریز ساغر بے صدا ہوتا نہیں

اسرار نہاں آتے ہیں سینے سے زباں پر
اب سدِ سکندر کروں تعمیر گلے میں

ہے یہ وہ راہ کہ تا عرش پہنچتا ہے بشر
دل میں دروازہ ہے اس گنبدِ مینائی کا

عارفوں کو ہر در و دیوار ادب آموز ہے
مانع گردن کشی ہے انحنا محراب کا

مظہر وہ بُت ہے نورِ خدا کے ظہور کا
نقشِ قدم سے سنگ کو رُتبہ ہے طُور کا

حریف یہ بھی حرف رکھتے ہیں کہ شیخ ناسخ مخلوق فارسی کو تناسخ دے کر اُردو کی زندگی دیتے تھے۔

مسی آلودہ لب پر رنگ پاں ہے
تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

مسی آلودہ بر لب رنگِ پان است
تماشا کن نہ آتش دخان است

ناتوانی سے گراں سُرمہ ہے چشمِ یار کو
جس طرح ہو رات بھاری مردمِ بیمار کو

گویند کہ شب بر سرِ بیمار گراں است
گر سُرمہ بچشم تو گراں است ازاں است

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انساں سے

کسی اُستاد کا شعر فارسی میں ہے :

بروزِ بیکسی کس نیست غیر از سایہ یارِ من — مگر آنہم ندارد طاقت شبہائے تارِ من
فرق ہے شاہ و گدا میں قولِ شاعر سے یہی — شیرِ قالیں اور ہے شیرِ نیستاں اور ہے

بوریا جائے من و جائے توانگر قالیں
شیرِ قالیں دگر و شیرِ نیستاں دگر است

میر تقی مرحوم اور بقا میں دو آبے کے مضمون پر جو دو لطیفے ہوئے، میر صاحب کے حال میں لکھے گئے۔ میں سمجھتا تھا کہ شیخ ناسخ نے الٰہ آباد میں بیٹھ کر اس میں سے یہ مضمون تراشا ہوگا۔ صفحہ ۲۲۳

ایک تر بینی ہے دو آنکھیں مری
اب الٰہ آباد بھی پنجاب ہے

لیکن غیاث الدین بلبن بادشاہ دہلی کا بیٹا یعنی محمد سلطان جب لاہور کے باہر راوی کے کنارے پر ترکان تاتاری کی لڑائی میں مارا گیا۔ تو امیر خسرو نے اس کا مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے، اس میں کہتے ہیں :

بسکہ آبِ چشمِ خلقے شد رواں در چار سو
پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید

کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے انھیں باتوں پر چوٹ کر کے کہا ہے :

مضمون کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں
چکھتی خراب کرتی ہے مالِ حرام کی

اگرچہ اس طرح کے چند اشعار اور بھی سُنے جاتے ہیں، مگر ایسا صاحبِ کمال جس کی تصنیفات میں کمال نازک خیالی اور مضامین عالی کے ساتھ ایک مجلّد ضخیم موجود ہے، اس پر سرقے کا الزام لگانا انصاف کی آنکھوں میں خاک ڈالنی ہے۔ سودا اور میر کے اشعار جن اُستادوں کے اشعار سے لڑ گئے ہیں، وہ لکھے گئے۔ جو اُن کی طرف سے جواب ہے، وہی اُن کی طرف سے سمجھیں۔ میری رائے میں یہ دونوں حریف اور اُن کے طرف دار کوئی موردِ الزام نہیں، کیونکہ دونوں طرفوں میں کوئی کمال سے خالی نہیں تھا۔ البتہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں، اس لیے پسند میں اختلاف ہے۔ کہنے والے جو چاہیں سو کہے جائیں :

انھی نازک خیالیوں میں جو صاف شعر بھی زبان سے نکل گیا ہے، ایک تیر ہے کہ نشانے کے پار جا کر اُڑا ہے، اٹک کر ترازو بھی نہیں ہُوا:

سیکڑوں آہیں کروں پر دخل کیا آواز کا
تیر جو دیوے صدا ہے نقص تیر انداز کا

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

اِس انداز کے شعر بھی اِن کے دیوانوں میں ڈھونڈو تو بہت ہوں گے۔

شیخ صاحب کے کلام میں نمکِ ظرافت کا چٹخارا کم ہے۔ چنانچہ زاہد اور ناصح، جو شعرائے اُردو، فارسی کے لیے ہر جگہ رونقِ محفل ہیں، یہ اُن سے بھی ہنس کر دل نہیں بہلاتے اور اگر اتفاقاً ہے تو ایسا ہے کہ وہ ہنسنا زہر خند معلوم ہوتا ہے۔

حرص سے زاہد یہ کہتا ہے جو گر جائینگے درخت — کیا کشادہ بہرِ رزق اپنا وہاں ہو جائے گا

دیکھیو ناسخ سرِ شیخِ معمّر کی طرف
کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار کا

سودا کی غزل ہے، جو مس ہووے، نا اگر ہووے، قفس ہووے، اگر ہووے۔ اُس کا شعر دیکھیو کہ وہ اسی بات کو کس چوچلے سے کہتا ہے:

نہیں شایانِ زیبِ گنبدِ دستار کچھ زاہد — مگر مسواک ہی اس پر کلس ہووے اگر ہووے

زاہد اب کی رمضان میں مَیں پڑھوں خاک نماز — سوئے قبلہ تو خنازیر کھڑے رہتے ہیں

واہ کیا پیرِ مغاں کا ہے تصرّف مے کشو — محتسب کا اب سخن تکیہ ہی بُل بُل ہو گیا

عابد و زاہد چلے جاتے ہیں پینا ہے شراب — اب تو ناسخ زورِ رندِ لااُبالی ہو گیا

اہلِ تزویر سے اس درجہ ہے نفرت مجھ کو
کہ مجھے قافیہ زور سے کچھ کام نہیں

شیخ صاحب کا مذہب پہلے سُنّت و جماعت تھا، پھر مذہب شیعہ اختیار کیا۔ وہ اکثر غزلوں میں مذہبی تعریفیں کرتے تھے اور یہ شاعر یا عام مصنّف کے لیے نازیبا ہیں۔ ہاں کوئی اپنے تائیدِ مذہب میں کتاب لکھے تو اُس میں دلائل و براہین کے قبیل سے جو چاہے کہے مضائقہ نہیں۔

وہ بہت خوش اخلاق تھے، مگر اپنے خیالات میں ایسے محو رہتے تھے کہ ناواقف شخص خشک مزاج یا بد دماغ سمجھتا تھا۔ سیّد مہدی حسن فراغ مرحوم میاں بیتاب کے شاگرد تھے۔ اور زبانِ ریختہ کے کہن سال مشّاق تھے۔ نقل فرماتے تھے کہ ایک دن میں شیخ صاحب کی خدمت

میں گیا - دیکھا کہ چوکی پر بیٹھے نہار ہے ہیں - آس پاس چند احباب موڑھوں پر بیٹھے ہیں۔ میں سامنے جا کر کھڑا ہُوا اور سلام کیا - اُنھوں نے ایک آواز سے جو اِن کے بدن سے بھی فربہ تھی، فرمایا کہ کیوں صاحب کس طرح تشریف لانا ہُوا - میں نے کہا کہ ایک فارسی کا شعر کسی اُستاد کا ہے، اُس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے -

- فرمایا، میں فارسی کا شاعر نہیں - اتنا کہہ کر اَور شخص سے باتیں کرنے لگے - میں اپنے جانے پر بہت پچھتایا - اور اپنے تئیں ملامت کرتا چلا آیا ؎

لطیفہ :- ایک دن کوئی شخص ملاقات کو آئے - یہ اس وقت چند دوستوں کو لیے انگنائی میں کرسیوں پر بیٹھے تھے - شخص مذکور کے ہاتھ میں چھڑی اور اتفاقاً پاؤں کے آگے ایک مٹی کا ڈھیلا پڑا تھا - وہ شغل بیکاری کے طور پر جیسے کہ اکثر اشخاص کو عادت ہوتی ہے آہستہ آہستہ لکڑی کی نوک سے ڈھیلے کو توڑنے لگے - شیخ صاحب نے نوکر کو آواز دی - سامنے حاضر ہُوا - فرمایا کہ میاں! ایک ٹوکری مٹی کے ڈھیلوں کی بھر کر ان کے سامنے رکھ دو، دل لگا کر شوق پُورا کریں -

لطیفہ :- شاہ غلام اعظم افضل ان کے شاگرد اکثر حاضر خدمت ہوتے تھے - ایک دن آپ تخت پر بیٹھے تھے - اس پر سِتیل پاٹی کا بوریا بچھا تھا - افضل آئے - وہ بھی اُسی پر بیٹھ گئے - اس پر سِتیل پاٹی کا ایک تنکا توڑ کر چٹکی سے توڑنے اور مروڑنے لگے - شیخ صاحب نے آدمی کو بُلا کر کہا - کہ بھائی وہ جو آج نئی جھاڑو تم بازار سے لائے ہو، ذرا لے آؤ - اُس نے حاضر کی - خود لے کر شاہ صاحب کے سامنے رکھ دی اور کہا، صاحبزادے! اس سے شغل فرمایئے - فقیر کا بوریا آپ کے تھوڑے سے التفات میں برباد ہو جائے گا، پھر اور سِتیل پاٹی اس شہر میں کہاں ڈھونڈتا پھرے گا ؛ وہ بے چارے شرمندہ ہو کر رہ گئے ؎

لطیفہ :- آغا کلبِ عابد خاں صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ شیخ صاحب کے واسطے کسی شخص نے دو تین چمچے بطریق تحفہ بھیجے کہ شیشے کے تھے - اِن دنوں میں نیا ایجاد سمجھے جاتے تھے اور حقیقت میں بہت خوشنما تھے - وہ پہلو میں طاق پر رکھے تھے - ایک امیر صاحبزادے آئے، اِس طرف دیکھا اور پوچھا کہ حضرت یہ چمچے کہاں سے خریدے اور کس قیمت کو خریدے؟ شیخ صاحب نے حال بیان کیا - انھوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک چمچہ اُٹھا لیا - دیکھ کر تعریف کی - پھر باتیں چیتیں کرتے رہے اور چمچے سے زمین پر کھٹکا دے کر شغل بے شغلی فرماتے رہے - شیشے کی بساط کیا تھی - ٹھیس زیادہ لگی، جھٹ سے دو ٹکڑے - شیخ صاحب نے دوسرا چمچہ اُٹھا کر سامنے رکھ دیا اور کہا، اب اس سے شغل فرمایئے -

لطیفہ :- ایک دن اپنے خانہ باغ کے بنگلے میں بیٹھے اور فکرِ مضمون میں غرق تھے۔ ایک شخص آکر بیٹھے۔ ان کی طبیعت پریشان ہوئی۔ اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ کہ یہ اُٹھ جائیں۔ ناچار پھر آ بیٹھے، مگر وہ نہ اُٹھے۔ کسی ضرورت کے بہانے سے پھر گئے کہ یہ سمجھ جائیں گے۔ وہ پھر بھی نہ سمجھے۔ انھوں نے چلم میں سے چنگاری اُٹھا کر بنگلے کی ٹٹی میں رکھ دی اور آپ الگ ہو بیٹھے۔ ٹٹی جلنی شروع ہوئی۔ وہ شخص گھبرا کر اُٹھے اور کہا کہ شیخ صاحب آپ دیکھتے ہیں! یہ کیا ہو رہا ہے؟ انھوں نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا کہ جاتے کہاں ہو؟ اب تو مجھے اور تمھیں مل کر راکھ ہونا ہے۔ تم نے میرے مضامین کو خاک میں ملایا ہے، میرے دل کو جلا کر خاک کیا ہے، اب کیا تمھیں جانے دوں گا؟

لطیفہ :- اسی طرح ایک شخص نے بیٹھ کر انھیں تنگ کیا۔ نوکر کو بُلا کر صندوقچہ منگایا۔ اس میں سے مکان کے قبالے نکال کر اُن کے سامنے دھر دیئے اور نوکر سے کہا کہ بھائی مزدوروں کو بلاؤ اور اسباب اُٹھا کر لے چلو۔ اِدھر وہ شخص حیران، ان کا منہ دیکھے، اُدھر نوکر حیران۔ آپ نے کہا، دیکھتے کیا ہو، مکان پر تو یہ قبضہ کر چکے، ایسا نہ ہو۔ کہ اسباب بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔

شیخ صاحب کے مزاج میں یہ صفتیں تھیں، مگر بنیاد اِن کی فقط نازک مزاجی پر تھی، نہ غرور یا بدنیتی پر، جس کا انجام بدی تک پہنچے۔ نازک مقام آپڑتا تو اس طرح تحمل کر کے ٹال جاتے تھے کہ اوروں سے ہونا مشکل ہے۔

نقل :- ایک نواب صاحب کے ہاں مشاعرہ تھا۔ وہ اُن کے معتقد تھے۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ شیخ صاحب جب غزل پڑھ چکیں تو انھیں سرِ مشاعرہ خلعت دیں۔ یار لوگوں نے خواجہ صاحب کے پاس مصرع طرح نہ بھیجا۔ انھیں اس وقت مصرع پہنچا، جب ایک دن مشاعرے میں باقی تھا۔ خواجہ صاحب بہت خفا ہوئے اور کہا کہ اب لکھنؤ رہنے کا مقام نہیں، ہم نہ رہیں گے۔ شاگرد جمع ہوئے اور کہا کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں، نیاز مند حاضر ہیں، دو دو شعر کہیں گے تو صدہا شعر ہو جائیں گے۔ وہ بہت تند مزاج تھے۔ اُن سے بھی ویسے ہی تقریریں کرتے رہے۔ شہر کے باہر چلے گئے۔ پھرتے پھرتے ایک مسجد میں جا بیٹھے۔ وہاں سے غزل کہہ کر لائے اور مشاعرے میں گئے تو ایک قرابین بھی بھر کر لیتے گئے۔ بیٹھے ایسے موقع پر تھے کہ عین مقابل شیخ صاحب کے تھے۔ اوّل تو آپ کا انداز ہی بانکے سپاہیوں کا تھا، اس پر قرابین بھری سامنے رکھی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھرے بیٹھے ہیں۔ بار بار قرابین اُٹھاتے تھے اور رکھ دیتے تھے۔ جب شمع سامنے آئی تو سنبھل کر ہو بیٹھے اور شیخ صاحب کی طرف اشارہ کر کے پڑھا ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

اس ساری غزل میں کہیں ان کے لے پالک ہونے پر، کہیں ذخیرۂ دولت پر، کہیں ان کے سامانِ امارت پر، غرض کچھ نہ کچھ چوٹ ضرور ہے۔ شیخ صاحب بیچارے دم بخود بیٹھے رہے نواب صاحب ڈرے کہ خدا جانے یہ اُن پر قرابین خالی کریں یا میرے پیٹ میں آگ بھر دیں۔ اُسی وقت داروغے کو اشارہ کیا کہ دوسرا خلعت خواجہ صاحب کے لیے تیار کرو۔ غرض دونوں صاحبوں کو برابر خلعت دے کر رخصت کیا۔

رعمی سلمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدتوں لکھنؤ میں رہنا ہوا۔ میں نے کبھی چاند اور سورج کا طلوع ایک مطلع میں سے نہ دیکھا۔ ہمیشہ مشاعرے میں پہلو بچاتے تھے۔ خواجہ صاحب نواب سید محمد خاں رند اور صاحب مرزا آشنا اور کے مشاعرے میں جایا کرتے تھے۔ ادھر مرزا محمد رضا برق کے ہاں مشاعرہ ہوتا تھا۔ شیخ صاحب اپنی غزل بھیج دیتے تھے۔ جب جلسہ جمتا، برق کے شاگرد میاں آخور سب سے پہلے غزل مذکور کو لے کر کہتے۔ صاحبو! ہمہ تن گوش باشید۔ یہ غزل اُستاذ الاستاذ شیخ ناسخ کی ہے۔ تمام اہلِ مشاعرہ چپ چاپ ہو کر متوجہ ہو جاتے۔ اُن کی غزل کے بعد اور شعرا پڑھتے تھے۔

برخلاف عادت شعرا کے ان کی طبیعت میں سلامت روی کا جوہر تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ سید محمد خاں رند کی اپنے اُستاد خواجہ حیدر علی آتش سے شکر رنجی ہو گئی۔ چاہا کہ ناسخ کی شاگردی سے اُستادِ سابق کے تعلق کو فسخ کریں۔ مرزا محمد رضا برق کے ساتھ شیخ صاحب کے پاس آئے۔ مرزا صاحب نے اظہارِ مطلب کیا۔ شیخ صاحب نے تامل کے بعد کہا کہ نواب صاحب دس برس سے خواجہ صاحب سے اصلاح لیتے ہیں۔ آج اُن سے یہ حال ہے تو کل مجھے اُن سے کیا اُمید ہے۔ علاوہ برآں آپ خواجہ صاحب سے کچھ سلوک بھی کرتے ہیں۔ وہ سلسلہ قطع ہو جائے گا۔ اُس کا وبال کدھر پڑے گا اور مجھے اُن سے یہ تمنا نہیں۔ میری دانست میں بہتر ہے کہ آپ ہی دونوں صاحبوں میں صلح کرا دیں۔ اور اس امر میں اس قدر تاکید کی کہ پھر آپس میں صفائی ہو گئی۔

اگرچہ اِن کے کلاموں اور حکایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت میں شوخی اور رنگینی نہ تھی، مگر شاعری کا وہ نشہ ہے۔ کہ اپنے رنگ پر لے ہی آتا ہے۔ چنانچہ میر گھسیٹا ایک شخص مر گئے۔ تو شیخ صاحب نے تاریخ فرمائی:

جب مر گئے ہائے میر گھسیٹا
ہر ایک نے اپنے منہ کو پیٹا
ناسخ نے کہی یہ سُن کے تاریخ
افسوس کہ موت نے گھسیٹا

نقل: ان کے مزاج میں منصفی اور حق شناسی کا اثر ضرور تھا۔ چنانچہ الٰہ آباد میں ایک دن مشاعرہ تھا۔ سب موزوں طبع طرحی غزلیں کہہ کر لائے۔ شیخ صاحب نے غزل پڑھی، مطلع تھا:

دل اب محو ترسا ہوا چاہتا ہے ۔۔۔ یہ کعبہ کلیسا ہوا چاہتا ہے

ایک لڑکے نے صف کے پیچھے سے سر نکالا۔ بھولی بھالی صورت سے معلوم ہوتا تھا، کہ معرکے میں غزل پڑھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ لوگوں کی دلدہی نے اس کی ہمت باندھی۔ پہلا ہی مطلع تھا:

دل اُس بُت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے
خدا جانے اب کیا ہُوا چاہتا ہے

محفل میں دھوم مچ گئی۔ شیخ ناسخ نے بھی تعریف کر کے لڑکے کا دل بڑھایا اور کہا کہ بھائی! یہ فیضان الٰہی ہے، اس میں اُستادی کا زور نہیں چلتا۔ تمھارا مطلع مطلع آفتاب ہے، میں اپنا پہلا مصرعہ غزل سے نکال ڈالوں گا۔

شاہ نصیر کا مطلع ہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے، نصیر تخلص نہ ہوتا تو یہ مطلع نصیب نہ ہوتا:

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیرؔ پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

ایک دن کسی سوداگر کی کوٹھی میں گئے۔ سوداگر بچہ کہ دولتِ حسن کا بھی سرمایہ دار تھا، سامنے لیٹا تھا، مگر کچھ سوتا کچھ جاگتا تھا۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا۔ ؏

ہے چشمِ نیم باز عجب خواب ناز ہے

یہ مصرع تو ہوگیا، مگر دوسرا مصرع جیسا جی چاہتا، ویسا نہ ہوتا تھا۔ گھر آئے، اسی فکر میں غرق تھے کہ خواجہ وزیر آگئے۔ انھوں نے خاموشی کا سبب پوچھا۔ شیخ صاحب نے بیان فرمایا۔ اتفاق ہے کہ اُن کی طبیعت لڑ گئی:

ہے چشمِ نیم باز عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے، درِ فتنہ باز ہے

شیخ صاحب بہت خوش ہوئے:

ایک دن وزیر اپنے شاہِ سخن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مزاج پرسی فرما کر عنایت و محبت کی باتیں کرنے لگے اور کہا کہ آج کل کچھ فکر کیا؟ عرض کی کہ درود وظیفہ سے فرصت نہیں ہوئی آپ نے ارشاد فرمایا۔ انھوں نے یہ مطلع پڑھا:

وہ زلف لیتی ہے تابِ دل و تواں اپنا
اندھیری رات میں لُٹتا ہے کارواں اپنا

بہت خوش ہوئے، اُس وقت ایک عمدہ تسبیح عقیق البحر کی ہاتھ میں تھی وہ عنایت فرمائی۔ خواجہ وزیر پر بڑی عنایت تھی۔ اور قدر و منزلت فرماتے تھے۔ سب شاگردوں میں اُن کا نمبر اوّل تھا، پھر برقؔ، رشکؔ وغیرہ وغیرہ۔

تاریخ کلیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ پہر اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے۔ چنانچہ جن دنوں شاہ اجمل کے دائرے میں تشریف رکھتے تھے تو وہاں تین گھرانے بابرکت اور صاحبِ دست گاہ تھے۔ تینوں جگہ سے وقت معمول پر کھانا آتا تھا۔ ایک خوان بلکہ دستر خوان شاہ ابوالمعالی کی سرکار سے آتا تھا۔ اس میں ہر قسم کے امیرانہ اور عمدہ کھانے موجود ہوتے تھے۔ ایک خواں سید علی جعفر کے ہاں سے آتا تھا کہ شاہ ابوالمعالی کی بہن ان سے منسوب تھیں۔ ایک خوان شاہ غلام حیدر صاحب کے ہاں سے آتا تھا۔ اس پر بھی اپنا باورچی خانہ الگ گرم ہوتا تھا۔ جس چیز کو جی چاہتا تھا، پکواتے تھے۔ دستر خوان پر وہ بھی شامل ہو جاتا تھا۔ ایک دن باورچی سے خاگینے کی فرمائش فرمائی تھی۔ اس میں کوئی سپنولیا گرا ہوگا۔ چونکہ دوبارہ یہ حرکت کی تھی، آپ نے تاریخ کہہ دی۔ (تاریخ)

ے
جاں بلب آمد مرا از غفلتِ طباخ آہ
مے پزد خاگینہ با مارِ کرہ یہ از بہرِ من
چوں دگر بارہ خطا بنمود سالِ عیسوی
گفت دلِ مارِ سیہ بخت ایں سفیہ از بہرِ من

۱۸۳۷ء میں معتمد الدولہ آغا میر نے جو سوا لاکھ قصیدے کا صلہ دیا تھا۔ انھوں نے مرزائی صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔ لوگوں نے جانا کہ ان کے گھر ہی میں ہے۔ چور نے رات کو نقب لگائی اور ناکام گیا۔ آپ نے فرمایا: (تاریخ)

دُزد در خانۂ ناسخ چو زدہ نقب امشب
نہ زر و سیم نہ بُد مس، خجل آمد بیروں
بہرِ تاریخِ مسیحی چو بُریدم سرِ دُزد
دزد از خانۂ مفلس خجل آمد بیروں

بات بات پر تاریخ کہتے تھے۔ بخار سے صحت پائی، تاریخ کہی: رفت تپ تو بہ من۔ ۱۲۳۵ھ۔ غسل صحت کیا تو کہا۔ ع شود صحت ہمایون و مبارک، ۱۲۳۵ھ۔ ایک موقع پر قتل ہوتے

ہوتے بچ گئے، کہا: کنم شکرِ خدا، ۱۲۳۵ھ

حریفوں نے نظر بند کروا دیا تو کہا۔ ع ہے ہے افسوس خانہ زنداں گردید۔ جس بزرگ کی سفارش سے چھوٹے، اس کا تاریخی شکریہ کہا ع رہا نیدی مرا دزدست گرگے۔ کسی نے خطوط چرا لیے تو کہا۔ ع سیاہ ہچو قلم باد زوئے حاسدِ من۔ پھر چار خط جاتے رہے، تاریخ کہی ع۔ صد حیف تلف چہار نامہ

پیارے شاگرد خواجہ وزیر کا بیاہ ہوا تو فرمایا ع شدہ نوشہ وزیر من امروز۔ پھر ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو صبح کا وقت تھا۔ فرمایا ع صبح طالع شد برآمد آفتاب

ایک مشاعرے میں خواجہ صاحب نے مطلع پڑھا۔

سرمہ منظور نظر ٹھیرا ہے چشمِ یار میں
نیل کا گنڈا پنھایا مردمِ بیمار میں

شیخ صاحب نے کہا، سبحان اللہ خواجہ صاحب کیا خوب فرمایا ہے۔

سرمہ منظورِ نظر ٹھیرا جو چشمِ یار میں
نیلگوں گنڈا پنھایا مردمِ بیمار میں

خواجہ صاحب نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا، جائے اُستاد خالی است۔ آزاد کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مردمِ بیمار میں گنڈا کیونکر پنھاتے ہیں۔ گنڈا بیمار کو پنھایا کہتے ہیں اور اس سے زیادہ تعجب شیخ صاحب کے مطلع کا ہے کہ فرماتے ہیں۔

یوں نزاکت سے گراں ہے سُرمہ چشمِ یار میں
جس طرح ہو رات بھاری مردمِ بیمار میں

یہاں بھی میں بے معنی ہے۔ پر ہو تو ٹھیک ہے۔

لطیفہ:۔ ایک مشاعرے میں ایسے وقت پہنچے کہ جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ مگر خواجہ حیدر علی آتش چند شعرا ابھی موجود تھے۔ یہ جا کر بیٹھے۔ تنظیم رسمی اور مزاج پرسی کے بعد کہا کہ جناب خواجہ صاحب مشاعرہ ہو چکا؟ انھوں نے کہا کہ سب کو آپ کا اشتیاق رہا۔ شیخ صاحب نے یہ مطلع پڑھا:

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں
شمارِ دانۂ تسبیح میں امام نہیں

چونکہ نام بھی امام بخش تھا، اس لیے تمام اہلِ جلسہ نے نہایت تعریف کی۔ خواجہ صاحب نے یہ مطلع پڑھا:

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفے میں بازیِ غلام نہیں

بعض اشخاص کی روایت ہے کہ یہ مطلع آتش کے شاگرد کا ہے۔ ناسخ کے شاگردوں کی طرف سے اس کا جواب ہے اور حقیقت یہ ہے کہ لاجواب ہے:

جو خاص بندہ ہیں وہ بندہ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسفؑ کے، غلام نہیں

عوام میں یہ روایت اس طرح مشہور ہے، مگر دیرینہ سال لوگ جو اس زمانے کی صحبتوں میں شریک تھے، اُن سے یہ تحقیق ہوا کہ پہلا مطلع آتش نے حقیقت میں طالب علی خاں عیشی کے حق میں کہا تھا۔ یار لوگوں نے صفت پیدا کر کے شیخ صاحب کے ذمے لگا دیا۔

طبع اوّل کی ترویج میں اس کتاب کو دیکھ کر میرے شفیق دِلی سید احمد صاحب ڈکشنری نے کسی کی زبانی بیان کیا، کہ شیخ ناسخ ایک دن نواب نصیر الدین حیدر کے حضور میں حاضر تھے، حقہ سامنے تھا۔ فرمایا کہ شیخ صاحب اِس پہ کچھ کہیے، اُنھوں نے اُسی وقت کہا:

حقّہ جو ہے حضورِ معلّیٰ کے ہاتھ میں — گویا کہ کہکشاں ہے ثریّا کے ہاتھ میں
ناسخ یہ سب بجا ہے ولیکن تو عرض کر
بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

بعض احباب کہتے ہیں کہ ظاہر الفاظ میں حقہ کہکشاں ہے اور ممدوح ثریّا، لیکن ایسے ممدوحوں کو چاند سورج بلکہ بہ اعتبار قدر و منزلت کے فلک بھی کہہ دیا ہے، ثریّا سے آج تک کسی نے تشبیہ نہیں دی۔ شیخ ناسخ کلام کی گرمی اور شوخی اور چستی اور ترکیب سے دست بردار ہوئے مگر اصولِ فن کو نہیں جانے دیا۔ ان کی طرف یہ قطعہ منسوب کرنا چاند پر داغ لگانا ہے، لیکن چونکہ فی البدیہہ کہا ہے، اس لیے اس قدر سخت گیری بھی جائز نہیں۔

ایک غزل شیخ صاحب کی ہے، جس کا مطلع ہے:

دل لیتی ہے وہ زلفِ سیہ فام ہمارا
بجھتا ہے چراغ آج سرِ شام ہمارا

وہی مرزائی صاحب، جن کے پاس شیخ صاحب کے روپے امانت رہتے تھے، ایک امیر شرفا لکھنؤ میں سے تھے اور شیخ صاحب کے بہت دوست تھے۔ انھوں نے ایک عمدہ فیروزے پر آپ کا نامِ نامی کھدوا کر انگوٹھی بنوا کر دیا۔ اکثر پہنے رہتے تھے۔ کبھی اُتار کر رکھ بھی دیتے تھے۔ وہ کسی نے چرا لی یا کھوئی گئی۔ اُس پر فرمایا۔

ہم سا کوئی گمؔ نام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھُدے نام ہمارا

اس عہد تک لکھنؤ بھی آج کا لکھنؤ نہ تھا۔ شیخ ابراہیم ذوقؔ کا یہ مطلع جب وہاں پڑھا گیا:

خبر کر جنگ نوفل کی تو مجنوں اہل ہاموں کو
کبادہ تا صبا کھچوائے شاخِ بید مجنوں کو

سب نے اُسے بے معنی کہا۔ شیخ صاحبؔ نے جنگ نوفل کا واقعہ اور کبادہ کھینچنے کی اصطلاح بتائی۔ پھر سب نے تسلیم کیا، لیکن یہ امر نہ کچھ دِلّی والوں کے لیے موجب فخر ہے نہ لکھنؤ والوں کے لیے باعثِ رنجش۔ آخر دِلّی بھی ایک دن میں شاہجہان آباد نہیں ہوگئی تھی۔ میرتقیؔ اور مرزا رفیعؔ پیدا ہوتے ہی میرؔ اور سوداؔ نہیں ہو گئے۔ جب کلام کا سلسلہ یہاں تک پہنچا تو اس قدر کہنا واجب ہے کہ اس عہد تک شعرائے لکھنؤ اُن اُستادوں کے شاگرد تھے، جن کا دریائے کمال دِلّی کے سرچشمے سے نِکلا تھا اور فصحائے لکھنؤ بھی ہر محاورے کے لیے دِلّی ہی کو فخر سمجھتے تھے، کیونکہ وہ اکثر انہی بزرگوں کے فرزند تھے، جنھیں زمانے کی گردش نے اُڑا کر پھینک دیا تھا۔ پس شیخ صاحب اور خواجہ حیدر علی آتشؔ کے کمال نے لکھنؤ کو دِلّی کی قید پابندی سے آزاد کر کے استقلال کی سندوی اور وہی مستند ہوئی۔ اب جو چاہیں سو کہیں، ہم نہیں روک سکتے۔ چنانچہ شیخ صاحبؔ فرماتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| شہسواری کا جو اس چاند کے ٹکڑے کے ہے شوق | چاندنی نام ہے شبدیز کی اندھیاری کا |
| اے خط اُسکے گورے گالوں پر یہ تونے کیا کیا | چاندنی راتیں یکا یک ہو گئیں اندھیاریاں |
| اللہ رے روشنی مرے سینے کے داغ کی | اندھیاری رات میں نہیں حاجت چراغ کی |

نام سنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا
دل دھڑکتا ہے جدائی کی شب تار نہ ہو

اگرچہ دِلّی میں بچے سے بوڑھے تک اندھیری رات کہتے ہیں، مگر لکھنؤ والوں کو ٹوکنے کا منہ نہیں، کیونکہ جس خاک سے ایسے ایسے صاحب کمال اُٹھیں، وہاں کی زبان خود سند ہے۔ بکاولی میں نسیم کہتے ہیں۔ ع گھوما مانندِ نرد گھر گھر، دلی والوں کی زبان سے گھومنا ممکن نہیں۔ اہلِ لکھنؤ، ملائی کو بالائی کہتے ہیں۔ پینے کا ہو تو تمباکو، پان میں کھانے کا ہو تو تمباکو کہتے ہیں۔ دِلّی والے پینے کا ہو تو تمباکو، کھانے کا ہو تو زردہ کہتے ہیں۔

یوں تو شیخ صاحب کا ایک زمانہ معتقد ہوا۔ اور سب نے اُن کی شاگردی کو فخر سمجھا، مگر چند شاگرد بڑے بڑے دیوانوں کے مالک ہوئے۔

۱۔ خواجہ وزیر کہ آتش کے شاگرد تھے، پھر ناسخ کے شاگرد ہوئے اور اسی پر فخر کرتے کرتے مر گئے۔ جیسے نازک خیال تھے، ویسی ہی زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ شیخ صاحب بھی ان کی بڑی خاطر کرتے اور اوّل درجے کی شفقت مبذول فرماتے تھے۔

۲۔ مرزا محمد رضا خاں برق بعض بعض غزلوں سے اور واجد علی شاہ بادشاہ کی مصاحبت سے مشہور عالم ہوئے۔ اِن کا دیوان چھپا ہوا بکتا ہے۔

۳۔ والا جاہ میر علی اوسط رشک، جن کی طبیعت کی آمد ضخیم اور جسیم دیوانوں میں نہیں سماتی اور شاعری کی سرکار سے تاریخیں کہنے کا ٹھیکہ ملا۔

۴۔ شیخ امداد علی بحر ہر چند زمانے نے غریبی کی خاک سے سر اُٹھانے نہیں دیا مگر طبیعت بڑھاپے میں جوانی کی اکڑ تکڑ دکھاتی رہی۔ آخر میں آکر اقبال نے رفاقت کی۔ نواب صاحب رامپور کی سرکار میں آکر چند سال آرام سے بسر ہوئے۔ حقیقت میں وہی ایک شاگرد تھے، جو اب اُستاد کے لیے باعث فخر تھے۔

۵۔ سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی کہن سال مشاق تھے۔ پہلے نواب باندہ کی سرکار میں تھے، ۱۸۵۷ء کے مفسدے کے بعد چند روز بہت تکلیف اُٹھائی، پھر نواب صاحب رامپور نے قدر دانی فرمائی۔ چند سال عمر کے باقی تھے، اچھی طرح بسر کیے اور عالم آخرت کا سفر کیا۔

۶۔ آغا کلب حسین خاں نادر سب سے آخیر میں ہیں، مگر افراطِ شوق اور آمدِ مضامین اور کثرتِ تصانیف اور پابندیٔ اصول میں سب سے اوّل ہیں۔ تمام عمر انھوں نے ڈپٹی کلکٹری کی اور حکومت کے شغلوں میں گرفتار رہے، مگر فکرِ شعر سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ جس ضلع میں گئے، مشاعرے کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ شعرا کے ساتھ خواہ سرکاری نوکریوں سے خواہ اپنے پاس سے ہمیشہ سلوک کرتے رہے اور اسی عالم میں یہ بھی کہا:

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

اِن کے کئی ضخیم دیوان۔ غزلوں اور قصیدوں اور سلاموں اور مرثیوں کے ہیں۔ کئی کتابیں اور رسائل ہیں، جن سے طالب زبان بہت کچھ فائدے حاصل کر سکتا ہے۔ ایک کتاب فنِ زراعت میں لکھی۔ اس میں ہندوستان کے میووں اور ترکاریوں کی مفصل تحقیقات ہے۔ بسبب دیرینہ سالی کے سرکار سے پنشن لے لی تھی، پھر بھی شاعری کا فرض اسی طرح ادا کیے جاتے تھے۔ خوش اعتقادی اُن کی قابلِ رشک تھی۔ یعنی وصیت کی تھی کہ بعد وفات میرے

ایک ہاتھ میں سلاموں اور مرثیوں کا دیوان دینا اور دوسرے ہاتھ میں قصائد کا دیوان رکھ دینا، جو بزرگانِ دین کی مدح میں کہے ہیں۔

ان لوگوں نے اور ان کے بعض ہمعصروں نے زبان کے باب میں اکثر قیدیں واجب سمجھیں کہ دلّی کے مستند لوگوں نے بھی اُن میں سے بعض باتوں کی رعایت اختیار کی اور بعض میں اختلاف کرتے تھے اور عام لوگ خیال بھی نہ کرتے تھے، مگر اصل واضع اِن قوانین کے میر علی اوسط رشک تھے، چنانچہ کچھ الفاظ نمونے کے طور پر لکھنے ضرور ہیں، مثلاً فرماتے تھے :

یہاں - وہاں بروزن جاں نہ ہو، بروزن جہاں ہو، لیکن تعجب یہ ہے کہ شیخ صاحب اور خواجہ صاحب کوئی اس کے پابند نہ تھے :

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| پہ —— اور —— پر —— پر کو وجوباً اختیار کیا | | | | |
| رکھا | 〃 | رکھّا | میں | رکھا ایضاً |
| تلک | اور | تک | میں | تک 〃 |
| بٹھانا | 〃 | پنھانا | میں | بیٹھانا۔ پہنانا 〃 |
| کبھو | اور | کبھی | میں | کبھی 〃 |
| ایجاد اور کلام | | مذّکر | | بعض مؤنث کہتے ہیں |
| نمو یعنی بڑھنا | | مذّکر | | ایضاً |
| طرز | | مؤنّث | | بعض مذّکر بولتے ہیں |
| صُلح ہوگئی | | | | صُلح ہوگئی |

اس باب میں اس بارے میں، غدر سے پہلے دِلّی میں نہ بولتے تھے، اب سب بولنے لگے۔ آئے ہے، جائے ہے کی جگہ آتا ہے، جاتا ہے۔ اب دِلّی والے بھی یہی کہنے لگے۔ صورت ہے جیسے چودھویں کا چاند ہے۔ جانے چودہویں کا چاند ہے۔

فسانہ عجائب میں ہے۔ شعلہ، وعدہ وغیرہ کو دریا اور صحرا کا قافیہ نہیں باندھتے۔

# غزلیات

پونچھتا اشک اگر گوشۂ داماں ہوتا
چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا

مال ملتا جو فلک سے ضررِ جاں ہوتا
سر نہ ہوتا جو میسّر مجھے ساماں ہوتا

منہ کو دامن سے چھپا کر جو وہ رقصاں ہوتا
شعلۂ حسن چراغِ تہِ داماں ہوتا

اُس سزا منہ پہ جو پھرنے نہیں دیتا ہے بجا
محو دیں دار سے کیونکر خطِ قرآں ہوتا

اپنے ہونٹوں سے جو اک بار لگا لیتا وہ
ہے یقیں ساغرِ مے چشمۂ حیواں ہوتا

نازک ایسا ہے وہ کافر وہیں ہوتا بدمست
گزر اُس کا جو کبھی زیرِ مغیلاں ہوتا

سنگِ چقماق بھی بنتا تو مرا ضبط یہ ہے
نہ مری قبر کا پتھر شرر افشاں ہوتا

ہوں وہ وحشی کہ اگر دشت میں پھرتا شب کو
آگے مشعلچی وہی غولِ بیاباں ہوتا

نکہت کاکلِ پیچاں سے جو دیتے تشبیہ
عطر مجموعے کا ہر جزو پریشاں ہوتا

کی مکافاتِ شبِ وصل خدا نے ورنہ
کس لیے مجھ پہ یہ عذابِ شبِ ہجراں ہوتا

اپنی صورت کا وہ دیوانہ ہوتا تو کیوں
پاؤں میں سلسلۂ گیسوئے پیچاں ہوتا

ایک دم یار کو بوسوں سے نہ ملتی فرصت
گر دہن دیدۂ عالم سے نہ پنہاں ہوتا

کس کی پریاں؟ شہِ جنات کو بھی آٹھ پہر
ہے یہ حسرت کہ سگِ کوچۂ جاناں ہوتا

خوں رلاتا وہیں ناسور بنا کر گردوں
زخم بھی گر مرے تن پر کبھی خنداں ہوتا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

کون ہے جو نہیں مرتا ہے ترے قامت پر
کیوں نہ ہر سروِ چمن قالبِ بےجاں ہوتا

کیا قوی ہے یہ دلیل اس کی پریزادی کی
ربط انسان سے کرتا جو وہ انساں ہوتا

اے بتو! ہوتی اگر مہر و محبت تم میں
کوئی کافر بھی نہ واللہ مسلماں ہوتا

حسرتِ دل نہیں دیتا ہے نکلنے ناسخ
ہاتھ شل ہوتے میسر جو گریباں ہوتا

دمِ بلبلِ اسیر کا تن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا جو ہیں سن سے نکل گیا

لایا وہ ساتھ غیر کو میرے جنازے پر
شعلہ سا ایک جیبِ کفن سے نکل گیا

ساقی بغیر شب جو پیا آبِ آتشیں
شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا

اب کی بہار میں یہ ہوا جوش اے جنوں
سارا لہو ہمارے بدن سے نکل گیا

اُس رنگِ گل کے جاتے ہی بس آگئی خزاں
ہر گل بھی ساتھ بو کے چمن سے نکل گیا

اہلِ زمیں نے کیا ستمِ نو کیا کوئی؟
نالہ جو آسمانِ کہن سے نکل گیا

سنسان مثلِ وادیِ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

واعظا مسجد سے اب جاتے ہیں میخانے کو ہم
پھینک کر ظرفِ وضو لیتے ہیں پیمانے کو ہم

کیا مگس بیٹھے بھلا اُس شعلہ رو کے جسم پر
اپنے داغوں سے جلا دیتے ہیں پروانے کو ہم

تیرے آگے کہتے ہیں گل کھول کر بازو سے رگ — گلشنِ عالم سے ہیں تیار اُڑ جانے کو ہم
کون کرتا ہے بتوں کے آگے سجدہ زاہدا — سر کو دے دے مار کر توڑیں گے بُت خانے کو ہم
جب غزالوں کے نظر آجاتے ہیں چشمِ سیاہ — دشت میں کرتے ہیں یاد اپنے سیہ خانے کو ہم
بوسۂ خالِ زنخداں سے شفا ہو گی ہمیں — کیا کریں گے اے طبیب اس تیرے بہدانے کو ہم
باندھتے ہیں اپنے دل میں زلفِ جاناں کا خیال — اس طرح زنجیر پہناتے ہیں دیوانے کو ہم
پنجۂ وحشت سے ہوتا ہے گریباں تار تار — دیکھتے ہیں کاکلِ جاناں میں جب شانے کو ہم

عقل کھو دی تھی جو اے ناسخ جنونِ عشق نے
آشنا سمجھا کیے اک عمر بیگانے کو ہم

چوٹ دل کو جو لگے آہِ رسا پیدا ہو — صدمہ شیشے کو جو پہنچے تو صدا پیدا ہو
کشتۂ تیغ جدائی ہوں یقیں ہے مجھ کو — عضو سے عضو قیامت کو جدا پیدا ہو
ہم ہیں بیمارِ محبت یہ دعا مانگتے ہیں — مثلِ اکسیر نہ دنیا میں دوا پیدا ہو
کہہ رہا ہے جرسِ قلب بآوازِ بلند — گم ہو رہبر تو ابھی راہِ خدا پیدا ہو
کس کو پہنچا نہیں اے جان ترا فیضِ قدم — سنگ پر کیوں نہ نشانِ کفِ پا پیدا ہو
مل گیا خاک میں پس پس کے حسینوں پر میں — قبر پر بوٹی کوئی جز حنا پیدا ہو
اشک تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں — خشک ہو جائے جو پانی تو ہوا پیدا ہو
یاں کچھ اسباب کے ہم بندے ہی محتاج نہیں — نہ زباں ہو تو کہاں نامِ خدا پیدا ہو
گل تجھے دیکھ کے گلشن میں کہیں عمر دراز — شاخ کے بدلے وہیں دستِ دعا پیدا ہو
بوسہ مانگا جو دہن کا تو وہ کیا کہنے لگے — تو بھی مانندِ دہن اب کہیں ناپیدا ہو
نہ سرِ زلف ہلائل ہے درازی تیری — رشتۂ طولِ امل کا بھی سرا پیدا ہو
کس طرح سچ ہے نہ خورشید کو رجعت ہو جائے — تجھ سا آفاق میں جب ماہ لقا پیدا ہو

کیا مبارک ہے مرا دشت جنوں اے ناسخ
بیضۂ بوم بھی ٹوٹے تو ہما پیدا ہو

جو اس پری سے شبِ وصل میں رکاوٹ ہو — مجھے بھی ایک جنازہ ہو یا چھپر کھٹ ہو
محال خواب لحد سے ہے گرچہ بیداری — میں چونک اٹھوں اگر اس کے قدم کی آہٹ ہو
نہ میرے پاؤں ہوں زنجیر کے کبھی شاکی — جو اس کے کاکلِ پیچاں کی ہاتھ میں لٹ ہو
کبود رنگ ہے مستی کا تیرے مونٹھ میں لال — ملیں جو دونوں تو پیدا نہ کیوں اُداہٹ ہو
مجال کیا کہ ترے گھر میں پاؤں میں رکھوں — یہ آرزو ہے مرا سر ہو تیری چوکھٹ ہو

ہجوم رکھتے ہیں جانباز ترے آگے
جو اریوں کا دوالی کو جیسے جمگھٹ ہو

لپٹ کے یار سے سوتا ہوں مانگتا ہوں دعا
تمام عمر بسر یارب ایک کروٹ ہو

نسیمِ آہ کے جھونکے سے کھول دوں دم میں
بھڑا ہوا ترے دروازے کا اگر پٹ ہو

جلاؤ غیروں کو مجھ سے جو گرمیاں کرکے
تمھارے کوچے میں تیار ایک مرگھٹ ہو

نہ الگ چلوں میں یہی اپنے دل میں ٹھانی ہے
تری طرف سے ہزار اے پری لگاوٹ ہو

وہ منہ چھپاتے ہیں جب تک حجاب ہے شبِ وصل
عذارِ صبح سے شب کا نہ دور گھونگھٹ ہو

تری بلائیں مری طرح وہ بھی لیتا ہے
نہ کیونکہ آگ میں اسپند کی یہ چٹ پٹ ہو

میں جاں بلب ہوں گلا کاٹو یا گلے سے لگو
جو اس میں آپ کو منظور ہو سو جھٹ پٹ ہو

کرے وہ ذکرِ خدا اے صنم بھلا کس وقت
نصیب کہ آٹھ پہر تیرے نام کی رٹ ہو

جو دل کو دیتے ہو ناسخ تو کچھ کر دو
کہیں یہ مفت میں دیکھو نہ مال تلپٹ ہو

خاک میں مل جایئے ایسا اکھاڑا چاہیئے
لڑ کے کشتی دیوِ ہستی کو پچھاڑا چاہیئے

وہ سہی قد کرکے ورزش خوب زوروں پہ چڑھا
کہہ رہا ہے سرو کو جڑ سے اکھاڑا چاہیئے

کیوں نہ روئیں پھوٹ کر ہم قصرِ جاناں کے تلے
دیدۂ تر اپنے دریا میں کڑاڑا چاہیئے

اور نخشوں کی ہماری قبر میں حاجت نہیں
خانۂ محبوب کا کوئی کواڑا چاہیئے

ہے شبِ مہتاب فرقت میں تقاضائے جنوں
چادرِ محبوب کو بھی آج پھاڑا چاہیئے

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا تہ میں
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیئے

کرچکی ہے تیری رفتار ایک عالم کو خراب
شہرِ خاموشاں کو بھی چل کر اجاڑا چاہیئے

منہ بنائے کیوں ہے قاتل پاس ہے تیغِ نگاہ
باغ میں ہنستے ہیں گل کو منہ بگاڑا چاہیئے

کوئی سیدھی بات صاحب کی نظر آتی نہیں
آپ کی پوشاک کو کپڑا بھی آڑا چاہیئے

تنگ اس وحشت کدے میں ہوں میں اے جوشِ جنوں
عرش کی سقفِ محدب کو لتاڑا چاہیئے

آنسوؤں سے ہجر میں برسات رکھیے سال بھر
ہم کو گرمی چاہیئے ہرگز نہ جاڑا چاہیئے

آج اس محبوب کے دل کو مسخر کیجیئے
عرشِ اعظم پہ نشاں نالے کا گاڑا چاہیئے

مرگیا ہوں حسرتِ نظارۂ ابرو میں میں
عین کعبے میں مرے لاشے کو گاڑا چاہیئے

محتسب کو ہوگیا آسیب جو توڑا ہے خم
جوتیوں سے مے کشو جن آج جھاڑا چاہیئے

جلد رنگ اے دیدۂ خونبار اب تارِ نگاہ
ہے محرم اس پری پیکر کو نارا چاہیئے

لڑتے ہیں پریوں سے کشتی پہلوانِ عشق ہیں
ہم کو ناسخ راجہ اندر کا اکھاڑا چاہیئے

# میر مستحسن خلیق

میر حسن کے صاحبزادے، حسنِ اخلاق اور اوصاف کی بزرگی میں بزرگوں کے فرزند تھے۔ متانت، سلامت روی اور مسکینی اُن کی سیادت کے لیے محضرِ شہادت دیتے تھے۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ ١٦ برس کی عمر سے مشقِ سخن شروع کی اور خلقِ حسن کی مناسبت سے خلیق تخلص اختیار کیا۔ ابتدا میں غزلیں بہت کہتے تھے اور والد بزرگوار سے اصلاح لیتے تھے۔

جب شیخ مصحفی لکھنؤ میں پہنچے تو میر حسن اُن دنوں میں "بدرِ منیر" لکھ رہے تھے۔ اور میر خلیق کی آمد کا یہ عالم کہ مارے غزلوں کے دم نہ لیتے تھے۔ شفیق باپ کو اپنے فکر سے فرصت نہ دیتے تھے، بیٹے کو ساتھ لے گئے، اپنی کم فرصتی کا حال بیان کیا اور اصلاح کے لیے شیخ موصوف کے سپرد کر دیا۔ ہونہار جوان کی جوان طبیعت نے رنگ نکالا تھا کہ قدردانی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور نیشاپوری خاندان میں پندرہ روپیہ مہینے کا نوکر رکھوا دیا۔ انہی دنوں میں مرزا تقی ترقی نے چاہا کہ فیض آباد میں شعر و سخن کا چرچا ہو۔ مشاعرہ قائم کیا اور خواجہ حیدر علی آتش کو لکھنؤ سے بلایا۔ تجویز یہ تھی کہ انھیں وہیں رکھیں، پہلے ہی جلسے میں جو میر خلیق نے غزل پڑھی، اُس کا مطلع تھا:

رشک آئینہ ہے اِس رشکِ قمر کا پہلو
صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے۔

میر خلیق نازک خیالیوں میں ذہن لڑا رہے تھے کہ باپ کی موت نے شیشے پر پتھر مارا۔ عیال کا بوجھ پہاڑ ہو کر سر پر گرا، جس نے آمد کے چشمے خاک ریز کر دیے، مگر ہمت کی پیشانی پر ذرا بل نہ آیا۔ اکثر فیض آباد میں رہتے تھے لکھنؤ آتے تھے تو پیر بخارا میں ٹھیرا کرتے تھے۔ پُرگوئی کا کہ مثلاً ایک لڑکا آیا، اُس نے کہا۔ میر صاحب! آٹھوں کا میلا ہے۔ ہم جائیں گے، ایک غزل کہہ دیجیے۔ اچھا بھئی! کہہ دیں گے۔ میر صاحب! میلا تو کل ہے، ہم کل جائیں گے۔ ابھی کہہ دیجیے۔ اُسی وقت غزل لکھ دی۔ اُس نے کہا یاد بھی کرا دیجیے۔ میر صاحب اُسے یاد کرا رہے ہیں۔ اُن دِنوں میں غزلیں بِکا کرتی تھیں۔ میاں مصحفی تک اپنا کلام بیچتے تھے۔ یہ بھی غزلیں کہہ کر فروخت کرتے تھے۔

ایک دن ایک خریدار آیا اور اپنا تخلص ڈلوا کر شیخ ناسخ کے پاس پہنچا کہ اصلاح دے

دیجیئے - شیخ صاحب نے غزل کو پڑھ کر اُس کی طرف دیکھا اور بگڑ کر کہا: یہ نیر امنہ ہے، جو یہ غزل کہے گا! ہم زبان پہچانتے ہیں، یہ وہی پیر بخارا والا ہے۔

میر خلیق صاحب دیوان تھے، مگر اُسے رواج نہ دیا۔ نقد سخن اور سرمایۂ مضامین جو بزرگوں سے ورثہ پہنچا تھا، اُسے زادِ آخرت میں صرف کیا اور ہمیشہ مرثیے کہتے رہے۔ اُسی میں نام اور زمانے کا کام چلتا رہا۔ آپ ہی کہتے تھے اور آپ ہی مجلسوں میں پڑھتے تھے۔ قدردان آنکھوں سے لگا لگا کر لے جاتے تھے۔

سید انشاء دریائے لطافت میں جہاں شرفائے دہلی کے رسوم و رواج بیان کرتے ہیں، وہاں کہتے ہیں کہ مرثیہ خوانی کے پیشے کو لوگ کم نظر سے دیکھتے ہیں اور عوز سے دیکھو تو اب بھی یہی حال ہے۔ مرثیہ گوئی کی یہ صورت رہی کہ سودا اور میر کے زمانے میں میاں سکندر، میاں گدا، میاں مسکین، افسردہ وغیرہ مرثیے کہتے تھے۔ تصنیفاتِ مذکور کو دیکھو تو فقط بترک ہیں، کیونکہ ان بزرگوں کو نظم مذکور سے فقط گریہ و بکا اور حصولِ ثواب مقصود تھا اور اس شک نہیں کہ وہ نیک نیت لوگ حسنِ تاثیر سے اپنے مقصد میں کامیاب تھے۔ شاعری اور صنائع انشاپردازی سے کچھ غرض نہ تھی۔ میر خلیق اور اس عہد کے چند اشخاص تھے، جنھوں نے کدورت ہائے مذکورہ کو دھو کر مرثیوں کو ایسا چمکا دیا کہ جس نظر سے اساتذہ شعرا کے کلام دیکھے جاتے تھے۔ اُسی نظر سے لوگ اُنھیں بھی دیکھنے لگے اور پہلے مرثیے سوز میں پڑھے جاتے تھے، پھر تحت لفظ بھی پڑھنے لگے۔

مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے میدان میں جو ہوا بدلی، وہ میر خلیق کے زمانے سے بدلی۔ پہلے اکثر مرثیے چو مصرعے ہوتے تھے۔ ہر چار مصرعوں کے بعد قافیہ۔ وہ انداز موقوف ہوا۔ ایک سلام غزل کے انداز میں اور مرثیے کے لیے مسدس کا طریقہ آئین ہو گیا۔ وہ سوز اور تحت لفظ دونوں طرح سے پڑھا جاتا۔ اور جو کچھ اوّل مستزاد کے اُصول پر کہتے تھے۔ وہ نوحہ کہلاتا تھا۔ اُسے سوز ہی میں پڑھتے تھے اور یہی طریقہ اب جاری ہے۔ میر موصوف اور اُن کے بعض ہم عہد سلام یا مرثیے وغیرہ کہتے ہیں۔ اُن میں مصائب اور ماجرائے شہادت ساتھ امور اس کے فضائل اور معجزات کی روایتیں اس سلاست اور سادگی اور صفائی کے ساتھ نظم کرتے تھے کہ واقعات کی صورت سامنے تصویر ہو جاتی تھی اور دل کا درد آنکھوں سے آنسو ہو کر ٹپک پڑتا۔

اس زمانے میں میر ضمیر ایک مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے کہ طبع شعر کے ساتھ عربی فارسی وغیرہ علوم رسمی میں استعدادِ کامل رکھتے تھے اور نہایت متقی و پرہیز گار شخص تھے۔ تعجب یہ ہے کہ ساتھ اس کے طبیعت میں شوخی اور ظرافت بھی اتنی رکھتے تھے، گویا سودا کی رُوح نے حلول کیا۔

انھوں نے بھی اپنی دُنیا کو آخرت کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا، اور غزل وغیرہ سے دست بردار ہو گئے تھے۔ لوگوں نے ان دونوں بزرگوں کو نقطۂ مقابل کر کے تعریفیں شروع کر دیں۔ طبیعتیں ایک دوسرے کی چوٹ پر زور آزمائی کر کے نئے نئے ایجاد پیدا کرنے لگیں۔

اس وقت تک مرثیہ ۳۰ سے ۵۴، حد ۵۰ بند تک ہوتا تھا۔ میر ضمیرؔ مرحوم نے ایک مرثیہ لکھا۔ ع کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے۔ اس میں شہزادہ علی اکبر کی شہادت کا بیان ہے۔ پہلے ایک تمہید سے مرثیے کا چہرہ باندھا، پھر سراپا لکھا، پھر میدانِ جنگ کا نقشہ دکھایا اور بیانِ شہادت پر خاتمہ کر دیا۔ چونکہ پہلا ایجاد تھا، اس لیے تعریف کی آوازیں دُور دُور تک پہنچیں۔ تمام شہر میں شہرہ ہو گیا اور اطراف سے طلب میں فرمائشیں آئیں۔ یہ ایجاد مرثیہ گوئی کے عالم میں انقلاب تھا کہ پہلی روش متروک ہو گئی۔ باوجودیکہ انھوں نے مقطع میں کہہ دیا تھا۔

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ وِرد ہے میرا
اس طرز میں جو کہوے سو شاگرد ہے میرا

پھر بھی سب اس کی پیروی کرنے لگے، یہاں تک کہ پہلے امانتؔ نے پھر اور شاعروں نے واسوخت میں سراپا کو داخل کیا۔

عہدِ مذکور میں چار مرثیہ گو نامی تھے، میر ضمیرؔ، میر خلیقؔ، میاں دلگیرؔ، میاں فصیحؔ۔ میاں دلگیرؔ کی زبان میں لکنت تھی، اس لیے مرثیہ خوانی نہ کرتے تھے۔ تصنیف میں بھی انھوں نے مرثیت کے دائرے سے قدم نہیں بڑھایا۔ مرزا فصیحؔ حج و زیارت کو گئے اور وہیں سکونت پذیر ہوئے۔ میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ کے لیے میدان خالی رہا کہ جولانیاں دکھائیں۔ دُنیا کے تماشائی جنھیں تیز طبیعتوں کے لڑانے میں مزا آتا ہے، دونوں اُستادوں کو تعریفیں کر کے لڑاتے تھے اور دل بہلاتے تھے۔ اور اس سے ان کے ذہن کو کمال کی ورزش اور اپنے دلوں کو چاشنیٔ ذوق کی لذت دیتے تھے۔

اظہارِ کمال میں دونوں اُستادوں کی رفتار الگ الگ تھی، کیونکہ میر ضمیرؔ استعدادِ علمی اور زورِ طبع کے بازوؤں سے بہت بلند پرواز کرتے تھے اور پورے اُترتے تھے۔ میر خلیقؔ مرثیت کے کوچے سے اتفاقاً ہی قدم آگے بڑھاتے تھے۔ وہ مضمون آفرینی کی ہوس کم کرتے تھے اور ہمیشہ محاورے اور لطفِ زبان کو خیالاتِ درد انگیز کے ساتھ ترکیب دے کر مطلب حاصل کرتے تھے اور بہ جوہر اس آئینے کا کافی اور خاندانی وصف تھا۔ ان کا کلام بہ نسبت سُبحان اللہ، واہ واہ کے نالہ و آہ کا زیادہ طلب گار تھا۔ لڑنے والے ہر وقت اپنے کام میں مصروف تھے، مگر دونوں صاحب اخلاق اور سلامت روی کے قانون دان تھے۔ کبھی ایک جلسے میں جمع نہ ہوتے تھے۔

آخر ایک شوقینِ نیک نیت نے روپے کے زور اور حکمتِ عملی کی مدد سے قانون کو توڑا، وہ بھی فقط ایک دفعہ۔ صورت یہ کہ نواب شرف الدولہ مرحوم نے اپنے مکان پر مجلس قرار دے کر سب خاص و عام کو اطلاع دی اور مجلس سے ایک دن پہلے میر ضمیرؔ مرحوم کے مکان پر گئے۔ گفتگوے معمولی کے بعد پانچسو روپے کا توڑا سامنے رکھ دیا اور کہا کہ کل مجلس ہے، مرثیہ آپ پڑھیے گا۔ بعد اس کے میر خلیقؔ کے ہاں گئے، اُن سے بھی وہی مضمون ادا کیا، اور ایک کو دوسرے کے حال سے آگاہ نہ کیا۔ لکھنؤ شہر ا روزِ معین پر ہزار در ہزار آدمی جمع ہوئے۔ ایک بجے کے بعد میر ضمیر منبر پر تشریف لے گئے اور مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ ان کا پڑھنا سبحان اللہ مرثیہ نظم اور اس پر نثر کے حاشیے۔ کبھی رُلاتے تھے اور کبھی تحسین و آفرین کا غل مچواتے تھے کہ میر خلیق بھی پہنچے اور حالتِ موجودہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور دل میں کہا کہ آج کی شرم بھی خدا کے ہاتھ ہے۔ میر ضمیر نے جب انھیں دیکھا تو زیادہ پھیلے اور مرثیے کو اتنا طول دیا کہ آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر تحسین بلکہ وقت میں گنجائش بھی نہ چھوڑی۔ آفتاب یوں ہی سا جھلکتا رہ گیا۔

وہ ابھی منبر سے اُترے ہی تھے کہ چوبدار ان کے پاس آیا اور کہا کہ نواب فرماتے ہیں آپ بھی حاضرین کو داخلِ حسنات فرمائیں۔ اس وقت ان کے طرف داروں کی بالکل صلاح نہ تھی، مگر یہ توکل بخدا کھڑے ہوئے اور منبر پر جا کر بیٹھے۔ چند ساعت توقف کیا۔ آنکھیں بند، خاموش بیٹھے رہے۔ ان کی گوری رنگت، جسم نحیف و ناتواں، نہیں معلوم ہوتا تھا کہ بدن میں لہو کی بوند ہے یا نہیں۔ جب انھوں نے رباعی پڑھی تو اہلِ مجلس کو پوری آواز بھی نہیں سنائی دی۔ چند مرثیے کے بند بھی اسی حالت میں گزر گئے۔ دفعتہً باکمال نے رنگ بدلا اور اس کے ساتھ ہی محفل کا بھی رنگ بدلا۔ آہوں کا دھواں ابر کی طرح چھا گیا اور نالہ و زاری نے آنسو برسانے شروع کیے۔ ۱۵۔ ۲۰ بند پڑھے تھے کہ ایک کو دوسرے کا ہوش نہ رہا۔ ۲۵ یا ۳۰ بند پڑھ کر اُتر آئے۔ اہلِ مجلس اکثر ایسی حالت میں تھے کہ جب آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو منبر خالی تھا۔ نہ معلوم ہوا کہ میر خلیق صاحب کس وقت منبر سے اُتر آئے۔ دونوں کے کمال پر صاد ہوا اور طرفین کے طرف دار خُرم خرد گھروں کو پھرے۔

روایت مندرجہ بالا میر مہدی حسن فراغؔ کی زبانی سنی تھی۔ لیکن میر علی حسن اشکؔ تخلص کہ میر عماد خوشنویس کی اولاد میں ہیں، خود ناسخؔ کے شاگرد اور صاحبِ دیوان ہیں۔ ان کے والد جنتیؔ تخلص فقط مرثیہ کہتے تھے اور میاں دلگیرؔ کے شاگرد تھے۔

میر اشکؔ اب بھی حیدرآباد میں بزمرۂ منصب داران ملازم ہیں۔ ان کی زبانی مولوی شریف حسین خاں صاحب نے بیان کیا کہ لکھنؤ میں ایک عزیب خوش اعتقاد شخص

بڑے شوق سے مجلس کیا کرتے تھے اور اسی رعایت سے ہر ایک نامی مرثیہ خواں اور لکھنؤ کے خاص و عام اس کے ہاں حاضر ہوتے تھے ۔ یہ معرکہ اس کے مکان پر ہُوا تھا اور میر ضمیرؔ کے اشارے سے ہُوا تھا ۔ میر انشک فرماتے تھے کہ میر خلیق نے اپنے والد کے بعد چند روز بہت سختی سے زندگی بسر کی ۔ عیال فیض آباد میں تھے ۔ آصف الدولہ لکھنؤ میں رہنے لگے ۔ اُن کے سبب سے تمام امرا یہیں رہنے لگے ۔ میر موصوف لکھنؤ میں آتے تھے ۔ سال بھر میں تین چار سو روپے حاصل کر کے لے جاتے تھے اور پرورشِ عیال میں صرف کرتے تھے ۔ صورتِ حال یہ تھی کہ مرثیوں کا جزدان بغل میں لیا اور لکھنؤ چلے آئے ۔ یہاں ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت خالی پڑی رہتی تھی، اس میں آکر اُترتے تھے ۔ ایک دفعہ وہ آئے ۔ بستر رکھ کر آگ سلگائی تھی ۔ آٹا گوندھ رہے تھے کہ شخص مذکور ہاتھ جوڑ کر سامنے آکھڑا ہُوا اور کہا کہ حضور! مجلس تیار ہے ، میری خوش نصیبی ہے آپ کا تشریف لانا ہوا ہے ، چل کر مرثیہ پڑھ دیجیے ۔ یہ اُسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ دھو جزدان لے اُس کے ساتھ ہو لیے ۔ وہاں جا کر دیکھیں میر ضمیرؔ منبر پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔ وہیں یہ واقعہ ہُوا اور اُسی دن سے میر خلیق نے مرثیہ خوانی میں شہرت پائی ۔

میر خلیقؔ کے کلام کا اندازہ اور خوبی محاورہ اور لطفِ زبان یہی سمجھ لو جو آج میر انیسؔ کے مرثیوں میں دیکھتے ہو ۔ فرق اتنا ہے کہ اُن کے ہاں مرثیت اور صورتِ حال کا بیان درد انگیز تھا، اِن کے مرثیوں میں تمہیدیں اور سامان اور سخن پردازی بہت بڑھی ہوئی ہے ۔

اُن کے ادائے کلام اور پڑھنے کی خوبی دیکھنے اور سُننے کے قابل تھی ۔ اعضا کی حرکت سے بالکل کام نہ لیتے تھے ۔ فقط نشست کا انداز ، اور آنکھ کی گردش تھی ، اُسی میں سب کچھ ختم کر دیتے تھے ۔ میر انیسؔ مرحوم کو بھی میں نے پڑھتے ہوئے دیکھا ۔ کہیں اتفاقاً ہی ہاتھ اُٹھ جاتا تھا ۔ یا گردن کی ایک جنبش یا آنکھ کی گردش تھی کہ کام کر جاتی تھی ، ورنہ کلام ہی سارے مطالب کے حق پورے پورے ادا کر دیتا تھا ۔

میر خلیقؔ نے اپنے بڑھاپے کے سبب سے آخر عمر میں مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا تھا ۔ شعرا شاگردانِ الٰہی ہیں ۔ اِن کی طبیعت میں غیرت اور جوش اوروں سے بہت زیادہ بلند ہوتا ہے ۔ میر انیسؔ کی مرثیہ خوانی مشرقِ منبر سے طلوع ہونے لگی تھی ۔ جب کوئی آکر تعریف کرتا کہ آج فلاں مجلس میں کیا خوب پڑھے ہیں ! یا فلاں نواب کے ہاں تمام مجلس کو رُلا دیا تو انھیں خوش نہ آتا تھا ۔ کئی دفعہ ایسا ہُوا کہ اسی عالمِ ناتوانی میں منبر پر جا بیٹھے اور مرثیہ پڑھا ۔ اس سے مطلب یہ تھا کہ اس گئی گزری حالت میں

آخر ایک شوقین نیک نیت نے روپے کے زور اور حکمتِ عملی کی مدد سے قانون کو توڑا، وہ بھی فقط ایک دفعہ۔ صورت یہ کہ نواب شرف الدولہ مرحوم نے اپنے مکان پر مجلس قرار دے کر سب خاص و عام کو اطلاع دی اور مجلس سے ایک دن پہلے میر ضمیرؔ مرحوم کے مکان پر گئے۔ گفتگوئے معمولی کے بعد پانچسو روپے کا توڑا سامنے رکھ دیا اور کہا کہ کل مجلس ہے، مرثیہ آپ پڑھیے گا۔ بعد اس کے میر خلیق کے ہاں گئے، اُن سے بھی وہی مضمون ادا کیا، اور ایک کو دوسرے کے حال سے آگاہ نہ کیا۔ لکھنؤ ٹھہرا روزِ معین پہ ہزار در ہزار آدمی جمع ہوئے۔ ایک بجے کے بعد میر ضمیرؔ منبر پر تشریف لے گئے اور مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ اِن کا پڑھنا سبحان اللہ مرثیہ نظم اور اس پہ نثر کے حاشیے۔ کبھی رُلاتے تھے اور کبھی تحسین و آفرین کا غُل مچواتے تھے کہ میر خلیقؔ بھی پہنچے اور حالتِ موجودہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور دل میں کہا کہ آج کی شرم بھی خدا کے ہاتھ ہے۔ میر ضمیر نے جب انھیں دیکھا تو زیادہ پھیلے اور مرثیے کو اتنا طول دیا کہ آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر تحسین بلکہ وقت میں گنجائش بھی نہ چھوڑی۔ آفتاب یوں ہی سا جھلکتا رہ گیا۔

وہ ابھی منبر سے اُترے ہی تھے کہ چوبدار ان کے پاس آیا اور کہا کہ نواب فرماتے ہیں آپ بھی حاضرین کو داخلِ حسنات فرمائیں۔ اس وقت ان کے طرف داروں کی بالکل صلاح نہ تھی، مگر یہ توکل بخدا کھڑے ہوئے اور منبر پر جا کر بیٹھے۔ چند ساعت توقف کیا۔ آنکھیں بند، خاموش بیٹھے رہے۔ ان کی گوری رنگت، جسم نحیف و ناتواں، نہیں معلوم ہوتا تھا کہ بدن میں لہو کی بوند ہے یا نہیں۔ جب انھوں نے رباعی پڑھی تو اہل مجلس کو پوری آواز بھی نہیں سنائی دی۔ چند مرثیے کے بند بھی اسی حالت میں گزر گئے۔ دفعتہً باکمال نے رنگ بدلا اور اس کے ساتھ ہی محفل کا بھی رنگ بدلا۔ آہوں کا دھواں ابر کی طرح چھا گیا اور نالہ و زاری نے آنسو برسانے شروع کیے۔ ۱۵۔۲۰ بند پڑھے تھے کہ ایک کو دوسرے کا ہوش نہ رہا۔ ۲۵ یا ۳۰ بند پڑھ کر اُتر آئے۔ اہلِ مجلس اکثر ایسی حالت میں تھے کہ جب آنکھ اٹھا کر دیکھا تو منبر خالی تھا۔ نہ معلوم ہوا کہ میر خلیقؔ صاحب کس وقت منبر سے اُتر آئے۔ دونوں کے کمال پر صاد ہوا اور طرفین کے طرف دار سُرخرو گھروں کو پھرے۔

روایت مندرجہ بالا میر مہدی حسن فراغؔ کی زبانی سنی تھی۔ لیکن میر علی حسن اشکؔ تخلص کہ میر عماد خوشنویس کی اولاد ہیں، خود ناسخؔ کے شاگرد اور صاحبِ دیوان ہیں۔ ان کے والد جنتیؔ تخلص فقط مرثیہ کہتے تھے اور میاں دلگیر کے شاگرد تھے۔

میر اشکؔ صاحب بھی حیدرآباد میں بزمرۂ منصب داران ملازم ہیں۔ ان کی زبانی مولوی شریف حسین خاں صاحب نے بیان کیا کہ لکھنؤ میں ایک غریب خوش اعتقاد شخص

بڑے شوق سے مجلس کیا کرتے تھے اور اسی رعایت سے ہر ایک نامی مرثیہ خواں اور لکھنؤ کے خاص و عام اس کے ہاں حاضر ہوتے تھے۔ یہ معرکہ اس کے مکان پر ہُوا تھا اور میر ضمیرؔ کے اشارے سے ہُوا تھا۔ میر انسؔ فرماتے تھے کہ میر خلیقؔ نے اپنے والد کے بعد چند روز بہت سختی سے زندگی بسر کی۔ عیال فیض آباد میں تھے۔ آصف الدولہ لکھنؤ میں رہنے لگے۔ اُن کے سبب سے تمام امرا یہیں رہنے لگے۔ میر موصوف لکھنؤ میں آتے تھے۔ سال بھر میں تین چار سو روپے حاصل کر کے لے جاتے تھے اور پرورشِ عیال میں صرف کرتے تھے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ مرثیوں کا جزدان بغل میں لیا اور لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت خالی پڑی رہتی تھی، اس میں آ کر اُترتے تھے۔ ایک دفعہ وہ آئے۔ بستر رکھ کر آگ سُلگائی تھی۔ آٹا گوندھ رہے تھے کہ شخصِ مذکور ہاتھ جوڑ کر سامنے آ کھڑا ہُوا اور کہا کہ حضور! مجلس تیار ہے، میری خوش نصیبی سے آپ کا تشریف لانا ہوا ہے، چل کر مرثیہ پڑھ دیجیے۔ یہ اُسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ دھو جزدان لے اُس کے ساتھ ہو لیے۔ وہاں جا کر دیکھیں میر ضمیرؔ منبر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہیں یہ واقعہ ہُوا اور اُسی دن سے میر خلیقؔ نے مرثیہ خوانی میں شہرت پائی۔

میر خلیقؔ کے کلام کا اندازہ اور خوبی محاورہ اور لُطفِ زبان یہی سمجھ لو جو آج میر انیسؔ کے مرثیوں میں دیکھتے ہو۔ فرق اتنا ہے کہ اُن کے ہاں مرثیت اور صورتِ حال کا بیان دردانگیز تھا، اِن کے مرثیوں میں تمہیدیں اور سامان اور سخن پردازی بہت بڑھی ہوئی ہے۔

اُن کے ادائے کلام اور پڑھنے کی خوبی دیکھنے اور سُننے کے قابل تھی۔ اعضا کی حرکت سے بالکل کام نہ لیتے تھے۔ فقط نشست کا انداز، اور آنکھ کی گردش تھی، اُسی میں سب کچھ ختم کر دیتے تھے۔ میر انیسؔ مرحوم کو بھی میں نے پڑھتے ہوئے دیکھا۔ کہیں اتفاقاً ہی ہاتھ اُٹھ جاتا تھا۔ یا گردن کی ایک جنبش یا آنکھ کی گردش تھی کہ کام کر جاتی تھی، ورنہ کلام ہی سارے مطالب کے حق پورے پورے ادا کر دیتا تھا۔

میر خلیقؔ نے اپنے بڑھاپے کے سبب سے آخر عمر میں مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ شعرا شاگردانِ الٰہی ہیں۔ اِن کی طبیعت میں غیرت اور جوش اوروں سے بہت زیادہ بلند ہوتا ہے۔ میر انیسؔ کی مرثیہ خوانی مشرقِ منبر سے طلوع ہونے لگی تھی۔ جب کوئی آکر تعریف کرتا کہ آج فلاں مجلس میں کیا خوب پڑھے ہیں! یا فلاں نوّاب کے ہاں تمام مجلس کو لٹا دیا تو انھیں خوش نہ آتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہُوا کہ اسی عالمِ ناتوانی میں منبر پر جا بیٹھے اور مرثیہ پڑھا۔ اس سے مطلب یہ تھا کہ اس گئی گزری حالت میں

مجھی ہمیں درماندہ نہ سمجھنا۔

میر خلیق صاحب نے پیرانہ سالی کی تکلیف اُٹھا کر دُنیا سے انتقال کیا۔ میں ان دنوں خرد سال تھا، مگر اچھی طرح یاد ہے۔ جب اِن کا کلام دِلّی میں پہنچا۔ وہ سالِ اخیر کی تصنیف تھا۔ مطلع :۔

مجرائی طبع کند ہے، لُطفِ بیاں گیا
دنداں گئے کہ جوہرِ تیغِ زباں گیا

ایک دو شعر ضعفِ پیری کی شکایت میں اور بھی تھے اور مقطع تھا :

لرزی بہارِ عمر، خلیق اب کہیں گے سب
باغِ جہاں سے بُلبُلِ ہندوستان گیا

اخیر عمر میں ضعف کے سبب سے مرثیہ نہ پڑھتے تھے، لیکن قدرتی شاعر کی زبان کب رہتی ہے؟ بی بی کے مرنے سے گھر کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ ۳ صاحبزادے تھے۔ انیسؔ، مونسؔ، اُنسؔ۔ میر خلیق ہمیشہ دوسرے پر رہتے۔ ۱۰-۱۰، ۱۵-۱۵ دن ہر ایک کے ہاں بسر کر دیتے تھے۔ کہیں جاتے آتے بھی نہ تھے، پلنگ پر بیٹھے رہتے تھے اور لکھے جاتے تھے۔ کوئی شگفتہ زمین خیال میں آئی، اُس میں سلام کہنے لگے۔ دل لگ گیا تو پورا کیا، نہیں تو چند شعر کہے اور چھوڑ دیے۔ کوئی تمہید سُوجھی۔ مرثیے کا چہرہ باندھا۔ جتنا ہُوا، اُتنا ہوا۔ جو رہ گیا، رہ گیا۔ کوئی روایت نظم کرنی شروع کر دی۔ گھوڑے کا مضمون خیال میں آیا، وہی کہتے چلے گئے۔ طبیعت لڑ گئی، تلوار کی تعریف کرنے لگے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ جو کچھ جس کے گھر میں کہتے تھے، وہ اُسی کے گھر میں چھوڑ کر چلے آتے تھے۔ یہ سرمایہ میر انیسؔ کے پاس سب سے زیادہ رہا کہ اُن کے گھر میں زیادہ رہتے تھے، کیونکہ ان کی بی بی کھانوں اور آرام و آسائش کے سامانوں سے اپنے ضعیف العمر بزرگ کو بہت اچھی طرح رکھتی تھیں۔

ان کی بلکہ ان کے گھرانے کی زبان محاورے کے لحاظ سے سب کے نزدیک سندی تھی۔ شیخ ناسخؔ کی منصفی اور حق پرستی پر رحمت و آفرین کے سہرے چڑھائیے، اپنے شاگردوں کو کہا کرتے تھے کہ بھئی زبان سیکھنی ہے تو میر خلیقؔ کے ہاں جایا کرو اور اس کے علاوہ بھی اُن کے کمال کو فروغ دیتے رہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ تینوں بیٹے ہونہار ہیں۔ دیکھنا خوب ہوں گے۔ میر خلیقؔ کے محاورے کے اس قدر پابند تھے کہ ان کے محضرِ کمال پر بجائے مہر کے بعض لوگوں نے کم علمی کا داغ لگایا۔ اُنھوں نے شہزادہ علی اصغر کے حال میں اپنی جگہ لکھا کہ عالمِ بے آبی میں پیاس کی شدت سے غش آگیا۔ آنکھ کھولی تو مادرِ مقدسہ نے ع لیلاف پڑھی

اور اُسے دودھ پلایا۔ حریف آٹھ پہر تاک میں تھے۔ کسی نے یہ مصرع ناسخ کے سامنے جاکر پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں یوں کہا ہوگا۔ ع پڑھ پڑھ کے لا ہلاف اسے دودھ پلایا۔

میر انیس مرحوم فرماتے تھے کہ میرے والد میرے گھر تشریف رکھتے تھے۔ میں ایک مرثیے میں وہ روایت نظم کر رہا تھا کہ جناب امام حسین عام طفولیت میں سواری کے لیے ضد کر رہے تھے۔ جناب آں حضرت تشریف لائے اور فرطِ شفقت سے خود جھک گئے کہ آؤ سوار ہو جاؤ تاکہ پیارے نواسے کا دل آزردہ نہ ہو۔ اس موقع پر ٹیپ کا دوسرا مصرع کہہ لیا تھا ع اچھا سوار ہو جیے ہم اونٹ بنتے ہیں۔ پہلے مصرع کے لیے اُلٹ پلٹ کرتا تھا، جیسا کہ دل چاہتا تھا، ویسا برجستہ نہ بیٹھتا تھا۔ والد نے مجھے غور میں غرق دیکھ کر پوچھا، کیا سوچ رہے ہو؟ میں نے مضمون بیان کیا۔ مصرعے خیال میں آئے تھے پڑھے۔ فرمایا۔ یہ مصرع لگا دو (ذرا زبان کی لطافت تو دیکھو)

جب آپ رُوٹھتے ہیں تو مشکل سے منتے ہیں
اچھا سوار ہو جیے ہم اُونٹ بنتے ہیں

افسوس کہ ان کی کوئی پوری غزل ہاتھ نہ آئی۔ دو شعر یاد ہیں، وہی لکھ دیتا ہوں ؎

اشک جو چشم خوں فشاں سے گرا — تھا ستارہ کہ آسماں سے گرا
ہنس دیا یار نے جو رات خلیق
کھا کے ٹھوکر اُس آستاں سے گرا

# خواجہ حیدر علی آتش

آتش تخلص، خواجہ حیدر علی نام۔ باپ دِلّی کے رہنے والے تھے، لکھنؤ میں جاکر سکونت اختیار کی۔ خواجہ زادوں کا خاندان تھا۔ جس میں مسندِ فقیری بھی قائم تھی اور سلسلہ پیری مریدی کا بھی تھا، مگر شاعری اختیار کی، اور خاندانی طریقے کو سلام کر کے اُس میں سے فقط آزادی و بے پروائی کو رفاقت میں لے لیا۔ مصحفی کے شاگرد تھے اور حق یہ ہے کہ ان کی آتش بیانی نے اُستاد کے نام کو روشن کیا، بلکہ کلام کی گرمی اور چمک کی دمک نے اُستاد شاگرد کے کلام میں اندھیرے اُجالے کا امتیاز دکھایا۔

خواجہ صاحب کی ابتدائی عمر تھی اور استعدادِ علمی تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ طبیعت مشاعروں میں کمال دکھانے لگی۔ اُس وقت دوستوں کی تاکید سے درسی کتابیں دیکھیں۔ باوجود اس کے عربی میں کافیہ کو کافی سمجھ کر آگے پڑھنا فضول سمجھا۔ مشق سے کلام کو قوت دیتے رہے، یہاں تک کہ

اپنے زمانے میں مسلّم الثبوت اُستاد ہوگئے اور سیکڑوں شاگرد دامنِ تربیت میں پرورش پاکر اُستاد کہلائے۔

چھریرا بدن، کشیدہ قامت، سیدھے سادے، بھولے بھالے آدمی تھے۔ سپاہیانہ، رندانہ اور آزادانہ وضع رکھتے تھے اور اس لیے کہ خاندان کا تمغہ بھی قائم رہے، کچھ رنگ فقیری کا بھی تھا۔ ساتھ اس کے بڑھاپے تک تلوار باندھ کر سپاہیانہ بانکپن نباہے جاتے تھے۔ سر پہ ایک زُلف اور کبھی حیدری چُٹیا کہ یہ بھی محمد شاہی بانکوں کا سکّہ ہے۔ اسی میں ایک طرّہ سبزی کا بھی لگائے رہتے تھے اور بے تکلّفانہ رہتے تھے اور ایک بانکی ٹوپی بھووں پر دھرے جدھر چاہتے تھے، چلے جاتے تھے۔ بابی خاں کی سرائے میں ایک پُرانا سا مکان تھا، وہاں سکونت تھی۔ اس محلّے کے ایک طرف اُن کے دل بہلانے کا جنگل تھا، بلکہ ویرانوں میں اور شہر کے باہر جنگلوں میں اکثر پھرتے رہتے تھے۔ اسّی روپے مہینا بادشاہِ لکھنؤ کے ہاں سے ملتا تھا، پندرہ روپے گھر میں دیتے تھے، باقی غربا اور اہلِ ضرورت کو کھلا پلا کر مہینے سے پہلے ہی فیصلہ کر دیتے تھے۔ پھر توکّل پہ گزارا تھا، مگر شاگردوں یا امرائے شہر میں سے کوئی سلوک کرتا تھا تو اس سے انکار نہ تھا۔ باوجود اس کے ایک گھوڑا بھی ضرور بندھا رہتا تھا۔ اسی عالم میں کبھی آسودہ حال رہتے تھے، کبھی ایک آدھ فاقہ بھی گزر جاتا تھا۔ جب شاگردوں کو خبر ہوتی، ہر ایک کچھ نہ کچھ لے کر حاضر ہوتا اور کہتا کہ آپ ہم کو اپنا نہیں سمجھتے کہ کبھی اظہارِ حال نہیں فرماتے۔ جواب میں کہتے کہ تم لوگوں نے کھلا کھلا کر ہمارے نفسِ حریص کو فربہ کر دیا ہے۔ میر دوست علی خلیل کو یہ سعادت اکثر نصیب ہوتی تھی۔ فقیر محمد خاں گویا، خواجہ وزیر یعنی شیخ صاحب کے شاگرد کے شاگرد تھے، مگر ۲۵ روپے مہینا دیتے تھے۔ سید محمد خاں رند کی طرف سے بھی معمولی نذرانہ پہنچتا تھا۔

زمانے نے ان کی تصاویرِ مضمون کی قدر ہی نہیں بلکہ پرستش کی، مگر اُنھوں نے اس کی جاہ و حشمت سے ظاہر آرائی نہ چاہی۔ نہ امیروں کے درباروں میں جا کر غزلیں سنائیں۔ نہ ان کی تعریفوں میں قصیدے کہے۔ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں، جس پر کچھ چھپر سایہ کیے تھے، بوریا بچھا رہتا تھا۔ اسی پر ایک لُنگ باندھے صبر و قناعت کے ساتھ بیٹھے رہے اور عمرِ چند روزہ کو اس طرح گزار دیا، جیسے کوئی بے نیاز و بے پرواہ فقیر تکیے میں بیٹھا ہوتا ہے۔ کوئی متوسط الحال اشراف یا کوئی مسافر غریب آتا تو متوجہ ہو کر باتیں بھی کرتے تھے۔ امیر آتا تو دھتکار دیتے تھے۔ وہ سلام کر کے کھڑا رہتا کہ آپ فرمائیں تو بیٹھے۔ یہ کہتے ہُوں، کیوں صاحب! بوریے کو دیکھتے ہو کپڑے خراب ہو جائیں گے؟ یہ فقیر کا تکیہ ہے، یہاں مسند تکیہ کہاں؟ اور یہ حالت شیخ صاحب کی شان و شکوہ کے بالکل خلاف ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ عالم میں مقبولِ خلائق ہوئے۔ علم والے شاعروں سے پہلو بہ پہلو

رہے - امیر سے غریب تک اِسی فقیرانہ تکیے میں آکر سلام کر گئے۔

اے ہما پیشِ فقیری سلطنت کیا مال ہے
بادشاہ آتے ہیں پابوسِ گدا کے واسطے

سنہ ۱۲۶۳ء ہجری میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے، یکایک البیا موت کا جھوکا آیا کہ شعلے کی طرح بجھ کر رہ گئے - آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہونا تھا - میر دوست علی خلیل نے تجہیز و تکفین کی اور رسومِ ماتم بھی بہت اچھی طرح ادا کیں - بی بی اور ایک لڑکا لڑکی خرد سال تھے - اُن کی بھی سرپرستی وہی کرتے رہے - میر علی اوسط رشک نے تاریخ لکھی ع

خواجہ حیدر علی اے وائے مروند -

تمام عمر کی کمائی، جسے حیاتِ جاودانی کا مول کہنا چاہیئے، ایک دیوان غزلوں کا ہے، جو اُن کے سامنے رائج ہو گیا تھا - دوسرا تتمہ ہے جو پیچھے مرتب ہُوا - جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورۂ اُردو کا دستور العمل ہے اور انشا پردازیٔ ہند کا اعلیٰ نمونہ - شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے - جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں -

اِسی طرح اُنھوں نے شعر کہہ دیے ہیں - اُن کے کلام نے پسندِ خاص اور قبولِ عام کی سند حاصل کی اور نہ فقط اپنے شاگردوں میں، بلکہ بے غرض اہلِ انصاف کے نزدیک بھی مقبول اور قابلِ تعریف ہُوا - دلیل اس کی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ بار بار چھپ جاتا ہے اور بک جاتا ہے - اہلِ سخن کے جلسوں میں پڑھا جاتا ہے اور عاشقانہ غزلیں موسیقی کی تاثیر کو چمکا کر محفلوں کو گرماتی ہیں -

وہ شیخ امام بخش ناسخ کے ہمعصر تھے - مشاعروں میں اور گھر بیٹھے روز مقابلے رہتے تھے - دونوں کے معتقد انبوہ درانبوہ تھے - جلسوں کو معرکے اور معرکوں کو ہنگامے بناتے تھے، مگر دونوں بزرگوں پر صد رحمت ہے کہ مرزا رفیع اور سید انشا کی طرح دست و گریباں نہ ہوتے تھے، کبھی کبھی نوک جھوک بھی ہو جاتی تھی کہ وہ قابلِ اعتنا نہیں - چنانچہ خواجہ صاحب نے جب شیخ صاحب کی غزلوں پر متواتر غزلیں لکھیں تو انھوں نے کہا ؎

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب — بو مسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب

(شیخ صاحب)

کیوں نہ دے ہر مومن اُس ملحد کے دیواں کا جواب
جس نے دیواں اپنا ٹھیرایا ہے قرآں کا جواب

(خواجہ صاحب)

خواجہ صاحب کے کلام میں بول چال اور محاورے اور روزمرہ کا لُطف بہت ہے جو کہ شیخ صاحب کے کلام میں اس درجے پر نہیں - شیخ صاحب کے معتقد اس معاملے کو ایک اور قالب میں ڈھال کر کہتے ہیں کہ ان کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں ہیں، کلام میں ریختہ کی پختگی اور ترکیب میں

متانت اور اشعار میں عالی مضامین نہیں اور اس سے نتیجہ اُن کی بے استعدادی کا نکالتے ہیں، مگر یہ ویسا ہی ظلم ہے، جیسا ان کے معتقد اُن پر کرتے ہیں کہ شیخ صاحب کے شعروں کو اکثر بے معنی اور مہمل سمجھتے ہیں۔ میں نے خود دیوانِ آتش کو دیکھا۔ کلام مضامینِ بلند سے خالی نہیں، ہاں طرزِ بیان صاف ہے۔ سیدھی سی بات کو پیچ نہیں دیتے۔ ترکیبوں میں استعارے اور تشبیہیں فارسیت کی بھی موجود ہیں، مگر قریب الفہم اور ساتھ ہی اس کے محاورے کے زیادہ پابند ہیں۔ یہ درحقیقت ایک وصفِ خداداد ہے کہ رقابت اُسے عیب کا لباس پہنا کر سامنے لاتی ہے۔ کلام کو رنگینی اور استعارہ و تشبیہ سے بلند کر دکھانا آسان ہے، مگر زبان اور روزمرہ کے محاورے میں صاف صاف مطلب اس طرح ادا کرنا، جس سے سننے والے کے دل پر اثر ہو، یہ بات بہت مشکل ہے۔ شیخ سعدی کی گلستاں کچھ چھپی ہوئی نہیں ہے۔ نہ اس میں نازک خیالات ہیں، نہ کچھ عالی مضامین ہیں، نہ پیچیدہ تشبیہیں ہیں، نہ استعارہ در استعارہ کے فقرے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں۔ صاف صاف باتیں ہیں، اس پر آج تک اس کا جواب نہیں۔ مینا بازار اور پنج رقعہ کے انداز میں صدہا کتابیں موجود ہیں۔ اس معاملے میں غور کے بعد یہ معلوم ہوا کہ جو بزرگ خیال بندی اور نازک خیالی کے چمن میں ہوا کھاتے ہیں، اوّل اُن کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ایسے نئے مضمون لگائیں جو اب تک کسی نے نہ باندھے ہوں، لیکن جب متقدمین کے اشعار سے کوئی بات بچی ہوئی نہیں دیکھتے تو ناچار انہی کے مضامین میں باریکیاں نکال کر موشگافیاں کرتے ہیں اور ایسی ایسی لطافتیں اور نزاکتیں نکالتے ہیں کہ غور سے خیال کریں تو نہایت لُطف حاصل ہوتا ہے، پھولوں کو پھینک کر فقط رنگِ بے گُل سے کام لیتے ہیں۔ آئینے سے صفائی اُتار لیتے ہیں، تصویرِ آئینہ میں سے حیرت نکال لیتے ہیں، اور آئینہ پھینک دیتے ہیں۔ نگاہِ سرمگیں سے حرفِ بے آواز کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ فی الحقیقت ان مضامین سے کلاموں میں خیالی نزاکت اور لطافت سے تازگی پیدا ہو جاتی ہے اور لوگ بھی تحسین و آفرین کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ ان کے ادا کرنے کو الفاظ ایسے نہیں بہم پہنچتے کہ کہنے والا کہے اور سمجھنے والا صاف سمجھ جائے۔ اس لیے ایسے کلام پُر اثر اور ناخن بر جگر نہیں ہوتے۔ بڑا افسوس یہ ہے کہ اس انداز میں عمومی مطالب ادا نہیں ہو سکتے بے شک یہ بہت مشکل کام ہے، مگر اس کی مثال ایسی ہے، گویا چنے کی دال پر مصور نے ایک شکارگاہ کی تصویر کھینچ دی یا چاول پر خوشنویس نے قل ہو اللہ لکھ دیا۔ فائدہ دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ اسی واسطے جو فہمیدہ لوگ ہیں، وہ ادائے مطلب اور طرزِ کلام میں صفائی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی نئی بات نکل آئی تو ایسے اونچے نہ جائیں گے کہ بالکل غائب ہو جائیں اور سننے والے منہ دیکھتے رہ جائیں۔ البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ترکیبوں

کی پیچیدگی اور لفظوں کی باریکی و تاریکی میں جو ہراتِ معنی کا بھرم ہوتا ہے۔ اور اندر سے دیکھتے ہیں تو سیدھی سی بات ہوتی ہے جسے اِن کے حریف کوہ کندن اور کاہ برآوردن کہتے ہیں۔ مگر انصاف یہ ہے کہ دونوں لُطف سے خالی نہیں ہیں ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

شیخ صاحب کے معتقد خواجہ صاحب کے بعض الفاظ پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ جب انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

دُخترِ رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے
میں جہانگیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

لوگوں نے کہا، حضور! بیگم ترکی لفظ ہے، اہلِ زبان گاف پر پیش بولتے ہیں اور زبانِ فارسی کا قاعدہ بھی یہی چاہتا ہے۔ یہ اس وقت بھنگیائے ہوئے بیٹھے تھے۔ کہا کہ ہُونہہ! ہم ترکی نہیں بولتے، ترکی بولیں گے تو بیگم کہیں گے۔

اسی طرح جب انھوں نے یہ مصرع کہا ع اس خوان کی نمش کفِ مارِ سیاہ ہے، لوگوں نے کہا کہ قبلہ! یہ لفظ فارسی اور اصل میں نمشک ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب فارس میں جائیں گے تو ہم بھی نمشک ہی کہیں گے۔ یہاں سب نمش کہتے ہیں۔ تو نمش ہی شعر میں باندھنا چاہیئے۔

پیشگی دل کو جو دے لے وہ اسے تحصیلے
ساری سرکاروں سے ہے عشق کی سرکار جُدا

حریفوں نے کہا کہ پیشگی ترکیب فارسی سے ہے، مگر فارسی والوں کے استعمال میں نہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہمارا محاورہ ہے۔

یہاں تک تو درست ہے، مگر بعض مواقع پر جو ان کے حریف کہتے ہیں تو ہمیں بھی لاجواب ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ دیوان میں ایک غزل ہے، صاف ہُوا، معاف ہُوا، خلاف ہُوا، اس میں فرماتے ہیں ؎

زہر پرہیز ہو گیا مجھ کو
دردِ درماں سے المضاعف ہُوا

اس ٹھوکر کھانے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کے تلفظ میں المضاعف بجو المضاعف بولا جاتا ہے، وہ اس کی اصلیت کے دھوکے میں رہے۔

خواجہ صاحب شاید حلوا کو حلوہ سمجھے، جو فرماتے ہیں :

لعلِ شکر بار کا بوسہ میں کیونکر نہ لوں
کوئی نہیں چھوڑتا حلوۂ بے دُود کو

کفّارہ کو بھی عوام بے تشدید بولتے ہیں، چنانچہ خواجہ صاحب نے بھی لکھا ہے:

رنگِ زرد و لبِ خشک و مژۂ خون آلود — گشتۂ عشق ہیں ہم، ہے یہ کفّارہ اپنا
لکھے ہیں سرگزشتِ دل کے مضموں یکقلم اس میں — تماشا قتل گہ کا ہے مطلع میرے دیواں کا
کشاکش دم کی مارِ آستیں کا کام کرتی ہے — دلِ بے تاب کو پہلو میں اک گرگِ بغل پایا

مخالف کہتے ہیں کہ بغلی گھونسا اُردو کا لفظ ہے، مارِ آستین فارسی کا محاورہ ہے۔ گرگِ بغل کے لیے فارسی کی سند چاہیئے، بے سند صحیح نہیں:

چار ابرو میں تری حیراں ہیں سارے خوشنویس
کس قلم کا قطعہ ہے یہ کاتبِ تقدیر کا

یہاں چار ابرو بمعنی چہرہ لیا ہے، محاورے میں چار ابرو کا لفظ بغیر صفائی کے نہیں آتا، جس سے مراد ہے کہ ابرو اور ریش و بروت کو چٹ کر دیں۔ وہ بے نواؤں اور قلندروں کے لیے خاص ہے، نہ کہ معشوق کے لیے۔ سید انشاء نے کیا خوب کہا ہے:

سید انشا — اک بے نوا کے لڑکے پہ مرتے ہیں شیخ جی — عاشق ہوئے ہیں واہ عجب ٹُنڈ مُنڈ پہ

آتش — بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

خوش پھرتے ہیں چاہیے۔

لعب بازی کی بھی حسرت رہے اے آتش — میرے اللہ نے بازیچۂ تن مجھ کو دیا
بھلا دیکھیں تو گو بازی میں سبقت کون کرتا ہے — اِدھر ہم بھی ہیں توسن پہ اُدھر تم بھی ہو توسن پر
ابروے یار کا ہے سر میں جنھوں کے سودا — رقص وہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر
نہیں غم تیغ ابروے صنم سے قتل ہونے کا — شہادت بھی بمنزل فتح کے ہے مردِ غازی کو
سودائی جان کر تری چشمِ سیاہ کا — ڈھیلے لگاتے ہیں مجھے دیدے غزال کے

اس صنعتِ مراعات النظیر کو تکلیفِ زائد سمجھتے ہیں۔

حریف بعض اور قسم کے جزئیات پر بھی اعتراض کرتے ہیں، مثلاً خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

قدرتِ حق ہے صباحت سے تماشا ہے وہ رُخ — خالِ مشکیں دلِ فرعون یدِ بیضا ہے وہ رُخ
کانپتا ہے آہ سے میری رقیبِ روسیاہ — اژدہا فرعون کو موسیٰ کا عصا معلوم ہو
چکھ کے یاقوتی لب کو تری بیخود ہوئے ہم — نشۂ معجوں میں سے ہوش رُبا کا نکلا

حالِ مستقبل نجومی اس سے کرتے ہیں بیاں — زائچہ بھی نقل ہے پیشانی کی تحریر کا

جو کہ قسمت میں لکھا ہے، جان، ہووئیگا وہی — پھر عبث کاہے طالع آزمائی کیجیے

آتش — رات بھر آنکھوں کو اس امید پر رکھتا ہوں بند — خواب میں شاید کہ دیکھوں طالع بیدار کو

جرأت — بند آنکھیں کیے رہتا ہوں پڑا
خواب میں آئے نظر تا کوئی

آتش — دولتِ عشق کا گنجینہ وہی سینہ ہے — داغِ دل، زخمِ جگر مُہرو نشاں ہے کہ جو تھا

خواجہ حافظ — گوہرِ مخزنِ اسرار ہمانست کہ بود
حقّہ مہر بداں مہرو نشانست کہ بود

آتش — آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے — دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لیے

میر صاحب — کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس
ہم نے دیدار کی گدائی کی

اِن کے کلام میں بھی بعض الفاظ ایسے ہیں، جو دِلّی اور لکھنؤ کی زبان میں پُورب، پچھم کا فرق دکھلاتے ہیں۔ دِلّی والے اندھیری کہتے ہیں اور انھوں نے اندھیاری باندھا ہے چنانچہ کئی شعر ناسخ کے حال میں لکھے گئے۔

خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

بلند و پستِ عالم کا بیاں تحریر کرتا ہے
قلم ہے شاعروں کا یا کوئی رہرو ہے بیہڑ کا

بیہڑ کا لفظ دِلّی میں مستعمل نہیں۔ بل بے دِلّی کے شعرا باندھتے تھے، آج کل کے لوگ اس کو بھی متروک سمجھتے ہیں، مگر خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

خانہ خراب نالوں کی بل بے شرارتیں
بہتی ہیں پانی ہو ہو کے سنگیں عمارتیں

متاخرین لکھنؤ اور دہلی کے فارسی جمع کو بے اضافت یا صفت کے نہیں لاتے، مگر یہ اکثر باندھتے ہیں، دیکھو اشعارِ مفصلہ ذیل:

رفتگاں کا بھی خیال اے اہلِ عالم چاہیئے — عالمِ ارواح سے صحبت کوئی دم چاہیئے

رہگزر میں دفن کرنا اے عزیزاں تم مجھے — شاید آجائے کسی کے میرا مدفن زیرِ پا

بھاگو نہ مجھ کو دیکھ کے بے اختیار دُور — اے کودکاں ابھی تو ہے فصلِ بہار دُور

کیا نفاق انگیز ہمجنساں ہوائے دہر ہے — نیند اُڑ جاتی ہے سُننے سے نفیرِ خواب، کو

روز و شب رویا میں آتشِ رفتگاں کی یاد میں — عمر بھر آنکھیں نہ بھولیں صورتِ احباب کو

عہدِ طفلی میں بھی تھا میں بسکہ سودائی مزاج — بیڑیاں منّت کی بھی پہنیں تو میں نے پھاڑیاں

اے خط اس گورے گالوں پر یہ تو نے کیا کیا — چاندنی راتیں یکایک ہو گئیں اندھیاریاں

صفت کو اس طرح موصوف کی مطابقت کے لیے جمع کرنا اب خلافِ فصاحت سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ میر تقی ترقی کے ہاں مشاعرے میں خواجہ صاحب نے غزل پڑھی کہ شبنم کے مضمون میں "تموج بحرِ کافور" باندھا تھا۔ طالب علی خاں عیشی نے وہیں ٹوکا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میاں ابھی مدت بہت چاہیے، دیکھو تو سہی، جامی کیا کہتا ہے:

دو پستانش بہم چوں قبۂ نور
حبابے خاستہ از بحرِ کافور

ساتھ ہی میر مشاعرہ سے کہا کہ اب کی دفعہ یہی طرح ہو:

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفے میں بازئ غلام نہیں

وہ بیچارے بھی کسی کے متبنّٰی تھے۔ اسی مطلع کو یار لوگوں نے شیخ ناسخ کے گلے باندھا۔ کتبِ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرا جو شاگردانِ الٰہی ہیں، مجازی اُستادوں کے ساتھ ان کی بگڑتی ہی چلی آئی ہے، چنانچہ ان کا بھی اُستاد سے بگاڑ ہوا۔ خدا جانے بُنیاد کن کن جزئیات پر قائم ہوئی ہوگی۔ اور ان میں حق کس کی طرف تھا، آج اصل حقیقت دُور کے بیٹھنے والوں پر کھُلنی مشکل ہے۔ مگر جہاں سے کھُلم کھُلا بگڑ ہی، اس کی حکایت یہ سُنی گئی کہ شیخ مصحفی ابھی زندہ تھے اور خواجہ صاحب کی طبیعت بھی اپنی گرمیاں دکھانے لگی تھی، جو مشاعرے میں طرح ہوئی۔ دہن بگڑا، یاسمن بگڑا۔ اس میں سب نے غزلیں لکھیں۔ خواجہ صاحب نے غزل لکھ کر شیخ مصحفی اپنے اُستاد کو سُنائی اور جب یہ شعر سنائے:

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک — نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

لگے مُنہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب — زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

نشے کے سرور میں آکر کہا کہ اُستاد! اس ردیف قافیہ میں کوئی شعر نکالے تو کلیجا نکل پڑتا ہے۔ انھوں نے ہنس کر کہا، ہاں میاں سچ کہتے ہو، اب تو کسی سے ایسے شعر نہیں ہو سکتے۔ بعد اس کے شاگردوں میں سے ایک نو مشق لڑکے کی غزل کو توجہ سے بنایا اور اس میں انہی دو قافیوں کو اس طرح باندھا:

لکھا ہے خاکِ کوئے یار سے اے دیدۂ گریاں
قیامت میں کروں گا گر کوئی حرفِ کفن بگڑا
نہ ہو محسوس جو شے کس طرح نقشے میں ٹھیک اُترے
شبیہِ یار کھچوائی کمر بگڑی، دہن بگڑا

اگرچہ اُن شعروں میں اور اِن شعروں میں جو نسبت ہے، وہ اِن جواہرات کے پرکھنے والے ہی جانتے ہیں، لیکن مشاعرے میں بہت تعریف ہوئی۔ پھر چونکہ لڑکے کے منہ پر شعر کھلتے نہ تھے۔ اِس لیے تاڑنے والے تاڑ گئے کہ اُستاد کی اُستادی ہے۔ خواجہ صاحب اسی وقت اُٹھ کر شیخ مصحفی کے پاس جا بیٹھے اور غزل ہاتھ سے پھینک کر کہا کہ یہ آپ ہمارے کلیجے میں چھریاں مارتے ہیں۔ نہیں تو اس لونڈے کا کیا منہ تھا، جو اِن قافیوں میں شعر نکالتا۔ خیر اِس قسم کی باتیں اُستاد کے ساتھ بچوں کی شوخیاں اور لڑکپن کے ناز ہیں، جو کہ سننے والوں کو اچھے معلوم ہوتے ہیں اور طبیعتوں میں جوشِ ترقی پیدا کرتے ہیں، لیکن سعادت مند شاگرد کو اُستاد کے مرتبے اور اپنی حد کا اندازہ رکھنا واجب ہے تاکہ خاقانی اور ابوالعلائی گنجوی کی طرح دونوں طرف سے کثیف اور غلیظ ہجوؤں تک نوبت نہ پہنچے۔ نہیں تو قیامت تک دونوں رسوائے عالم ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ خواجہ صاحب کی شرافت و نجابت، جس نے انھیں اس آئین کا پابند رکھا، اس معاملے میں قابلِ تعریف ہے۔

میر مہدی حسن فراغ سے اِن کے نہایت گرم و پسندیدہ اشعار ایسے بھی سُنے گئے، جو کلیات مروجہ میں نہیں ہیں۔ سبب یہ معلوم ہوا کہ ایک صاحب اس زمانے میں نہایت خوش مذاق اور اور صاحبِ فہم تھے، جو خود شاعر تھے اور اُن کے ہاں بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب بھی جاتے تھے اور مشاعرے میں غزل پڑھ کر وہیں دے آتے تھے۔ بعد انتقال کے جب شاگرد دیوان مرتب کرنے لگے تو بہت سی غزلیں اُنھیں میر مشاعرہ سے حاصل ہوئیں۔ خدا جانے عمداً یا اُن کی بے اعتنائی سے بعض اشعار دیوان میں نہ آئے، لیکن چونکہ وہ شاگرد شیخ ناسخ کے تھے، اس لیے بدگمانی لوگوں کو گنہگار کرتی ہے۔

جب شیخ ناسخ کا انتقال ہوا تو خواجہ صاحب نے ان کی تاریخ کہی اور اس دن سے شعر کہنا چھوڑ دیا کہ کہنے کا لطف سُننے اور سنانے کے ساتھ ہے۔ جس شخص سے سنانے کا لطف تھا، جب وہ نہ رہا تو اب شعر کہنا نہیں بکواس ہے۔

حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت کی آزادی اور کلام کے کمال نے ظاہر آرائی کے ذوق شوق سے بے پرواہ کر دیا تھا، مگر مزاج میں ظرافت ایسی تھی کہ ہر قسم کا خیال لطائف و ظرائف

ہی میں ادا ہوتا تھا۔

لطیفہ: ایک شاگرد اکثر بے روزگاری کی شکایت سے سفر کا ارادہ ظاہر کیا کرتے تھے اور خواجہ صاحب اپنی آزادہ مزاجی سے کہا کرتے تھے کہ میاں کہاں جاؤ گے ؛ دو گھڑی مل بیٹھنے کو غنیمت سمجھو اور جو خدا دیتا ہے، اس پر صبر کرو۔ ایک دن وہ آئے اور کہا کہ حضرت رخصت کو آیا ہوں۔ فرمایا: خیر باشد، کہاں ؟ انھوں نے کہا، کل بنارس کو روانہ ہوں گا۔ کچھ فرمائش ہو تو فرما دیجئے۔ آپ ہنس کر بولے: اتنا کام کرنا کہ وہاں کے خدا کو ذرا ہمارا بھی سلام کہہ دینا۔ وہ حیران ہو کر بولے کہ حضرت! یہاں اور وہاں کا خدا کوئی جُدا ہے؟ فرمایا کہ شاید یہاں کا خدا بخیل ہے، وہاں کا کچھ سخی ہو۔ انھوں نے کہا معاذ اللہ آپ کے فرمانے کی یہ بات ہے؟ خواجہ صاحب نے کہا، بھلا سنو تو سہی، جب خدا وہاں یہاں ایک ہے تو پھر ہمیں کیوں چھوڑتے ہو، جو اُس سے وہاں جا کر مانگو گے، اُسی طرح یہاں مانگو۔ وہاں دے گا تو یہاں بھی دے گا۔ اس بات نے اُن کے دل پر ایسا اثر کیا کہ سفر کا ارادہ موقوف کیا اور خاطر جمعی سے بیٹھ گئے۔

خواجہ صاحب کی سیدھی سادی طبیعت اور بھولی بھالی باتوں کے ذکر میں میر انیس مرحوم نے فرمایا کہ ایک دن آپ کو نماز کا خیال آگیا۔ کسی شاگرد سے کہا۔ کہ بھئی ہمیں نماز سکھاؤ۔ وہ اتفاقاً فرقۂ سُنت جماعت سے تھا۔ اُس نے ویسی ہی نماز سکھادی اور یہ کہہ دیا کہ اُستاد عبادات الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اُتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ جب نماز کا وقت ہوتا یہ حجرے میں جاتے یا گھر کا دروازہ بند کر کے اسی طرح پڑھا کرتے۔ میر دوست علی خلیل ان کے شاگرد خاص اور جلوت و خلوت کے حاضر باش تھے۔ ایک دن انھوں نے بھی دیکھ لیا۔ بہت حیران ہوئے یہ نماز پڑھ چکے تو انھوں نے کہا کہ اُستاد! آپ کا مذہب کیا ہے ؟ فرمایا، شیعہ۔ ہیں! یہ کیا پوچھتے ہو؟ اُنھوں نے کہا کہ نماز سُنیوں کی ؟ فرمایا! بھئی میں کیا جانوں، فلاں شخص سے میں نے کہا تھا، اُس نے جو سکھادی، سو پڑھتا ہوں۔ مجھے کیا خبر کہ ایک خدا کی دو دو نمازیں ہیں۔ اس دن سے شیعوں کی طرح نماز پڑھنے لگے۔ جتنے شاگرد انھوں نے پائے کسی اُستاد کو نصیب نہیں ہوئے۔ ان میں سے سید محمد خاں رندؔ، امیر وزیر علی صباؔ، میر دوست علی خلیلؔ، ہدایت علی خیلیؔ، صاحب مرزا شاؔدر۔ مرزا عنایت علی لسمّلؔ، نادر مرزا فیض آبادی نامور شاگرد تھے کہ رُتبۂ اُستادی رکھتے تھے۔

## غزل

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟

کیا کیا اُلجھتا ہے تری زلفوں کے تار سے
بخیہ طلب ہے سینۂ صد چاک شانہ کیا؟

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لُٹایا خزانہ کیا؟

اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عُمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا؟

زینہ صبا کا ڈھونڈتی ہے اپنی مشتِ خاک
بامِ بلند یار کا ہے آستانہ کیا؟

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا؟

صیاد! اسیرِ دامِ رگِ گُل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھُپ کے اسے آب و دانہ کیا؟

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا؟

ہوتا ہے زرد سُن کے جو نامرد مُدّعی
رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا؟

بے یار سازگار نہ ہوگا وہ گوش کو
مطرب ہمیں سناتا ہے اپنا ترانہ کیا؟

صیاد گلعذار دکھاتا ہے سبز باغ
بُلبُل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا؟

ترچھی نظر سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے گا اُڑے گا نشانہ کیا؟

بے تاب ہے کمال ہمارا دلِ حزیں
مہماں سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا؟

یاں مدّعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتشؔ غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا؟

خانہ خراب نالوں کی بل بے شرارتیں
بہتی ہیں پانی ہو ہو کے سنگیں عمارتیں

سر کونسا ہے جس میں کہ سودا ترا نہیں
ہوتی ہیں ترے نقشِ قدم کی زیارتیں

خانہ ہے گنجفے کا ہر اک قصرِ شہرِ عشق
گھر گھر میں بادشاہیاں گھر گھر وزارتیں

دیدارِ یار برقِ تجلّی سے کم نہیں
بند آنکھیں ہونگی، دیں گی دُعائیں بصارتیں

آنکھوں میں اپنی دولتِ بیدار ہیں وہ خواب
ہوتی ہیں تیرے وصل کی جن میں بشارتیں

کہتے ہیں مادر و پدرِ مہرباں کو بد
کرتے ہیں وہ جو ارض و سما کی حقارتیں

گویا زباں ہو تو کرے شکر آدمی
سمجھے جو تو تو کرتے ہیں یہ گنگ اشارتیں

زیرِ زمیں بھی یاد ہیں ہفت آسماں کے ظلم
بھولا نہیں ہیں سنگ دلوں کی شرارتیں

خضر و مسیح کاٹتے ہیں رشک سے گلا
تو بھی تو کر شہیدوں کی اپنے زیارتیں

عالم کو لوٹ کھایا ہے اِک پیٹ کے لیے
اس غار میں گئی ہیں ہزاروں ہی غارتیں

باقی رہے گا نام ہمارا نشاں کے ساتھ
اپنی بھی چند بیتیں ہیں اپنی عمارتیں

اہلِ جہاں کا حال ہے کیا ہم سے، کیا کہیں
بد گوئیاں ہیں پیچھے تو منہ پر اشارتیں

نقش و نگارِ حسنِ بتاں کا نہ کھا فریب
مطلب سے خالی جان لے تو یہ عبارتیں

عاشق ہیں، ہم کو مدِ نظر کوئے یار ہے — کعبے کے حاجیوں کو مبارک زیارتیں
ایسی خلاف ہم سے ہوئی ہے ہوائے دہر — کافور کھائیے تو ہوں پیدا حرارتیں
آتش یہ شش جہت ہے مگر کوچہ یار کا
چاروں طرف سے ہوتی ہیں ہم پر اشارتیں

باغباں انصاف پر بلبل سے آیا چاہیے — پنچھی اس کو زرِ گل کی پنھایا چاہیے
فرشِ گل بلبل کی نیت سے بچھایا چاہیے — شمع پروانوں کی خاطر سے جلایا چاہیے
پان بھی کھاؤ جمائی ہے جو مستی کی دھڑی — شام تو دیکھی شفق کو بھی دکھایا چاہیے
آئینے میں خطِ نورس کا نظارہ کیجئے — آہوانِ چشم کو ریحاں چرایا چاہیے
بوسہ اس لب کا ہے قوت بخشِ روحِ ناتواں — ایسی یاقوتی میسر ہو تو کھایا چاہیے
عشق میں حدِ ادب سے آگے رہتا ہے قدم — شاخِ گلبن سے بلبل کو اڑایا چاہیے
دیکھیے کرتا ہے کیونکر یار سے گستاخیاں — شوق کے حوصلے کو بھی آزمایا چاہیے
ہو گیا ہے ایک مدت سے دلِ نالاں خموش — باغ میں چل کر اسے بلبل سنایا چاہیے
فصلِ گل ہے چار دن ساقی تکلف ہے ضرور — پر جواہر کے پیڑے کو لگایا چاہیے
خم میں جوشِ مے سے مجھ کو یہ صدا ہے آ رہی — ظرفِ مستی ہو تو کیفیت اٹھایا چاہیے
حالِ دل کچھ کچھ کہا میں نے تو بولا سن کے یار — بس عبارت ہو چکی مطلب پہ آیا چاہیے
شیر سے خالی نہیں رہتا نیستاں زینہار — بوریائے فقر بچھا چھوڑ جایا چاہیے
رنگِ زرد و چشمِ تر سے کیجیے دعوائے عشق — دو گواہِ حال اس قضیے کے لایا چاہیے
رام ہوتے ہی نہیں، وحشی مزاجی ہے سبب — ان سیہ چشموں کو چوپھرا جگایا چاہیے
دیکھ کر خلوت سرائے یار کہتے ہیں فقیر — عود کی مانند یاں دھونی لگایا چاہیے
خاطرِ آتش سے کہیے چند جزو شعر اور بھی
بے نشاں کا نام باقی چھوڑ جایا چاہیے

فریبِ حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا — خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا
قبائے گل کو پھاڑا جب، مرا گل پیرہن بگڑا — بن آئی کچھ نہ غنچے سے جو وہ غنچہ دہن بگڑا
نہیں بے وجہ ہنسنا اس قدر زخمِ شہیداں کا — تری تلوار کا منہ کچھ نہ کچھ اے تیغ زن بگڑا
تکلف کیا جو کھوئی جانِ شیریں پھوڑ کر سر کو — جو غیرت تھی تو پھر خسرو سے ہوتا کوہکن بگڑا
کسی چشمِ سیاہ کا جب ہوا ثابت میں دیوانہ — تو مجھ سے مست ہاتھی کی طرح جنگلی ہرن بگڑا
اثر اکسیر کا مٹی قدم سے تیرے پایا ہے — جذامی خاکِ رہ مل کر بناتے ہیں بدن بگڑا

تری تقلید سے کبکِ دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

زوالِ حسن کھلواتا ہے میوے کی قسم مجھ سے
لگا یا داغ خط نے آن کر سیبِ ذقن بگڑا

رخِ سادہ نہیں اس شوخ کا نقشِ عداوت ہے
نظر آتے ہی آپس میں ہر اہلِ انجمن بگڑا

وہ بدخو طفلِ اشک اے چشمِ تر ہیں دیکھنا اک دن
گھروندے کی طرح سے گنبدِ چرخِ کہن بگڑا

صفِ مژگاں کی جنبش کا کیا اقبال نے کشتہ
شہیدوں کے ہوئے سالار جب ہم سے تمن بگڑا

کسی کی جب کوئی تقلید کرتا ہے میں روتا ہوں
ہنسا گل کی طرح غنچہ جہاں اس کا دہن بگڑا

کمال دوستی اندیشۂ دشمن نہیں رکھتا
کسی بھونرے سے کس دن کوئی ماہِ یاسمن بگڑا

رہی نفرت ہمیشہ داغِ عریانی کو جامے سے
ہوا جب قطع جامے پر ہمارے پیرہن بگڑا

رگڑوائیں یہ مجھ سے ایڑیاں غربت میں وحشت نے
ہوا مسدود رستہ جادۂ راہِ وطن بگڑا

کہا بلبل نے جب توڑا گلِ سوسن کو گلچیں نے
الٰہی خیر کیجو نیلِ رخسارِ چمن بگڑا

ارادہ میرے کھانے کا نہ اے زاغ و زغن کیجو
وہ کشتہ ہوں، جسے سونگھے سے کتوں کا بدن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

جہاں خالی نہیں رہتا کبھی ایذا دہندی سے
ہوا ناسورِ نو پیدا اگر زخمِ کہن بگڑا

تونگر تھا بنی تھی جب تلک اس محبوبِ عالم سے
میں مفلس ہو گیا جس روز سے وہ سیم تن بگڑا

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

بناوٹ کیفِ مے سے کھل گئی اس شوخ کی آتش
لگا کر منہ سے پیمانے کو وہ پیماں شکن بگڑا

# شاہ نصیر

نصیر تخلص، نصیر الدین نام تھا، مگر چونکہ رنگت کے سیاہ فام تھے، اس لیے گھرانے کے لوگ میاں کلّو کہتے تھے۔ وطن ان کا خاص دہلی تھا۔ والد شاہ غریب نام ایک بزرگ تھے کہ اپنی غربت طبع اور خاکساری مزاج کی بدولت اسم بامسمیٰ غریب تھے۔ نیک نیتی کا ثمرہ تھا کہ نام کی غریبی کو امیری میں بسر کرتے تھے۔ شہر کے رئیس اور امیر سب ادب کرتے تھے، مگر وہ گوشۂ عافیت میں بیٹھے اپنے معتقد مریدوں کو ہدایت کرتے رہتے تھے۔ ان کے بزرگوں کے نام چند گاؤں دربارِ شاہی سے آل تمغا معاف تھے۔ ملا ماجرا اور ہرسانہ علاقہ سونی پت میں، سلیم پور علاقہ غازی آباد میں، وزیر آباد شہر دہلی کے پاس جہاں مخدوم شاہ عالم کی درگاہ ہے اور اب تک ۲ رجمادی الاوّلی کو وہاں عرس ہوتا ہے۔ اب فقط مولڑبن ایک گاؤں بلب گڑھ کے علاقے میں۔ سید عبداللہ شاہ اُن کے سجادہ نشین کے نام پر واگذاشت ہے۔ غرض کہ شاہ غریب مرحوم نے اس اکلوتے بیٹے کو بڑی ناز و نعمت سے پالا تھا اور اُستاد و ادیب نوکر رکھ کر تعلیم کیا تھا۔

عجیب اتفاق ہے کہ وہ کتابی علم میں کما حقہٗ کامیاب نہ ہوئے، البتہ نتیجہ اُس کا اہلِ علم سے بہتر حاصل تھا، کیونکہ جو وہ کہتے تھے، اُسے عالم کان لگا کر سُنتے تھے، جو لکھتے تھے، اُس پر فاضل سر دھنتے تھے۔ ان کی طبیعت شعر سے ایسی مناسب واقع ہوئی تھی کہ بڑے بڑے ذی استعداد اور مشّاق شاعر مشاعروں میں منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ سلسلۂ تلمذ دو واسطوں سے سودا اور درد تک پہنچتا ہے، کیونکہ یہ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے اور وہ قیام الدین قائم کے۔ قائم نے سودا سے بھی اصلاح لی اور خواجہ میر درد سے بھی انھوں نے انگریزی عملداری میں زندگی بسر کی، لیکن شاہ عالم کے زمانے میں شاعری جوہر دکھانے لگی تھی اور خاندانی عظمت نے ذاتی کمال کی سفارش سے دربار تک پہنچا دیا تھا۔ دربار کے اہلِ کمال کو عیدوں اور جشنوں کے علاوہ ہر فصل اور موسم پر سامانِ مناسب انعام ہوتے تھے۔ شعراء کو دیر ہوتی تو تقاضے سے بھی وصول کر لیتے تھے۔ ایک قطعہ بطورِ حسنِ طلب جاڑے کے موسم میں انھوں نے کہہ کر دیا تھا۔ اور صلہ حاصل کیا تھا۔ اس کے دو شعر مجھے یاد ہیں:

بچائے گا تو ہی اے میرے اللہ ۔۔۔ کہ جاڑے سے پڑا ہے ڈھب پالا

پناہِ آفتاب اب مجھ کو بس ہے ۔۔۔ کہ وہ مجھ کو اڑھا دے گا دوشالا

اِس میں لطف یہ ہے کہ آفتاب شاہ عالم بادشاہ کا تخلص تھا ؛

سیاحی کی دولت میں سے جو سرمایہ انھیں حاصل ہوا، وہ بھی شاعری کی برکت سے تھا، جس کی مسافت جنوب میں حیدر آباد تک اور مشرق میں لکھنؤ تک پہنچی - اگرچہ دربار کے علاوہ تمام شہر میں بھی اِن کی قدر اور عزت ہوتی تھی، مگر جن لوگوں کی عادتیں ایسے درباروں میں بگڑی ہوتی ہیں ان کے دل تعلیم یافتہ حکومتوں میں نہیں لگتے، اِسی واسطے جب انگریزی عملداری ہوئی تو انھیں دکن کا سفر کرنا پڑا۔

دکن میں دیوان چندو لال کا دَور تھا - اگرچہ کمال کی قدردانی اور سخاوت اِن کی عام تھی، مگر دِلّی والوں پر نظرِ پرورش خاص رکھتے تھے اور بہت مروّت سے پیش آتے تھے - بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے - غرض وہاں شاہ صاحب کے جواہرات نے خاطر خواہ قیمت پائی - لیکن دِلّی کا چٹخارا بھی ایسا نہیں کہ انسان بھول جائے، اس لیے انعام واکرام سے مالا مال ہو کر پھر دِلّی آئے اور تین دفعہ پھر گئے -

دکن میں ان کے لیے فقط دولت کے فرشتے نے ضیافت نہ کی، بلکہ حسنِ شاعری کی زہرہ آسمان سے اُتری اور شمس ولی کے عہد کا پرتوہ پھر دلوں پر ڈالا - شعر گوئی کے شوق جو برسوں سے بجھے چراغوں کی طرح طاقوں میں پڑے تھے، دِل دِل میں روشن ہو گئے اور دماغوں کی محنتیں اس پر تیل ٹپکانے لگیں - اب بھی کوئی دِلّی سے دکن جائے تو شاہ صاحب کے شاگردوں کے نام اتنے سُنے گا کہ دِلّی کی کثرتِ تلامذہ کو بھول جائے گا -

شاہ صاحب دو دفعہ لکھنؤ بھی گئے تھے - مگر افسوس ہے، آج دِلّی یا لکھنؤ میں کوئی اتنی بات کا بتانے والا نہ رہا کہ کِس کِس سنہ میں کہاں کہاں گئے تھے - یا یہ کہ کِس کِس مشاعرے میں اور کِس کے مقابلے میں کون کون سی غزل ہوئی تھی - اس میں شک نہیں کہ پہلی دفعہ جب گئے ہیں تو سید انشاء اور مصحفی اور جرأت وغیرہ سب موجود تھے اور بعض غزلیں، جو ان معرکوں سے منسوب مشہور ہیں، وہ مصحفی کے دیوان میں بھی موجود ہیں - دیکھو صفحہ ۳۰۵ دہن سُرخ ترا، چمنِ سُرخ ترا

یہ وہ زمانہ تھا کہ لکھنؤ میں بزرگانِ اخلاق اور امرائے رتبہ شناس موجود تھے - وہ جوہر کو پہچانتے تھے اور صاحبِ جوہر کا حق مانتے تھے - جو جاتا تھا عزت پاتا تھا اور شکر گزار آتا - لیکن دوسری دفعہ جو گئے تو رنگ پلٹا ہوا تھا - شیخ ناسخ کے زمانے نے عہدِ قدیم کو نسخ کر دیا تھا - اور خواجہ آتش کے کمال نے دماغوں کو گرمایا ہوا تھا - جوانوں کی طبیعتیں زور پر تھیں - نئی نئی شوخیاں انداز دکھاتی تھیں - انوکھی تراشیں پرانے سادہ پن پر مسکراتی تھیں - چنانچہ جس حریف کا نشان منزلوں کے فاصلے پر دکھائی دیتا تھا، جب پاس آیا تو سب گردنیں اُبھار اُبھار دیکھنے لگے -

یہ زبردست شاعر کہن سال مشاق، جس کا بڑھاپا جوانی کے زوروں کو چٹکیوں میں اُڑاتا تھا۔ جس دن وہاں پہنچا تو مشاعرے میں شاید دو تین دن باقی تھے۔ ہر اُستاد نے ایک ایک، دو دو مصرعے طرح کے بھیجے۔ ادھر انھیں دردِ گردہ عارض ہُوا، مگر وہ درد کے مچھڑتے ہی اُٹھ بیٹھے اور آٹھ غزلیں تیار کر کے مشاعرے میں آپہنچے۔ پھر اور مشکل مشکل طرحیں مشاعرے کے شاعروں نے بھیجیں اور یہ بھی بے تکلف غزلیں لے کر پہنچے، مگر وہاں کے صاحب کمال خود نہ آئے۔ جب دو تین جلسے اور اس طرح گزرے تو ایک شخص نے سرِ مشاعرہ مصرع طرح دیا۔ وہ مصرع شیخ صاحب کا تھا۔ اس وقت شاہ صاحب سے ضبط نہ ہوسکا۔ مصرع تو لے لیا، مگر اتنا کہا کہ اُن سے کہنا، چکس پر گلدم لڑانے کی صحیح نہیں ہے، پالی میں آیئے کہ دیکھنے والوں کو بھی مزا آئے۔ افسوس ہے کہ اس موقع پر بعض جہلانے، جن سے کوئی زمانہ اور کوئی جگہ خالی نہیں، اپنی یاوہ گوئی سے اہلِ لکھنؤ کی عالی ہمتی اور مہمان نوازی کو داغ لگایا چنانچہ ایک معرکے کے مشاعرے میں شاہ صاحب نے آٹھ غزلیں فرمائش کی کہہ کر پڑھی تھیں۔ ایک غزل اپنی طرح کی کہی ہوئی بھی پڑھی، جس کی ردیف اور قافیہ غسل کی مکھی اور محل کی مکھی تھا۔ اس پر بعض اشخاص نے طنز کی۔ کسی شعر پر یہ کہا کہ سُبحان اللہ کیا خوب مکھی بیٹھی ہے۔ کسی نے کہا کہ حضور! یہ مکھی تو نہ بیٹھی۔ ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ قبلہ! غزل تو خوب ہے، مگر ردیف سے جی متلانے لگا۔ شاہ صاحب نے اسی وقت کہا کہ انھیں چاشنیٔ سخن کا مذاق ہے، وہ تو لطف ہی اُٹھاتے ہیں، ہاں جنھیں صفرائے حسد کا زور ہے اُن کا جی متلائے گا۔

ان جلسوں میں اُستادِ مسلم الثبوت نے علمِ اُستادی بے لاگ بلند کر دیا تھا۔ مگر بعض لغزشوں نے قباحت کی، جن سے کوئی بشر خالی نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ایک جگہ تظلم بجائے تظلم باندھ دیا تھا۔ اسی پر سرِ مشاعرہ گرفت ہوئی اور غضب یہ ہُوا کہ انھوں نے سند میں یہ شعر محتشم کاشی کا پڑھا:

آلِ نبیؐ چو دستِ تظلم بر آورند

ارکانِ عرش را بہ تزلزل در آورند

ایسی بھول چوک سے کوئی اُستاد خالی اور اتنی بات ان کے کمال میں کچھ رخنہ بھی نہیں ڈال سکتی۔ چنانچہ زورِ کلام نے وہیں بیسیوں اشخاص اُن کے شاگرد کر لیے۔ منشی کرامت علی اظہر کہ اوّل اوّل لکھنؤ کی تمام کتب مطبوعہ پر انھیں کی تاریخیں ہوتی تھیں۔ ہمیشہ شاہ صاحب کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔

شاہ صاحب چوتھی دفعہ پھر دکن گئے، مگر اس دفعہ ایسے گئے کہ پھر نہ آئے۔ اُستاد مرحوم کہ شاہ صاحب کی اُستادی کو ہمیشہ زبان ادب سے یاد کرتے تھے، اکثر افسوس سے کہا کرتے تھے

کہ چوتھی دفعہ ادُھر کا قصد تھا، جو سرِ راہ مجھ سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے کہا کہ اب آپ کا سِن ایسے دُور و دراز سفر کے قابل نہیں۔ فرمایا میاں ابراہیم! وہ بہشت ہے بہشت میں جاتا ہوں، چلو تم بھی چلو۔ اُستاد مرحوم عالم تاسّف میں اکثر یہ بھی کہا کرتے تھے، اُن کا ہی مطلع اُن کے حسبِ حال ہُوا ؎

بیاباں مرگ ہے مجنونِ خاک آلودہ تن کس کا
سِیے ہے سوزنِ خارِ مغیلاں تو کفن کس کا

آخر حیدر آباد میں جہانِ فانی سے رحلت اور قاضی مخدوم موسیٰ کی خانقاہ میں دفن ہُوئے شاگرد نے چراغ گل کے الفاظ سے سنہ تاریخ نکالا۔ دیوان اپنا مرتب نہیں کیا۔ جو غزلیں کہتے تھے، ایک ۱۲۵۱ھ جگہ رکھتے جاتے تھے۔ جب بہت سی جمع ہو جاتیں تو تکیے کی طرح ایک تھیلے میں بھرتے تھے۔ گھر میں دے دیتے تھے اور کہتے تھے، احتیاط سے رکھ چھوڑو۔ متفرق غزلیں ایک دو مختصر جلدوں میں تھیں کہ وہ اور بہت سا سرمایہ دکن ہی میں رہا۔ یہاں اِن کی اولاد میں زمانے کی گردش نے کسی کو سر نہ اُٹھانے دیا۔ جو کل کلام کو تہذیب اور ترتیب کرتا۔ شاگردوں کے پاس بہت سی متفرق غزلیں ہیں، مگر کسی نے سب کو جمع نہیں کیا۔ اُن کے دیوان کی ہر شخص کو تلاش ہے، چنانچہ دہلی میں میر حسن تسکین ایک طباع اور نازک خیال شاعر تھے، اِن کے بیٹے سید عبدالرحمٰن بھی صاحب ذوق اور سخن فہم شخص تھے۔ انھوں نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ ایسا جمع کیا کہ غالباً اِس سے زیادہ ایک جگہ شاہ صاحب کا کلام جمع نہ ہوگا۔ نواب صاحب رام پور نے کہ نہایت قدر دانِ سخن ہیں، ایک رقم معقول دے کر وہ نسخہ منگا لیا۔ غزلیں اکثر جگہ بکثرت پائی جاتی ہیں، مگر قصیدے نہیں ملتے کہ وہ بھی بہت تھے۔ حق یہ ہے کہ غزل کا انداز بھی قصیدے کا زور دکھاتا ہے۔

کلام کو اچھی طرح دیکھا گیا۔ زبان شکوہ الفاظ، چستی ترکیب میں سوداؔ کی زبان تھی اور گرمی و لذت اس میں خداداد تھی۔ انھیں اپنی تشبیہوں اور استعاروں کا دعویٰ تھا اور یہ دعویٰ بجا تھا۔ نئی نئی زمینیں نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے، مگر ایسی سنگلاخ ہوتی تھیں، جن میں بڑے بڑے شہسوار قدم نہ مار سکتے تھے۔ تشبیہ اور استعارہ کو لیا ہے اور نہایت آسانی سے برتا ہے، جیسے اکثر زبردست انشا پرداز ناپسند کر کے کم استعدادی کا نتیجہ نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تشبیہ یا استعارہ شاعرانہ نہیں، پھبتی ہے، لیکن یہ اُن کی غلطی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کہتے تو کلام سریع الفہم کیونکر ہوتا۔ اور ہم ایسی سنگلاخ زمینوں میں گرم گرم شعر کیونکر سنتے، پھر وہ ہزاروں شاعروں میں خاص و عام کے منہ سے واہ وا کیونکر لیتے؟ بعض الفاظ مثلاً۔ واہ پھر طرے۔ تپیر وغیرہ جو کہ سید انشا اور جرأت تک باقی تھے، وہ انھوں نے ترک کیے، مگر آئے ہے اور جائے ہیں وغیرہ

افعال انھوں نے بھی استعمال کیے۔ علم کے دعویدار شاعران کے کلام کی دھوم دھام کو ہمیشہ کن کن انکھیوں سے دیکھتے تھے اور آپس میں کانا پھوسیاں بھی کرتے تھے، پھر بھی اُن کے زور کلام کو دبا نہ سکتے تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ زور طبع ان کا کسی کے بس کا نہ تھا۔ جن سنگلاخ زمینوں میں گرمی کلام سے وہ مشاعرے کو تڑپا دیتے تھے، اوروں کو غزل پوری کرنی مشکل ہوتی تھی۔ اکثر بزرگ پرانے پرانے مشاق کہ علوم تحصیلی میں ماہر کامل تھے، مثل حکیم ثناء اللہ خاں فراق، حکیم قدرت اللہ خاں شاگرد خواجہ میر درد، میاں شکیبا شاگرد میر، مرزا عظیم بیگ اور شیخ ولی اللہ محب شاگرد سودا، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان وغیرہ موجود تھے۔ سب ان کے دعوے سنتے تھے اور بعض موقع پر اپنی بزرگی سے ان کی طنزوں کی برداشت کرتے تھے، مگر خاموش نہ رہ سکتے تھے۔

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم سے ایک خاص معاملہ درمیان آیا۔ کہ ایک دفعہ مشاعرے میں طرح ہوئی، یار شتاب اور تلوار شتاب، شاہ نصیر نے جو غزل کہہ کر پڑھی تو اس میں قطعہ تھا کہ:۔

رُخ انور کا ترے وصف لکھا جب ہم نے ۔۔۔ انوری نے دیا دیواں اُلٹ اے یار شتاب

پھر پڑھا ہم نے جو مضمونِ بیاضِ گردن\
سن اُسے ہو گیا چپ قاسم انوار شتاب

حکیم صاحب مرحوم خاص و عام میں واجب تعظیم تھے، اس کے علاوہ فضیلت علمی کے ساتھ فن شعر کے مشاق تھے اور فقط موزونی طبع اور زور کلام کو خاطر میں نہ لاتے تھے، چونکہ خود قاسم تخلص کرتے تھے۔ اس لیے قاسم انوار کا لفظ ناگوار ہوا۔ چنانچہ دوسرے مشاعرے کی غزل میں قطعہ لکھا:

واسطے انساں کے انسانیت اوّل شرط ہے ۔۔۔ میر ہو یا میرزا ہو، خاں ہو یا نواب ہو\
آدمی تو کیا خدا کو بھی نہ ہم سجدہ کریں ۔۔۔ گر نہ خم تنظیم کو پہلے سر محراب ہو

شاہ صاحب کی بدیہہ گوئی اور طبع حاضر نے خاص و عام سے تصدیق و تسلیم کی سند لی تھی اور وہ ایک اصلی جوش تھا کہ کسی طور فرو ہوتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ شعر کہنے سے کبھی تھکتے نہ تھے اور کلام کی چستی میں سستی نہ آتی تھی۔ اکثر مشاعروں میں اوروں کے غزل پڑھتے پڑھتے اشعار برجستہ موزون کر کے غزل میں داخل کر لیتے تھے۔ طبع موزوں گویا ایک درخت تھا کہ جب اس کی ٹہنی ہلاؤ، فوراً پھل جھڑ پڑیں گے۔ وہ نہایت جلد اصلاح دیتے تھے اور برجستہ اصلاح دیتے تھے۔ طبیعت میں تیزی بھی غضب تھی۔ عین مشاعرے میں کسی کا شعر سنتے اور وہیں بول اُٹھتے کہ یوں کہو۔ کہنے والا مُنہ دیکھتا رہ جاتا۔ یہی سبب ہے کہ پرانے پرانے مشاق جھکتے

رہتے تھے۔

پڑھنے کا انداز بھی سب سے الگ تھا اور نہایت مطبوع طبع تھا۔ ان کے پڑھنے سے زورِ کلام دوچند بلکہ دہ چند ہو جاتا تھا، کیونکہ زبان نے بھی زورِ طبعی سے زور اور دل کے جوش سے اثر حاصل کیا تھا۔ ان کی آواز میں بڑھاپے تک بھی جوانی کی کڑک دمک تھی۔ جب مشاعرے میں غزل پڑھتے تو ساری محفل پہ چھا جاتے تھے، اور اپنا کلام انھیں بے اختیار کر دیتا تھا۔ ایک مشاعرے میں غزل پڑھی۔ اس میں جب قطعہ مذکورۂ ذیل پہ پہنچے تو شعر پڑھتے تھے اور مارے خوشی کے کھڑے ہوئے جاتے تھے:

یہ مجنوں ہے نہیں آہو ہے لیلیٰ
پہن کر پوستیں نکلا ہے گھر سے
جنہیں تو سینگ سمجھے ہے، یہ ہیں خار
لگے ہیں پاؤں میں نکلے ہیں سر سے

اُن کا مذہب سنت و جماعت تھا، مگر اس میں کچھ تشدد نہ تھا۔ کئی ترجیع بند اور مناقب جناب امیرؑ کی شان میں موجود ہیں۔ اُن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے، وہ زورِ طبع دکھانے کو یا تحسین و آفرین کے طرّے زیب و دستار کرنے کو نہیں، بلکہ دِلی محبت اور اصلی اعتقاد سے کہا ہے۔ اُن کی خوش اعتقادی کا یہ حال تھا کہ گلی کوچے میں راہ چلتے ہوئے اگر کسی طاق پر تیل لڑی کا سہرا یا کوئی مو کھا لپا ہوا، اس میں پانچ پھول پڑے دیکھتے تو جوتیوں کے اوپر پا برہنہ کھڑے ہو جاتے اور دونوں ہاتھ باندھ کر فاتحہ پڑھتے۔ بعض شاگرد (کہ ہمیشہ چار پانچ ساتھ ہی رہتے تھے) اُن سے پوچھتے کہ اُستاد! کس کی درگاہ ہے؟ فرماتے کہ خدا جانے کس بزرگ کا گزر ہے۔ وہ کہتا کہ حضرت! آپ نے بے تحقیق کیوں فاتحہ پڑھ دی؟ فرماتے کہ بھائی! آخر کسی نے پھول چڑھائے، سہرا باندھا تو یونہی باندھ دیا۔ کچھ سمجھ کر ہی باندھا ہو گا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض دفعہ کسی شاگرد کو معلوم تھا، اُسی نے کہا کہ استاد! میں جانتا ہوں یہ سامنے حلال خور کا گھر ہے اور اس نے اپنے لال بیگ کا طاق بنا رکھا ہے۔ اُس وقت خود ہنس دیتے تھے اور کہتے کہ خیر میں نے کلامِ خدا پڑھا ہے۔ اِس کی برکت ہوائی تو نہیں جا سکتی، جہاں ٹھکانا ہے، وہاں پہنچے گی۔ میرا ثواب کہیں گیا نہیں۔

شاہ صاحب نہایت نفیس طبع اور لطیف مزاج تھے۔ خوش پوشاک، خوش لباس رہتے تھے اور اس میں ہمیشہ ایک وضع کے پابند تھے، جو کہ دہلی کے قدیم خاندانیوں کا قانون ہے۔ اُن کی وضع ایسی تھی کہ ہر شخص کی نظروں میں عظمت اور ادب پیدا کرتی تھی۔ وہ اگرچہ رنگت کے گورے

نہ تھے، مگر نورِ معنی سر سے پاؤں تک چھایا ہوا تھا۔ بدن چھریرا اور بلند قامت تھے۔ جس قدر ریش مبارک مختصر اور وجاہت ظاہری کم تھی، اُس سے ہزار درجہ زیادہ خلعتِ کمال نے شان و شوکت بڑھائی تھی۔ بعض معرکوں یا بعض شعروں میں وہ اس بات پر اشارہ کرتے تھے تو ہزار حُسن قربان ہوتے تھے۔ بعض لطائف میں اس کا لطف حاصل ہوگا۔

شاہ صاحب باوجودیکہ اس قدر صاحبِ کمال اور محفلوں میں اعزاز و اکرام کے صدر نشین تھے، اس پہ نہایت خوش مزاج اور یار باش تھے۔ بوڑھوں میں بوڑھے، بچوں میں بچے بن جاتے تھے۔ ہر ایک میلے میں جا کر تلاش مضامین کرتے تھے اور فکرِ سخن سے جو دل کملا جاتا ہے، اُسے تر و تازہ اور شاداب کرتے تھے۔

لطیفہ:۔ اُستاد مرحوم فرماتے تھے، ایک دفعہ بھولو شاہ کی بسنت میں شاہ صاحب آئے۔ چند شاگرد ساتھ تھے۔ انھیں لے کر تیس ہزاری باغ کی دیوار پر بیٹھے اور تماشا دیکھنے لگے۔ کسی رنڈی نے بہت سا روپیہ لگا کر نہایت زرق برق کے ساتھ ایک کارچوبی رتھ بنوائی تھی۔ شہر میں جابجا اُس کا چرچا ہو رہا تھا۔ رنڈی رتھ پر بیٹھی چھم چھم کرتی سامنے سے نکلی۔ ایک شاگرد نے کہا کہ اُستاد اِس پہ کوئی شعر ہو، اُسی وقت فرمایا:

اُس کی رتھ کا کلس طلائی دیکھ
شب کہا ماہ سے یہ پروین نے
بہر پرواز یہ نکالی ہے
چونچ بیضے سے مرغِ زرّیں نے

لطیفہ:۔ ایک ایسے ہی موقع پہ کوئی رنڈی سامنے سے نکلی۔ اُس کے سر پہ اُودی رضائی تھی۔ اور وسمے کی جھمک عجیب لطف دکھاتی تھی۔ ایک شاگرد نے پھر فرمائش کی۔ انھوں نے کہا:

اُودی وسمے کی نہیں تیری رضائی سر پہ
مہ جبیں رات ہے تاروں بھری چھائی سر پہ

اگرچہ شاہ صاحب کے لیے اقبال نے فارغ البالی کا میدان وسیع رکھا تھا، مگر اُن کی عادت تھی کہ ہر ایک شاگرد سے کچھ نہ کچھ فرمائش بھی ضرور کر دیتے تھے۔ مثلاً غزل کو اصلاح دینے لگے قلمدان سے قلم اُٹھاتے اور کہتے، میاں کشمیر کے قلمدان کیا کیا خوب آیا کرتے تھے۔ خدا جانے کیا ہوگیا، اب تو آتے ہی نہیں۔ بھلا کوئی نظر چڑھے تو لانا۔ اسی طرح کسی ایک سے چاقو کی فرمائش، کبھی کوئی آسودہ حال شاگرد ہوتا۔ اور آپ کپڑے پہننے لگتے تو کہتے کہ ڈھاکے کی ململ،

جو پہلے آتی تھی، وہ اب دکھائی ہی نہیں دیتی۔ صاحب! ہمیں تو یہ انگریزی ململ نہیں بھاتی، میاں کوئی تھان نظر چڑھے تو دیکھنا۔

بعض دوستوں نے تعجباً پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ فرمایا کہ روز واہیات بکواسیں کاغذ پر لکھتے ہیں اور آ کر میری چھاتی پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اِس فرمائش کا اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ روز کے آنے والے چوتھے دن غزل لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس کام کو انسان کچھ خرچ کر کے سیکھتا ہے اُس کی قدر بھی ہوتی ہے۔ اور شوق بھی پکا ہوتا ہے اور جو کچھ لکھتا ہے، جا لکھا ہی سے لکھتا ہے اس کا تو اُدھر وہ فائدہ ہوا، میرا یہ فائدہ ہُوا، لے آیا تو چیز آ گئی، نہ لایا تو میرا پیچھا چھُوٹا۔ جب کوئی واقعہ قابلِ یادگار شہرت پاتا۔ تو اس پر بھی شاہ صاحب کچھ نہ کچھ ضرور کہا کرتے تھے۔ چنانچہ مولوی اسمٰعیل صاحب نے جب جہاد میں شکست کھائی اور دلّی میں خبر آئی، تو انھوں نے اس موقع پر ایک طولانی قصیدہ کہا، تین شعر اُس میں سے اس وقت یاد ہیں:

کلام اللہ کی صورت ہُوا دل اُن کا سیپارہ
نہ یاد آئی حدیث اُن کو نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدانِ دغا میں چوکڑی بھُولے
اگرچہ تھے دُمِ شملہ سے وہ شیرِ نیستانی

مولوی صاحب کے طرفدار مجاہدوں کا دِلّی میں لشکر تھا۔ بہت سے بہادروں نے آ کر شاہ صاحب کا گھر گھیر لیا۔ مرزا خانی کوتوالِ شہر تھے وہ سنتے ہی دوڑے اور آ کر بچایا۔ شاہ صاحب نے اشعار مذکور کو قصیدہ کر دیا۔ اور کوتوال صاحب کا بہت شکریہ ادا کیا۔ ایک شعر اس میں میں کا بھی خیال میں ہے:

نصیر الدین بے چارہ تو رستہ طوس کا لیتا
نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی

لطیفہ:۔ ایک دفعہ کئی بادشاہی گاؤں سرکش ہو گئے۔ شاہ نظام الدین کہ شاہ جی مشہور تھے۔ اور دربار میں مختار تھے، فوج لے کر گئے اور ناکام پھرے۔ اِن کی نوکری میں بادشاہی نوکروں نے تکلیف پائی تھی۔ اس پر بھی شاہ نصیر نے ایک نظم لکھی، جس کا مطلع یہ تھا:

کیا پوچھتے ہو یارو، بیٹھے تھے زہر کھائے
شکرِ خدا کہ بارے پھر شاہ صاحب آئے

لطیفہ:۔ دلّی میں ایک منشی ہندو تھے، بچیا نام رنڈی پر مسلمان ہو گئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا:

جس طرف تُو نے کیا اک اشارہ، نہ جیا
نجیا آہ تری چشم کا مارا نہ جیا

لطیفہ:۔ عیسیٰ خاں اور موسیٰ خاں دو بھائی دِلّی میں تھے۔ مال و دولت کی بابت دونوں میں جھگڑا ہُوا۔ عیسیٰ خاں ناکام ہوئے۔ موسیٰ خاں نے کچھ عدالت کے زور سے کچھ حکمت عملی سے سارا مال مار لیا۔ شاہ صاحب نے بطور ظرافت چند شعر کا قطعہ کہا۔ ایک مصرع یاد ہے اور وہی قطعے کی جان ہے ؎ ہوئی آفاق میں شہرت کہ عیسیٰ خاں کا گھر موسا۔ لُطف یہ کہ دونوں بھائی شاعر تھے۔ ایک کا تخلص آفاق دوسرے کا شہرت تھا۔ اُن میں سے کسی بے مغز نے کچھ واہیات لکھا تھا۔ شاہ صاحب کے بزرگوں کی خوبیاں بیان کر کے خود ان کی شکایت کی تھی اور چونکہ روشن پورہ میں رہتے تھے، اس کا اشارہ کر کے کہا تھا ؎

بعد اُن سب کے شاہ صاحب نے
خوب روشن پورہ کیا روشن

مرزا مغل بیگ نے خدمتِ وزارت میں نوکرانِ شاہی کو ناخوش کیا۔ اس موقع پر ہر ایک شخص نے اپنے اپنے حوصلے کے بموجب دل کا بُخار نکالا۔ ایک صاحب نے تاریخ کہی:

ہنس کے ہاتف نے کہا اس کو کہ واہ
کیا ہی انٹی میں وزارت آگئی

شاہ صاحب نے بھی ایک قطعہ کہا اُس کے دو شعر یاد ہیں:

تانے بانے پر نہ کر دُنیا کے ہرگز اعتبار
غور کر چشمِ حقیقت سے کہ سر پر کُوچ ہے
توڑ کر تو اس طرف سے اِس طرف کو جوڑ لے
تُو تو مومن ہے وگرنہ مومنوں کی پُوچ ہے

شاہ نصیر مرحوم اور شیخ ابراہیم ذوق سے بھی معرکے ہوئے ہیں، دیکھو اُن کے حال میں۔

لطیفہ:۔ دکن کی سرکار میں دستور تھا کہ دن رات برابر کاروبار جاری رہتے تھے۔ مختلف کاموں کے وقت مقرر تھے۔ جس صیغے کا دربار ہو چکا۔ اس کے متعلق لوگ رُخصت ہوئے، دوسرے صیغے کے آن حاضر ہوئے۔ اسی میں صاحبِ دربار نے اُٹھ کر ذرا آرام لے لیا۔ ضروریات سے فارغ ہوئے اور پھر آن بیٹھے۔ چنانچہ مشاعرے اور مناظرے کا دربار رات کے پچھلے پہر ہوتا تھا۔ ایک موقع پر کہ نہایت دھوم دھام کا جلسہ تھا، تمام با کمال اہلِ دکن اور اکثر اہلِ ایران موجود تھے۔ سب کی طبیعتوں نے اپنے اپنے جوہر دکھائے۔ خصوصاً چند شعرائے ایران نے ایسے ایسے

قصائد سنائے کہ لب و دہن پر حرف آفرین نہ چھوڑا۔ شاہ نصیر کی حسن رسائی اور اخلاق نے دربار کے چھوٹے بڑے سب تسخیر کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ شمع قریب پہنچی تو ایک خواص نے کہ سونے کا عصا ہاتھ میں۔ ہزار بارہ سو کا دوشالہ کندھے پر ڈالے کھڑا تھا، کان میں جھک کر کہا کہ آج غزل نہ پڑھیں تو بہتر ہے۔ آپ وہیں بگڑ کر بولے کہ کیوں! اُس نے کہا کہ ہوا تیز ہو گئی (یعنی کلام کا سرسبز ہونا مشکل ہے) یہ خفگی سے ٹھوڑی پر ہاتھ پھیر کر بولے کہ ایسا تو میں خوبصورت بھی نہیں کہ کوئی صورت دیکھنے کو نوکر رکھے گا۔ یہ نہیں تو پھر میں ہوں کس کام کا؟ اس قیل و قال میں شمع بھی سامنے آگئی۔ پھر جو غزل سنائی تو سب کو لُٹا دیا ؎

لطیفہ:۔ قطع نظر اس سے کہ شعر کے باب میں طبع حاضر رکھتے تھے، حاضر جوابی میں برق تھے۔ چنانچہ ایک دن سلطان جی کی سترھویں میں گئے۔ اور باؤلی میں جا کر ایک طاق میں بیٹھ گئے۔ حقہ پی رہے تھے کہ اتفاقاً ایک نواب صاحب آنکلے۔ شاہ صاحب سے صاحب سلامت ہوئی۔ وہیں بہت سی ارباب نشاط بھی حاضر تھیں اور ناچ ہو رہا تھا۔ اُس عالم زرق برق پر اشارہ کر کے نواب صاحب نے فرمایا۔ کہ اُستاد آج آپ بھی بالائے طاق ہیں۔ بولے۔ جی ہاں جفت ہونے کو بیٹھا ہوں، آئیے، تشریف لائیے ؎

لطیفہ: ایک دن دکن کو چلے۔ نواب جھجھر مدت سے بلاتے تھے۔ اب چونکہ مقام مذکور سرِ راہ تھا۔ اور گرمی شدت سے پڑتی تھی۔ برابر سفر بھی مشکل تھا، اس لیے وہاں گئے اور کئی دن مقام کیا۔ جب چلنے لگے تو رخصت کی ملاقات کو گئے۔ نواب نے کہا کہ گرمی کے دن ہیں، دکن کا سفر دُور دراز کا ہے۔ خدا خیر و عافیت سے لائے، مگر وعدہ فرمائیے کہ اب جھجھر میں کب آئیے گا۔ ہنس کر بولے کہ جھجھر کی چاہ تو وہی گرمی میں ؎

شاہ صاحب کا ایک مشہور شعر ہے:

چرائی چادرِ مہتاب شب مے کش نے جیحوں پر
کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

نواب سعادت یار خاں رنگیں مجالس رنگین میں فرماتے ہیں کہ ایک جلسے میں اس شعر کی بڑی تعریف ہو رہی تھی۔ میں نے اس میں اصلاح دی کہ ع چرائی چادرِ مہتاب شب بادل نے، جیحوں پر، ہو تو اچھا ہے۔ سبب یہ کہ جب بادل چاند پر آتا ہے، تو چادر مہتاب نہیں رہتی، گویا چوری جاتی ہے۔ یہاں چور تو زمین پر ہے اور مضمون عالم بالا پر قصّہ زمین پر سر زمین ہوتا ہے، عالم بالا کے لیے چور بھی آسمانی ہی چاہیے۔ کسی شخص نے شاہ صاحب سے بھی جا کر کہا۔ وہ بہت خفا ہوئے اور کہا کہ نواب زادہ ہونا اور بات ہے اور شاعری اور بات ہے۔ خاں صاحب

یہ خبر سُن کر شاہ صاحب کے پاس گئے اور معذرت کی ۔

مگر میرے نزدیک شاہ صاحب نے کچھ نامناسب نہیں کہا۔ چاند آسمان پر ہوتا ہے، چاندنی زمین پر ہوتی ہے اور چاندنی کا لطف میکش اُڑاتا ہے، بادل کیا اُڑائے گا اور میکش نہ ہوگا تو شعر غزلیت کے رتبے سے گر جائے گا ۔

لطیفہ :۔ دیہات جاگیر کے تعلق سے ایک دفعہ تحصیل دار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے۔ اور کچھ زنگترے دِلّی سے بطور سوغات ساتھ لے گئے۔ تحصیلدار نے کہا کہ جناب شاہ صاحب! زنگتروں کی تکلیف کیا ضرور تھی آپ کی طرف سے بڑا تحفہ آپ کا کلام ہے۔ اِن زنگتروں کی حسن تشبیہ میں کوئی شعر ارشاد فرمایئے۔ اُسی وقت رُباعی کہی اور سُنائی :

اے بر بُرجِ آسمانِ اقبال    اِن زنگتروں پر غور سے کیجئے گا خیال
یہ نذرِ حقیر ہو قبولِ خاطر
پردے ہیں شفق کے ہیں گرہ بند ہلال

# غزلیں

زیبِ تن گرچہ ہے گُل پیرہن سُرخ ترا    لیکن انجام یہ ہوگا کفنِ سُرخ ترا
مجھ کو کہتا ہے وہ نِکلا ہے شفق میں یہ ہلال    یا نمودار ہے زخمِ کہن سُرخ ترا
دسترس پاؤں تک اس شوخ کے تجھ کو ہے یہاں    کیونکہ رُتبہ نہ ہو اے گلبدن سُرخ ترا
شیشۂ بادۂ گُل رنگ ٹپک دے ساقی    جامۂ سبز میں دیکھے جو تن سُرخ ترا
آستیں سے یہ لگا کہنے وہ تلوار کو پونچھ    بن گیا موجِ یم خوں شکن سُرخ ترا
رشکِ شلیم ہی نہیں رنگ مسی کی یہ نمود    لب بھی ہے غیرتِ لعلِ یمن سُرخ ترا
سچ بتا تو مجھے سوفارِ خدنگ قاتل    لہو کس کِس کا پیئے گا دہن سُرخ ترا
خاک باہم ہو شرارت سے ہم آغوش نصیر
صاف ہے شعلۂ آتش بدنِ سُرخ ترا

خالِ پشتِ لبِ شیریں ہے عسل کی مکھی    روحِ فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی
سنگ و خشتِ در و دیوار افتادہ کو دیکھ    ہاتھ ملتی ہے پتھوڑا کے محل کی مکھی
بن گیا ہوں میں خیالِ کمرِ یار میں مور    نہ ترے زور کی طاقت ہے نہ بل کی مکھی
تیرہ بختانِ ازل کا کبھی دیکھا نہ فروغ    شب کو جگنو کی طرح اُڑ کے نہ جھلکی مکھی

بیٹھنے سے ترے ہم سمجھے لبِ یار کو قند
بات مشکل تھی مگر تُو نے یہ حل کی مکھی

اُن کو کیا کام توکّل سے جو بن جاتے ہیں
غالبِ بریانی پہ ہر اہلِ دول کی مکھی

ہو گیا ہے یہ تری چشم کا بیمار نحیف
نہ اُڑا سکتا ہے منہ کی نہ بغل کی مکھی

ریس پروانۂ جانسوز کی کرتی تو ہے پر
نگہِ شمع میں ہو جائے گی ہلکی مکھی

صنعتِ لعبتِ چین دیکھ دلا جا کر تو
دیکھنی گر تجھے منظور ہے کل کی مکھی

دل رُبا قہر فسوں ساز ہیں بنگالہ کے
آدمی کو وہ بناتے ہیں عمل کی مکھی

سخن اپنا جو شکر ریزِ معانی ہے نصیرؔ
ہے ردیف اس لیے اس شعرِ غزل کی مکھی

سدا ہے اس آہ و چشمِ تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
نکل کے دیکھو ٹک اپنے گھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

وہ شعلہ رُو ہے سوار توسن اور اُس کا توسن عرق فشاں ہے
عجب ہے اک سیرِ دوپہر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

ہنسے ہے کوٹھے پہ یوسف اپنا میں زیرِ دیوار رو رہا ہوں
عزیزو دیکھو مری نظر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

فلنگ کیونکر نہ ہووے حیراں کہ شمع سب کو دکھا رہی ہے
بچشمِ گریاں و تاجِ زر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

نہا کے افشاں چُنو جبیں پر نچوڑو زلفوں کو بعد اس کے
دکھاؤ عاشق کو اس ہُنر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

کہاں ہے جوں شعلہ شاخ پر گُل کدھر ہے فصلِ بہار شبنم
نیا ہے اعجاز طرفہ تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

کرو نہ دریا پہ مے کشی تم ادھر کو آؤ تو میں دکھاؤں
سرشک و ہر نالۂ جگر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

کدھر کو جاؤں نکل کے یارب کہ گرم و سیر در زمانہ مجھ کو
دکھائے ہے شام تک سحر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

وہ تیغ کھینچے ہوئے ہے سر پہ میں سر جھکا کے ہوں اشک ریزاں
دکھاؤں اے دل تجھے کدھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

غضب ہے چیں پر جبیں وہ کیا ہے بدن سے ٹپکے بھی ہے پسینہ
عیاں ہے یارو نئے ہنر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

نصیرؔ لکھی ہے کیا غزل یہ کہ دل تڑپتا ہے سُن کر جس کو
بندھے ہے کب یوں کسی بشر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

نہاں ہے کب چشمِ ہر بشر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
ہے اس نگہ سے اس اشکِ تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

دکھا کے تم شرر نشیں یہ جلوہ جو دیکھو فوّارے کا تماشا
تو یہ صدا آئے بام و در سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

وہ مہروش پشتِ فیل پر ہے اور اس کی خرطوم آب افشاں
عجب ہے تشبیہ جلوہ گر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

وہ طفل ترسا جبیں پہ قشقہ جو کھینچ سورج کو دیوے پانی
تو کیوں نہ دل دیکھنے کو ترسے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

دوپٹہ سر پر ہے بادلے کا گلاب پاش اُس کے ہاتھ میں ہے
نہ کیونکہ چمکے نہ کیونکہ برسے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

وہاں وہ غرفے میں تابِ رُخ ہے یہاں یہ ابرِ مژہ پُرنم ہے
یہ حُسن الفت کے ہے ثمر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

عجب ہے کچھ ماجرا یہ ساقی کہ غل مچایا ہے مے کشوں نے
مدام یاں دیکھ ابرِ تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

وہ شوخ جھرنے سیر کرکے پھسلنے پتھر پہ جا کے بیٹھا
پکاری خلقت اِدھر اُدھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ بالا

نصیرؔ صد آفریں ہے تجھ کو کہ اہلِ معنی پکارتے ہیں
عجب ہے مضمون تازہ تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

لَو لگ رہی ہے جس سے وہ شمع رُو نہ آیا
بل بے تری شرارت یاں تک کبھو نہ آیا

ہو اس دہن سے رَوِشِ سیلی صبا کی کھائی
غنچے کے آہ منہ سے کس دن لہو نہ آیا

دنداں دکھا کے مت ہنس اے بخیۂ گریباں
چاکِ جگر کا ہم کو طورِ رفو نہ آیا

کیا جانے یہ گیا تھا کس منہ سے روکشی کو
آئینہ واں سے لے کر خاک آبرو نہ آیا

برگشتہ بخت ہم وہ اس دَور میں ہیں ساقی
لب تک کبھو ہمارے جام و سبو نہ آیا

موجِ سرشک سے ہے رونق قبائے تن کی
کیونکر کہوں کہ اس کو کارِ اتو نہ آیا

آخر کو کہکشاں ہے یکسر وہ مانگ نکلی
اس بات میں ہماری فرق یک مُو نہ آیا

کشتیٔ دل تو دائم موجِ خطر میں ڈوبی
چیں بر جبیں ہو کس دن وہ رُو برو نہ آیا

کیونکر یہ ہاتھ اپنے پہنچے گا تا گریباں
دستِ خیال جس کے دامن کو چھو نہ آیا

اپنی بھی بعد مجنوں یارو ہوا بندھی ہے
لے گرد بادِ خیمہ کب کو بکو نہ آیا

نامحرموں سے تم نے کھلوائے بندِ محرم
میں تو بھی آہ لے کر کچھ آرزو نہ آیا

ہر دم نصیرؔ رہ تو اُمیدوارِ رحمت
تیری زباں پہ کس دن لاتقنطو نہ آیا

اے اشکِ رواں ساتھ لے آہِ جگری کو
عاشق کہیں بے فوجِ علَم اُٹھ نہیں سکتا

سقفِ فلکِ کہنہ میں کیا خاک لگاؤں
اے ضعفِ دل اس آہ کا تھم اُٹھ نہیں سکتا

سر معرکۂ عشق میں آسان نہیں دینا
گاڑے ہے جہاں شمع قدم اُٹھ نہیں سکتا

ہے جنبشِ مژگاں کا کسی کی جو تصوّر
دل سے خلشِ خارِ الم اُٹھ نہیں سکتا

دل پر ہے مرے خیمہ ہر آبلہ اُستاد
کیا کیجئے کہ یہ لشکرِ غم اُٹھ نہیں سکتا

ہر جا متجلّی ہے وہی، پردۂ غفلت
اے معتکفِ دیر و حرم اُٹھ نہیں سکتا

یوں اشک زمیں پر ہیں کہ منزل کو پہنچ کر
جوں قافلۂ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

شب کو کیونکہ تجھ کو ہے پھبتا سر پہ طرہ ہار گلے میں
جوں پہ دین دہاڑ مہ تھا سر پہ طرہ ہار گلے میں

رونق سریاں داغِ جنوں ہے اشکِ مسلسل زیبِ گلو ہے
چاہیئے تجھ کو غیرتِ لیلا سر پہ طرہ ہار گلے میں

شعلہ کہاں آنسو ہیں کدھر شب شمع رکھے تھی محفل میں
تاج اور زر اور موتیوں کا سا سر پہ طرہ ہار گلے میں

بال پریشاں ہیں کاکل کے پیچ گلے میں ہیں پگڑی کے
یوں رکھتا ہے وہ متوالا سر پہ طرہ ہار گلے میں

حق میں ہے میرے طائرِ دل کے باز کا چنگل دام کا حلقہ
اے بُت کافر مجکو دکھلا سر پہ طرہ ہار گلے میں

شملے اور تسبیح کے بدلے شیخ جی صاحب رکھنے لگے ہیں
کیونکہ نہ دیکھیں رند تماشا سر پہ طرہ ہار گلے میں

رشکِ چمن تو سیر کریگا جبکہ کنارہ حوض ولبِ جُو
فوارہ اور پھول رکھے گا سر پہ طرہ ہار گلے میں

عکس شعاعِ مہر نہیں یہ بیل چنبیلی کی لپٹی ہے
سروِ چمن نے کیا ہے پیدا سر پہ طرہ ہار گلے میں

کیفیت کیا ہو بن ساقی سوئے چمن طاؤس اور قمری
ابر و ہوا میں رکھیں ہیں تنہا سر پہ طرہ ہار گلے میں

ہے یہ تمنا میرے جی میں یوں تجھے دیکھوں بادہ کشی میں
ہاتھ میں ساغر بر میں مینا سر پہ طرہ ہار گلے میں

اور بدل کے ردیف قوافی لکھیئے غزل اس بحر میں جلدی
تم نے نصیر اب خوب بٹھایا سر پہ طرہ ہار گلے میں

وقتِ نماز ان کا قامت ہے گاہ خدنگ و گاہ کماں
بن جاتے ہیں اہلِ عبادت گاہ خدنگ و گاہ کماں

مرد جوانی میں تو ہے سیدھا پیری میں جھک جاتا ہے
قوت و ضعف کی ہے یہ علامت گاہ خدنگ و گاہ کماں

بادہ کشی کے سکھلاتے ہیں کیا ہی قرینے ساون بھادوں
کیفیت کے ہم نے جو دیکھا دو ہیں مہینے ساون بھادوں

چھوٹتے ہیں فوارہ مژگاں روز و شب اِن آنکھوں سے
یوں نہ برستے دیکھے ہونگے مل کے کسی نے ساون بھادوں

ٹانکنے کو پھرتی ہے بجلی اس میں گوٹ تمامی کی
دامنِ ابر کے ٹکڑوں کو جب لگتے ہیں سینے ساون بھادوں

بھولے دم کی آمد و شد ہم یاد کر اس جھولے کی پینگیں
سُوجھے ہے بے یار نہ دینگے آہ یہ جینے ساون بھادوں

کیونکہ نہ یہ دُر ہائے تگرگ اے بادہ پرستو برسائیں
کان گہر چھیٹ زر کے رکھتے ہیں گنجینے ساون بھادوں

کانِ جواہر کیونکہ نہ سمجھے کھیت کو دہقاں اولوں سے
برساتے ہیں موتیوں میں ہیرے کے نگینے ساون بھادوں

ابرِ سیہ میں دیکھی تھی بگلوں کی قطار اس شکل ہے ہم نے
یاد دلائے پھر کے ترے دندانِ مسی نے ساون بھادوں

---

# مومن خاں صاحب مومنؔ

## تمہید

پہلی دفعہ اس نسخے میں مومنؔ خاں صاحب کا حال نہ لکھا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ دَورِ پنجم جس سے اِن کا تعلق ہے، بلکہ دَورِ سوم و چہارم کو بھی اہلِ نظر دیکھیں کہ جو اہل کمال اس میں بیٹھے ہیں، کس لباس و سامان کے ساتھ ہیں۔ کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اُسی سامان و شان اور وضع و لباس کے ساتھ ہو، جو اہل محفل کے لیے حاصل ہے۔ نہ ہو تو ناموزون معلوم ہوتا ہے۔ خاں موصوف کے کمال سے مجھے انکار نہیں۔ اپنے وطن کے اہل کمال کا شمار بڑھا کر اور ان کے کمالات دکھا کر ضرور چہرۂ فخر کا رنگ چمکاتا، لیکن میں نے ترتیب کتاب کے دنوں میں اکثر اہل وطن کو خطوط لکھے اور لکھوائے۔ وہاں سے صاف جواب آیا۔ وہ خط بھی موجود ہیں۔ مجبور ان کا حال قلم انداز کیا۔ دُنیا کے لوگوں نے اپنے اپنے حوصلے کے بموجب جو چاہا سو کہا، آزادؔ نے سب کی عنایتوں کو دامن پھیلا کر لے لیا۔ ذوقؔ

دو گالیاں کہ بوسہ خوشی پر ہے آپ کی
رکھتے فقیر کام نہیں ردّ و کد سے ہیں

البتہ افسوس اس بات کا ہے کہ بعض اشخاص جنھوں نے میرے حال پر عنایت کر کے حالات مذکورہ کی طلب و تلاش میں خطوط لکھے اور سعی ان کی ناکام رہی۔ انھوں نے بھی کتاب مذکور پر ریویو لکھا، مگر اصل حال نہ لکھا، کچھ کچھ اور ہی لکھ دیا۔ میں نے اُسی وقت دہلی اور اطراف دہلی میں ان اشخاص کو خطوط لکھنے شروع کر دیئے تھے، جو خاں موصوف کے خیالات سے دل گلزار رکھتے ہیں۔ اب طبع ثانی سے چند مہینے پہلے تاکید و التجا کے نیاز ناموں کو جولانی دی۔ انہی میں سے ایک صاحب کے الطاف و کرم کا شکر گذار ہوں جنھوں نے باتفاق احباب اور صلاح ہمدگر جزئیات احوال فراہم کر کے چند ورق مُرتب کیے اور عین حالتِ طبع میں یہ کتاب مذکور قریب الاختتام ہے، مع ایک مراسلے کے عنایت فرمائے بلکہ اس میں کم و بیش کی بھی اجازت دی۔ میں نے فقط بعض فقرے کم کیے، جن سے طول کلام کے سوا کچھ فائدہ نہ تھا۔ اور بعض عبارتیں اور بہت سی روایتیں مختصر کر دیں یا چھوڑ دیں، جن سے اُن کے نفس شاعری کو تعلق نہ تھا۔ باقی اصل کو بجنسہٖ لکھ دیا۔ آپ ہرگز دخل و تصرف نہیں کیا۔ ہاں کچھ کہنا ہُوا تو حاشیے پر خط وحدانی میں لکھ دیا۔ جو احباب پہلے شاکی تھے، اُمید ہے کہ اب اس فرد گذاشت کو معاف فرمائیں گے؛

## مومن خاں صاحب کا حال

ان کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں شہر کے شرفا میں سے تھے (جن کی اصل نجباے کشمیر سے تھی)

اوّل حکیم نامدار خاں اور حکیم مدار خاں دو بھائی سلطنتِ مغلیہ کے آخری دَور میں آ کر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے میں موضع بلاہہ وغیرہ پرگنہ نارنول میں جاگیر پائی جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست فیض طالب خاں کو عطا فرمائی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا۔ رئیس مذکور نے اِن کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن ورثہ حکیم نامدار خاں کے نام مقرر کر دی۔ پنشن مذکور میں سے حکیم غلام نبی خاں صاحب نے اپنا حصّہ لیا اور اس میں سے حکیم مومن خاں صاحب نے اپنا حق پایا۔ اس کے علاوہ اِن کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی۔ اس سے ایک چوتھائی اِن کے والد کو اور اُن کے بعد اُس میں سے اُن کو حصّہ ملتا رہا۔

اِن کی ولادت ۱۲۱۵ھ میں واقع ہوئی۔ بزرگ جب دلّی میں آئے تو چیلوں کے کوچے میں رہے تھے۔ وہیں خاندان کی سکونت رہی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ وہاں سے بہت قریب تھا۔ اِن کے والد کو شاہ صاحب سے کمال عقیدت تھی۔ جب یہ پیدا ہوئے تو حضرت ہی نے آ کر کان میں اذان دی اور مومن خاں نام رکھا۔ گھر والوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور حبیب اللہ نام رکھنا چاہا، لیکن شاہ صاحب کے نام سے نام پایا۔

بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پہنچایا۔ اُن سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے۔ حافظے کا یہ حال تھا کہ جو باتیں شاہ صاحب سے سُنتے تھے، فوراً یاد کر لیتے تھے۔ اکثر شاہ عبدالعزیز صاحب کا وعظ ایک دفعہ سُن کر بعینہٖ اُسی طرح ادا کر دیتے تھے۔ جب عربی میں کسی قدر استعداد ہو گئی تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انھیں کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔

تیز طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک فن پر دل نہیں جمتا، اس نے بزرگوں کے علم یعنی طبابت پر پاؤں تھمنے نہ دیا۔ دل میں طرح طرح کے شوق پیدا کیے۔ شاعری کے علاوہ نجوم کا خیال آیا۔ اس کو اہلِ کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچائی۔ اُن کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سُن سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے۔ پھر برس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور ان کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا، نہ زائچہ کھینچتے، نہ تقویم دیکھتے۔ پوچھنے والے سے کہتے کہ تم خاموش رہو، جو میں کہتا جاؤں، اُس کا جواب دیتے جاؤ۔ پھر مختلف باتیں پوچھتے تھے اور سائل اکثر تسلیم کرتا جاتا تھا۔ ایک دن ایک غریب ہندو نہایت بیقرار اور پریشان آیا۔ اُن کے بیس برس کے رفیق قدیم

شیخ عبدالکریم اُس وقت موجود تھے۔ خاں صاحب نے اُسے دیکھ کر کہا کہ تمھارا کچھ مال جاتا رہا ہے؟ اُس نے کہا، میں لُٹ گیا۔ کہا، خاموش رہو۔ جو میں کہوں اُسے سُنتے جاؤ۔ جو بات غلط ہو، اُس کا انکار کر دینا۔ پھر پوچھا کیا زیور کی قسم سے تھا؟ صاحب! ہاں، وہی عمر بھر کی کمائی تھی۔ کہا تم نے لیا ہے یا تمھاری بیوی نے؟ کوئی غیر چرانے نہیں آیا۔ اُس نے کہا، میرا مال تھا اور بیوی کے پہننے کا زیور تھا، ہم کیوں چراتے؟ ہنس کر فرمایا، کہیں رکھ کر بھول گئے ہوگے، مال باہر کہیں نہیں گیا۔ اُس نے کہا، صاحب! سارا گھر ڈھونڈ مارا، کوئی جگہ باقی نہیں رہی، فرمایا، پھر دیکھو۔ گیا اور سارے گھر میں اچھی طرح دیکھا۔ پھر آکر کہا، صاحب میرا چھوٹا سا گھر ہے، ایک ایک کونا دیکھ لیا، کہیں پتا نہیں لگتا۔ خاں صاحب نے کہا، اُسی گھر میں ہے، تم غلط کہتے ہو۔ کہا، آپ چل کر تلاشی لے لیجئے۔ میں تو ڈھونڈ چکا۔ فرمایا، میں یہاں سے بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر ان کے سارے گھر کا نقشہ بیان کرنا شروع کیا۔ وہ سب باتوں کو تسلیم کرتا جاتا تھا۔ پھر کہا، اس گھر میں جنوب کے رُخ ایک کوٹھڑی ہے اور اس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے۔ اُس کے اوپر مال موجود ہے، جا کر لے لو۔ اُس نے کہا مچان کو تین دفعہ چھان مارا، وہاں نہیں ملا۔ فرمایا، اُسی کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ غرض وہ گیا اور جب روشنی کر کے دیکھا تو ڈبّا اور اس میں سارا زیور جوں کا توں وہیں سے مل گیا۔

ایک صاحب کا مراسلہ اسی تحریر کے ساتھ پہنچا ہے، جس میں یہ اور اس قسم کے کئی اسرار نجومی ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں اور ان کے شاگردوں کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ آزادؔ ان کے درج کرنے میں قاصر ہے، معاف فرمائیں۔ زمانہ ایک طرح کا ہے، لوگ کہیں گے، تذکرۂ شعرا لکھنے بیٹھا اور نجومیوں کا تذکرہ لکھنے لگا۔

خان صاحب نے اپنی نجوم دانی کو ایک غزل کے شعر میں نہایت خوبی سے ظاہر کیا ہے:

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی۔ جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دُنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی تھی اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے۔ دِلّی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے اور شہر کے ایک دو مشہور شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔

شعر و سخن سے انھیں طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اُسے اور بھی چمکا دیا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیرؔ مرحوم کو اپنا کلام دکھایا، مگر چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینی چھوڑ دی اور پھر کسی کو اُستاد نہیں بنایا۔

ان کے نامی شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ صاحب تذکرہ گلشن بیخار خلف نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں مظفر جنگ بہادر رئیس پلول اور اُن کے چھوٹے بھائی نواب اکبر خاں کو سہ برس ہوئے راولپنڈی میں دُنیا سے انتقال کیا۔ میر حسین تسکین کہ نہایت ذکی الطبع شاعر تھے۔ سید غلام علی خاں وحشت، غلام ضامن کرم۔ نواب اصغر علی خاں کہ پہلے اصغر تخلص کرتے تھے۔ پھر نسیم تخلص اختیار کیا اور مرزا خدا بخش قیصر شہزادے وغیرہ اشخاص تھے۔

رنگین طبع، رنگین مزاج، خوش وضع، خوش لباس، کشیدہ قامت، سبزہ رنگ سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال اور ہر وقت انگلیوں سے اُن میں کنگھی کرتے رہتے تھے۔ ململ کا انگرکھا ڈھیلے ڈھیلے پائچے۔ اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا۔ میں نے انھیں نواب اصغر علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سُنا تھا۔ ایسی دردناک آواز سے دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔ اللہ اللہ اب تک وہ عالم آنکھوں کے سامنے ہے۔ باتیں کہانیاں ہوگئیں۔ باوجود اس کے نیک خیالوں سے بھی اُن کا دل خالی نہ تھا۔ نوجوانی ہی میں مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوئے کہ مولوی اسمٰعیل صاحب کے پیر تھے شفا الصاحب اُنہی کے عقائد کے بھی کے بھی قائل رہے؛

اُنھوں نے کسی کی تعریف میں قصیدہ نہیں کہا۔ ہاں راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ، جو دہلی میں رہتے تھے اور ان کی سخاوتیں شہر میں مشہور تھیں، وہ ایک دن مصاحبوں کے ساتھ سر راہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ خاں صاحب کا اُدھر سے گزر ہوا۔ لوگوں نے کہا مومن خاں شاعر یہی ہیں۔ راجہ صاحب نے آدمی بھیج کر بُلوایا۔ عزت و تعظیم سے بٹھایا (کچھ نجوم کچھ شعر و سخن کی باتیں کیں) اور حکم دیا کہ ہتھنی کس کر لاؤ۔ ہتھنی حاضر ہوئی۔ وہ خان صاحب کو عنایت کی۔ اُنھوں نے کہا کہ مہاراج میں غریب آدمی ہوں، اسے کہاں سے کھلاؤں گا اور کیونکر رکھوں گا۔ کہا کہ سو روپیہ اور دو۔ خاں صاحب اسی پر سوار ہو کر گھر آئے اور پہلے اس سے کہ ہتھنی روپے کھائے، اسے بیچ کر فیصلہ کیا۔ (اسی موقع پر اوج نے کہا تھا۔ دیکھو صفحہ ۴۶۰)

پھر خاں صاحب نے ایک قصیدۂ مدحیہ شکریے میں کہہ کر راجہ صاحب کو دیا، جس کا مطلع ہے:

صبح ہوئی تو کیا ہوا، ہے وہی تیرہ اختری

کثرتِ درد سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

سوا اس قصیدے کے اور کوئی مدح کسی دُنیا دار کے صلہ و انعام کی توقع پر نہیں لکھی۔ وہ اِس قدر غیور تھے کہ کسی عزیز یا دوست کا ادنیٰ احسان بھی گوارا نہ کرتے تھے۔

راجہ کپور تھلہ نے انھیں ساڑھے تین سو روپیہ مہینا کر کے بلایا اور ہزار روپیہ خرچ سفر بھیجا۔ وہ بھی تیار ہوئے، مگر معلوم ہوا کہ وہاں ایک گوییے کی بھی یہی تنخواہ ہے۔ کہا کہ جہاں میری اور ایک گوییے کی برابر تنخواہ ہو وہاں نہیں جاتا۔

جس طرح شاعری کے ذریعے سے اُنھوں نے روپیہ پیدا نہیں کیا، اُسی طرح نجوم، رمل اور طبابت کو بھی معاش کا ذریعہ نہیں کیا۔ جس طرح شطرنج ان کی ایک دل لگی کی چیز تھی اُسی طرح نجوم، رمل اور شاعری کو بھی ایک اور بہلاوا دل کا سمجھتے تھے۔

خاں صاحب پانچ چار دفعہ دہلی سے باہر گئے۔ اوّل رامپور اور وہاں جا کر کہا:

دلّی سے رامپور میں لایا جنوں کا شوق
ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

دوسری دفعہ سہسوان گئے۔ وہاں فرماتے ہیں:

چھوڑ دلّی کو سہسوان آیا
ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

۳- جہانگیر آباد میں نواب مصطفیٰ خاں کے ساتھ کئی دفعہ گئے۔

۴- ایک دفعہ نواب شائستہ خاں کے ساتھ سہارنپور گئے۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دلّی میں جو مُیسّر تھا، اُسی پر قانع تھے، درُست ہے۔ تصدیق اس کی دیکھو غالب مرحوم کے حال میں۔

اُن کی تیزی ذہن اور ذکاوت طبع کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ وہ خود بھی ذہانت میں دو شخصوں کے سوا کسی ہمعصر کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ایک مولوی اسمٰعیل صاحب، دوسرے خواجہ محمد نصیر صاحب کہ ان کے پیر اور خواجہ میر درد کے نواسے تھے۔

اسی سلسلے میں نواب مصطفیٰ خاں کی ایک وسیع تقریر ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ایسا ذکی الطبع آج تک نہیں دیکھا۔ اُن کے ذہن میں بجلی کی سُرعت تھی وغیرہ وغیرہ ساتھ اس کے مراسلت میں بعض اور معاملے منقول ہیں، مگر ان میں بھی واردات کی بنیاد نہیں لکھی۔ مثلاً یہ کہ مولا بخش قلق، مولوی امام بخش صاحب صہبائی کے شاگرد دیوان نظیری پڑھتے تھے۔ ایک دن خاں صاحب کے پاس آئے اور ایک شعر کے معنی پوچھے۔ انھوں نے ایسے نازک معنی اور نادر مطلب بیان فرمائے کہ قلق معتقد ہو گئے اور کہا کہ مولوی صاحب نے جو معنی بتائے ہیں، وہ اس سے کچھ نسبت نہیں رکھتے، لیکن نہ وہ شعر لکھا ہے، نہ کسی لفظ کے معنی لکھے ہیں۔ ایسی

باتوں کو آزاد نے افسوس کے ساتھ ترک کر دیا ہے۔ شفیق کرم معاف فرمائیں۔

لطیفہ: ان کی عالی دماغی اور بلند خیالی شعرائے متقدمین و متاخرین میں سے کسی کی فصاحت یا بلاغت کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ یہ قول اُن کا مشہور تھا کہ گلستان سعدی کی تعریف میں لوگوں کے دم چڑھے جاتے ہیں، اس میں ہے ؟ کیا گفت، گفتہ اند، گفتہ اند کہتا چلا جاتا ہے۔ اگر اِن لفظوں کو کاٹ دو تو کچھ بھی نہیں رہتا۔ ایک دن مفتی صدرالدین خاں مرحوم کے مکان پر یہی تقریر کی۔ مولوی احمدالدین کرسانوالہ، مولوی فضل حق صاحب کے شاگرد بیٹھے تھے انھوں نے کہا کہ قرآن شریف میں کیا فصاحت ہے، جا بجا قال قال قالوا قالوا ہے۔

اِن کے کسی شاگرد نے غزل میں یہ شعر لکھا تھا:

ہجر میں کیونکر نہ پھروں ہر سُو نہ گھبرایا ہُوا
وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہُوا

خاں صاحب نے پہلے مصرع کو یوں بدل دیا ع اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہُوا اہل مذاق جانتے ہیں کہ اب شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

ایک اور شخص نے الٰہی بخش کا سجع لکھا تھا۔ ع مجھ گنہگار کو الٰہی بخش۔ خاں صاحب نے فرمایا:

ع میں گنہگار ہوں الٰہی بخش

تاریخیں: تاریخ میں ہمیشہ تعمیہ اور تخرجہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر ان کی طبع رسا نے اسے محسناتِ تاریخ میں داخل کر دیا۔ چنانچہ اپنے والد کی تاریخ وفات کہی ؎

بہ من الہام گشت سالِ وفات
کہ غلامِ نبی بہ حق پیوست

غلام نبی کے اعداد کے ساتھ حق ملائیں تو پورے پورے سنہ فوت نکل آتے ہیں۔

اپنی صغیر سن بیٹی کی تاریخ فوت کہی:

خاک بر فرق دولتِ دُنیا
من فشاندم خزانہ بہ سرِ خاک

خزانہ کے اعداد سرِ خاک یعنی خ کے ساتھ ملانے سے ۱۲۶۳ھ ہوتے ہیں۔

تاریخ چاہ ع آب لذت فزا بجام بگیر۔ آب لذت فزا کے اعدا جام کے اعداد میں ڈالو تو ۱۲۶۵ھ حاصل ہوئے۔

ایک شخص زین خاں نام حج کو گیا۔ رستے میں سے پھر آیا۔ خاں صاحب نے کہا:

ع چوں بیاید ہنوز خر باشد ۱۲۶۵ھ

شاہ محمد اسحاق صاحب نے دِلّی سے ہجرت کی، خاں صاحب نے کہا :

گفتم کہ وحیدِ عصر اسحاق

بر حکمِ شہنشہِ دو عالم

بگزاشتہ دار حرب امسال

جا کردہ بمکۂ معظم

وحیدِ عصر اسحاق کے اعداد مکۂ معظم کے اعداد کے ساتھ ملاؤ اور دار حرب کے اعداد اس میں سے تفریق کرو تو ۱۲۶۰ھ تاریخ ہجرت نکلتی ہے۔

ایک شخص قلعۂ دلّی سے نکالا گیا، انھوں نے تاریخ کہی - ع

از باغ خلد بیروں شیطان بے حیا شد ؛ باغ خلد کے اعداد میں سے شیطانِ بے حیا کے عدد نکال ڈالیں تو ۱۲۳۶ھ رہتے ہیں۔

سادی تاریخیں بھی عمدہ ہیں۔ چنانچہ خلیل خاں کے ختنے کی تاریخ کہی، سُنتِ خلیل اللہ۔

اپنی عمّہ کے مرنے کی تاریخ کہی :- لَهَا اَجْرٌ عَظِيمٌ

اپنے والد کی وفات کی تاریخ کہی :- قَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيماً ۵

اپنی بیٹی کی ولادت کی تاریخ کہی :

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے

کہی تاریخ دُخترِ مومن

دُخترِ مومن کے اعداد میں سے نال کے اعداد کو اخراج کیا ہے :

شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات کی تاریخ :

دستِ بے دادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے

فقر و دیں، فضل و ہُنر، لُطف و کرم، علم و عمل

الفاظ مصرعِ آخر کے اوّل و آخر کے حرفوں کو گرا دو، بیچ کے حرفوں کے عدد لے لو تو ۱۲۳۹ھ رہتے ہیں۔

اِن کے معمّے بھی متعدد ہیں، مگر ایک لاجواب ہے۔ ایسا نہیں سُنا گیا :

بنے کیونکر کہ ہے سب کار اُلٹا

ہم اُلٹے، بات اُلٹی، یار اُلٹا (یعنی مہتاب رائے)

پہیلیاں بھی کہیں، ایک یہاں لکھی جاتی ہے کہ گھڑیال پر ہے

نہ بولے وُہ جب تک کہ کوئی بُلائے
نہ لفظ اور معنی سمجھ میں کچھ آئے
نہیں، چور، پر وہ لٹکتا رہے
زمانے کا احوال بکتا رہے
شب و روز غوغا مچایا کرے
اسی طرح سے مار کھایا کرے

کوٹھے سے گرنے کے بعد اُنھوں نے حکم لگایا تھا کہ ۵ دن یا ۵ مہینے یا ۵ برس میں مر جاؤں گا، چنانچہ ۵ مہینے کے بعد مر گئے۔ گرنے کی تاریخ خود ہی کہی تھی:

دست و بازو بشکست۔ مرنے کی تاریخ ایک شاگرد نے کہی۔ ماتمِ مومن۔ دہلی دروازہ کے باہر میدھیوں کے جانب غرب، زیرِ دیوار احاطہ مدفون ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا خاندان بھی یہیں مدفون ہے۔

روایت: مرنے کے بعد لوگوں نے عجیب عجیب طرح سے خواب میں دیکھا۔ ایک خواب نہایت سچا اور حیرت انگیز ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں نے دو برس بعد خواب میں دیکھا کہ ایک قاصد نے آکر خط دیا کہ مومن مرحوم کا خط ہے۔ اُنھوں نے لفافہ کھولا تو اس کے خاتمے پر ایک مہر ثبت تھی، جس میں مومن جنّتی لکھا تھا اور خط کا مضمون یہ تھا کہ آج کل میرے عیال پر مکان کی طرف سے بہت تکلیف ہے، تم اُن کی خبر لو۔ صبح کو نواب صاحب نے دو سو روپے ان کے گھر بھیجے اور خواب کا مضمون بھی کہلا بھیجا۔ ان کے صاحبزادے احمد نصیر خاں سلمہ اللہ کا بیان ہے کہ فی الواقع ان دنوں میں ہم پر مکان کی نہایت تکلیف تھی۔ برسات کا موسم تھا اور سارا مکان ٹپکتا تھا۔

اپنے شفیق مکرم کے الطاف و کرم کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے یہ حالات مرتب کر کے عنایت فرمائے، لیکن کلام پر رائے نہ لکھی اور باوجود التجائے مکرر کے انکار کیا۔ اس لیے بندہ آزاد اپنے فہم قاصر کے بموجب لکھتا ہے:

غزلوں میں ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں اور استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجے پر پہنچایا ہے۔ اُن میں معاملاتِ عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کیے ہیں۔ اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے، اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے۔ اشعارِ مذکورہ میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دل کش تراشیں ہیں کہ اُردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ ان کی زبان میں چند وصف خاص ہیں، جن کا جتانا لطف سے خالی نہیں۔ وہ

اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذاتِ شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لُطف ملکہ معانی پنہانی پیدا کرتے ہیں:

موئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہُوا — بلائے جاں ہے وُہ دل جو بلائے جاں نہ ہُوا
محو مجھ سا دمِ نظارہ جاناں ہوگا — آئنہ آئنہ دیکھے گا تو حیراں ہوگا
کیا رم نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا — الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا
روزِ جزا جو قاتلِ دل جُو خطاب تھا — میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
پس شکستن خمُ زجرِ محتسب معقول — گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے

نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف
عونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد را

اکثر عمدہ ترکیبیں اور نادر تراشیں فارسی کی اور استعارے اور اضافتیں اُردو میں استعمال کر کے کلام کو نمکین کرتے ہیں، مثلاً:

گروہاں ہے یہ خموشی اثرِ نغاں ہوگا — حشر میں کون مرے حال کا پُرساں ہوگا

یعنی فغانے کہ اثرش خموشی است:

بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰؑ — اچھا نہ کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

یعنی بیمارے کہ چارہ اش اجل است:

وفائے غیرت سے شکر جفا نے کام کیا — کہ اب ہوس سے بھی اعدائے بوالہوس گزرے
ستم اسے شورِ بختی میری ہڈی کیوں ہما کھاتا — سگ لیلیٰ اد اکو گر نہ ظالم بدمزہ لگتی

اکثر اہلِ اُردو یہ طرز پسند نہیں کرتے، لیکن اپنا اپنا مذاق ہے۔ ناسخ اور آتش کے حال میں اس تقریر کو بہت طول دے چکا ہوں، دوبارہ لکھنا فضول ہے۔

قصائد: اپنے درجے میں عالی رُتبہ رکھتے ہیں اور زبان کا انداز وہی ہے۔
مثنویاں: نہایت درد انگیز ہیں، کیونکہ دردخیز دل سے نکلی ہیں۔ زبان کے لحاظ سے جو غزلوں کا انداز ہے، وہی اُن کا ہے۔

## غزلیں

غیروں پہ کھُل نہ جائے کہیں راز دیکھنا — میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
اُڑتے ہی رنگِ رُخ مرا نظروں سے تھا نہاں — اس مُرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں — اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا
دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا
بدکام کا مآل بُرا ہے جزا کے دن — حالِ سپہر تفرقہ انداز دیکھنا
مت رکھیو گردِ تارکِ عشاق پر قدم — پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا
کُشتہ ہوں اُس کی چشمِ فسوں گر کا اے مسیح — کرنا سمجھ کے دعویِ اعجاز دیکھنا
میری نگاہِ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو — بے طاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے
مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

اشکِ واژونہ اثر باعثِ صد جوش ہوا — ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا
جلوہ افروزیِ رُخ کے لیے مے نوش ہوا — میں کبھی آپ میں آیا تو وہ بے ہوش ہوا
کیا یہ پیغامبرِ غیر ہے اے مرغِ چمن — خندہ زن بادِ بہاری سے وہ گلگوش ہوا
ہے یہ غم گور میں رنجِ شبِ اوّل سے فزوں — کہ وہ میرے ماتم میں سیہ پوش ہوا
مجھ پہ شمشیرِ نگہ خود بخود آ پڑتی ہے — عاجز احوالِ زبوں سے وہ ستم کوش ہوا
آفریں دل میں رہی خنجرِ دشمن کے سبب — اپنے قاتل سے خفا تھا کہ میں خاموش ہوا
دردِ شانہ سے ترا محوِ نزاکت خوش ہے — کہ میں ہمدوش ہوں گو غیر بھی ہمدوش ہوا
وہ ہے خالی تو یہ خالی، یہ بھری تو وہ بھری — کاسۂ عمرِ عدو حلقۂ آغوش ہوا

تو نے جو قہرِ خدا یاد دلایا مومن
شکوۂ جورِ بتاں دل سے فراموش ہوا

گئے وہ خواب سے اُٹھ غیر کے گھر آخرِ شب — اپنے نالے نے دکھایا یہ اثر آخرِ شب
صبح دم وصل کا وعدہ تھا یہ حسرت دیکھو — مر گئے ہم دمِ آغازِ سحر آخرِ شب
شعلہ آہِ فلک رُتبہ کا اعجاز تو دیکھ — اوّلِ ماہ میں چاند آئے نظر آخرِ شب
سوزِ دل سے گئی جاں بخت چمکنے کے قریب — کرتے ہیں موسمِ گرما میں سفر آخرِ شب
ملے ہو غیر سے بے پردہ تم انکار کے بعد — جلوہ خورشید کا سا تھا کچھ اُدھر آخرِ شب
صبح دم آنے کو وہ تھا کہ گواہی دے دے — رجعتِ قہقریِ چرخ و قمر آخرِ شب
غیر نکلا ترے گھر سے گئی اس وہم میں جان — غل ہوئے چور کے اس کوچے میں گر آخرِ شب
دی تسلی تو وہ ایسی کہ تسلی نہ ہوئی — خواب میں تو مرے آئے وہ مگر آخرِ شب

مو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن
نیند آتی ہے بہ آرام دگر آخرِ شب

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستمِ ناز تو دیکھو

اس بت کے لیے میں ہوسِ حور سے گزرا
اس عشقِ خوش انجام کا آغاز تو دیکھو

چشمک مری وحشت پہ ہے، یہ کیا حضرتِ ناصح
طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو

اربابِ ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے
کم طالعیٔ عاشقِ جانباز تو دیکھو!

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ
بدنامیِ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

دیں پاکیٔ دامن کی گواہی مرے آنسو
اس یوسفِ بے درد کا اعجاز تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
جورِ اجلِ تفرقہ پرواز تو دیکھو

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلسِ ماہی کے گل شمعِ شبستاں ہوں گے

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

تابِ نظارہ نہیں آئنہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گو وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موجِ صبا بل تیرے
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

صبر یا رب مری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی قیدیِ زنداں ہوں گے

منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے

تیرے دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے
گل نہ ہوں گے شررِ آتشِ سوزاں ہوں گے

غور سے دیکھتے ہیں طوف کو آہوئے حرم
کیا کہیں اس کے سگِ کوچہ کے قرباں ہوں گے

داغِ دل نکلیں گے تربت سے مری جو لالہ
یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہوں گے

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاکِ گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہو گی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

سنگ اور ہاتھ وہی وہ ہی سر و داغِ جنوں
وہی ہم ہوں گے وہی دشت و بیاباں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی
خبر ہے لاش پہ اُس بے وفا کے آنے کی

ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشکِ خوں کیجے
سکھائی طرز اُسے دامن اُٹھا کے آنے کی

سمجھ کے اور ہی کچھ مر چلا میں اے ناصح
کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنے کی

اُمیدِ سرمہ میں تکتے ہیں راہ دیدۂ زخم
شمیمِ سلسلۂ مشک سا کے آنے کی

چلی ہے جان نہیں تو کوئی نکالو راہ
تم اپنے پاس تک اس مبتلا کے آنے کی

نہ جائے کیوں دلِ مرغِ چمن کہ سیکھ گئی
بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

مشامِ غیر میں پہنچی ہے نکہتِ گل داغ
یہ بے سبب نہیں تندی ہوا کے آنے کی

جو بے حجاب نہ ہو گی تو جان جائے گی
کہ راہ دیکھی ہے اُس نے حیا کے آنے کی

پھر اب کے لا ترے قربان جاؤں جذبۂ دل
گئے ہیں یاں سے وہ سوگند کھا کے آنے کی

خیالِ زلف میں خود رفتگی نے قہر کیا
امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

کروں میں وعدہ خلافی کا شکوہ کس کس سے
اجل بھی رہ گئی ظالم سنا کے آنے کی

کہاں ہے ناقہ ترے کان بجتے ہیں مجنوں
قسم ہے مجھ کو صدائے درا کے آنے کی

مرے جنازے پہ آنے کا ہے ارادہ تو آ
کہ دیر اُٹھانے میں کیا ہے صبا کے آنے کی

مجھے یہ ڈر ہے کہ مومن کہیں نہ کہتا ہو
مری تسلی کو روزِ جزا کے آنے کی

ازبس جنوں جدائیِ گل پیرہن سے ہے
دل چاک چاک نغمۂ مرغِ چمن سے ہے

سرگرم مدحِ غیر دمِ شعلہ زن سے ہے
دوزخ کو کیا جلن مرے دل کی جلن سے ہے

روزِ جزا نہ دے جو مرے قتل کا جواب
وہم سخن رقیب کو اس کم سخن سے ہے

یاد آگیا زبس کوئی مہر دے مہر وش
اُمیدِ داغ تازہ سپہرِ کہن سے ہے

کچھ بھی کیا نہ یار کی سنگیں دلی کا پاس
سب کاوشِ رقیب دلِ کوہکن سے ہے

ان کو گمان ہے گلۂ چینِ زلف کا
خوشبو دہانِ زخم جو مشکِ ختن سے ہے

میں کیا کہ مرگِ غیر بہ دامانِ تر نہ ہو
وہ اشک ریز خندۂ چاکِ کفن سے ہے

کیونکہ نجاتِ آتشِ ہجراں سے ہو کہ مرگ
آئی تو دور ہی تب و تابِ بدن سے ہے

خود رفتگی میں چین وہ پایا کہ کیا کہوں
غربت جو مجھ سے پوچھو تو بہتر وطن سے ہے

رشکِ پری کہے سے عدو کے یہ وحشتیں
نفرت بلا تمہیں مرے دیوانہ پن سے ہے

داغِ جنوں کو دیتے ہیں گل سے زبس مثال
میں کیا کہ عندلیب کو وحشت چمن سے ہے

کہیں یار نوحہ زن ہیں کہاں مرگ مجھ کو تو
لب تشنگی تصورِ بوسِ دہن سے ہے

کیا کیا جوابِ شکوہ میں باتیں بنا گیا
لو اب بھی دل درست اسی دل شکن سے ہے

اپنا شریک بھی نہ گوارا کرے مُتو
مومن کو ضد ہے کیش بدِ برہمن سے ہے

دُعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لیے
سُخن بہانہ ہُوا مرگِ ناگہاں کے لیے

نہ پائے یار کے بوسے نہ آستاں کے لیے
عبث میں خاک ہُوا میلِ آسماں کے لیے

خلافِ وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں
اُمید یک شبہ ہے پاس جاوداں کے لیے

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں
کہ سخت چاہیئے دل اپنے رازداں کے لیے

حجابِ چرخ بلا ہے ہُوا کرے بیتاب
فغاں اثر کے لیے اور اثر فغاں کے لیے

ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لیے

مزہ یہ شکوے میں آیا کہ بے مزہ ہوئے وہ
میں تلخ کام رہا لذتِ زباں کے لیے

کیا ہے دل کے عوض جان دے لے رقیب تو دوں
میں اور آپ کی سوداگری زیاں کے لیے

وہ لعل رُوح فزا دے کہاں تلک بوسے
کہ جو ہے کم ہے یہاں شوقِ جانفشاں کے لیے

ملے رقیب سے وہ جب سُنے وصال ہوا
دریغ جان گئی ایسے بدگماں کے لیے

کہاں وہ عیشِ اسیری کہاں وہ امنِ قفس
ہے بیم برق بلا روز آشیاں کے لیے

جنونِ عشقِ ازل کیوں نہ خاک اُڑائیں کہ ہم
جہاں میں آئے ہیں ویرانیِ جہاں کے لیے

بھلا ہُوا کہ وفا آزما ستم سے ہوئے
ہمیں بھی دینی تھی جاں اس کے امتحاں کے لیے

رواں فزائی سحرِ حلال مومن سے
رہا نہ معجزہ باقی لبِ بتاں کے لیے

# مَلِکُ الشُّعرا خاقانیٔ ہند شیخ ابراہیم ذوقؔ

جب وہ صاحبِ کمال عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا، جن کی خوشبو شہرتِ عام بن کر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا۔ اور اُس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اُردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز اُمید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بُلبُل تھا، وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہمعصر رہے، نہ ہم داستان رہے، نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اس زبان کے لیے ٹکسال تھا، وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ امراء کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں، جو بات بات میں دل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں؟ آج جن لوگوں کو زمانے کی فارغ البالی نے اس قسم کی ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں، وہ اور اور اصل کی شاخیں ہیں۔ اُنھوں نے اور پانی سے نشو و نما پائی ہے۔ وہ اور ہی ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں۔ پھر اس کی زبان کی ترقی کا کیا بھروسا؟ کیسا مبارک زمانہ ہو گا، جبکہ شیخ مرحوم اور میرے والدِ مغفور ہم عمر ہوں گے۔ تحصیلِ علمی اُن کی عمروں کی طرح حالتِ طفولیت میں ہو گی۔ صرف و نحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی اور ایک اُستاد کے دامنِ شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے۔ ان نیک نیت لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بُنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ وہ رابطہ اُن کا عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور آخیر وقت تک ایسا نبھ گیا کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا۔ اِن کے تحریرِ حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے، مگر کیا کروں، جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ اس سبب سے کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے، لیکن نہیں! اس شعر کے پُتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل ہیں کون سے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو، یہ کام کا نہیں اور کونسی حرکت اس کی ہے، جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور سب

کچھ لکھوں گا۔ جو بات اِن کے سلسلۂ حالات میں مسلسل ہو سکے گی، ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔ شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانے کے تجربے اور بزرگوں کی صحبت نے انھیں حالاتِ زمانہ سے ایسا باخبر کیا تھا کہ اُن کی زبانی باتیں کتب تاریخ کے قیمتی سرمایے تھے۔

وہ دِلّی میں کابلی دروازہ کے پاس رہتے تھے اور نواب لُطف علی خاں نے انھیں معتبر اور بالیاقت شخص سمجھ کر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ علیہ الرحمۃ ان کے اکلوتے بیٹے تھے کہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت کسے خبر ہوگی کہ اس رمضان سے وہ چاند نکلے گا۔ جو آسمانِ سُخن پہ عید کا چاند ہو کر چمکے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلے کے اکثر لڑکے انہی کے پاس پڑھتے تھے، انہیں بھی وہیں بٹھا دیا۔

حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے، شوقؔ تخلص کرتے تھے۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں، ویسے شعر کہتے تھے۔ محلے کے شوقین نوجوان دلوں کی اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ کہوا لے جایا کرتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت اُن کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔ شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سُنتے سُنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے اور سُننے میں دل کو ایک روحانی لذّت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دُعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے۔ ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حُسنِ اتفاق تھا ایک حمد میں تھا ایک نعت میں۔ اِس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مُبارک مہم کو خود اس طرح سمجھ کر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو، دوسرا نعت میں ہو۔ جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس قدرتی اتفاق کو مبارک فال سمجھوں، مگر اُن دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی، اُس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ انھیں کہیں اپنی کتاب میں، کہیں جا بجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائیوں سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سناتا تھا اور خوشی کے مارے پھُولوں نہ سماتا تھا۔ غرض کہ اسی عالم میں کچھ کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔

اِسی محلّے میں میر کاظم حسین نام ایک اِن کے ہم سن ہم سبق تھے کہ نواب سید رضی خاں مرحوم کے بھانجے تھے۔ بیقرارؔ تخلص کرتے تھے اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے، مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی براقی کا یہ عالم تھا کہ کبھی برق تھے اور کبھی باد و باراں۔ انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں تحصیلِ کمال کے لیے اچھے اچھے موقع ملے شیخ مرحوم اور وہ اتحادِ طبعی

کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے۔ انھیں دنوں کا شیخ مرحوم کا ایک مطلع ہے کہ نمونہ تیزیٔ طبع کا دکھاتا ہے:

ماتھے پہ ترے جھمکے ہے جھومر کا پڑا چاند
لا بوسہ، چڑھے چاند کا دعدہ تھا، چڑھا چاند

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لا کر سنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا، یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ اُنھیں سے یہ اصلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہُوا اور اِن کے ساتھ جا کر شاگرد ہو گئے۔

سلسلے اصلاح کے جاری تھے۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں کی واہ وا طبیعتوں کو بلند پروازیوں کے پر لگاتی تھی کہ رشک جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے، اُستاد شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقعوں پر ایسا ہُوا کہ شاہ صاحب نے اِن کی غزل کو بے اصلاح پھیر دیا اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ کبھی کہہ دیا کہ یہ کچھ نہیں، پھر سوچ کر کہو۔ بعض غزلوں کو جو اصلاح دی تو اُس سے بے پروائی پائی گئی۔ اِدھر انھیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا، کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی یا پہلو تہی کرتے ہیں چنانچہ اس طرح کئی دفعہ غزلیں پھیریں۔ بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے، جو براقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ اِن کی غزلوں میں توارد سے یا خدا جانے کسی اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اس لیے انھیں زیادہ رنج ہُوا۔

مُنیر مرحوم کو جس قدر دعوے تھے، اُس سے زیادہ طبیعت میں نوجوانی کے زور بھرے ہوئے تھے۔ وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور کہتے تھے کہ جس غزل پر ہم قلم اُٹھائیں، اُس زمین پر کون قدم رکھ سکتا ہے؟ مشکل سے مشکل طرحیں کرتے تھے اور کہتے تھے، کون پہلوان ہے؟ جو اس فال کو اُٹھا سکے۔ غرض اُن سے اور شیخ مرحوم سے بمقتضائے سن اکثر تکرار ہو جاتی تھی اور مباحثے ہوتے تھے۔ ایک دفعہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ شیخ علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ گھر کے کہے ہوئے شعر صحیح نہیں، شاید آپ اُستاد سے کہوا لاتے ہوں گے۔ ہاں ایک جلسے میں بیٹھ کر ہم اور آپ غزل کہیں۔ چنانچہ اس معرکے کی منیر مرحوم کی غزل نہیں ملی، شیخ علیہ الرحمۃ کی غزل کا مطلع مجھے یاد ہے:

یاں کے آنے کے مقرر قاصدا وہ دن کرے
جو تو مانگے گا وہی دوں گا خدا وہ دن کرے

اگرچہ اُن کی طبیعت حاضر و فکر رسا، بندش چُست، اُس پر کلام میں زور، سب کچھ تھا، مگر چونکہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے، نہ دُنیا کے معاملات کا تجربہ تھا، نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا، اس لیے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی قیل وقال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی، دوشِ نقشِ پا، شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ انھوں نے خفا ہو کر غزل پھینک دی کہ اُستاد کی غزل پر غزل کہتا ہے؟ اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا۔ اِن دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بے قرار ہو کر گھر سے نکالا، مگر غزل بے اصلاح تھی۔ دِل کے ہراس نے روک لیا کہ ابتدائے کار ہے، احتیاط شرط ہے۔ قریب شام افسردگی اور مایوسی کے عالم میں جامع مسجد تک آ نکلے۔ آثار شریف میں فاتحہ پڑھی۔ حوض پر آئے۔ وہاں میر کلو حقیر بیٹھے ہوئے تھے۔ چونکہ مشاعرے کی گرم غزلوں نے روشناس کر دیا تھا اور سن رسیدہ اشخاص شفقت کرنے لگے تھے۔ میر صاحب نے اُنھیں پاس بٹھایا اور کہا کہ کیوں میاں ابراہیم! آج کچھ مکدر معلوم ہوتے ہو، خیر ہے؟ جو کچھ ملال دل پر تھا۔ انھوں نے بیان کیا۔ میر صاحب نے کہا کہ بھلا وہ غزلیں سناؤ۔ انھوں نے غزل سنائی۔ میر صاحب کو اُن کے معاملہ پر درد آیا۔ کہا کہ جاؤ بے تامل غزل پڑھ دو۔ کوئی اعتراض کرے گا تو جواب ہمارا ذمہ ہے اور ہاتھ اُٹھا کر دیر تک اُن کے لیے دُعا کرتے رہے۔ اگرچہ میر صاحب کا قدیمانہ انداز تھا، مگر وہ ایک کہن سال شخص تھے۔ بڑے بڑے باکمال شاعروں کو دیکھا ہوا تھا اور مکتب پڑھایا کرتے تھے، اس لیے شیخ مرحوم کی خاطر جمع ہوئی اور مشاعرے میں جا کر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔ چنانچہ غزل مذکور یہ ہے:

رکھتا بہر قدم ہے وہ یہ ہوشِ نقشِ پا ہو خاکِ عاشقاں نہ ہم آغوشِ نقشِ پا
اُفتادگاں کو بے سروساماں نہ جانیو دامانِ خاک ہوتا ہے روپوشِ نقشِ پا
اعجازِ پا سے تیرے عجب کیا کہ راہ میں بول اُٹھے منہ سے ہر لبِ خاموشِ نقشِ پا
اس رہگزر میں کس کو ہوئی فرصتِ مقام بیٹھے ہے نقشِ پا بہ سرِ دوشِ نقشِ پا
جسمِ نزارِ خاک نشینانِ کوئے عشق یوں ہے زمیں پہ جیسے تن و توشِ نقشِ پا

پابوس در کنارہ کہ اپنی تو خاک بھی
پہنچی نہ ذوق اُس کے بہ آغوشِ نقشِ پا

اُس دن سے جرأت زیادہ ہوئی اور بے اصلاح مشاعرے میں غزل پڑھنے لگے۔

اب کلام کا چرچا زیادہ تر ہوا۔ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں اثر برقی کی طرح دوڑنے لگی۔ اُس زمانے کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت، جو اساتذہ سلف کی یادگار باقی تھے، مشاعرے میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کرکے دِل

بڑھاتے، بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سنتے۔ غزلیں ارباب نشاط کی زبانوں سے نکل کر کوچہ و بازار میں رنگ اُڑانے لگیں۔

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ انھیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی، مگر مرزا ابوظفر ولی عہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے، شعر کے عاشق شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اس لیے دربارِ شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے، مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراق، میر غالب علی خاں سید، عبدالرحمٰن خاں احسان، برہان الدین خاں زار، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق۔ میاں شکیبا شاگردِ میر تقی مرحوم، مرزا عظیم بیگ عظیم شاگردِ سودا، میر قمرالدین منت، ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب مشاعرے میں آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ مطلع اور مصرع جسے میں ڈالتے تھے، ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا، مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار کہ ولی عہد موصوف کے ملازمِ خاص تھے، اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اس جلسے میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوتِ فکر کو خوب بلند پروازی ہو، لیکن اس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی، جب کوئی قلعے میں جانے پاتا تھا۔ چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعے میں پہنچے اور اکثر دربارِ ولی عہد میں جانے لگے۔

شاہ نصیر مرحوم کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے، میر کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے۔ انھیں دنوں میں جان انفسٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لے کر کابل تک عہد نامے کرنے کو چلے۔ انھیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت و علمیت کے ساتھ امارتِ خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اس عہدے پر سفارش کے لیے ولی عہد پر سفارش کے لیے ولی عہد سے شقہ چاہا۔ مرزا مغل بیگ اِن دنوں میں اُن کے مختارِ کل تھے اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ جس پر ولی عہد کی زیادہ نظرِ عنایت ہو اسے کسی طرح سامنے سے سرکاتے رہیں۔ اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقۂ سفارش آسان ہو گیا اور وہ چلے گئے۔

چند روز بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولی عہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے۔ میاں ابراہیم! اُستاد تو دکن گئے، میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے، تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا؟ غرض اُسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی۔ ولی عہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا، بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ممتاز محل کی خاطر سے اکبر شاہ

کبھی مرزا سلیم، کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولی عہدی کے لیے کوششیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مرزا ابوظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اس کا گورنمنٹ میں دائر تھا اور ولی عہد کو بجائے ۵ ہزار روپے کے فقط ۵ سو روپے مہینا ملتا تھا۔ غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کار سرکارِ ولی عہدی سے للعہ مہینا بھی ہو گیا۔ اُس وقت لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کا رُعب وداب کچھ اور تھا۔ چنانچہ کچھ ولی عہدی کے مقدمے پر خیال کرکے، کچھ تنخواہ کی کمی پر نظر کرکے باپ نے اکلوتے بیٹے کو اس نوکری سے روکا، لیکن ادھر تو شاعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے ادھر کھینچا، ادھر قسمت نے آواز دی کہ للعہ نہ سمجھنا، یہ ایوانِ ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں، موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ چنانچہ شیخ مرحوم ولی عہد کے اُستاد ہو گئے۔

دِلّی میں نواب الٰہی بخش خاں معروف ایک عالی خاندان امیر تھے۔ علوم ضروری سے باخبر تھے اور شاعری کے کہنہ مشاق، مگر اس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے۔ کہ فنا فی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں۔ چونکہ لطفِ کلام کے عاشق تھے، اس لیے جہاں متاع نیک دیکھتے تھے، نہ چھوڑتے تھے۔ زمانے کی درازی نے سات شاعروں کی نظر سے ان کا کلام گزرانا تھا۔ چنانچہ ابتداء میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لیتے رہے اور سید علی خاں غمگین وغیرہ وغیرہ اُستادوں سے بھی مشورہ ہوتا رہا۔ جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہُوا تو اُنھیں بھی اشتیاق ہوا۔ یہ موقع وہ تھا کہ نواب موصوف نے اہل فقر کی برکتِ صحبت سے ترک دُنیا کرکے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اُستاد مرحوم فرماتے تھے کہ میری ۱۹-۲۰ برس کی عمر تھی۔ گھر کے قریب ایک قدیمی مسجد تھی۔ ظہر کے بعد وہاں بیٹھ کر میں وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ایک چوبدار آیا۔ اُس نے سلام کیا اور کچھ چیز رومال میں لپیٹی ہوئی میرے سامنے رکھ کر الگ بیٹھ گیا۔ وظیفے سے فارغ ہو کر اُسے دیکھا تو اس میں ایک خوشہ انگور کا تھا۔ ساتھ ہی چوبدار نے کہا کہ نواب صاحب نے دُعا فرمائی ہے۔ یہ تبرک بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ کا کلام تو پہنچا ہے مگر آپ کی زبان سے سُننے کو جی چاہتا ہے۔ شیخ مرحوم نے وعدہ کیا اور تیسرے دن تشریف لے گئے۔ وہ بہت اخلاق سے ملے اور بعد گفتگوے معمولی کے شعر کی فرمائش کی۔ انھوں نے ایک غزل کہنی شروع کی تھی۔ اُس کا مطلع پڑھا:

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

سُن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ خیر حال تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا، مگر تمھاری زبان سے سُن کر اور لُطف حاصل ہُوا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ عجیب اتفاق یہ کہ حافظ غلام رسول شوق یعنی اُستاد مرحوم کے قدیمی اُستاد اُسی وقت آ نکلے۔ نواب انھیں دیکھ کر مسکرائے اور شیخ مرحوم

نے اسی طرح سلام کیا، جو سعادت مند شاگردوں کا فرض ہے۔ وہ ان سے خفا بنتے تھے کہ شاگرد میرا اور مجھے غزل نہیں دکھاتا اور مشاعروں میں میرے ساتھ نہیں چلتا۔ غرض انھوں نے اپنے شعر پڑھنے شروع کر دیئے۔ شیخ مرحوم نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا اور رخصت چاہی۔ چونکہ نواب مرحوم کے برابر بیٹھے ہوئے تھے، نواب نے چپکے سے کہا، کان بدمزہ ہو گئے۔ کوئی شعر اپنا سُناتے جاؤ۔ اُستاد مرحوم نے انہی دنوں میں ایک غزل کہی تھی۔ دو مطلعے اُس کے پڑھے۔

جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا  گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا
مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا  پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

اُس دن سے معمول ہو گیا کہ ہفتے میں دو دن جایا کرتے اور غزل بنا آیا کرتے تھے۔ چنانچہ جو دیوان معروف اب رائج ہے۔ وہ تمام و کمال انہی کا اصلاح کیا ہُوا ہے۔ نواب مرحوم اگرچہ ضعفِ پیری کے سبب سے خود کاوش کر کے مضمون کو لفظوں میں بٹھا نہیں سکتے تھے، مگر اس کے حقائق و دقائق کو ایسا پہنچتے تھے کہ جو حق ہے۔ اُس عالم میں اُستاد مرحوم کی جوان طبیعت اور ذہن کی کاوش اِن کی فرمائش کے نکتے نکتے کا حق ادا کرتی تھی۔ شیخ مرحوم کہا کرتے تھے کہ اگرچہ بڑی بڑی کاہشیں اُٹھانی پڑیں۔ مگر اُن کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے۔

فرماتے تھے کہ اپنی لذتِ شوق میں وہ بھی کبھی جرأت، کبھی سودا، کبھی میر کے انداز میں غزلیں لکھتے رہے، مگر اخیر میں کچھ بمقتضائے سن، کچھ اس سبب سے کہ صاحبِ دل اور صاحب نسبت تھے، خواجہ میر درد کی طرز میں آ گئے تھے۔ یہ بھی آپ ہی کہتے تھے کہ ان دنوں میں ہمارا عالم ہی اور تھا جوانی اُودانی۔ ہم کبھی جرأت کے رنگ میں کبھی سودا کے انداز میں اور وہ رد کرتے تھے۔ آج الٰہی بخش خاں مرحوم ہوتے تو ہم کہہ کر دکھاتے۔ اب اُن کا دیوان ویسا ہی بنا دیتے، جیسا اُن کا جی چاہتا تھا۔ اُن کی باتیں کرتے اور بار بار افسوس کرتے اور کہتے، ہائے الٰہی بخش خاں، اُن کا نام ادب سے لیتے تھے اور اس طرح ذکر کرتے تھے، جیسے کوئی با اعتقاد اپنے مرشد کا ذکر کرتا ہے۔ اُن کی سینکڑوں باتیں کیا کرتے تھے، جو دین و دُنیا کے کاموں کا دستور العمل ہیں۔

یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا سخی میں نے آج تک نہیں دیکھا جو آتا تھا، امیر، فقیر، بچہ، بوڑھا، اُسے بغیر دیئے نہ رہتے تھے اور دُنیا بھی وہی کہ جو اس کے مناسب حال ہو، کوئی سوداگر نہ تھا کہ آئے اور خالی پھر جائے۔ انھیں اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ ہماری غزل ہمارے پاس بیٹھ کر بناتے جاؤ، سُناتے جاؤ۔ میں نے اس باب میں پہلو بچایا تھا، مگر اُن کی خوشی اسی میں دیکھی تو مجبور ہُوا اور یہی خوب ہُوا۔ ایک دن میں اُن کی غزل بنا رہا تھا، اُس کا مقطع تھا ؎

اِک غزل پُر درد سی معروف لکھ اس طرح میں ذوق ہے دل کو نہایت درد کے اشعار سے
کون روتا ہے یہ لگ کر باغ کی دیوار سے جانور گرنے لگے جائے ثمر اشجار سے

سوداگر آیا اور اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ ان میں ایک اصفہانی تلوار بھی تھی۔ وہ پسند آئی خم دم آبداری اور جوہر دیکھ کر تعریف کی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔ ع

اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

میں نے اسی وقت دوسرا مصرع لگا کر داخل غزل کیا۔ بہت خوش ہوئے:

سر لگا دیں ابروئے خمدار کی قیمت میں آج اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

غرض اور چیزوں کے ساتھ وہ تلوار بھی لے لی۔ میں حیران ہوا کہ یہ تو اُن کے معاملات و حالات سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی اُسے کیا کریں گے۔ خدا کی قدرت ۲، ۲ ہی دن کے بعد بڑے صاحب (فریزر صاحب ریذیڈنٹ دہلی) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ لے کر نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔ وہاں سے ان کے پاس آ بیٹھے۔ باتیں چیتیں ہوئیں۔ جو صاحب ساتھ تھے، اُن سے ملاقات کروائی۔ جب چلنے لگے۔ تو انھوں نے وہی تلوار منگا کر صاحب کے ہمراہی کی کمر سے بندھوائی اور کہا۔

ے

برگ سبز است تحفۂ درویش
چہ کند بے نوا ہمیں دارد

اُن کے ساتھ میم صاحب بھی تھیں۔ ایک ارگن باجا نہایت عمدہ کسی رومی سوداگر سے لیا تھا، وہ اُنھیں دیا۔

اُن کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے، جس میں ردیف وار ۱۰۱ مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اسی روایت سے اس کا نام تسبیح زمرد رکھا تھا۔ یہ تسبیح بھی اُستاد مرحوم نے پروئی تھی اور آخر میں ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے کہہ کر لگائی تھی۔ جن دنوں ان کے دانے پروئے تھے تو نواب صاحب مرحوم کی سب پر فرمائش تھی کہ کوئی مثل، کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ۔ اُن کے بذل و کرم اور حسنِ اخلاق اور علو ہمتہ کے سبب سے اکثر شرفا خصوصاً شعرا آکر جمع ہوتے تھے اور اشعار سُنتے سناتے تھے۔ اِن دنوں اُن کے شوق سے اوروں پر بھی سبز رنگ چھایا ہوا تھا۔ بھورے خاں آشفتہ ایک پرانے شاعر شاہ محمدی مائل کے شاگرد اور اُن کے مُرید تھے۔ حضور وظیفہ بھی پاتے تھے۔ اُن کے شعر میں ہری چُگ کا لفظ آیا۔ کہ ان کے ہاں ابھی تک نہ بندھا تھا۔ ان سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے سجایا۔ ے

آج یہاں کل وہاں گزرے یوہیں چُگ ہمیں
کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری چُگ ہمیں

اُنھیں سو روپے ایک رومال میں باندھ کر دے دیئے کہ تمھاری کاوش کیوں خالی جائے۔ افسوس اخیر میں کمبخت بھورے خاں نے روسیاہی کمائی اور سب تعلقات پر خاک ڈال کر اُن کی ہجو کہی۔ لطف یہ کہ دریا دل نواب طبیعت پر اصلا میل نہ لائے، لیکن اس نااہل کو اُن کا آزردہ ہی کرنا منظور تھا جب دیکھا کہ انھیں کچھ رنج نہیں تو نواب حسام الدین حیدر خاں نامی کی ہجو کہی۔ نامی مرحوم سے انھیں ایسی محبت تھی کہ وہ خود بھی کہتے تھے کہ ان دونوں بزرگوں میں محبت نہیں عشق ہے (اگلے زمانے کے لوگوں کی دوستیاں ایسی ہی ہوتی تھیں) ان کی تعریف میں غزلیں کہہ کر داخل دیوان کی تھیں، ایک مطلع یاد ہے ؎

جو آؤ تم مرے مہماں حسام الدین حیدر خاں

کروں دل نذر جاں قرباں حسام الدین حیدر خاں

جب اُن کی ہجو کہی تو اُنھیں سخت رنج ہوا۔ اس پر بھی اتنا کیا کہ ہمارے سامنے نہ آیا کرو۔ وہ بھی سمجھ گیا۔ عذر میں کہا کہ لوگ ناحق بدنام کرتے ہیں، میں نے نہیں کہی۔ کہا، بس اب آگے نہ بولو۔ اتنی مدت ہم نے زمین سخن کی خاک اُڑائی ہے، کیا تمھاری زبان بھی نہیں پہچانتے؟ میں تو اس سے بدتر ہوں، جو کچھ کہ تم نے کہا، مگر میرے لیے تم میرے دوستوں کو خراب کرنے لگے۔ بھئی مجھ سے تہیں دیکھا جاتا۔ پھر جیتے جی بھورے خاں کی صورت نہ دیکھی۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ دالان میں ایک طرف جانماز بچھی رہتی تھی۔ جب میں رخصت ہوتا تو آٹھویں دسویں دن فرماتے۔ بھئی میاں ابراہیم! ذرا ہماری جانماز کے نیچے دیکھنا۔ پہلے دن تو میں حیران ہوا کہ ایک پڑیا میں کچھ دھرے تھے۔ آپ نے سامنے سے مسکرا کر فرمایا۔ ؏

خدا دیوے تو بندہ کیوں نہ لیوے

اس میں لطیفہ یہ تھا کہ ہم کس قابل ہیں، جو کچھ دیں۔ جس سے ہم مانگتے ہیں، یہ وہی تمھیں دیتا ہے۔

ایک دفعہ استاد بیمار ہوئے اور کچھ عرصے کے بعد گئے۔ ضعف تھا اور کچھ کچھ شکایتیں باقی تھیں۔ فرمایا کہ حقہ پیا کرو۔ عرض کی کہ بہت خوب اب وہ حقہ پلوائیں تو خالی حقہ پلوائیں۔ ایک چاندی کی گڑگڑی، چلم اور چنبل، مغرق نیچہ مرصع مہنال تیار کروا کر سامنے رکھوا دیا۔

خلیفہ صاحب (میاں محمد اسمٰعیل) چھوٹے سے تھے۔ ایک دن استاد کے ساتھ چلے گئے۔ رخصت ہوئے تو ایک چھوٹا سا ٹانگن اصطبل سے منگایا۔ زین زرین کسا ہوا۔ اس پر سوار کر کے رخصت کیا۔ کہ یہ بچہ ہے، کیا جانے گا۔ کہ میں کس کے پاس گیا تھا۔

کبھی کھانے کو جی چاہتا تو آپ نہ کھاتے۔ بہت سا پکواتے۔ لوگوں کو بلاتے۔ آپ کھڑے

رہتے، انھیں کھلواتے۔ خوش ہوتے اور کہتے کہ دل سیر ہو گیا۔ یہ ساری سخاوتیں اُسی سعادتمند بھائی کی بدولت تھیں۔ جو دن بھر سرانجام مہام میں جان کھپاتا تھا۔ راتوں سوچ میں گھلتا تھا۔ اور خاندان کے نام کو زندہ کرتا تھا اور ان سے فقط دعا کی التجا رکھتا تھا۔

اُستاد مرحوم فرماتے تھے کہ ایک دن میں بیٹھا غزل بنا رہا تھا کہ نواب احمد بخش خاں آئے۔ آداب معمولی کے بعد باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ فلاں انگریز کی ضیافت کی، آتنا روپیہ اس میں صرف ہوا۔ فلانی گھڑدوڑ میں ایک چائے پانی دیا تھا۔ یہ خرچ ہو گیا۔ وہ صاحب آئے تھے اصطبل کی سیر دکھائی۔ کاٹھیاواڑ کے گھوڑوں کی جوڑی کھڑی تھی۔ انھوں نے تعریف کی۔ میں نے بگھی میں جڑوائی اور اُسی پر سوار کر کے اُنھیں رخصت کیا، وغیرہ وغیرہ۔ کیا کروں، خالی ملنا، خالی رخصت کرنا مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے امیروں کو امارت کے بڑے بڑے دعوے ہیں (جس طرح بچے بزرگوں سے بگڑ بگڑ کر باتیں کرتے ہیں، چلیں بجبیں ہونے تھے اور کہتے تھے) نیل خانے میں گیا تھا۔ وہاں یہ بندوبست کر آیا ہوں۔ گھوڑیاں سب علاقے بھجوا دیں۔ حضرت کیا کروں، شہر میں اس گلّے کا گزارا نہیں۔ یہ لوگ اس خرچ کا بوجھ اُٹھائیں تو چھاتی ترق ہو جائے۔ الٰہی بخش خاں مرحوم بھی ادا شناسی میں کمال ہی رکھتے تھے۔ تاڑ گئے۔ چپکے بیٹھے سُنتے تھے اور مسکراتے تھے۔ جب اُن کی زبان سے نکلا کہ چھاتی ترق جائے۔ آپ مسکرا کر بولے، ہاں تو آپ کی چھاتی میں بھی آیا ہو گا۔ شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ پھر انھوں نے فرمایا، آخر امیرزادے ہو۔ خاندان کا نام ہے۔ یہی کرتے ہیں، مگر اس طرح نہیں کہا کرتے۔

نواب احمد بخش خاں نے کہا۔ حضرت پھر آپ سے بھی نہ کہوں؟ فرمایا، خدا سے کہو۔ عرض کی کہ مجھے آپ دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ہی سے کہتا ہوں، آپ خدا سے کہیے۔ فرمایا کہ اچھا ہم تم مل کر کہیں، تمھیں بھی کہنا چاہیئے۔ نواب احمد بخش خاں بھی جانتے تھے کہ جو سخاوت ادھر ہوتی ہے، عین بجا ہے اور اسی کی ساری برکت ہے۔

ایک دن نواب احمد بخش خاں آئے۔ لیکن افسردہ اور برآشفتہ۔ الٰہی بخش خاں مرحوم سمجھ جاتے تھے۔ کہ کچھ نہ کچھ آج ہے، جو اس طرح آئے ہیں۔ پوچھا، آج کچھ خفا ہو؟ کہا، نہیں، حضرت فیروزپور جھرکے جاتا ہوں۔ پوچھا، کیوں؟ کہا، بڑے صاحب (صاحب ریذیڈنٹ) نے حکم دیا ہے کہ جس کو ملنا ہو، بدھ کو ملاقات کرے۔ حضرت آپ جانتے ہیں، مجھے ہفتے میں ۱۰ دفعہ کام پڑتے ہیں، جب جی چاہا، گیا، جو ضرورت ہوئی، کہہ سُن آیا، مجھ سے یہ پابندیاں نہیں اُٹھتیں۔ میں یہاں رہتا ہی نہیں۔ فرمایا کہ تم سے کہلا ہے؟ کہا، مجھ سے تو نہیں کہا، سُنا ہے۔ بعض روسا گئے بھی تھے، ان سے ملاقات نہ کی۔ یہی کہلا بھیجا کہ بدھ کو ملیے۔ فرمایا کہ تمھارے واسطے نہیں ہے۔

اوروں کے لیے ہوگا۔ احمد بخش نے کہا کہ نہیں حضرت! یہ اہلِ فرنگ ہیں، ان کا قانون عام ہوتا ہے۔ جو سب کے لیے ہے، وہی میرے لیے ہوگا۔ فرمایا کہ بھلا تم جاؤ، تم ابھی جاؤ، دیکھو تو کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا، بہت خوب، جاؤں گا۔ فرمایا کہ جاؤں گا نہیں۔ اُٹھیے، بس ابھی جائیے۔ نواب نے کہا کہ نہیں۔ میں نے عرض کیا، ضرور جاؤں گا۔ بگڑ کر بولے کہ عرض و رض نہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ اسی وقت جائیے اور سیدھے وہیں جائیے گا۔ احمد بخش خاں بھی انداز دیکھ کر خاموش ہوئے اور اُٹھ کر چلے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ وہیں جانا اور مجھے پر ... ہے ذرا پھرتے ہوئے ادھر ہی کو آنا۔ اُستاد کہتے تھے کہ وہ تو گئے، مگر ان کو دیکھتا ... اور چہرے پر اضطراب کوئی دو گھڑی ہوئی تھی۔ ابھی میں بیٹھا غزل بنا رہا ہوں کہ دیکھتا ہوں، نواب ... سے چلے آتے ہیں۔ خوش خوش لبوں پر تبسم۔ آکر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ انھوں نے دیکھتے ہی کہا، کیوں صاحب؟ نواب بولے گیا تھا، وہ۔ اطلاع ہوتے ہی خود نکل آئے اور پوچھا ... نواب! اس وقت خلافِ عادت؟ میں نے کہا، بھئی میں نے سُنا، تم نے حکم دیا ہے کہ جو ہم سے ملے، بُڈھے کو ملے۔ ابھی میں نے تقریر تمام بھی نہ کی تھی کہ وہ بولے نہیں نہیں، نواب صاحب! آپ کے واسطے یہ حکم نہیں۔ آپ ان لوگوں میں نہیں ہیں۔ آپ جس وقت چاہیں، چلے آئیں۔ میں نے کہا! بھائی تم جانتے ہو، ریاست کے جھگڑے۔ میں خفقانی دیوانہ۔ کوئی بات کہنی ہے، کوئی سُننی ہے۔ بس میرے کام تو بند ہوئے۔ بھائی میں تو رخصت کو آیا تھا کہ فیروز پور چلا جاؤں گا۔ اب یہاں رہ کر کیا کروں۔ انھوں نے پھر وہی کلمات ادا کیے اور کہا، دن رات دن رات، جب جی چاہے۔ میں نے کہا، خیر تو خاطر جمع ہو گئی۔ اب میں جاتا ہوں۔ الٰہی بخش خاں مرحوم بھی شگفتہ ہو گئے اور کہا، بس اب جائیے، آرام کیجیے۔ آزاد۔ جو خدا کے لیے دُنیا کو چھوڑ بیٹھے ہیں، خدا بھی انھیں نہیں چھوڑتا۔

ساتھ ہی اُستاد مرحوم یہ بھی کہتے تھے اور یہ بات بھی لکھنے کے قابل ہے کہ زبان سے الٰہی بخش خاں مرحوم نے کبھی نہیں کہا، مگر میں جانتا ہوں، انھیں آرزو تھی کہ علی بخش خاں (ایک ہی بیٹا تھا) بذاتِ خود صاحبِ منصب اور صاحبِ امارت ہو، چچا کا اور اس کی اولاد کا دستِ نگر نہ ہو۔ ساز و سامان کر کے ریاستوں میں بھی بھیجا۔ صاحب لوگوں کے ہاں بھی بندوبست کیے۔ ظاہری و باطنی ساری کوششیں کیں۔ یہی بات نصیب نہ ہوئی۔ مشیت اللہ اور وہ خود بھی اخیر میں سمجھ گئے تھے۔ ایک دن اُنھیں باتوں میں اُستاد نے فرمایا کہ علی بخش خاں بھی خوبصورت اور شاندار امیر زادہ تھا۔ میں نے عرض کی کہ حضرت! کئی دفعہ بعض مجلسوں میں، بعض درباروں میں میں نے دیکھا، ایسے تو نہیں۔ افسردہ ہو کر کہا، کیا کہتے ہو۔ ذکرِ جوانی در پیری اور ذکرِ امیری در فقیری کس کو یقین آیا ہے۔

لطیفہ: اُستاد مرحوم نے فرمایا کہ ان دنوں مرزا خاں کوتوال تھے۔ مرزا قتیل کے شاگرد، فارسی نگاری اور انشا پردازی کے ساتھ سخن فہمی کے دعوے رکھتے تھے۔ منشی محمد حسین خاں میر منشی تھے اور فی الحقیقت نہایت خوش صحبت، خوش اخلاق، با مروت لوگ تھے۔ ایک روز دونوں صاحب الٰہی بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے اور تعارف رسمی کے بعد شعر کی فرمائش کی۔ انھیں اور لوگوں کی طرح یہ عادت نہ تھی۔ کہ خواہ مخواہ جو آئے انھیں اپنا شعر سنانے لگیں۔ اگر کوئی فرمائش کرتا تھا تو بات کو ٹال کر پہلے اُس کا کلام سُن لیتے تھے۔ شاعر نہ ہوتا تو کہتے کسی اور اُستاد کے دو چار شعر پڑھیے، جو آپ کو پسند ہوں۔ جب اُس کی طبیعت معلوم کر لیتے تو اُسی رنگ کا شعر اپنے اشعار میں سے سُناتے۔ اِسی بُنیاد پر ان سے کہا کہ آپ دونوں صاحب کچھ کچھ اشعار سنائیے۔ انھوں نے کچھ شعر پڑھے۔ بعد اس کے الٰہی بخش مرحوم نے دو تین شعر، وہ بھی ان کے اصرار سے پڑھے اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹال گئے۔ جب وہ چلے گئے تو مجھ سے کہنے لگے۔ میاں ابراہیم! تم نے دیکھا اور ان کے شعر بھی سُنے! عجب مجہول الکیفیت ہیں۔ کچھ حال ہی نہیں کھُلتا کہ ہیں کیا؟ یہی مرزا خاں اور منشی صاحب ہیں، جن کی سخن پردازی اور نکتہ یابی کی اتنی دھوم ہے اور اس پر تماش بینی کے بھی دعوے ہیں۔ رنڈی تو ان کے منہ پر دو جوتیاں بھی نہ مارتی ہوگی۔ بھلا یہ کیا کہیں گے اور کیا سمجھیں گے۔

آزاد۔ ملک سخن اور شاعری کا عالم۔ عالم گوناگوں ہے۔ ہمہ گیر ذہن اور کیفیتوں سے لُطف اُٹھانے والی طبیعت اس کے لیے لازم ہے۔ الٰہی بخش خاں مرحوم صاحبدل، پاکیزہ نفس، روشن ضمیر تھے، مگر ہر بات کو جانتے تھے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ بات کا جاننا اور چیز ہے اور کرنا اور چیز ہے۔ طبیعتیں ہیں کہ نہیں کرتیں اور سب کچھ جانتی ہیں اور ایسی بھی ہیں کہ سب کچھ کرتی ہیں اور کچھ نہیں جانتیں۔ خوشا نصیب اُن لوگوں کے جنھیں خدا اثر پذیر دل اور کیفیت کے پانے والی طبیعت عنایت کرے کہ عجب دولت ہے۔

ادھر ولی عہد بہادر کی فرمائشیں، اُدھر نواب مرحوم کی غزلوں پر طبیعت کی آزمائشیں تھیں کہ کئی برس کے بعد شاہ نصیر مرحوم دکن سے پھرے اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا۔ شیخ علیہ الرحمۃ کی مشقیں بہت زوروں پر چڑھ گئی تھیں۔ انھوں نے بھی مشاعرے میں جا کر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمائش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی، جس کی ردیف تھی، "آتش و آب و خاک و باد"، وہ غزل مشاعرے میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل کہے، اُسے میں اُستاد مانتا ہوں۔ دوسرے مشاعرے میں انھوں نے اس پر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر کچھ اعتراض ہوئے۔ جشن قریب تھا۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے بادشاہ کی تعریف میں

ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا۔ مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز کے پاس لے گئے کہ اس کے صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں۔ انھوں نے سُن کر پڑھنے کی اجازت دی کہ ولی عہد بہادر نے اپنے شقّے کے ساتھ اُسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ انھوں نے جو کچھ کہا تھا، وہی جواب میں لکھ دیا اور یہ شعر بھی لکھا ؎

بود بگفتۂ من حرفِ اعتراض چناں
کسے بدیدۂ بینا فرو برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا اور دربار شاہی میں جا کر قصیدہ سُنایا۔ اس کے بڑے بڑے چرچے ہوئے، اور کئی دن کے بعد سُنا کہ اس پر اعتراض لکھے گئے ہیں۔

شیخ مرحوم قصیدہ مذکور کو مشاعرے میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور روبرو سرِ معرکہ فیصلہ ہو جائے۔ چنانچہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک مستعد طالب علم کو کہ کتب تحصیلی اُسے خوب رواں تھیں، جلسے میں پیش کر کے فرمایا کہ انھوں نے اس پر اعتراض لکھے ہیں۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں، اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کے اعتراضوں کے لیے قابل خطاب ہوں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے کچھ تعلق نہیں، انھوں نے کچھ لکھا ہے۔ شیخ مرحوم نے کہا خیر تحریر تو اُسی وقت تک ہے کہ فاصلہ دوری درمیان ہو، جب آمنے سامنے موجود ہیں تو تقریر فرمائیے۔ قصیدے کا مطلع تھا:

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد
آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب و خاک و باد

معترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ جب پہاڑ کو بڑھنے کے سبب سے حرکت ہے تو اس میں آگ کو بھی حرکت ہو گی۔ معترض نے کہا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مشاہدہ! اُس نے کہا کہ کتابی سند دو۔ انھوں نے کہا، تاریخ سے ثابت ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی۔ اُس نے کہا کہ شاعری میں شعر کی سند درکار ہے، تاریخ شعر میں نہیں چلتی۔ حاضرینِ مشاعرہ ان جواب و سوال کی اُلٹ پلٹ کے تماشے دیکھ رہے تھے اور اعتراض پر حیران تھے کہ دفعتہً شیخ علیہ الرحمۃ نے یہ شعر محسن تاثیر کا پڑھا:

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم
آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

سُنتے ہی مشاعرے میں غُل سے ایک ولولہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی سودا کا مصرع گزرانا۔

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

اسی طرح اور اکثر سوال و جواب ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بیچ بیچ میں کچھ دخل دیتے جاتے تھے۔ آخر میں ایک شعر پر انھوں نے یہ اعتراض کیا۔ کہ اس میں ثبوت روانی کا نہیں ہے۔ شیخ علیہ الرحمتہ نے کہا یہاں تغلیب ہے۔ اس وقت خود شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ تغلیب کہیں آئی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ تغلیب کا قاعدہ عام ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ جب تک کسی اُستاد کے کلام میں نہ ہو جائز نہیں ہو سکتی۔ شیخ علیہ الرحمتہ نے کہا کہ آپ نے ۹ شعر کی غزل پڑھ کر فرمایا تھا کہ اس طرح میں کوئی غزل کہے تو ہم اُسے اُستاد جانیں۔ میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے، اب بھی اُستاد نہ ہُوا؟ معترض نے کہا کہ اس وقت مجھ سے اعتراضوں کا پورا سرانجام نہیں ہو سکتا، کل پر منحصر رکھنا چاہیئے اور جلسہ برخاست ہُوا۔

اُسی دن سے اُنھیں تکمیل علوم اور سیر کتب کا شغل واجب ہُوا۔ قدرتی سامان اس کا یہ کہ راجہ صاحب رام جو املاک شاہ اودھ کے مختار تھے، انھیں یہ شوق ہُوا کہ اپنے بیٹے کتب علمی کی تحصیل تمام کروائیں۔ مولوی عبدالرزاق کہ شیخ مرحوم کے قدیمی اُستاد تھے، وہی ان کے پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اتفاقاً ایک دن یہ بھی مولوی صاحب کے ساتھ گئے۔ چونکہ ان کی تیزی طبع کا شہرہ ہو گیا تھا، راجہ صاحب رام نے اُن سے کہا کہ میاں ابراہیم! تم ہمیشہ درس میں شریک ہو۔ چنانچہ نوبت یہ ہوگئی کہ اگر یہ کبھی شغل یا ضرورت کے سبب وہاں نہ جاتے تو راجہ صاحب رام کا آدمی انہیں ڈھونڈھ کر لاتا اور نہیں تو اُن کا سبق ملتوی رہتا۔

کہا کرتے تھے کہ جب بادشاہ عالم ولی عہدی میں تھے تو مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں ایک مثنوی ہم نے لکھی۔ اس کی بحر، مثنوی کی بحروں سے الگ تھی۔ لوگوں نے چرچا کیا کہ جائز نہیں۔ میر نجات کی گل کشتی ہماری دیکھی ہوئی تھی۔ مگر حکیم مرزا محمد صاحب رحمہم اللہ زندہ تھے اور میرے والد مرحوم انھیں کا علاج کرتے تھے۔ وسعتِ معلومات اور حصولِ تحقیقات کی نظر سے ہم نے ان سے جا کر پوچھا۔ انھوں نے فرمایا کہ رواجِ اتفاقی ہے، جو مثنوی انہی آٹھ بحروں میں منحصر ہو گئی ہے، ورنہ طبع سلیم پر کون حاکم ہے، جو روکے۔ جس بحر میں چاہو لکھو۔ اُستاد کے مسوّدوں میں ایک پرچے پر چند شعر اس کے نکلے تھے، اُن میں ساقی کا مضمون تھا۔ دو شعر اب تک یاد ہیں:

لٹلیاں تو نہ تھیں وہ مے عشرت کے سبو تھے
یا قلزم مستی کے حبابِ لب جو تھے
لازم تھا کہ لکھ باندھتے یہ اُن کے گلو میں
ہے بند کیا عیش کے دریا کو سبو میں

چند سوال کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سنایا کہ جس کے مختلف

شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صرف کیے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا، ان کی تعداد ۱۸ تھی۔ مطلع اس کا یہ ہے:

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرے مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے خاقانیِ ہند کا خطاب عطا کیا۔ اس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔

حافظ احمد یار نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک جنازہ رکھا ہے، بہت سے لوگ گرد جمع ہیں۔ وہاں حافظ عبدالرحیم کہ حافظ احمد یار کے والد تھے، ایک کھیر کا پیالہ لیے کھڑے ہیں اور شیخ علیہ الرحمۃ کو اس میں سے چمچے بھر بھر کر دیئے جاتے ہیں۔ حافظ موصوف نے اُن سے پوچھا کہ یہ مُوکر ہے اور جنازہ کس کا ہے۔ انھوں نے کہا، یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے اور میاں ابراہیم اُن کے قائم مقام مقرر ہوئے ہیں۔ خاقانیِ ہند کے خطاب پر لوگوں نے بڑے چرچے کیے کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا۔ کہن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ایک نوجوان کو ملک الشعرا بنایا اور ایسا عالی درجے کا خطاب دیا۔ ایک جلسے میں یہی گفتگو ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا۔ کہ جس قصیدے پر یہ خطاب عطا ہوا ہے، اُسے بھی تو دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ قصیدہ مذکور لا کر پڑھا گیا۔ میر کلو حقیر کہ شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے، سن کو بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے، کلام کو بھی تو دیکھو۔ ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانیِ ہند کے خطاب سے ملک الشعراء بنایا تو کیا بُرا کیا۔ مجھے یاد ہے، جب اُستاد مرحوم نے یہ احوال بیان کیا، اُس وقت بھی کہا تھا اور جب ہیں اربابِ زمانہ کی بے انصافی یا اُن کی بے خبری اور بے صبری سے دق ہو کر کچھ کہتا تو فرماتے تھے کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی باانصاف بھی بول اُٹھتا ہے، بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے۔ اپنا کام کیے جاؤ۔ ۲۶ برس کی عمر تھی، جبکہ جملہ منہیات سے توبہ کی اور اس کی تاریخ کہی ع

اے ذوق بگو سہ بار توبہ

مرزا ابوظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے تو انھوں نے پہلے یہ قصیدہ گزرانا:

روکش ترے رُخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگِ شفق
ہے ذرہ تیرا پرتو انور سحر رنگِ شفق

اگرچہ مرزا ابوظفر ہمیشہ انھیں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اور دلی رازوں کے لیے مخزن اعتبار سمجھتے تھے، مگر ولی عہدی میں مرزا مغل بیگ مختار تھے۔ جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کے موقعے آئے تو اُستاد کے لیے یہ ہُوا کہ للعہ مہینے سے ۳۰ ہو گئے۔ ۳۰ سے ۴۰ روپے ہو گئے۔

جب بادشاہ ہوئے اور مرزا مغل بیگ وزیر ہوئے تو وزیر شاہی کا سارا کنبہ قلعے میں بھر گیا، مگر اُستادِ شاہی کو سو روپیہ مہینہ! پھر بھی انھوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کے لیے عرض نہیں کی۔ ان کی عادت تھی کہ فکرِ سخن میں ٹہلا کرتے تھے اور شعر موزوں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان دنوں میں جب کوئی عالی مضمون چستی اور درستی کے ساتھ موزوں ہوتا۔ تو اس کے سرور میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھرتے:

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

میاں عبدالعزیز خاں صاحب ایک مردِ بزرگ صاحب نسبت فقیر تھے۔ شیخ مرحوم بھی اُن سے بہت اعتقاد رکھتے۔ اس عالم میں ایک دن اُن کے پاس گئے اور کہا کہ تخت نشینی سے پہلے حضور کے بڑے بڑے وعدے تھے، لیکن اب یہ عالم ہے، الف کے نام ب نہیں جانتے، زباں تک درست نہیں، مگر جو کچھ ہیں، مرزا مغل بیگ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خدائی کے کارخانے ہیں اگرچہ عقل ظاہر میں کام نہیں کرتی۔ مگر یہ دیکھو کہ جو دولت تم کو دی ہے، وہ اس کو بھی تو نہیں دی ہے۔ جس دعوے سے تم دربار میں کھڑے ہو کر اپنا کلام پڑھتے ہو، اس دعوے سے وہ اپنی وزارت کے مقام پر کب کھڑا ہو سکتا ہوگا؟ ادنے ادنے منشی متصدی اس کے لکھتے پڑھتے ہوں گے، وہ کیسا ترستا ہوگا۔ کہ نہ ان کے لکھے کو سمجھ سکتا ہے، نہ ان کا جھوٹ سچ معلوم کر سکتا ہے۔ شیخ مرحوم نے ان کی ہدایت کو تسلیم کیا اور پھر کبھی شکایت نہ کی۔

چند روز کے بعد مرزا مغل بیگ کی ترقی تمام ہوگئی۔ تمام کنبہ قلعے سے نکالا گیا۔ نواب حامد علی خاں مرحوم مختار ہو گئے، جب اُستادِ شاہی کا سو روپیہ مہینہ ہوا۔ ہمیشہ عیدوں اور نوروزوں کے جشنوں میں قصیدے مبارکباد کے پڑھتے تھے اور خلعت سے اعزاز پاتے تھے۔

اواخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی اور انھوں نے ایک قصیدۂ غرا کہہ کر گزرانا تو خلعت کے علاوہ خطاب خاں بہادر اور ایک ہاتھی معہ حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔

پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہہ کر گزرانا۔ جس کا مطلع ہے۔ ع
شب کو میں اپنے سرِ بستر خواب راحت

اُس پر ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا۔

جس رات کی صبح ہوتے انتقال ہوا، قریب شام میں بھی موجود تھا کہ انھیں پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی۔ خلیفہ صاحب نے اُٹھایا۔ چوکی پاس ہی لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ کا سہارا دیا اور

انھوں نے کھسک کر آگے بڑھنا چاہا۔ طاقت نے یاری نہ دی تو کہا، آہ ناتوانی! خلیفہ صاحب نے فرمایا، شاعروں ہی کا ضعف ہو گیا۔ حافظ ویران بھی بیٹھے تھے۔ وہ بولے آپ نے بھی ضعف کے بڑے بڑے مضمون باندھے ہیں۔ مسکرا کر فرمایا کہ اب تو کچھ اُس سے بھی زیادہ ہے۔ میں نے کہا، سبحان اللہ! اس عالم میں بھی مبالغہ قائم ہے۔ خدا اسی مبالغے کے ساتھ توانائی دے۔ میں رخصت ہُوا۔ رات اِسی حالت سے گزری۔ صبح ہوتے کہ ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ جمعرات کا دن تھا، ۱۷ اردن بیمار رہ کر وفات پائی۔ مرنے سے ۳ گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا۔

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا
کیا آدمی تھا خدا مغفرت کرے

شعرائے ہند نے جس قدر تاریخیں ان کی کہیں، آج تک کسی بادشاہ یا صاحب کمال کو نصیب نہیں ہوئیں ؁

اُردو اخبار ان دنوں دہلی میں جاری تھا۔ برس دن تک کوئی اخبار اُس کا ایسا نہ تھا۔ جس میں ہر ہفتے کئی کئی تاریخیں نہ چھپی ہوں ؁

# خاص حالات اور طبعی عادات

شیخ مرحوم قدوقامت میں متوسط اندام تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

آدمیت سے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

رنگ سانولا، چیچک کے داغ بہت تھے۔ کہتے تھے کہ ۹ دفعہ چیچک نکلی تھی، مگر رنگت اور وہ داغ کچھ ایسے مناسب و موزون واقع ہوئے تھے کہ چمکتے تھے اور بھلے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز تھیں۔ چہرے کا نقشہ کھڑا تھا۔ اور بدن میں پھُرتی پائی جاتی تھی۔ بہت جلد چلتے تھے۔ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے۔ اور وہ اُن کو نہایت زیب دیتے تھے۔ آواز بلند اور خوش آئند۔ جب مشاعرے میں پڑھتے تھے تو محفل گونج اُٹھتی تھی۔ اُن کے پڑھنے کی طرز اُن کے کلام کی تاثیر کو زیادہ زور دیتی تھی۔ اپنی غزل آپ ہی پڑھتے تھے۔ کسی اور سے ہرگز نہ پڑھواتے تھے ؁

صانع قدرت جنھیں صاحب کمال کرتا ہے، اُنھیں اکثر صفتیں دیتا ہے، جن میں وہ اپنے جنس سے صاف الگ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی تیزی ذہن اور تراقی طبع کا حال تو اب

بھی ان کے کلام سے ثابت ہے۔ مگر قوتِ حافظہ کے باب میں ایک ماجرا عالمِ شیر خواری کا انھوں نے بیان کیا، جسے سُن کر سب تعجب کریں گے۔ کہتے تھے، مجھے اب تک یاد ہے کہ اس عالم میں ایک دن مجھے بخار تھا۔ والدہ نے پلنگ پر لٹا کر لحاف اوڑھا دیا اور آپ کسی کام کو چلی گئیں۔ ایک بلّی لحاف میں گھس آئی۔ مجھے اس سے اور اُس کی خرخر کی آواز سے نہایت تکلیف معلوم ہونے لگی۔ لیکن نہ ہاتھ سے ہٹا سکتا تھا، نہ زبان سے پکار سکتا تھا۔ گھبراتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں والدہ آگئیں۔ انھوں نے اسے ہٹایا تو مجھے غنیمت معلوم ہوا اور وہ دونوں کیفیتیں اب تک یاد ہیں۔ چنانچہ میں جب بڑا ہُوا تو میں نے والدہ سے پوچھا انھوں یاد کر کے اس واقعے کی تصدیق کی اور کہا کہ فی الحقیقت اُس وقت تیری عمر برس دن سے کچھ کم تھی۔

صلاحیت طبع کے باب میں خدا کا شکر کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایک دن املی کے درخت میں کنکوا اٹک گیا۔ میں اُتارنے کو اُوپر چڑھ گیا، اور ایک ٹہنی کو سہارا کے قابل سمجھ کر پاؤں رکھا۔ وہ ٹوٹ گئی۔ میں نیچے آپڑا۔ بہت چوٹ لگی، مگر خدا نے ایسی توفیق دی کہ پھر نہ کنکوا اُڑایا، نہ درخت پر چڑھا۔

عمر بھر اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا۔ عالمِ جوانی کا ذکر کرتے تھے کہ یاروں میں ایک مجرب نسخہ قوتِ باہ کا بڑی کوششوں سے ہاتھ آیا۔ شریک ہو کر اُس کے بنانے کی صلاح ٹھہری۔ ایک ایک جزو کو بہم پہنچانا ایک ایک شخص کے ذمے ہُوا۔ چنانچہ ہم چڑیوں کے مغز ہمارے سر ہُوا۔ ہم نے گھر آکر اُن کے پکڑنے کے سامان پھیلا دیئے اور دو تین چڑیاں پکڑ کو ایک پنجرے میں ڈالے۔ ان کا پکڑنا دیکھ کر دل میں خیال آیا کہ ابراہیم ایک پل کے مزے کے لیے بے گناہوں کا مارنا کیا انسانیت ہے؟ یہ بھی آخر جان رکھتے ہیں۔ اور اپنی پیاری زندگی کے لیے ہر قسم کی لذتیں رکھتے ہیں۔ اُسی وقت اُٹھا انھیں چھوڑ دیا اور سب سامان توڑ پھوڑ کر یاروں میں جا کر کہہ دیا کہ بھئی ہم اس نسخے میں شریک نہیں ہوتے۔

اِن کی عادت تھی کہ ٹہلتے بہت تھے۔ دروازے کے آگے لمبی گلی تھی۔ اکثر اس میں پھرا کرتے تھے۔ رات کے وقت ٹہلتے ٹہلتے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ایک سانپ گلی میں چلا جاتا تھا۔ حافظ غلام رسول ویران شاگرد رشید بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا کہ حضرت پھر آپ نے اُسے مارا نہیں؟ کسی کو آواز دی ہوتی۔ فرمایا کہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا، مگر پھر میں نے کہا کہ ابراہیم! آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہے، تجھے کے رکعت کا ثواب ہوگا؟ پھر یہ قطعہ پڑھا:

چہ خوش گفت فردوسیٔ پاک زاد
کہ رحمت بر آں تربتِ پاک باد

میازار مورے کہ دانہ کش است
کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ ع

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت

چڑیاں سایہ بان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں۔ اور ان کے تنکے جو گرتے تھے، انھیں لینے کو بار بار اُن کے پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالمِ محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی۔ انھوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی، انھوں نے پھر اُڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہُوا تو ہنس کر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا، ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے۔ وہ نابینا ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے سر پہ تو نہیں بیٹھتی۔ اُستاد نے کہا کہ بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ ملاّ ہے، عالم ہے، حافظ ہے، ابھی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیْدُ کی آیت پڑھ کر کُلُوْا وَاشْرَبُوْا بِسْمِ اللہِ اَللہُ اَکْبَرْ کر دے گا۔ دیوانی ہے، جو تمھارے سر پہ آئے؟

فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے تین سو دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے اور اُن کا خلاصہ کیا۔ خانِ آرزو کی تصنیفات اور ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں گویا اُن کی زبان پر تھیں، مگر مجھے اس کا تعجب نہیں۔ اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر انھیں یاد تھے تو مجھے حیرت نہیں۔ گفتگو کے وقت جس تڑاقے سے وہ شعر سند میں دیتے تھے، مجھے اس کا بھی خیال نہیں، کیونکہ جس فن کو وہ لیے بیٹھے تھے، یہ سب اُس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحبِ نظر مُورّخ۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہیں۔ خصوصاً تصوّف میں ایک عالم خاص تھا۔ جب تقریر کرتے تھے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں کہ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود میں علمِ اشراق کا پرتوہ دے کر کبھی ابوسعید ابوالخیر تھے، کبھی محی الدین ابنِ عربی۔ پھر جو کہتے تھے، ایسے کانٹے کی تول کہتے تھے کہ دل پہ نقش ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ اُن سے سُن لیا ہے، آج تک دل پر نقش ہے۔ رمل اور نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیر میں اُنھیں خدا نے ایک ملکہ رسا سنجہ دیا تھا اور لُطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے۔ اگرچہ مجھے اس قدر وسعتِ نظر بہم پہنچانے کا تعجب ہے، مگر اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ ان کے حافظے میں

اس قدر مضامین محفوظ کیونکر رہے۔

وہ کہتے تھے کہ اگرچہ شعر کا مجھے بچپن سے عشق ہے، مگر ابتدا میں دُنیا کی شہرت اور ناموری اور تفریح طبع نے مجھے مختلف کمالوں کے رستے دکھائے۔ چند روز موسیقی کا شوق ہُوا اور کچھ حاصل بھی کیا، مگر خاندیس سے ایک بڑا صاحب کمال گویا آیا۔ اُس سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ جو گانے کا شوق کرے، اس کے لیے ۳۰۰ برس کی عمر چاہیے۔ ۱۰۰ برس سیکھے، ۱۰۰ برس سُنتا پھرے اور جو سیکھا ہے، اُسے مطابق کرے۔ پھر سو برس بیٹھ کر اوروں کو سُنائے اور اُس کا لُطف اٹھائے۔ یہ سُن کر دل برداشتہ ہو گیا اور یہ بھی خیال آیا کہ ابراہیم اگر بڑا کمال پیدا کیا تو ایک ڈوم ہو گئے۔ اس پر بھی جو کلاونت ہو گا، وہ ناک چڑھا کر یہی کہے گا کہ اتائی ہیں۔ ایک سپاہی زادے سے ڈوم بننا کیا ضرور ہے۔

نجوم و رمل کا بھی شوق کیا۔ اُس میں دست گاہ پیدا کی۔ نجوم کا ایک صاحب کمال مغل پورہ میں رہتا تھا۔ اُس سے نجوم کے مسائل حل کیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی سوال کا نہایت درست جواب اُس نے دیا اور گفتگو ہوتے ہوتے یہ بھی کہا کہ یہ ایک ستارے کا حال اور اس کے خواص معلوم کرنے کے لیے ۷۰ برس چاہیے ہیں۔ سُن کر اس سے بھی دل برداشتہ ہو گیا۔

طب کو چند روز کیا۔ اس میں خونِ ناحق نظر آنے لگے۔ آخر جو طبیعت خدا نے دی تھی، وہی خوبیٔ قسمت کا سامان بنی۔

مکھن لال کے گنج میں ایک جوتشی پنڈت تلسی رام نابینا تھے۔ ایک مرد دیرینہ سال منشی درگا پرشاد کہ شیخ مرحوم کے قدیمی دوست اور جوتشی صاحب کے پاس بھی جایا کرتے تھے، اُنھوں نے جوتشی صاحب کی بہت تعریف کی اور ایک دن قرار پا کر یہ بھی اُن کے پاس گئے۔ کئی دلچسپ سلسلے گفتگوؤں کے ہوئے۔ بعد ازاں اُنھوں نے بے اظہار نام اپنے زائچے کی صورت حال بیان کی۔ جوتشی صاحب نے کہا۔ کہ وہ شخص صاحب کمال ہو اور غالباً کمال اس کا کسی ایسے فن میں ہو کہ باعث تفریح ہو۔ اس کا کمال رواج خوب پاوے۔ اس کے حریف بھی بہت ہوں، مگر کوئی سامنے نہ ہو سکے۔ وہ اسی قسم کی باتیں کہے جاتے تھے، جو شیخ مرحوم نے پُوچھا کہ اس کی عمر کیا ہو؟ انھوں نے کہا کہ ۷۷، ۷۸، ۷۹، یہ سُن کر شیخ مرحوم کے چہرے پر آثارِ ملال ظاہر ہوئے اور خدا کی قدرت ۷۸ برس کی عمر میں انتقال ہُوا۔ اگرچہ عقلاً اور نقلاً احکام نجوم پر اعتقاد نہ کرنا چاہیے، لیکن واقعہ پیش نظر گزرا تھا، اس لیے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا۔ میں بھی دیکھتا تھا کہ انھیں آخر عمر میں مرنے کا خیال اکثر رہتا تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ غسل صحت کا جشن قریب تھا۔ انھوں نے مبارکباد کا قصیدہ کہا۔ میں حسبِ معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ اور وہ اس وقت قصیدہ ہی لکھ

رہے تھے۔ چنانچہ کچھ اشعار اُس کے سنانے لگے، مطلع تھا:

۵ زہے نشاط کہ گر کیجئے اُسے تحریر عیاں ہو خامے سے تحریر نغمہ جائے صریر

اُس کے آگے شعر سُناتے جاتے تھے۔ میں تو اب بند کرتا جاتا تھا۔ وہ مُسکراتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب یہ شعر پڑھا:

ہوا پہ دوڑتا ہے اِس طرح سے ابرِ سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی فیلِ مست بے زنجیر

بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ سبحان اللہ۔ رنگینی اور یہ زور۔ ظہوری کا ساقی نامہ ہو گیا چپ ہو گئے اور کہا کہ اس میں زور آتا جاتا ہے، میں گھُلا جاتا ہوں۔ اس کی جوانی ہے اور میرا بڑھاپا ہے۔ حافظ ویران سلمہ اللہ نے بیان کیا۔ اشعار بہاریہ کے سے ہیں۔ دو تین دفعہ فرمایا، خواجہ حافظ کا شعر بھی اس موقع سے تضمین کریں گے:

مے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

ایک دن جو میں گیا تو جو شعر پرچوں پر پریشان تھے، اُنھیں ترتیب دیا تھا۔ چنانچہ سُناتے سُناتے پھر شعر مذکور پڑھا۔ بعد اس کے قطعہ پڑھا کہ خود کہا تھا۔

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہِ عیش و نشاط کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدرِ منیر
اگر پیالہ ہے صغرا تو ہے سبو کبرا
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

میری طرف دیکھ کر فرمایا، اب بھی؟ میں نے عرض کی، سبحان اللہ! اب اس کی کیا ضرورت رہی؟ آنکھیں بند کر کے فرمایا، اُدھر ہی کا فیضان ہے۔

دِلّی میں نواب زینت محل کا مکان لال کنوئیں کے پاس اب بھی موجود ہے۔ بادشاہ نے وہیں دربار کر کے یہ قصیدہ سُنا تھا۔ اِس برس ایک شادی کی تقریب میں مجھے دِلّی جانا ہوا۔ اِسی مکان میں برات بیٹھی تھی۔ فتح دہلی کے بعد گورنمنٹ وہ مکان سرکارِ پٹیالہ کو دے دیا ہے۔ بند پڑا رہتا ہے۔ اب اِتنے ہی کام کا ہے کہ اُدھر کے ضلع میں کوئی برات یا شادی کا جلسہ ہوتا ہے تو داروغہ سے اجازت لے کر وہاں آن بیٹھتے ہیں۔ واہ:

کُشتوں کی تیری چشمِ سیہ مست کے مزار
ہو گا خراب بھی تو خرابات ہوئے گا

وُہ زمانہ اور آج کی حالت دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔

ان کی طبیعت کو خدا تعالیٰ نے شعر سے ایسی مناسبت دی تھی کہ رات دن اس کے سوا کچھ خیال نہ تھا اور اسی میں خوش تھے۔ ایک تنگ و تار یک مکان تھا، جس کی انگنائی اس قدر تھی کہ ایک چھوٹی سی چارپائی ایک طرف بچھتی تھی۔ دو طرف اتنا رستہ رہتا تھا، کہ ایک آدمی چل سکے۔ حقہ منہ سے لگا رہتا تھا۔ کھرّی چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے۔ لکھتے جاتے تھے یا کتاب دیکھے جاتے تھے۔ گرمی، جاڑا، برسات تینوں موسموں کی بہاریں وہیں بیٹھے گزر جاتی تھیں۔ اُنھیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی میلا، کوئی عید اور کوئی موسم، بلکہ دُنیا کے شادی و غم سے انھیں سروکار نہ تھا۔ جہاں اوّل روز بیٹھے! وہیں بیٹھے! اور جبھی اُٹھے کہ دُنیا سے اُٹھے۔

نمازِ عصر کے وقت میں ہمیشہ حاضرِ خدمت ہوتا تھا۔ نہا کر وضو کرتے تھے اور ایک لوٹے سے برابر کُلّیاں کیے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ متاسفانہ طور سے بولے کہ خدا جانے کیا کیا ہزلیات زبان سے نکلتے ہیں۔ خیر یہ بھی ایک ہے۔ پھر ذرا تامل کر کے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہ مطلع اُسی وقت کہہ کر پڑھا:

پاک رکھ اپنا دہان ذکرِ خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

اُن کا معمول تھا کہ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر بادشاہ کی غزل کہتے تھے۔ آدھی بجے تک اُس سے فراغت ہوتی تھی۔ پھر وضو کرتے اور وہی ایک لوٹے پانی سے کُلّیاں کر کے نماز پڑھتے پھر وظیفہ شروع ہوتا۔ زیرِ آسماں کبھی ٹہلتے جاتے، کبھی قبلہ رو ٹھہر جاتے۔ اگرچہ آہستہ آہستہ پڑھتے تھے، مگر اکثر اوقات اس جوشِ دل سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا، گویا سینہ پھٹ جائے گا۔ وظیفہ پڑھ کر دُعائیں شروع ہوتی تھیں۔ یہ گویا ایک نمونہ تھا۔ اُن کی طبیعت کی نیکی اور عام نیک خواہی کا۔ اس میں سب سے پہلے یہ دُعا تھی، الٰہی ایمان کی سلامتی، بدن کی صحت، دُنیا کی عزت و حُرمت۔ پھر الٰہی میرے بادشاہ کو با دولت، با اقبال، صحیح و سالم رکھ۔ اس کے دُشمن رد ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ پھر میاں اسمٰعیل یعنی اپنے بیٹے کے لیے، پھر اپنے عیال اور خاص خاص دوستوں کے لیے، یا جو کسی دوست کے لیے خاص مشکل در پیش ہو، وغیرہ وغیرہ۔ ایک شب اس موقع پر میرے والدِ مرحوم انہی کے ہاں تھے۔ ساری دُعائیں سُنا کیے۔ چنانچہ اُن کے دروازے کے سامنے محلے کا حلال خور رہتا تھا۔ اُن دنوں میں اُس کا بیل بیمار تھا۔ دُعائیں مانگتے وہ بھی یاد آگیا۔ کہا کہ الٰہی حمّا حلال خور کا بیل بیمار ہے، اُسے بھی شفا دے۔ بچارا بڑا غریب ہے۔ بیل مر جائے گا تو یہ بھی مر جائے گا۔ والد نے جب یہ سُنا تو بے اختیار ہنس پڑے۔ فقرا اور بزرگانِ دین کے ساتھ انھیں ایسا دِلی اعتقاد تھا کہ اُس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ علما اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ با ادب یاد کرتے

بھتے اور کبھی اُن پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے، اس واسطے اُن کا مذہب کا حال کسی پر نہ کھُلا۔

اِس میں کسی کو کلام نہیں کہ اُنھوں نے فکرِ سخن اور کثرتِ مشق میں فنا فی الشعر کا مرتبہ حاصل کیا۔ اور انشا پردازیٔ ہند کی رُوح کو شگفتہ کیا، مگر فصاحت کا دل کملا جاتا ہوگا، جب اُن کے دیوانِ مختصر پر نگاہ پڑتی ہوگی۔ اس کے سبب کا بیان کرنا ایک سخت مصیبت کا افسانہ ہے اور اس کی مرثیہ خوانی کرنی میرا فرض ہے۔ اُن کی وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے کہ وہ بھی باپ کی طرح اکلوتے بیٹے تھے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ متفرق غزلوں کے بستے اور بڑی بڑی پوٹلیں تھیں۔ بہت سی تھیلیاں اور مٹکے بھتے کہ جو کچھ کہتے تھے، گویا بڑی احتیاط سے اُن میں بھرتے جاتے تھے۔ بہت سی متفرق غزلیں بادشاہ کی بہتری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں۔

چنانچہ اوّل اُن کی اپنی غزلیں اور قصائد انتخاب کر لیے۔ یہ کلام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام میں نے جاری کیا، مگر باطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح ایکا یک زمانے کا ورق اُلٹ جائے گا، عالم تہ و بالا ہو جائے گا، حسرتوں کے خون بہ جائیں گے، دل کے ارمان دل ہی دل میں رہ جائیں گے۔ دفعتہً ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل اُن کے فرزندِ جسمانی کے ساتھ ہی اُن کے فرزندِ روحانی بھی دُنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہُوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتہً گھر میں گھُس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہُوا گھر سامنے تھا کہ میں حیران کھڑا تھا۔ کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں۔ ان کی غزلوں کی جُنگ پر نظر پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسین! اگر خدا نے کرم کیا اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہوں گے، جو یہ غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو وہ مر کر بھی زندہ ہیں، یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جُنگ اُٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ کر ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے، بلکہ شہر سے نکلا۔ ساتھ ہی زبان سے نکلا کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے۔ دِلّی بھی ایک بہشت ہے۔ انھی کا پوتا ہوں۔ دہلی سے کیوں نہ نکلوں؟ غرض میں تو آوارہ ہو کر خدا جانے کہاں کا کہاں نکل آیا، مگر حافظ غلام رسول ویران کہ محبت کے لحاظ سے میرے شفیق دوست اور مرحوم کی شاگردی کے سبب روحانی بھائی ہیں، اُنھوں نے شیخ مرحوم کے بعض اور درد خواہ دوستوں سے ذکر کیا کہ مسودوں کا سرمایہ تو سب دِلّی کے ساتھ برباد ہُوا۔ اس وقت یہ زخم تازہ ہے، اگر اب دیوان مرتب نہ ہُوا تو کبھی نہ ہوگا۔ حافظِ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد ہے اور خدا نے اُن کی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی ہیں کہ آنکھوں کی بصارت کے محتاج نہیں۔ اس لیے لکھنے کی سخت مشکل ہوئی۔ غرض کہ ایک مشکل میں کئی کئی

مشکلیں تھیں۔ انھوں نے اس مہم کو سرانجام کیا اور اپنی یاد کے علاوہ نزدیک بلکہ دُور دُور سے بہت کچھ بہم پہنچایا۔ سب کو سمیٹ کر ۱۲۷۹ھ میں ایک مجموعہ، جس میں اکثر غزلیں تمام اور اکثر ناتمام، بہت سے متفرق اشعار اور چند قصیدے ہیں، چھاپ کر نکالا، مگر دردمندی کا دل پانی پانی ہو گیا اور عبرت کی آنکھوں سے لہو ٹپکا، کیونکہ جس شخص نے دُنیا کی لذتیں، عمر کے مختلف موسم اور موسموں کی بہاریں، دن کی عیدیں، اور رات کی شب براتیں، بدن کے آرام، دل کی خوشیاں، طبیعت کی اُمنگیں سب چھوڑ دیں اور ایک شعر کو لیا، جس کی انتہائے تمنا یہی ہو گی کہ اس کی بدولت نام نیک باقی رہے گا۔ تباہ کار زمانے کے ہاتھوں آج اس کی عمر بھر کی محنت نے یہ سرمایہ دیا اور جس نے ادنی ادنی شاگردوں کو صاحب دیوان کر دیا، اس کو یہ دیوان نصیب ہوا۔ خیر ع

یونہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے

میرے پاس بعض قصیدے ہیں، اکثر غزلیں ہیں، داخل ہو جائیں گی یا ناتمام غزلیں پوری ہو جائیں گی، مگر تصنیف کے دریا میں سے پیاس بھر پانی بھی نہیں۔ چنانچہ یہ تذکرہ چھپ لے تو اس پر توجہ کروں۔ مسبب الاسباب سرانجام کے اسباب عنایت فرمائے۔

جو غزلیں اپنے تخلص سے کہی تھیں، اگر جمع کی جائیں تو بادشاہ کے چاروں دیوانوں کے برابر ہوں گی۔ غزلوں کے دیوان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر ان کے کلام کی تازگی، مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے، مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا۔ شاہ نصیر سے ان دنوں معرکے ہو رہے تھے۔ اُن کا ڈھنگ وہی تھا۔ اس لیے انھوں نے بھی وہی اختیار کیا۔ اس کے علاوہ مرزا کی طرز کو جلسے کے گرمانے میں اور لوگوں کے لب و دہن سے واہ وا نکال لینے میں ایک عجیب جادو کا اثر ہے۔ چنانچہ وہی مشکل طرحیں، چست بندشیں، برجستہ ترکیبیں، معانی کی بلندی، الفاظ کی شکوہ ہیں ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ چند روز کے بعد الٰہی بخش خاں معروف کی خدمت میں اور ولی عہد کے دربار میں پہنچے۔ معروف ایک دیرینہ سال مشّاق اور فقیر مزاج شخص تھے۔ ان کی پسند طبع کے بموجب انھیں بھی تصوّف اور عرفان اور درد دلی کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا۔ نوجوان ولی عہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ ادھر یہ بھی جوان ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ طبیعت بھی جوان تھی۔ وُہ جُرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے اور جُرأت اور سیّد انشاء و مصحفی کے مطلعے اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر آتے جرأت اور سید انشاء و مصحفی کے مطلعے اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر آتے رہتے تھے۔ اُن کی غزلیں انہی کے انداز میں بناتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہُوا کہ ان کی غزل آخر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے، ایک دو تصوف کے دو تین معاملے کے اور بیچ اس میں یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اسی میں بندھے تو لطف دے، نہیں تو بیکار رہے۔ پس وہ مشّاق باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھے ہوئے

تھا۔ اور جس قافیے کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا، اسی میں باندھ دیتا تھا اور اس طرح باندھتا تھا کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورے کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور انہی اصول کے لحاظ سے میرؔ، مرزاؔ، دردؔ، مصحفیؔ، سید انشاءؔ، جراتؔ بلکہ تمام شعرائے متقدمین کو اس ادب سے یاد کرتے تھے، گویا، انھیں کے شاگرد ہیں۔ ایک ایک کے چیدہ اشعار اس محبت سے پڑھتے تھے، گویا اسی دستورالعمل سے انھوں نے تہذیب پائی ہے اور فی الحقیقت سب کے انداز کو اپنے اپنے موقع پر پورا پورا کام میں لاتے تھے۔ پھر بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ اصلی میلان ان کی طبیعت کا سوداؔ کے انداز پر زیادہ تھا۔ نظمِ اُردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف نے قصیدے پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ اُن کے بعد شیخ مرحوم کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اُٹھایا اور اُنھوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ انوریؔ ظہیرؔ، ظہوریؔ، نظیریؔ، عرفیؔ، فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں، لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دکھایا۔ ہر جشن میں ایک قصیدہ کہتے تھے اور خاص خاص تقریبیں جو پیش آتی تھیں، وہ الگ تھیں مگر اس لیے اگر جمع ہوتے تو خاقانیٔ ہند کے قصائد خاقانی شروانی سے دوچند ہوتے۔ جب تک اکبر شاہ زندہ تھے، تب تک اُن کا دستور تھا کہ قصیدہ کہہ کر لے جاتے اور اپنے آقا یعنی ولی عہد بہادر کو سُناتے۔ دوسرے دن ولی عہد ممدوح اُس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلوا کر لے جاتے اور دربارِ شاہی میں سنواتے۔ افسوس یہ ہے کہ عالمِ جوانی کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی۔ جو کچھ ہیں، وہ چند قصیدے ہیں کہ بڑھاپے کی ہمت کی برکت ہے۔

نواب حامد علی خاں مرحوم نے نہایت شوق سے ایک عاشقانہ خط لکھنے کی اُنھیں فرمائش کی تھی۔ بادشاہ کی متواتر فرمائشیں یہاں ایسے کاموں کے لیے کب فرصت دیتی تھیں، مگر اتفاق کہ انہی دنوں میں رمضان آگیا اور اتفاق پر اتفاق یہ کہ بادشاہ نے روزے رکھنے شروع کر دیے اس سبب سے غزل کہنی موقوف کر دی۔ خیر ان کی زبان کب رہ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نئے چمن کی ہوا کھانے کو اپنا بھی جی چاہتا تھا۔ انھوں نے وہ نامہ لکھنا شروع کیا۔ اُس نے ایسا طول کھینچا کہ تخمیناً ۲۰۰ شعر اس کے ہوگئے۔ اس عرصے میں تین تختیاں اس سے سیاہ ہوئی تھیں، مگر ادھر رمضان ہو چکا، بادشاہ کی غزلیں پھر شروع ہو گئیں۔ مثنوی وہیں رہ گئی۔ بیچ میں کبھی کبھی پھر بھی طبیعت میں امنگ اُٹھی، مگر کبھی ایک دن کبھی دو دن۔ ۲۰ - ۲۵ شعر ہوئے، پھر رہ گئے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور ہر وقت پاس رہنے لگا تو کئی دفعہ ان کے متعلق ذکر کرتے اور جا بجا کے شعر پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن وہ تختیاں اور کاغذی مسودے نکلوائے۔

بہت کم تھا، جو کچھ کہ پڑھا جاتا تھا۔ آخر فرصت کے وقت نکال کر ان سے پڑھواتے گئے اور آپ لکھتے گئے۔ کل ۵۰۰ شعر سے زیادہ ہوئے۔ اگرچہ نامہ ناتمام تھا، مگر ایک ایک مصرع سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق تھا۔ میرے صاف کیے ہوئے مسودے بھی اپنی متفرق غزلوں میں تھے، جو میں خلیفہ صاحب کے پاس جا کر صاف کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اُن کے ساتھ وہ بھی گئے۔ اس کا نام نامۂ جانسوز تھا۔ اوّل حمد و نعت تھی، پھر ساقی نامہ، پھر القابِ معشوق۔ اسی میں اس کا سراپا، اس کے بعد یادِ ایام۔ اس میں چاروں موسموں کی بہار، مگر اس کے معنوں کی نزاکت، لفظوں کی لطافت، ترکیبوں کی خوبیاں، اندازوں کی شوخیاں، کیا کہوں! سامری کے جادو اور جادو کے طلسم اُس کے آگے دھواں ہو کر اُڑ جاتے تھے۔

کئی مخمس تھے۔ کئی رباعیاں تھیں۔ صدہا تاریخیں تھیں، مگر تاریخوں کی کمائی بادشاہ کے حصے میں آئی، کیونکہ بہت بلکہ کل تاریخیں انہی کی فرمائش سے ہوئیں اور انہی کے نام سے ہوئیں۔ مرثیہ، سلام کہنے کا انھیں موقع نہ ملا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ کی طرح محرم میں کم از کم ایک سلام ضرور کہتے تھے۔ شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔ ہزاروں گیت، ٹپے، ٹھمریاں، ہولیاں کہیں۔ وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہوئیں اور ان باتوں میں اپنی شہرت چاہتے بھی نہ تھے۔ میرے نزدیک ان کے اور ان کے دیکھنے والوں کے لیے بڑے فخر کی بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے کمالِ شاعری اور ایسا اعلیٰ درجہ قادر الکلامی کا انھیں دیا اور ہزاروں آدمیوں سے انھیں ناراضی یا رنج پہنچا ہوگا، مگر انھوں نے تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہیں کہا۔ خدا ہر شخص کو اس کی نیت کا پھل دیتا ہے۔ اس کی شان دیکھو کہ ۷۰ برس کی عمر پائی، مگر خدا نے اُن کی ہجو بھی کسی کے منہ سے نہ نکلوائی۔

اکثر نئے ایجاد و اختراع اِن کے ارادے میں تھے اور بعض بعض ارادے شروع، مگر ناتمام رہے، کیونکہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ اتنا تھا کہ بات نکالتا، مگر اُسے سمیٹ نہ سکتا تھا۔ اس کا کیا ہوا، انھیں سنبھالنا پڑتا تھا۔

وہ اپنی غزل بادشاہ کو سناتے نہ تھے۔ اگر کسی طرح اُس تک پہنچ جاتی تو وہ اُسی غزل پر خود کہتا تھا۔ اب اگر نئی غزل کر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا، ۷۰ برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اُس سے چست کہیں تو اپنے کہے آپ مٹانا بھی کچھ آسان نہیں۔ ناچار اپنی غزل میں اُن کا تخلص ڈال کر دیتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنی کسی چیز

پر زورِ طبع خرچ نہ کریں۔ جب ان کے شوقِ طبع کو کسی طرف متوجہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا کہ جو کچھ جوشِ طبع ہو ادھر ہی آجائے ؏

# عموماً اندازِ کلام

کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اُتارے ہیں، مگر لفظوں کی ترکیب سے انھیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ انھیں قادر الکلامی کے دربار سے ملکِ سخن پر حکومت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں، کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارے کی بو سے بساتے ہیں، کبھی سادے لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں، مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ دل میں نشتر سا کھٹک جاتا ہے اور منہ سے کبھی واہ نکلتی ہے اور کبھی آہ نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہونٹوں میں شستہ اور برجستہ لفظوں کے خزانے بھرے ہیں اور ترکیبِ الفاظ کے ہزاروں رنگ ہیں، مگر جسے جہاں سجتا دیکھتے ہیں، وہ گویا وہیں کے لیے ہوتا ہے۔ وہ طبیبِ کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے کہ کونسا ہے کہ سادگی میں رنگ دے جائے گا اور کون سا رنگینی میں۔ کامل مصور کی تیزیٔ قلم کو اس کے رنگوں کی شوخی روشن کرتی ہے۔ اس طرح ان کے مضمون کی باریکی کو ان کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ انھیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے، گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستے سے پلا دیا۔ اسی وصف نے نادانوں کو غلطی میں ڈالا ہے، جو کہتے ہیں کہ ان کے ہاں عالی مضامین نہیں، بلکہ سیدھی باتیں اور صاف صاف خیالات ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان ہونٹوں میں خدا نے عجب تاثیر دی تھی کہ جو لفظ اُن سے ترکیب پا کر نکلتے ہیں، خود بخود زبانوں پر ڈھلکتے آتے ہیں، جیسے ریشم پر موتی۔ خدا جانے زبان نے کس آئینے کی صفائی اُڑائی ہے یا انھوں نے الفاظ کے نگینوں پر کیوں کر جلا کی ہے، جس سے کلام میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے ؛ حقیقت میں اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت ان کے کلام، ان کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورے اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتی ہے، جیسے آئینہ گر شیشے کو قلعی سے ترکیب دے کر آئینہ بناتا ہے۔ اسی واسطے ہر شخص کی سمجھ میں آتا ہے اور دل پر اثر بھی کرتا ہے۔

ان کے کلام میں یہ خصوصیت ہے کہ شعر کا کوئی لفظ بھول جائے تو جب تک وہی لفظ اس کی جگہ نہ رکھا جائے، شعر مزا نہیں دیتا۔ چنانچہ لکھنؤ میں میر انیس مرحوم کے سامنے سلسلۂ تقریر

میں ایک دن میں نے اُن کا مطلع پڑھا :

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا

انھوں نے پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے ؟ میں نے کہا، شیخ مرحوم کا ہے۔ دو چار باتیں کر کے اُنھوں نے پھر فرمایا کہ ذرا وہ شعر پڑھیے گا۔ میں نے پھر پڑھا۔ انھوں نے دوبارہ خود اپنی زبان سے پڑھا۔ پھر باتیں ہونے لگیں۔ چلتے ہوئے پھر کہا، ذرا وہ شعر پڑھتے جائیے گا اور ساتھ اس کے یہ بھی کہا کہ صاحب کمال کی یہ بات ہے کہ جو لفظ جس مقام پر اُس نے جڑ دیا ہے، اُسی طرح پڑھا جاوے تو ٹھیک ہوتا ہے، نہیں شعر رُتبے سے گر جاتا ہے۔

اُن کا مضمون جس طرح دل کو بھلا معلوم ہوتا ہے، اسی طرح پڑھنے میں زبان کا مزہ آتا ہے۔ اُن کے لفظوں کی ترکیب میں ایک خداداد چستی ہے، جو کلام میں زور پیدا کرتی ہے۔ وہ لفظ فقط اُن کے دل کا جوش ہی نہیں ظاہر کرتا، بلکہ سُننے والے کے دل میں ایک خروش پیدا کرتا ہے اور یہی قدرتی رنگ ہے جو اِن کے کلام پر سوداؔ کی تقلید کا پرتوہ ڈالتا ہے۔

اِن کے دیوان کو جب نظر غور سے دیکھا جاتا ہے تو اس سے رنگا رنگ کے زمزمے اور بوقلموں آوازیں آتی ہیں۔ ہر رنگ کے انداز موجود ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے دیکھنے سے دل اُکتا نہیں جاتا۔ وہ لفظ لفظ کی نبض پہچانتے تھے اور مضامین کے طبیب تھے۔ جس طرح برجستہ بیٹھتا دیکھتے تھے، اُسی طرح باندھ دیتے تھے، خیال بندی ہو یا عاشقانہ تصوف اِن کے سینے میں جو دل تھا، گویا ایک آدمی کا دل نہ تھا، ہزاروں آدمیوں کے دل تھے، اس واسطے کلام ان کا مقناطیس کی طرح قبولِ عام کھینچتا ہے۔ دل دل کے خیال باندھتے اور اس طرح باندھتے تھے، گویا اپنے ہی دل پر گزری ہے۔

# اعتراض

اُن کے کلام پر لوگ اعتراض بھی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک پرانی غزل کا شعر ہے۔

سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب ! اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

لوگوں نے کہا کہ بے اضافی یا صفتی ترکیب کے اس میں ی زیادہ کرنی جائز نہیں، مگر یہ

اعتراض اُن کی کم نظری کے سبب سے تھے :

درختے کہ اکنوں گرفت است پایے
بہ نیروے مردے بر آید ز جاے
اے زدہ بر تر از گمان دامن کبریاے لا
دست بتو کجا رسد عقلِ شکستہ پاے را

ایک پُرانی غزل شاہ نصیر کے مشاعرے میں طرح ہوئی تھی :

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو
آئے ہے جزو میں نظرِ کُل کا تماشا ہم کو

اس پر اعتراض ہُوا کہ اصل لفظ جزو مع واو کے ہے، فقط جز، صحیح نہیں۔ اس کا بھی وہی حال تھا، امیر خسرو فرماتے ہیں :

ہر چہ کُند در جزو و در کُل اثر
گُلّی و جز نیش بود زاں خبر

اور میر تقی فرماتے ہیں :

جز مرتبہ کُل کو حاصل کرے ہے آخر — اک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہُوا ہوگا

ایک دن میں اوج سے ملا اور اُستاد مرحوم کے مطلع کا ذکر آیا :

مقابل اُس رُخِ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وُہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو رستے میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا :

یاں جو برگِ گُل خورشید کا کھڑکا ہو جائے
دھول دستارِ فلک پہ لگے، تڑکا ہو جائے

اور کہا، دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طنز کرتے ہیں کہ سحر ہو جائے جو اُستاد نے باندھا ہے، یہ جائز نہیں، مگر تجاہل کر کے میں نے کہا کہ وہاں حقیقت میں بات کے کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا اور استعارے میں لا کر! میری طرف دیکھ کر ہنسے اور کہا کہ بھئی واہ، آخر شاگرد تھے، ہماری بات ہی بگاڑ دی۔

دوسرے دن میں اُستاد مرحوم کی خدمت میں گیا اور یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اِس گستاخی کی سزا میں صبا ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے اور ایسی بجھے کہ وہی اُس کے حق میں سحر ہو جائے،

یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوئی، ہوئی نہ ہوئی نہ ہوئی، وہ اور بات ہے۔ اب یہ ایک حُسنِ اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ ایسی ڈھول لگی کہ تڑاکا ہو گیا۔ خیر اگر ہُوا تو کچھ لطف ہی پیدا ہُوا، بلکہ طرزِ بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا۔ قباحت کیا ہوئی اور یہ بھی دیکھو، وہ محاورہ تو گیا تھا؟ متبذل، عامیانہ، اب ثقہ، متین اور شریفانہ ہے۔ آزاد۔ ایک شعر ناسخ کا بھی اسی ترکیب کا ہے:

سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کہیں شمشیر کا　　　جو ستمگر ہیں کبھی وہ پھُولتے پھلتے نہیں

محاورے میں تلوار کا کھیت کہتے ہیں، شمشیر کا کھیت نہیں ہے۔

اُن کی ایک غزل کا ایک شعر ہے:

ہے ترا نقشِ قدم چشم نمائی کرتا　　　مُنہ اُٹھائے ہوئے جاتا ہے کہاں تو کہ تجھے

نواب کلب حسین خاں نادر تخلص معلّیٰ ابیں فرماتے ہیں (تجھے) دوسرے مصرع کا حق ہے، پہلے مصرع میں نہیں لانا چاہیئے۔ اس کا جواب مجھے نہیں آتا۔

ایک دفعہ طبعِ موزوں نے نیا گل کھلایا۔ یہ وقت تھا کہ اصلاح بند ہو گئی تھی، مگر آمد و رفت جاری تھی۔ شاہ صاحب کو جا کر غزل سُنائی۔ اُنھوں نے تعریف کی اور کہا کہ مشاعرے میں ضرور پڑھنا۔ اتفاقاً مطلع کے سرے ہی پر سبب خفیف کی کمی تھی۔ جب وہاں غزل پڑھی تو شاہ صاحب نے آواز دی۔ کہ بھئی میاں ابراہیم! واہ! مطلع تو خوب کہا۔ شیخ مرحوم فرماتے تھے کہ اُسی وقت مجھے کھٹکا ہُوا اور ساتھ ہی لفظ بھی سُوجھا۔ دوبارہ میں نے پڑھا:

(بس) ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اُس میں زلفِ سرکش ہو
پھر زلف بنے وہ دستِ موسیٰ جس میں اخگرِ آتش ہو

اس پر اس قدر حیرت ہوئی کہ اُنھوں نے جانا، شاید پہلے عمداً یہ لفظ چھوڑ دیا تھا، مگر پھر اعتراض ہُوا کہ یہ بحر ناجائز ہے۔ کسی اُستاد نے اس پر غزل نہیں کہی۔ شیخ مرحوم نے جواب دیا کہ ۱۹ بحریں آسمان سے نازل ہُوئیں۔ طبائعِ موزوں نے وقت بوقت گُل کھلائے ہیں۔ یہ تقریر مقبول نہ ہوئی، مگر پھر منیر مرحوم نے اس پر غزل کہی۔ ایک دفعہ شیخ مرحوم نے مشاعرے میں غزل پڑھی، مطلع تھا:

نرگس کے پھُول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر
ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

شاہ صاحب نے کہا کہ میاں ابراہیم پھول بٹوے میں نہیں ہوتے، یہ کہو۔

ع　نرگس کے پھول بھیجے ہیں دونے میں ڈال کر

انھوں نے کہا کہ دونے میں رکھنا ہوتا ہے، ڈالنا نہیں ہوتا، یوں کہیے کہ۔

بادام یہ جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر
ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

نقل: شاہ نصیر مرحوم کے ہاں سال بسال ایک عُرس ہُوا کرتا تھا۔ اس میں بعد فاتحہ کے کھچڑی کھلایا کرتے تھے۔ حسبِ معمول اُستاد بھی گئے۔ فاتحہ کے بعد کھانا کھانے بیٹھے۔ شاہ صاحب ایک ہاتھ میں چمچہ، دوسرے میں ایک بادیہ لیے ہوئے آئے۔ اس میں دہی تھا کہ خاص خاص اشخاص کے سامنے ڈالتے آتے تھے۔ ان کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اور چمچہ بھرا۔ انھیں ریزش ہو رہی تھی۔ پرہیز کے خیال سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ شاہ صاحب نے کہا، سنکھیا ہے، سنکھیا، دیکھو، کھاؤ گے تو مر جاؤ گے۔ اُستاد نے ہنس دیا اور کہا ع

بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں

اگرچہ یہ مصرعِ قدیمی میاں مجذوب کا ہے، مگر چونکہ کھانے کا موقع تھا، اِس لیے سب کو بہت مزا دیا۔

جن دنوں شاہ صاحب سے معرکے ہو رہے تھے، منشی فیض پارسا دہلی کالج میں مدرسِ حساب تھے اور ان دنوں جوانی کے عالم میں شاعری کے جوش و خروش میں تھے۔ انھوں نے مدرسے میں بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ قائم کیا اور اُسے انشاءِ اُردو کی ترقی کا جزوِ اعظم ٹھیرا کر صاحب پرنسپل سے مدد لی۔ ان دنوں میں مدرسہ اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ شہر کے دروازے ۹ بجے بند ہو جاتے تھے۔ گڈھ کپتان سے اجازت لی کہ مشاعرے کے دن ۲ بجے تک اجمیری دروازہ کھلا رہا کرے۔ غرض مشاعرۂ مذکور اس شان و شکوہ سے جاری ہُوا کہ پھر کوئی ایسا مشاعرہ دِلّی میں نہیں ہُوا۔ شہر کے رؤسا اور نامی شاعر موجود ہوتے تھے، مگر سب کی نگاہیں شاہ صاحب اور شیخ صاحب کی طرف ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک مشاعرے میں شاہ صاحب نے غزلِ قفس کی تیلیاں، خس کی تیلیاں پڑھی۔ دوسرے مشاعرے میں یہی طرح ہو گئی۔ سب غزلیں کہہ کر لائے۔ شیخ مرحوم نے دو غزلہ لکھا اور اس پر کچھ تکرار ہوئی۔ اس پر جوش میں آ کر فرمایا کہ برس دن تک جو مشاعرہ ہو، اس میں سوائے غزل طرحی کے ایک غزل اس زمین میں ہُوا کرے۔ چنانچہ دو مشاعروں میں ایسا ہُوا۔ ایسے معرکوں میں عوام الناس بھی شامل ہوتے ہیں۔ تیسرے جلسے میں جب انھوں نے یہ غزل پڑھی تو بعض شخصوں نے کچھ کچھ چوٹیں کیں، جنھیں شیخ صاحب کے طرفدار سمجھے کہ شاہ صاحب کے اشارے سے ہوئیں۔ زیادہ تر یہ کہ شاہ وجیہ الدین منیر یعنی شاہ صاحب کے صاحبزادے نے یہ شعر بھی پڑھ دیا:

گرچہ قندیلِ سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہُوا　　ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس پر تکرار زیادہ ہوئی اور مشاعرہ بند کر دیا گیا کہ مبادا زیادہ بے لطفی ہو جائے۔

انہی دِنوں میں ایک دفعہ میر محمد خاں اعظم الدولہ نے کہ سرور تخلص کرتے تھے اور پُرانے شاعر تھے، ایک تذکرہ شعرائے اردو کا لکھا۔ اُستادِ مرحوم اتفاقاً اُن کے بالاخانے کے سامنے سے گزرے۔ انھوں نے بُلایا اور مزاج پرسی کے بعد کہا کہ ہمارا تذکرہ تمام ہو گیا۔ اس کی تاریخ تو کہہ دو۔ فرماتے تھے کہ خدا کی قدرت، اُن کے خطاب اور تخلص کے لحاظ سے گویا کہ دریائے اعظم۔ دل میں حساب کیا تو عدد برابر تھے۔ میں نے جھٹ کہہ دیا، حاضرین جلسہ حیران رہ گئے۔

شہیدی مرحوم دلّی میں آئے۔ امرائے شہر سے ملاقاتیں ہوئیں۔ نواب عبداللہ خاں صدرالصدور شعر کے عاشق تھے۔ اُن سے ایک جلسے میں میاں شہیدی نے کہا کہ آج ہندوستان میں تین شخص ہیں، لکھنؤ میں ناسخ، دِلّی میں ذوقؔ، دکن میں حفیظ۔ انھوں نے کہا کہ ناسخ کی اولیّت کا سبب؟ میاں شہیدی نے چمن کی شاخ یاسمن کی شاخ کی غزل پڑھی۔ خان موصوف نے اُستادِ مرحوم سے کہا۔ انھوں نے اس غزل پر ایک بڑی سیر نوا فی غزل کہی اور یہ بھی کہا کہ اب جو کوئی اس طرح میں غزل کہے گا، ہر قافیے کو جس جس پہلو سے میں نے باندھ دیا ہے، اُسے الگ کر کے نہ باندھ سکے گا۔ نواب عبداللہ خاں کی فرمائش سے غزل اور انھیں کی وساطت سے یہ گفتگوئیں ہوئی تھیں۔ انھوں نے تجویز کی کہ مشاعرے میں بر سرِ معرکہ غزلیں پڑھی جائیں، مگر شہیدی مرحوم بے اطلاع چلے گئے۔ نواب نے پیچھے آدمی دوڑایا، اس نے بریلی میں جا پکڑا، مگر وہ تشریف نہ لائے۔ غزل مذکور انشا واللہ شائقانِ سخن کے ملاحظے سے گزرے گی، خدا دیوان پورا کرے!

ایک دِن حسبِ معمول بادشاہ کے پاس گئے۔ اُن دنوں میں مرزا شاہرُخ ایک بیٹے بادشاہ کے تھے کہ انھوں نے بہت سی خدمتیں کاروبار کے قبضے میں کر رکھی تھیں اور اکثر حاضر رہا کرتے تھے۔ وہ اس وقت موجود تھے۔ انھیں دیکھتے ہی بولے کہ لیجئے وہ بھی آ ہی پہنچے۔ معلوم ہُوا کہ بادشاہ کی ایک غزل ہے۔ اس کے ہر شعر میں ایک ایک مصرع پیوند کر کے مثلّث کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ایجاد یہ ہے کہ مصرع جو لگے، بموجب رواج قدیم کے اوپر نہ لگے، بلکہ ہر شعر کے نیچے ایک ایک مصرع لگے کہ جس سے گویا ہر بند میں ایک ایک مصرع پیدا ہوتا جائے۔ غرض بادشاہ نے غزل انھیں دی کہ اُستاد اس پر مصرعے لگا دو۔ انھوں نے قلم اُٹھا کر ایک شعر پر نظر کی اور فوراً مصرع لگا دیا۔ اسی طرح دوسرے میں تیسرے میں، مسلسل غزل تمام کر کے جتنی دیر میں نظر ڈالی، بے تامل ساتھ ہی مصرعے لکھتے گئے۔ اور اسی وقت پڑھ کر سنائی۔ سب حیران

ہو گئے، بلکہ مرزا شاہرخ نے کہا کہ اُستاد آپ گھر سے کہہ کر لائے تھے؟ بادشاہ بولے، بھلا انھیں کیا خبر تھی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے، خصوصاً جس حال میں ایجاد بھی ایسا نیا ہو۔

نقل: برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ بموجب معمول کے قطب صاحب گئے ہوئے تھے۔ مرزا فخرو، بادشاہ کے صاحبزادے (کہ اخیر کو ولی عہد بھی ہو گئے تھے) ایک دن وہاں چاندنی رات میں تالاؤ کے کنارے چاندنی کی بہار دیکھ رہے تھے۔ اُستاد مرحوم پاس کھڑے تھے۔ انھیں بھی شعر کا شوق تھا اور اُستاد کے شاگرد تھے۔ اُن کی زبان سے یہ مصرع نکلا۔ ع چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر۔ ان سے کہا کہ اُستاد اس پر مصرع لگایئے گا۔ انھوں نے فوراً کہا ع تاب عکسِ رُخ سے پانی پھیر دے مہتاب پر

نواب حامد علی خاں کے خسر نواب فضل الٰہی خاں سے اور شیخ مرحوم سے سابقہ محبت بھی تھا۔ اِس لیے نواب حامد علی خاں مرحوم بھی محبت و اخلاق سے ملا کرتے تھے۔ ایک دن دیوانِ خاص میں کھڑے ہوئے شعر سُناتے تھے۔ نواب موصوف نے خواجہ وزیر کا مطلع پڑھا:

جانور جو ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے — اے شہِ حُسن وہ چھٹتے ہی ہُما ہوتا ہے

اُستاد مرحوم نے کہا کہ صدقے میں اکثر کوّا چھوڑاتے ہیں، اِس لیے زیادہ تر مناسب ہے:

زاغ بھی گر ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے — اے شہِ حُسن وہ چھٹتے ہی ہُما ہوتا ہے

ایک دفعہ قلعے میں مشاعرہ تھا۔ حکیم آغاجان عیش کہ کہن سال مشّاق اور نہایت زندہ دل شاعر تھے، اُستاد کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ زمینِ غزل، یار دے، بہار دے، روزگار دے۔ حکیم آغاجان عیش نے ایک شعر اپنی غزل میں پڑھا:

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لیے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

ان کے ہاں بھی اس مضمون کا ایک شعر تھا۔ باوجود اس رتبے کے لحاظ اور پاسِ مروّت حد سے زیادہ تھا۔ میرے والد مرحوم پہلو میں بیٹھے تھے۔ اُن سے کہنے لگے کہ مضمون لڑ گیا، اب میں وہ شعر نہ پڑھوں؟ انھوں نے کہا، کیوں نہ پڑھو؟ نہ پہلے سے انھوں نے آپ کا مضمون سُنا تھا، نہ آپ نے ان کا، ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس سے بھی طبیعتوں کا انداز معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک منزل پر دونوں فکر پہنچے، مگر کس کس انداز سے پہنچے۔ چنانچہ حکیم صاحب مرحوم کے بعد ہی اُن کے آگے شمع آئی۔ انھوں نے پڑھا:

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات — رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

ایک دن معمولی دربار تھا۔ اُستاد بھی حاضر تھے۔ ایک مرشد زادے تشریف لائے۔ وہ

شاید کسی اور مرشد زادی یا بیگمات میں کسی بیگم صاحب کی طرف سے کچھ عرض لے کر آئے تھے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے انھوں نے عرض کی، صاحب عالم اس قدر جلدی؟ یہ آنا کیا تھا اور تشریف لے جانا کیا تھا۔ صاحب عالم کی زبان سے اس وقت نکلا کہ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ بادشاہ نے استاد کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ اُستاد! دیکھنا کیا صاف مصرع ہُوا۔ اُستاد نے بے توقف عرض کی کہ حضور ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ اواخر عمر کی غزل ہے اس کے دو تین ہی برس بعد انتقال ہو گیا۔

ایک دن دربار سے آکر بیٹھے۔ جو میں پہنچا۔ افسردہ ہو کر کہنے لگے کہ آج عجیب ماجرا گزرا۔ میں جو حضور میں گیا تو محل میں تھے۔ وہیں بُلا لیا اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے، اُستاد آج مجھے دیر تک ایک بات کا افسوس رہا۔ میں نے حال پُوچھا کہا کہ وہ جو قصیدہ تم نے ہمارے لیے کہا تھا اُس کے وہ اشعار آج مجھے یاد آگئے۔ اُن کے خیالات سے طبیعت کو عجب لُطف حاصل ہُوا، مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ اب تم یہ قصیدے ہمارے لیے کہتے ہو۔ ہم مرجائیں گے تو جو تخت پر بیٹھے گا، اس کے لیے کہو گے۔ میں نے عرض کی کہ حضور کچھ تردد نہ فرمائیں، خیمہ پیچھے گرتا ہے، میخیں اور طنابیں پہلے ہی اُکھڑ جاتی ہیں۔ ہم حضور سے پہلے ہی اُٹھ جائیں گے اور حضور خیال فرمائیں کہ عرش آرامگاہ کے دربار کے لوگ حضور کے دربار میں کہاں تھے؟ فردوس منزل کے امرا اُن کے عہد میں کہاں تھے؟ عرش منزل کے فردوس منزل کے دربار میں کہاں تھے؟ فردوس منزل کے امیر عرش آرام گاہ کے دربار میں کہاں تھے؟ عرش آرام گاہ کے امرا آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں؟ بس یہی خیال فرمایئے، جو جس کے ہوتے ہیں وہ اُسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ نیا میر مجلس نئی ہی مجلس جماتا ہے اور اپنا سامان مجلس میں اپنے ہی ساتھ لاتا ہے۔ یہ سُن کر حضور بھی آبدیدہ ہوئے۔ میں بھی آبدیدہ ہُوا مگر خیال مجھے یہ آیا کہ دیکھو ہم ہمیشہ نماز کے بعد حضور کی سلامتی کی دُعائیں مانگتے ہیں۔ خدا شاہد ہے۔ اپنا خیال اس طرح آج تک کبھی نہیں آیا۔ حضور ہمارا خیال بھی نہیں۔ میاں! دُنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے۔

شیخ مرحوم ضعفِ جسمانی کے سبب سے روزہ نہ رکھتے تھے۔ مگر اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ کبھی شربت یا پانی بھی پینا ہوتا تو کوٹھے پر جا کر یا گھر میں جا کر پی آتے۔ ایک دفعہ میں نے پُوچھا۔ کہا میاں خدا کے گناہگار ہیں۔ وہ عالم نہاں و آشکار کا ہے۔ اس کی تو شرم نہیں ہو سکتی۔ بھلا بندے کی تو شرم رہے۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ گرمی کی شدت عصر کا وقت۔ نوکر نے شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پر تیار کیا اور کہا کہ ذرا اوپر تشریف لے چلیے۔ چونکہ وہ اس وقت کچھ لکھوا رہے تھے۔ معروفیت کے سبب سے نہ سمجھے اور سبب پوچھا۔ اُس نے اشارہ کیا۔ فرمایا کہ یے آپہیں یہ ہمارے یار ہیں ان سے کیا چھپانا، جب اُس نے کٹورا لا کر دیا تو یہ مطلع کہا کہ فی البدیہہ واقع ہُوا تھا:

پلا مے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری

خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

محبوب علی خاں خواجہ سرا سرکار بادشاہی میں مختار تھے اور کیا محل کیا دربار، دونوں جگہ اختیار قطعی رکھتے تھے، مگر بشدت جوا کھیلتے تھے۔ کسی بات پر ناخوشی ہوئی۔ میاں صاحب نے حج کا ارادہ کیا۔ ایک دن میں اُستاد مرحوم کے پاس بیٹھا تھا کہ کسی شخص نے آکر کہا، میاں صاحب کعبۃ اللہ جاتے ہیں۔ آپ ذرا تامل کر کے مسکرائے اور یہ مطلع پڑھا:

جو دل قمار خانے میں بُت سے لگا چکے

وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جب چکے

والد مرحوم نے بہ نیت وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایک دن تشریف لائے۔ اُن سے تاریخ کے لئے کہا۔ اُسی وقت تامل کر کے کہا، تعزیت گاہِ امام دارین، پوری تاریخ ہے۔ حکیم میر فیض علی مرحوم ان کے اُستاد بھی تھے اور انہی کا آپ علاج بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں بھی موجود تھا۔ نوکر نے آکر کہا کہ آج میر فیض علی کا انتقال ہوا۔ بار بار پوچھا اور ایسا اضطراب ہوا کہ اُٹھ کے ٹہلنے لگے۔ کچھ سوچ کر دفعتہً بولے کہ ہائے میر فیض علی۔ مجھ سے کہا کہ دیکھو تو یہی تاریخ ہے؟ حساب کیا تو عدد برابر تھے۔

ایک شخص نے آکر کہا کہ میرے دوست کا نام غلام علی ہے اور باپ کا نام غلام محمد ہے۔ اس نے نہایت تاکید سے فرمائش لکھی ہے کہ حضرت سے ایسا سجع کہوا دو کہ جس میں دونوں نام آجائیں۔ آپ نے سُن کر وعدہ کیا اور کہا کہ دو تین دن میں آپ آیئے گا۔ انشاءاللہ ہو جاوے گا وہ رخصت ہو کر چلے گئے۔ ڈیوڑھی کے باہر نکلے ہوں گے، جو نوکر سے کہا کہ محمد بخش بُلانا انہیں، لینا لینا، خوب ہُو تقاضے سے جلدی مخلصی ہو گئی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ع

پدر غلام محمد پسر غلام علی۔

دیوان چندو لال نے ان کا کلام سُن کر مصرع طرح بھیجا اور بلا بھیجا۔ غزل کہہ کر بھیجی اور مقطع میں لکھا:

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

انہوں نے خلعت اور پانسو روپے بھیجے، مگر یہ نہ گئے۔ ایک دن میں نے نہ جانے کا سبب پوچھا، فرمایا:

نقل: کوئی مسافر دِلّی میں مہینہ بیس دن رہ کر چلا۔ یہاں ایک کتا مِل گیا تھا، وہ وفا کا مارا ساتھ ہو لیا۔ شاہدرہ پہنچ کر دِلّی یاد آئی اور رہ گیا۔ وہاں کے کتوں کو دیکھا۔ گردنیں فربہ، بدن تیار، چکنی چکنی پشم۔ ایک کُتا انہیں دیکھ کر خوش ہوا اور دِلّی کا سمجھ کر بہت خاطر کی۔ دلہائیوں کے بازار میں لے گیا۔ حلوائی کی دُکان سے ایک بالوشاہی اڑا کر سامنے رکھا۔ بھٹیارے کی دُکان سے ایک کلّہ جھپٹا۔ یہ ضیافتیں کھاتے اور دلّی کی باتیں سناتے رہے۔ تیسرے دن رخصت مانگی۔ اس نے رد کا اہلہ نے دلّی کے سیر تماشے اور خوبیوں کے ذکر کئے۔ آخر چلے اور دوست کو بھی دلّی آنے کی تاکید کر آئے۔ اُسے بھی خیال رہا، اور ایک دن دلّی کا رُخ کیا۔ پہلے ہی مرگھٹ کے کُتے مردار خوار، خونی آنکھیں، کالے کالے منہ نظر آئے۔ یہ لڑنے بھڑنے نکلے۔ دریا ملا۔ دیر تک کنارے پر پھرے۔ آخر کود پڑے۔ مرکھپ کے پار پہنچے۔ شام ہو گئی تھی۔ شہر میں گلی کوچوں کے کتوں سے بچ بچا کر ڈیڑھ پہر رات گئی تھی، جو دوست سے ملاقات ہوئی۔ یہ بے چارے اپنی حالت پر شرمائے۔ بظاہر خوش ہوئے اور کہا او ہو اس وقت تم کہاں دل میں کہتے تھے کہ رات نے پردہ رکھا۔ ورنہ دن کو یہاں کیا دھرا تھا اسے لے کر اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ یہ چاندنی چوک ہے، یہ دریبہ ہے، یہ جامع مسجد ہے۔ مہمان نے کہا، یار بھوک کے مارے جان نکلی جاتی ہے، سیر ہو جائے گی، کچھ کھلواؤ تو سہی۔ انہوں نے کہا عجب وقت تم آئے ہو، اب کیا کروں؟ بارے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جانی کبابی مرچوں کی ہانڈی بھول گئے تھے۔ انہوں نے کہا، لو یار! بڑے قسمت والے ہو۔ وہ دن بھر کا بھوکا تھا، منہ پھاڑ کر گرا اور ساتھ ہی منہ سے مغز تک گویا باروت اڑ گئی۔ چھینک کر پیچھے ہٹا اور جل کر کہا، واہ یہی دلّی ہے! انہوں نے کہا، اس چٹخارے ہی کے مارے تو پڑے ہیں۔

عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکان ضرور جاتے تھے اور تین چار چلمیں حقّے کی وہاں پیتے تھے۔ میں چھٹّی کے دن اس وقت جایا کرتا تھا اور دن بھر وہیں رہتا تھا۔ مکان ضرور ڈیوڑھی میں تھا۔ پاؤں کی آہٹ جانتے تھے۔ پوچھتے تھے۔ میں تسلیم عرض کرتا۔ چھوٹی سی انگنائی تھی۔ پاس ہی چارپائی۔ وہیں بیٹھ جاتا۔ فرماتے: جی ہمارا وہ شعر اُس دن تم نے کیا پڑا تھا؟ ایک دو لفظ اُس کے پڑھتے۔ میں سارا شعر عرض کرتا۔ فرماتے، ہاں، اب اسے یوں بنا لو۔ ایک دن ہنستے ہوئے پاخانے سے نکلے۔ فرمایا کہ لو جی ۳۳ برس کے بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویران

نے کہا، حضرت کیونکر؟ فرمایا، ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے، اس میں مصرع تھا۔ ؎

کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ

ابتدائے مشق تھی۔ اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیئے اور جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نقطہ حل ہوا۔ عرض کی حضرت پھر کیا؟ فرمایا۔ ؎

کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

کمر کو اوپر ڈال دو۔ عرض کی، پھر وہ کیونکر؟ ۳-۴ مصرعے اُلٹ پلٹ کئے تھے۔ ایک اس وقت خیال میں ہے ؎

بل بے کمر کہ زلف مسلسل کے پیچ میں
کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

کابلی دروازہ پاس ہی تھا۔ شام کو باہر نکل کر گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ میں اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ مضامین کتابی، خیالات علمی، افادہ فرماتے، شعر کہتے۔ ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے، تیر ہمیشہ تصویر ہمیشہ سوچتے سوچتے کہنے لگے، تم بھی تو کچھ کہو۔ میں نے کہا، کیا عرض کروں۔ فرمایا، میاں! اسی طرح آتا ہے، ہوں، ہاں، اعوں، غاں کچھ تو کہو، کوئی مصرع ہی سہی۔ میں نے کہا ؎

سینے سے لگاتے تیری تصویر ہمیشہ

ذرا تامل کر گئے کہا، ہاں درست ہے ؎

آجاتی اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہتے
سینے سے لگاتے تری تصویر ہمیشہ

اب جو کبھی دلی جانا ہوتا ہے اور اس مقام پر گزر ہوتا ہے تو آنسو نکل پڑتے ہیں۔ اس مطلع پر حضور نے کئی مرتبہ جال مارے، مگر یہ ٹال گئے۔ مضمون آنہ سکا۔ مطلع انہوں نے دیا:

کیا کہوں اس ابروئے پیوستہ کے دل لبس میں ہے
ایک طعمہ مچھلیاں دو، کشمکش آپس میں ہے

بادشاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلے کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں۔ کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی ہیں، غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا حضرت مرحوم کے ہیں۔ جن سنگلاخ زمینوں میں قلم چلنا مشکل ہے، ان کا نظام و سرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ شگفتہ ہوتے ہیں۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے، طرحیں خوب نکالتا ہے، مگر تم سرسبز کرتے ہو، ورنہ شور زار ہو جائے۔ مسودہ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی ایک،

کوئی ادھا مصرع۔ فقط بحر اور ردیف قافیہ معلوم ہو جاتا تھا، باقی بخیر۔ یہاں ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔ ایجادی فرمائشوں کی حد نہ تھی۔ چند شعر اس غزل کے لکھتا ہوں، جس کے ہر شعر کے نیچے مصرع لگایا ہے:

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا  یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
ورنہ ایسا جو بنایا نہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ذوق دیا تھا مجھ کو  عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل کو میرے خُم و خمخانہ بنایا ہوتا

اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا  کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا
تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ  ایسی بستی سے تو ویران بنایا ہوتا
بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

ایک بڈھا چورن مرچن کی پڑیاں بیچتا پھرتا تھا اور آواز دیتا تھا:

لے تیرے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

حضور نے سنا ایک دو مصرعے اس پر لگا کر اُستاد کو بھیج دیئے۔ انہوں نے دس دہرے لگا دیئے۔ حضور نے لے رکھی۔ کئی کنچنیاں ملازم تھیں، انہیں یاد کرا دیئے۔ دوسرے دن بچے بچے کی زبان پر تھے، دو بند یاد رہ گئے:

لے تیرے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا
کنجڑے کی سی ہاٹ ہے دُنیا جنس ہے ساری اکٹھی  میٹھی چاہے میٹھی لے لے کھٹی چاہے کھٹی
لے تیرے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا
روپ رنگ پر بھول نہ دل میں دیکھ عقل کے بیری  اوپر میٹھی نیچے کھٹی، انبوا کی سی کیری!
لے تیرے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

ایک فقیر صدا کہتا تھا! کچھ راہِ خدا دے جا، جا تیرا بھلا ہوگا۔ حضور کی پسند آئی۔ ان سے کہا۔ انہوں نے بارہ دہرے اس پر لگا دیئے۔ مدتوں تک گھر گھر سے اسی کے گانے کی آواز آتی تھی اور گلی گلی لوگ گاتے پھرتے (حافظ ویران کہ خدا اسلامت رکھے۔ انہی نے یہ شعر بھی لکھوائے)

کچھ راہ خدا دے جا، جا تیرا بھلا ہوگا
محتاج خرا باتی یا پاک نمازی ہے  کچھ کر نہ نظر اس پر، واں نکتہ نوازی ہے

کچھ راہِ خدا دے جا، جا تیرا بھلا ہوگا

دُنیا کے کیا کرتا ہے سینکڑوں تو دھندے ۔۔۔ پر کام خدا را بھی کر لے کوئی یاں بندے

کچھ راہِ خدا دے جا، جا تیرا بھلا ہوگا

دُنیا ہے سرا اس میں تو بیٹھا مسافر ہے ۔۔۔ اور جانتا ہے یاں سے، جانا تجھے آخر ہے

کچھ راہِ خدا دے جا، جا تیرا بھلا ہوگا

جو رب نے دیا تجھ کو، تو نام پہ رب کے دے ۔۔۔ گر یاں نہ دیا تو نے، واں لیوے گا کیا بندے

کچھ راہِ خدا دے جا، جا تیرا بھلا ہوگا

دیوے گا اسی کو تو، وہ جس کو ہے دلواتا ۔۔۔ پر ہے یہ ظفر تجھ کو آواز سُنا جاتا

کچھ راہ خدا دے جا، جا تیرا بھلا ہوگا

اس طرح کی ہزاروں چیزیں تھیں۔ ٹپے، ٹھمریاں، پہیلیاں، سیٹھنیاں، کہاں تک لکھوں۔ ایک دن ٹہل رہے تھے۔ حافظ ویران ساتھ تھے۔ بہ تقاضائے استنجا بیٹھ گئے اور وقت معین سے زیادہ دیر ہوئی۔ انہوں نے قریب جا کر خیال کیا تو کچھ گنگنا رہے ہیں اور چٹکی سے جوتی پر کھٹ کھٹ کرتے جاتے ہیں۔ پوچھا کہ ابھی آپ فارغ نہیں ہوئے؟ فرمایا کہ حضور نے چلتے ہوئے ایک ٹھمری کے دو تین انترے سنائے تھے کہ اسے پورا کر دینا۔ اس وقت اس کا خیال آگیا۔ پوچھا کہ یہ جُوتی پر آپ چٹکی کیوں مارتے تھے؟ فرمایا کہ دیکھتا تھا کہ اس کے لفظ تال پر ٹھیک بیٹھتے ہیں یا نہیں؟

حافظ ویران کہتے ہیں ایک دن عجب تماشا ہوا۔ آپ بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے، مطلع ہوا کہ ؎

ابرو کی اس کے بات ذرا چل کے تھم گئی

تلوار آج ماہِ لقا چل کے تھم گئی

دو تین شعر ہوئے تھے کہ خلیفہ اسماعیل دربار سے پھر کر آئے اور کہا کہ اس وقت عجب معرکہ دیکھا۔ اُستاد مرحوم متوجہ ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ جب میں بھوانی شنکر کے چھتے کے پاس پہنچا تو کھاری باولی کے رُخ پہ دیکھا کہ دو تین آدمی کھڑے ہیں اور آپس میں تکرار کر رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں ایسی بگڑی کہ تلوار کھچ گئی اور دو تین آدمی زخمی بھی ہوئے۔ یہاں چونکہ غزل کے شعر حافظ ویران سن رہے تھے، ہنس کر بولے کہ حضرت آپ کیا وہاں موجود تھے؟ آہستہ سے فرمایا کہ یہیں بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اس سے مطلب یہ نہیں کہ انہیں کرامات تھی، یا وہ غیب دان تھے، ایک حسنِ اتفاق تھا، اہلِ ذوق کے لُطفِ طبع کے لئے لکھ دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک دن حضور میں غزل ہوئی، جس کا مطلع تھا ؎

آج ابرو کی ترے تصویر کھنچ کر رہ گئی
سُنتے ہیں بھوپال میں شمشیر کھنچ کر رہ گئی

پھر معلوم ہوا کہ اسی دن بھوپال میں تلوار چلی تھی۔ ایسے معاملے کتب تاریخ اور تذکروں میں اکثر منقول ہیں، طول کلام کے خیال سے قلم انداز کرتا ہوں۔

ایک دفعہ دوپہر کا وقت تھا۔ باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ آنکھ کُھلی تو فرمایا کہ ابھی خواب میں دیکھا! کہیں آگ لگی ہے۔ اتنے میں خلیفہ صاحب آئے اور کہا کہ پیر بخش سوداگر کی کوٹھی میں آگ لگ گئی تھی۔ بڑی خیر ہوئی کہ کچھ نقصان نہیں ہوا۔

ایک شب والد مرحوم کے پاس آکر بیٹھے۔ کہا کہ بادشاہ کی غزل کہنی ہے، لاؤ، یہیں کہہ لیں۔ کئی فرمائشیں تھیں، اُن میں سے یہ طرح کہنی شروع کی۔ محبت کیا ہے، صُورت کیا ہے، مصیبت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت! زمین شگفتہ نہیں۔ سکوت کرکے فرمایا کہنے والے شگفتہ کر ہی لیا کرتے ہیں۔ پھر یہ دو مطلعے پڑھے:

نہ بھول اے آرسی گر یار کو تجھ سے محبت ہے — نہیں ہے اعتبار اس کا یہ منہ دیکھے کی اُلفت ہے
بگولے سے جسے آسیب اودھر سے زحمت ہے
ہماری خاک یوں برباد ہو اے ابر رحمت ہے

اتفاق: فرماتے تھے کہ ایک دفعہ بادشاہ نے غزل کا مسودہ دیا اور فرمایا کہ اسے دُرست کرکے دے جانا۔ موسم برسات کا تھا، ابر آرہا تھا، دریا چڑھاؤ پر تھا۔ میں دیوانِ خاص میں جاکر اسی رُخ میں ایک طرف بیٹھ گیا اور غزل لکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو پشت پر ایک صاحب دانائے فرنگ کھڑے ہیں۔ مجھ سے کہا، آپ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا، غزل ہے۔ پوچھا آپ کون ہے؟ میں نے کہا کہ نظم میں حضور کی دُعا گوئی کیا کرتا ہوں۔ فرمایا، کس زبان میں؟ میں نے کہا، اردو میں۔ پوچھا، آپ کیا کیا زبانیں جانتا ہے؟ میں نے کہا، فارسی، عربی بھی جانتا ہوں۔ فرمایا، ان زبانوں میں بھی کہتا ہے؟ میں نے کہا، کوئی خاص موقع ہو تو ان میں بھی کہنا پڑتا ہے۔ ورنہ اردو ہی میں کہتا ہوں کہ یہ میری اپنی زبان ہے۔ جو کچھ انسان اپنی زبان میں کر سکتا ہے، غیر کی زبان میں نہیں کر سکتا۔ پوچھا آپ انگریزی جانتا ہے؟ میں نے کہا، نہیں۔ فرمایا، کیوں نہیں پڑھا؟ میں نے کہا، ہمارا لب و لہجہ اس سے موافق نہیں، وہ ہمیں آتی نہیں ہے۔ صاحب نے کہا، وِل یہ کیا بات ہے؟ دیکھیے ہم آپ کا زبان بولتے ہیں۔ میں نے کہا، پختہ سالی میں غیر زبان نہیں آسکتی، بہت مشکل معاملہ ہے۔ انھوں نے پھر کہا وِل ہم آپ کا

تین زبان ہندوستان میں آکر سیکھا، آپ ہمارا ایک زبان نہیں سیکھ سکتے، یہ کیا بات ہے؟ اور تقریر کو طول دیا۔ میں نے کہا، صاحب! ہم زبان کا سیکھنا اُسے کہتے ہیں کہ اس میں بات چیت ہر قسم کی تحریر و تقریر اس طرح کریں، جس طرح خود اہل زبان کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں، ہم آپ کا تین زبان سیکھ لیا۔ بھلا یہ کیا زبان ہے اور کیا سیکھنا ہے؟ اسے زبان کا سیکھنا اور بولنا نہیں کہتے، اسے تو زبان کا خراب کرنا کہتے ہیں۔

# غزلیں

مرے سینے سے تیرا تیر جب اے جنگجو نکلا وہاں زخم سے خوں ہو کے حرفِ آرزو نکلا
مرا گھر تیرا منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہرو نکلا
پھرا گر آسماں تو شوق میں تیرے ہے سرگرداں اگر خورشید نکلا تیرا گرم جستجو نکلا
مے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم کہ آخر شب اسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا
ترے آتے ہی آتے آخر کام ہو گیا میرا رہی حسرت کہ دم میرا نہ تیرے روبرو نکلا
کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے نکلا
خجل اپنے گناہوں سے ہوں میں یاں تک کہ جب رویا تو جو آنسو مری آنکھوں سے نکلا سرخ رو نکلا
گھسے سب ناخن تدبیر اور ٹوٹی سر سوزن مگر تھا دل میں جو کانٹا، نہ وہ ہرگز کبھو نکلا

اسے عیّار پایا یار سمجھے ذوقؔ ہم جس کو
جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا، وہ عدو نکلا

لکھیے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا
بیمار ترا صورت تصویر نہالی کیا اُٹھے سر بستر غم، اُٹھ نہیں سکتا
آتی ہے صدائے جرسِ ناقہ لیلیٰ پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا
جوں دانہ روئیدہ تہ خاک ہمارا سر زیرِ گراں بارِ الم اُٹھ نہیں سکتا
ہر داغ معاصی مرا اس دامنِ تر سے جوں حرفِ سرِ کاغذ نم اُٹھ نہیں سکتا
اِتنا ہوں تِری تیغ کا شرمندۂ احسان سر میرا ترے سر کی قسم، اُٹھ نہیں سکتا
پردہ درِ کعبہ سے اٹھانا تو ہے آسان پر پردہ رخسارِ صنم، اُٹھ نہیں سکتا
کیوں اتنا گراں بار ہے جو رختِ سفر بھی اے راہرو ملکِ عدم۔ اُٹھ نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوقؔ
کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

اس پر شاہ نصیر مرحوم کی غزل بھی دیکھو:

الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے کہ آج کوچے میں اس کے شورِ ہائے ذنبٍ قُتِلتِ ہے
زمین پہ نور قمر کے گرنے میں صاف اظہار روشنی ہے کہ جو ہیں روشن ضمیر، ان کو فروغ ان کی فروتنی ہے
غم جدائی میں تیرے ظالم آنکھوں میں کیا مجھ پہ کیا بنی ہے جگر گدازی ہے سینہ کاوی ہے، دل خراشی ہے، جانکنی ہے

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

ہٹے ہیں اس اپنی سادگی سے ہم آشنا جنگ و آشتی سے
اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے، نہ دشمنی ہے

کوئی ہے کافر، کوئی مسلماں جدا ہر اک کی ہے راہِ ایماں
جو اسکے نزدیک رہبری ہے وہ اس کے نزدیک رہزنی ہے

ہوئے ہیں تر گریہ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرقِ عرق پاکدامنی ہے

نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر، وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر
جہاں میں مانندِ کیمیا گر ہمیشہ محتاج و دل غنی ہے

لگا نہ اس بتکدے میں تو دل، یہ ہے طلسم شکست غافل
کہ کوئی کیسا ہی خوش شمائل صنم ہے آخر شکستنی ہے

تکلفِ منزلِ محبت نہ کر، چلا چل تو بے تکلف
کہ جا بجا خار زار وحشت سے زیرِ پا فرش سوزنی ہے

خدنگِ مژگاں سے ذوقؔ اسکے دل اپنا سینہ سپر ہے جب سے
مثالِ آئینہ سخت جانی سے سینہ دیوار آہنی ہے

دریائے اشک چشم سے جس آن بہہ گیا
سُن لیجیو کہ عرش کا ایوان بہہ گیا

بل بے گدازِ عشق کا خوں ہو کے دل کے ساتھ
سینے سے تیرے تیر کا پیکان بہہ گیا

زاہد شراب پینے سے کافر ہُوا میں کیوں
کیا ڈیڑھ چلو پانی سے ایمان بہہ گیا

ہے موجِ بحرِ عشق وہ طوفاں کہ الحفیظ
بے چارہ مشتِ خاک تھا انسان بہہ گیا

دریائے عشق میں دمِ تحریرِ حالِ دل
کشتی کی طرح میرا قلمدان بہہ گیا

یہ روئے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے
نالہ سا ایک سوئے بیاباں بہہ گیا

تھا تو بہا میں بیش پر اس لب کے سامنے
سب مول تیرا لعلِ بدخشاں بہہ گیا

کشتی سوارِ عمر ہے بحرِ فنا میں جسم
جس دم بہا کیلئے گیا طوفان بہہ گیا

پنجاب میں بھی وہ نہ رہی آب و تابِ حسن
اے ذوقؔ پانی اب تو وہ ملتان بہہ گیا

پاک رکھا اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں تیرے مسواک سے

جب ہی تیرِ حوادث کی کماں افلاک سے
خاک کا تودہ بنا انسان کی مشتِ خاک سے

جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغِ اسیر
جھانکتا ہے یوں تجھے دل سینۂ صد چاک سے

تیرے صیدِ نیم جاں کی جاں نکلتی ہی نہیں
باندھ رکھا ہے اسے بھی تو نے کیا فتراک سے؟

مجھ کو دوزخ، رشکِ جنت ہوا اگر، میرے لئے
واں بھی آتش ہو کسی کے روئے آتش ناک سے

آفتابِ حشر ہے یا رب کہ نکلا گرم گرم
کوئی آنسو دل جلوں کے دیدۂ نمناک سے

چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظارہ نصیب
جبکہ وہ پردہ نشیں پردہ کرے ادراک سے

بیت ساقی نامہ کی لکھو کوئی جائے دعا
مے پرستوں کے کفن پر چوبِ کلک تاک سے

عیب ذاتی کو کوئی کھوتا ہے حسنِ عارضی
زیب بدانداز کو ہو ذوق کیا پوشاک سے

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا، نہیں آتا

دیتا دلِ مضطر کو تری کچھ تو نشانی
پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں آتا

کیا جانے اسے وہم ہے کیا میری طرف سے
جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

آیا ہے دم آنکھوں میں دم حسرتِ دیدار
پر لب پہ کبھی حرفِ تمنا نہیں آتا

کس دم نہیں ہوتا قلقِ ہجر ہے مجھ کو
کس وقت میرا منہ کو کلیجہ نہیں آتا

میں جاتا جہاں سے ہوں تو آتا نہیں یاں تک
کافر تجھے کچھ خوفِ خدا کا نہیں آتا

ہم رونے کو آجائیں تو دریا ہی بہائیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارا نہیں آتا

آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت
پھر دیکھیے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

غافل ہے بہارِ چمنِ عمر جوانی
کر سیر کہ موسم یہ دوبارہ نہیں آتا

ساتھ اُن کے ہیں ہم سائے کی مانند و لیکن
اس پر بھی جدا ہیں کہ لپٹنا نہیں آتا

دُنیا ہے وہ صیّاد کہ سب دام میں اس کے
آجاتے ہیں، لیکن کوئی دانا نہیں آتا

دل مانگتا ہے مفت اور پھر اس پہ تقاضا
کچھ قرض تو بندے پہ تمہارا نہیں آتا

بیجا ہے ولا اس کے نہ آنے کی شکایت
کیا کیجیے گا فرمائیے، اچھا نہیں آتا

جاتی رہے زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے
افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا

جو کوچۂ قاتل میں گیا، پھر وہ نہ آیا
کیا جانے مزا کیا ہے کہ جینا نہیں آتا

آئے تو کہاں جائے، نہ تا جی سے کوئی جائے
جب تک اُسے غصہ نہیں آتا، نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوقؔ! وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق، مجھے کیا نہیں آتا

مزے یہ دل کیلئے تھے نہ تھے زبان کے لیے
سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لیے

نہیں ثبات بلندیِ عز و شاں کے لیے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لیے

ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لیے
ستم شریک ہوا کون آسماں کے لیے

فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لیے

صبا جو آئے خس و خارِ گلستاں کے لیے
قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دل آشیاں کے لیے

دمِ عروج ہے کیا فکر نردباں کے لیے
کمندِ آہ تو ہے بامِ آسماں کے لیے

سدا تپش پہ تپش ہے دلِ تپاں کے لیے
ہمیشہ غم پہ ہے غم جانِ ناتواں کے لیے

حجر کے چومنے ہی پر ہے حجِ کعبہ اگر
تو بوسے ہم نے بھی اس سنگِ آستاں کے لیے

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے

جو پاسِ مہر و محبت کہیں یہاں بکتا
تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لیے

خلش سے عشق کے ہے خارِ پیرہن تنِ زار
ہمیشہ اس ترے مجنونِ ناتواں کے لیے

تپش سے عشق کی یہ حال ہے مرا گویا
بجائے مغز ہے سیماب استخواں کے لیے

مرے مزار پہ کس وجہ سے نہ برسے نور
کہ جان دی ترے روئے عرق فشاں کے لیے

الٰہی کان میں کیا اس صنم نے پھونک دیا
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لیے

نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجتِ سامان
اثاثہ چاہیئے کیا خانۂ کماں کے لیے

نہ دل رہا، نہ جگر، دونوں جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینے میں کیا چشمِ خونفشاں کے لیے

نہ لوحِ گور پہ مستوں کے ہو نہ ہو تعویذ
جو ہو تو خشتِ خُم ہے کوئی نشاں کے لیے

اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس
بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لیے

وہ مول لیتے ہیں جس دم کوئی نئی تلوار
لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لیے

مریضِ چشم سخن گو تری کہے نہ کہے
جواب صاف ہے پر طاقتِ دلِ تواں کے لیے

رہے ہے ہَول کہ برہم نہ ہو مزاج کہیں
بجا ہے ہولِ دلِ ان کے مزاجداں کے لیے

مثالِ نَے ہے مرا جب تلک کہ دم میں دم
فغاں ہے میرے لیے اور میں فغاں کے لیے

بلند ہووے اگر کوئی میرا شعلۂ آہ
تو ایک اور ہو خورشید آسماں کے لیے

چلیں ہیں دَیر کو مدّت میں خانقاہ سے ہم
شکستِ توبہ لیے ارمغاں مغاں کے لیے

وبالِ دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے

بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیوں کر ہو
زباں نہ دل کے لیے ہے نہ دل زباں کے لیے

اشارہ چشم کا تیرے یکایک اے قاتل
ہُوا بہانہ مری مرگِ ناگہاں کے لیے

بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزوِ ضعیف
اور اس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لیے

نواب اصغر علی خاں نسیم کے مشاعرے میں غزل مذکورہ بالا طرح ہوئی تھی۔ وہ اور مومنؔ خاں صاحب کہ ان کے اُستاد تھے، اُستادِ مرحوم کی خدمت میں آئے اور بڑے اصرار سے لے گئے۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا، جو بندۂ آزادؔ نے دیدۂ شوق سے دیکھا۔ غالب مرحوم تشریف نہیں لائے۔ مگر غزل

لکھی تھی۔ ان دونوں اُستادوں کی غزلیں بھی لکھ دی ہیں، اہل نظر لطف حاصل کریں۔

# نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب

مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے، لیکن چونکہ تصانیف اِن کی اردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امرا و روسائے اکبر آباد میں علّو خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں، اسی طرح اُردوئے معلّیٰ کے مالک ہیں۔ اس لئے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرے میں ضرور کیا جائے۔ نام اسد اللہ تھا۔ پہلے اسدؔ تخلص کرتے تھے۔ بھجر میں کوئی فرومایہ سا شخص اسدؔ تخلص کرتا تھا۔ ایک دن اس کا مقطع کسی نے پڑھا:

؎ اسدؔ تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

سُنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا، کیونکہ ان کا ایک یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ مشترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ و ۱۸۲۸ء میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالبؔ تخلص اختیار کیا، لیکن جن غزلوں میں اسدؔ تخلص تھا، انہیں اسی طرح رہنے دیا۔

خاندان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ جب تورانیوں کا چراغ کیانیوں کی ہوائے اقبال سے گل ہوا تو غریب خانہ برباد جنگلوں پہاڑوں میں چلے گئے، مگر جوہر کی کشش نے تلوار ہاتھ سے نہ چھوڑی۔ سپہ گری ہمّت کی بدولت روٹی پیدا کرنے لگی۔ سینکڑوں برس کے بعد پھر اقبال ادھر جھکا اور تلوار سے تاج نصیب ہوا۔ چنانچہ سلجوقی خاندان کی بنیاد انہیں میں قائم ہوگئی۔ مگر اقبال کا جھکنا جھوکا ہوا کا ہے، کئی پشتوں کے بعد اس نے پھر رُخ پلٹا اور سمرقند میں جس طرح اور سرشار تھے، اس طرح سلجوقی شہزادوں کو بھی گھروں میں بٹھا دیا۔

مرزا صاحب کے دادا گھر چھوڑ کر نکلے۔ شاہ عالم کا زمانہ تھا کہ دہلی میں آئے۔ یہاں بھی سلطنت میں کچھ نہ رہا تھا، صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے شاہی دربار میں عزت پائی اور اپنی لیاقت اور خاندان کے نام سے پہاسو کا ایک پرگنہ سیر حاصل ذات اور رسالے کی تنخواہ میں لیا۔ شاہ عالم کے بعد طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا۔ وہ علاقہ بھی نہ رہا۔ ان کے والد عبد اللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ مرحوم کے دربار میں پہنچے۔ چند روز حیدر آباد میں جا کر نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں ۳۰۰ سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس بعد ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے

میں یہ صورت بھی بگڑی۔ وہاں سے گھر آئے اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کی ۵ برس کی عمر تھی۔ نصر اللہ خاں بیگ حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ انہوں نے دُرِ یتیم کو دامن میں لے لیا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا تو صوبہ داری کمشنری ہو گئی۔ اُن کے چچا کو سواروں کی بھرتی کا حکم ہوا اور ۴ سو سوار کے افسر ہوئے۔ ۱۷ سو روپیہ مہینہ ذات کا اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر سونک سوسا کے پرگنہ پر حین حیات مقرر ہو گئی۔

مرزا چچا کے سائے میں پرورش پاتے تھے۔ مگر اتفاق یہ کہ مرگ ناگہانی میں وہ مر گئے۔ رسالہ برطرف ہو گیا، جاگیر ضبط ہو گئی۔ بزرگوں نے لاکھوں روپے کی جائداد چھوڑی تھی۔ قسمت سے کس کا زور چل سکتا ہے۔ وہ امیر زادہ، جو شاہانہ دل و دماغ لے کر آیا تھا۔ اُسے ملکِ سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے غریبانہ حال سے زندگی بسر کرنی پڑی۔ بہت تدبیریں اور وسیلے درمیان آئے، مگر سب کھیل بن بن کر بگڑ گئے۔ چنانچہ اخیر میں کسی دوست نے انہیں لکھا کہ نظام دکن کے لئے قصیدہ کہہ کر فلاں ذریعے سے بھیجو۔ اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں۔ "۵ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، ۹ برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میں میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شاملِ جاگیر نواب احمد بخش خاں ۱۰ ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیے، مگر تین ہزار روپیہ سال ان میں سے خاص میری ذات کا حصہ، ساڑھے سات سو روپیہ سال فقط میں نے سرکار انگریزی میں غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے۔ میرا حق دلانے پر رزیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکرتر گورنمنٹ بمرگِ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے ۵۰ روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ ان کے ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری ۵۰۰ روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے، یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہیِ سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دِلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی، ۷ برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کُش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والیِ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی۔ والیِ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اگر اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی، ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔"

غرض کہ نواب احمد بخش خاں بہادر کی تقسیم سے مرزائے مرحوم نالاں ہو کر ۱۸۳۰ء میں کلکتہ

گئے اور گورنر جنرل سے ملنا چاہا۔ وہاں دفتر دیکھا گیا۔ اس میں سے ایسا کچھ معلوم ہوا کہ اعزازِ خاندانی کے ساتھ ملازمت ہو جاتے اور ۷ پارچہ خلعت تین رقم بالائے مروارید ریاست ور دمانی رعایت سے مقرر ہوا۔

غرض مرزا کلکتہ سے ناکام پھرے اور ایام جوانی ابھی پورے نہ ہوئے تھے کہ بزرگوں کا سرمایہ تمام کر کے دلّی میں آئے۔ یہاں اگرچہ گزران کا طریقہ امیرانہ شان سے تھا اور امیروں سے امیرانہ ملاقات تھی، مگر اپنے علوِ حوصلہ اور بلند نظری کے ہاتھوں سے تنگ رہتے تھے پھر بھی طبیعت ایسی شگفتہ پائی تھی کہ ان دقتوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ہمیشہ کھیل کر غم غلط کر دیتے تھے۔ کیا خوب فرمایا ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

جب دلّی تباہ ہوئی تو زیادہ تر مصیبت پڑی۔ ادھر قلعہ کی تنخواہ جاتی رہی، اُدھر پنشن بند ہو گئی اور انہیں رام پور جانا پڑا۔ نواب صاحب سے ملے ۲۰۔ ۲۵ برس کا تعارف تھا یعنی ۱۸۵۹ء میں ان کے شاگرد ہوئے تھے اور ناظم تخلص قرار پایا تھا۔ وہ گاہے گاہے غزل بھیج دیتے تھے۔ کبھی روپیہ بھی آتا تھا۔ اس وقت قلعے کی تنخواہ جاری، سرکاری پنشن کھلی ہوئی تھی۔ ان کی عنایت فتوحِ غیبی گنی جاتی ہے۔ جب دِلّی کی صورت بگڑی تو زندگی کا مدار اس پہ ہو گیا۔ نواب صاحب نے ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینہ کر دیا اور انہیں بڑی تاکید سے بُلایا۔ یہ گئے تو تعظیم خاندانی کے ساتھ دوستانہ و شاگردانہ بغلگیر ہو کر ملاقات کی اور جب تک رکھا، کمال عزّت کے ساتھ رکھا بلکہ سو روپیہ مہینہ ضیافت کا زیادہ کر دیا۔ مرزا کو دِلّی کے بغیر چین کہاں؟ چند روز کے بعد رخصت ہو کر پھر وہیں چلے آئے۔ چونکہ سرکاری پنشن بھی جاری ہو گئی تھی، اس لئے چند سال زندگی بسر کی۔

آخر عمر میں بڑھاپے نے بہت عاجز کر دیا۔ کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا۔ نقش تصویر کی طرح لیٹے رہتے تھے۔ کسی کو کچھ کہنا ہوتا تھا تو لکھ کر رکھ دیتا تھا، وہ دیکھ کر جواب دے دیتے تھے۔ خوراک دو تین برس سے یہ رہ گئی تھی کہ صبح کو پانچ سات بادام کا شیرہ، ۱۲ بجے آب گوشت شام کو ۴ کباب تلے ہوئے۔ آخر ۷۳ برس کی عمر ۱۸۶۹ء (۱۲۸۵ھ) میں جہانِ فانی سے انتقال فرمایا اور بندہ آثم نے تاریخ لکھی۔ آہ غالب بمرد۔ مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر کہا تھا اور اکثر یہی پڑھتے رہتے تھے۔

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

# مرزا صاحب کے حالات اور طبعی عادات

اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا اہل ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ مگر علومِ درسی کی تحصیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی اور حق پوچھو تو یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک امیرزادے کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اُٹھ جائے اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجہ کمال تک پہنچائے۔ وہ کیسی طبع لایا ہوگا، جس نے اس کے فکر میں بلند پروازی، دماغ میں یہ معنی آفرینی، خیالات میں ایسا انداز، لفظوں میں نئی تراش اور ترکیب میں انوکھی روش پیدا کی۔ جابجا خود اُن کا قول ہے اور حقیقت میں لُطف سے خالی نہیں کہ زبانِ فارسی سے مجھے مناسبتِ ازلی ہے ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میری طبیعت کو اس زبان سے ایک قدرتی لگاؤ ہے۔ مفتی میر عباس صاحب کو "قاطع برہان" بھیج کر خط لکھا ہے، اس میں فرماتے ہیں۔ دیباچے اور خاتمے میں جو کچھ لکھ آیا ہوں، سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ نگارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں، لیکن ۵۵ برس سے محوِ سخن گزاری ہوں۔ مبدءِ فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبتِ ازلی اور سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا مزہ بھی ابدی لایا ہوں۔

ہرمزد نام ایک پارسی ژند و پاژند کا عالم تھا۔ اُس نے اسلام اختیار کیا اور عبدالصمد اپنا نام رکھا۔ ایامِ سیاحت میں ہندوستان کی طرف آنکلا اور مرزا سے بھی ملاقات ہوئی۔ اگرچہ اُس کی عمر اس وقت ۱۴ برس کی تھی، مگر مناسبت ازلی طبیعت میں تھی، جس نے اُسے کھینچا اور دو برس گھر مہمان رکھ کر اکتساب کمال کیا۔ اس روشن ضمیر کے فیضانِ صحبت کا انہیں فخر تھا اور حقیقت میں یہ امر فخر کے قابل ہے۔

میں نے چاہا کہ مرزا صاحب کی تصویر الفاظ و معنی سے کھینچوں، مگر یاد آیا کہ انہوں نے ایک جگہ اسی رنگ و روغن سے اپنی تصویر آپ کھینچی ہے، میں اس سے زیادہ کیا کرلوں گا۔ اس کی نقل کافی ہے، مگر اول اتنا سن لو کہ مرزا حاتم علی مہر تخلص ایک شخص آگرہ میں تھے۔ مرزا کے اواخر عمر میں اس ہم وطن بھائی سے خط و کتابت جاری ہوئی۔ وہ ایک وجیہ اور طرحدار جوان تھے۔ ان سے اُن سے دید وادید نہ ہوئی، لیکن کسی زمانے کی ہم وطنی، شعر گوئی، ہم مذہبی اور اتحاد خیالات کے تعلق سے شاید کسی جلسے میں مرزا نے کہا کہ مرزا حاتم علی مہر کو سنتا ہوں کہ طرحدار آدمی ہیں، دیکھنے کو جی چاہتا ہے انہیں جو یہ خبر پہنچی تو مرزا کو خط لکھا اور اپنا حلیہ بھی لکھا اب اس کے جواب میں

جو مرزا آپ ہی اپنی تصویر کھینچتے ہیں، اسے دیکھنا چاہیئے۔" بھائی! تمہاری طرحداری کا ذکر میں نے مغل جان سے سُنا تھا جس زمانے میں کہ وہ حامد علی خاں کی نوکر تھی اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دیکھا دیئے۔ بہرحال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے کا مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ (تمہاری) داڑھی خوب گھنی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں، جی پر کیا گزری، بقولِ شیخ علی حزیںؔ:

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

(میرے) جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار (میں نے) مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی، مگر یہ یاد رکھیئے کہ اس بھونڈے شہر میں (یعنی دہلی میں) ایک وردی ہے عام۔ ملّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّا، بھٹیارا، جلاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی سر پر بال۔ میں نے جس دن داڑھی رکھی، اسی دن سر منڈایا۔ اس فقرے سے معلوم ہوا کہ اپنا انداز سب سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ لباس ان کا اکثر اہلِ ولایت کا ہوتا تھا۔ سر پر اگرچہ کلاہ یا پاخ نہ تھی، مگر لمبی ٹوپی سیاہ پوستین کی ہوتی تھی اور ایسا ضرور چاہیئے تھا کیونکہ وہ فارسی نویسی کو نہ فقط ذوق بلکہ عشق دلی کے ساتھ بناہتے تھے اور لباس و گفتار کی کچھ خصوصیت نہیں۔ وہ اپنی قدامت کی ہر بات سے محبت رکھتے تھے، خصوصاً خاندان کے اعزازوں کو ہمیشہ جانکاہ عرق ریزیوں کے ساتھ بچاتے رہے، اس اعزاز پر کہ جو ان کے پاس باقی تھا۔ دو دفعہ آسمانی صدمے پہنچے۔ اوّل جب کہ چچا کا انتقال ہوا، دوسرے جب ۱۸۵۷ء میں ناکردہ گناہ بغاوت کے جرم میں پنشن کے ساتھ کرسی دربار اور خلعت بند ہوا۔ "اردوئے معلّٰی" میں بیسیوں دوستوں کے نام خط ہیں، کوئی اس کے ماتم سے خالی نہیں۔ ان کے لفظوں سے اس غم میں خون ٹپکتا ہے اور دل پر جو گزرتی ہوگی وہ تو خدا ہی کو خبر ہے۔ آخر پھر ان کی جگہ اور اپنا حق لیا اور بزرگوں کے نام کو قائم رکھا۔

۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سرِ نو منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاعِ شمال، مغرب کے لفٹیننٹ گورنر بھی رہے، اس وقت سیکرٹری تھے۔ وہ مدرسین

کے امتحان کے لئے دِلّی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ مہینے کا ایک مدرس عربی ہے، ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے، ان میں مرزا کا نام بھی آیا، مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی، مگر یہ پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسبِ دستورِ قدیم صاحب سیکرٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جبکہ نہ وہ ادھر سے آئے، نہ یہ ادھر سے گئے اور دیر ہوئی تو صاحب سیکرٹری نے جمعدار سے پوچھا۔ وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے؟ انہوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے، میں کیونکر جاتا؟ جمعدار نے جاکر پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا، جب آپ دربارِ گورنری میں بہ حیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی، لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں، اس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعثِ زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں، نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں۔ صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رُخصت ہو کر چلے آئے۔ صاحب موصوف نے مومن خاں صاحب کو بلایا اُن سے کتاب پڑھوا کر سُنی اور زبانی باتیں کر کے اسّی روپے تنخواہ قرار دی۔ انہوں نے سو روپے سے کم منظور نہ کئے۔ صاحب نے کہا، سو روپے لو تو ہمارے ساتھ چلو۔ اُن کے دل نے نہ مانا کہ دِلّی کو ایسا سستا بیچ ڈالیں۔ مرزا کے کھلے ہوئے دل اور کھلے ہوئے ہاتھ نے ہمیشہ مرزا کو تنگ رکھا۔ مگر اس تنگ دستی میں بھی امارت کے تمغے قائم تھے۔ چنانچہ "اردوئے معلّٰی" کے اکثر خطوط سے یہ حال آئینہ ہے۔

مرزا تفتہ اپنے شاگردِ رشید کو ایک خط میں لکھتے ہیں، سو روپے کی ہنڈی وصول کر لی، ۲۴ روپے داروغہ کی معرفت اُٹھے تھے، وہ دیئے۔ ۵۰ روپے محل میں بھیج دیئے۔ ۲۶ باقی رہے، وہ بکس میں رکھ لئے۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہے، جلد آ گیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔ بھائی! بری آبنی ہے، انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصّہ مختصر یہ کہ قصّہ تمام ہوا۔

کدار ناتھ آپ کا دیوان تھا، اسی عالم میں ماہ بہ ماہ آکر چٹھا بانٹ دیتا تھا۔ آپ کہیں سفر میں گئے ہیں تو اس کے لئے خطوط میں بار بار احکام بھیجتے ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "ہنڈی میں ۱۲ دن کی میعاد تھی۔ ۶ دن گزر گئے تھے، ۶ دن باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں۔ منّی کاٹ کر روپے لے لئے۔ قرض، متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس ۴۷ روپے نقد بکس میں ہیں اور ۳۴ بوتل شراب کی اور ۳ شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ"

ایک اور جگہ اپنی بیماری کا حال کسی کو لکھتے ہیں۔ محل سرا اگرچہ دیوان خانے کے بہت قریب

ہے، پر کیا امکان، جو چل سکوں۔ صبح کو ۹ بجے کھانا یہیں آجاتا ہے۔ پلنگ پر سے کھسل پڑا۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا۔ پھر ہاتھ دھوئے، کلی کی پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے۔ اُٹھا اور حاجتی میں پیشاب کر لیا اور پڑ رہا۔

نواب الٰہی بخش خاں مرحوم کی صاحبزادی سے مرزا صاحب کی شادی ہوئی اور اس وقت ۱۳ برس کی عُمر تھی۔ باوجودیکہ اوضاع اطوار آزادانہ رکھتے تھے، لیکن آخر صاحب خاندان تھے گھرانے کی لاج پر خیال کر کے بی بی کا پاسِ خاطر بہت مدِّنظر رکھتے تھے۔ پھر بھی اس قید سے کہ خلافِ طبع تھی۔ جب بہت دق ہوتے تھے تو ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔ چنانچہ دوستوں کی زبانی بعض نقلیں بھی سُنیں اور اُن کے خطوط سے بھی اکثر جگہ پایا جاتا ہے۔ ایک قدیمی شاگرد سے ایسے معاملات میں بے تکلفی تھی۔ اس نے امراؤ سنگھ نام ایک اور شاگرد کی بی بی کے مرنے کا حال مرزا صاحب کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ ننھے ننھے بچے ہیں اور اب شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ پھر بچے کون پالے؟ اس شخص کی ایک بی بی پہلے مر چکی تھی اور یہ دوسری بی بی مری تھی۔ اب حضرت اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: "امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دوبار بیڑیاں کٹ چکی ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟" جب ان کی پنشن کھلی تو ایک اور شخص کو لکھتے ہیں: "تجھ کو میری جان کی قسم! اگر میں تنہا ہوتا تو اس قلیل آمد میں کیسا فارغ البال و خوشحال رہتا۔" مرزا صاحب نے فرزندانِ روحانی یعنی پاک خیالات اور عالی مضامین کا ایک انبوہ بے شمار اپنی نسل میں یادگار چھوڑا، مگر افسوس کہ جس قدر ادھر خوش نصیب ہوئے، اسی قدر فرزندانِ ظاہری کی طرف سے بے نصیب ہوئے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں: "سات بچے ہوئے، مگر برس برس دن کے پس و پیش میں سب ملکِ عدم کو چلے گئے۔" ان کی بی بی کے بھانجے الٰہی بخش مرحوم کے نواسے زین العابدین خاں تھے۔ وہ بھی شعر کہا کرتے تھے اور عارف تخلص کرتے تھے۔ عارف جوان مر گئے اور دو ننھے ننھے بچے یادگار چھوڑے۔ بی بی ان بچوں کو بہت چاہتی تھیں۔ اس لئے مرزا نے انہیں اپنے بچوں کی طرح پالا۔ بڑھاپے میں انہیں گلے کا ہار کئے پھرتے تھے۔ جہاں جاتے، وہ پالکی میں ساتھ ہوتے تھے۔ اُن کے آرام کے لئے آپ بے آرام ہوتے تھے، اُن کی فرمائشیں پوری کرتے تھے۔ افسوس کہ مرزا کے بعد دونوں جوان مر گئے۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم کے رشید فرزند مرزا صاحب کی تکلیف نہ دیکھ سکتے تھے۔ کمال کی دولت اُن سے لیتے تھے، دُنیا کی مزدوریوں میں انہیں آرام دیتے تھے۔ چنانچہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب شاگرد ہیں، نواب امین الدین خاں

مرحوم والیے لوہارو بھی آداب خسروانہ کے ساتھ خدمت کرتے تھے۔ نواب علاؤ الدین خاں والیے حال اس وقت ولی عہد تھے۔ بچپن سے شاگرد ہیں چنانچہ مرزا صاحب نواب علاؤ الدین خاں صاحب کو لکھتے ہیں "میاں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں، پاخانہ ڈھے گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں، تمہاری پھوپھی کہتی ہیں، ہائے دبی، ہائے مری۔ دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے، مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے، اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالانِ زیریں، جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا، میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی۔ مرمت ہو جائے گی، پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک یہ مروّت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔ غالبؔ"

مرزا کثیر الاحباب تھے۔ دوستوں سے دوستی کو ایسا نباہتے تھے کہ اپنایت سے زیادہ ان کی دوست پرستی خوش مزاجی کے ساتھ رفیق ہو کر ہر وقت ایک دائرہ شرفا اور رئیس زادوں کا ان کے گرد دکھاتی تھی۔ انہی سے غم غلط ہوتا تھا اور اسی میں ان کی زندگی تھی۔ لطف یہ کہ دوستوں کے لڑکوں سے بھی وہی باتیں کرتے تھے، جو دوستوں سے۔ اُدھر ہونہار جوانوں کا مؤدب بیٹھنا اِدھر سے بزرگانہ لطیفوں کا پھول برسانا۔ ادھر سعادت مندوں کا چُپ مُسکرانا اور بولنا تو حدّ ادب سے قدم نہ بڑھانا، ادھر پھر بھی شوخی طبع سے باز نہ آنا ایک عجب کیفیت رکھتا تھا۔ بہر حال انہی لطافتوں اور ظرافتوں میں زمانے کی مصیبتوں کو ٹالا اور ناگوار کو گوارا کر کے ہنستے کھیلتے چلے گئے چنانچہ میر مہدی، میر سرفراز حسین، نواب یوسف مرزا، وغیرہ اکثر شریف زادوں کے لئے خطوط "اردوئے معلّٰی" میں ہیں، جو کہ ان جلسوں کے فوٹو گراف دکھاتے ہیں۔

زمانے کی بے وفائی نے مرزا کو وہ فارغ البالی نصیب نہ کی، جو ان کے خاندان اور کمال کے لئے شایاں تھی اور انہی دو باتوں کا مرزا کو بہت خیال تھا، لیکن اس کے لئے وہ اپنے جی کو جلا کر دل تنگ بھی نہ ہوتے تھے، بلکہ ہنسی میں اڑا دیتے تھے۔ ان دو باتوں کی سند میں دو خط نقل کرتا ہوں۔ ایک خط میر مہدی صاحب کے نام ہے کہ ایک شریف عالی خاندان ہیں اور ان کے رشید شاگرد ہیں۔ دوسرا خط منشی ہرگوپال صاحب تفتہ تخلص کے نام ہے، جن کا ذکر مجملاً پہلے لکھا گیا ہے۔

"میر مہدی! تم میری عادات کو بھول گئے؟ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح

ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رامپور کیونکر رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے، مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آپہنچا، یک شنبہ کو غرّہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جاکر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں، شب کو جامع مسجد میں جاکر تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو دل میں آتی ہے تو وقتِ صوم مہتاب باغ میں جاکر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں

واہ واہ کیا اچھی عمر بسر ہوتی ہے

اب اصل حقیقت سنو، لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا وہاں انہوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا، ورنہ گرمی، برسات وہیں کاٹتا۔ اب شرطِ حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے، سو روپیہ مجھے ماہوار بھیجتے تھے، اب میں جو وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپیہ پاؤں اور دلّی رہوں تو سو روپے۔ بھائی سو دو سو میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ پس بہر حال غنیمت ہے...... رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیئے، کمی کا شکوہ کیا؟ انگریزی سرکار سے دس ہزار روپیہ سال ٹھہرے۔ اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپیہ سال۔ ایک صاحب نے نہ دیئے، مگر تین ہزار روپیہ سال، عزت میں وہ پایا، جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے، بنا رہا۔ خاں صاحب بسیار مہربان دوستان القاب، خلعت سات پارچہ اور جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم، کسی سے توقیر کم نہیں، مگر فائدہ وہی قلیل، سو میری جان! یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کوٹھڑی میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آرہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا، یہ باتیں کر لیں۔"

خط بنام منشی ہرگوپال تفتہ: بس اب تم سکندر آباد میں رہے۔ کہیں اور کیوں جاؤ گے؟ بنک گھر کا روپیہ اُٹھا چکے ہو، اب کہاں سے کھاؤ گے میاں! نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے، نہ تمہارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے۔ جو ہونا ہے، وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے۔ کہنے کی بات ہو تو کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے۔

رغبتِ جاہ چہ لغزت، اسباب کدام
زیں ہوسہا گزریا گزر، مگزر رد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں، نہ مقید۔ نہ رنجور ہوں، نہ تندرست۔ نہ خوش ہوں، نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں، نہ زندہ۔ جیئے جاتا ہوں، باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ بگاہ پیئے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی، مر بھی رہوں گا۔ نہ شکر ہے، نہ شکایت ہے، جو تقریر ہے بہ سبیلِ حکایت ہے۔

مرزا کے تمام خاندان کا اور بزرگوں کا مذہب سنّت وجماعت تھا، مگر اہل راز اور تصنیفات سے بھی ثابت ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا کہ ظہور اس کا جوشِ محبت میں تھا، نہ کہ تبرا اور تکرار میں۔ چنانچہ اکثر لوگ انہیں تفسیری کہتے تھے اور وہ سُن کر خوش ہوتے تھے ایک اور جگہ کہتے ہیں:

منصورِ فرقہ، علی اللّٰہیاں منم
آوازۂ انا اسد اللہ برا فگنم

تمام اقربا اور حقیقی دوست سنّت وجماعت تھے، لیکن ان کی اپنایت میں کس طرح کی دوئی نہ معلوم ہوتی تھی۔ مولٰنا فخر الدین کے خاندان کے مرید بھی تھے۔ دربار اور اہل دربار میں کبھی اس معاملے کو نہیں کھولتے تھے اور یہ طریقہ دہلی کے اکثر خاندانوں کا تھا۔ تصنیفاتِ اردو میں ۱۸۰۰ سو شعر کا ایک دیوانِ انتخابی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا۔ اس میں کچھ تمام اور کچھ ناتمام غزلیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ غزلوں کے تخمیناً ۱۵۰۰ شعر، قصیدوں کے ۱۶۲ شعر، مثنوی کے ۳۲ شعر، متفرقات قطعوں کے ۱۱۱ شعر، رباعیاں ۱۶، دو تاریخیں جن کے ۴ شعر۔ جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے، اس سے ہزاروں درجہ عالمِ معنی میں کلام بلند ہے، بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب ان شکایتوں کے چرچے زیادہ ہوئے تو اس ملکِ بے نیازی کے بادشاہ کو کہ اقلیمِ سخن کا بھی بادشاہ تھا، اپنی غزل کے ایک شعر سے سب کو جواب دے دیا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ایک اور رباعی بھی کہی:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن اسکے اسے سخنورانِ کامل

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

ایک دن اُستاد مرحوم سے مرزا صاحب کے انداز نازک خیالی کا اور فارسی ترکیبوں کا اور لوگوں کی مختلف طبیعتوں کا ذکر تھا۔ میں نے کہا، بعض شعر صاف بھی نکل جاتا ہے تو قیامت ہی کر جاتا ہے۔ فرمایا، خوب! پھر کہا کہ جو شعر مرزا کا ہوتا ہے، اس کی لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ شعر اُن کے میں تمہیں سناتا ہوں۔ کئی متفرق شعر پڑھے تھے، ایک اب تک خیال میں ہے:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے بیشے کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اوّل کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی اُن کا شیوۂ خاص تھا، دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اُس سے اُنہیں طبعی تعلق تھا، اس لئے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں، لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔ اہل ظرافت بھی اپنی نوک جھوک سے چوکتے نہ تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مرزا بھی مشاعرے میں تشریف لے گئے۔ حکیم آغا جان عیشؔ ایک خوش طبع شگفتہ مزاج شخص تھے۔

غزل طرحی میں یہ قطعہ پڑھا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے، اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اسی واسطے اواخر عمر میں نازک خیالی کے طریقے کو بالکل ترک کر دیا تھا۔ چنانچہ دیکھو اخیر کی غزلیں صاف صاف ہیں۔ دونوں کی کیفیت جو کچھ ہے، معلوم ہو جائے گی۔ سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بہت بڑا تھا، یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب فاضلِ بے عدیل تھے۔ ایک زمانے میں دہلی کی عدالت ضلعی میں سررشتہ دار تھے۔ اُسی عہد میں مرزا خاں عرف مرزا خانی صاحب کوتوالِ شہر تھے۔ وہ مرزا قتیل صاحب کے شاگرد تھے۔ نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے، ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انہوں نے اکثر غزلوں کو سُنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ شعر عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا، اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا، انتخاب کرو

اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے، جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔

عودِ ہندی: کچھ تقریظیں کچھ اور نثریں اور خطوط ہیں۔ اکثر خطوں میں ان لوگوں کے جواب ہیں، جنہوں نے کسی مشکل شعر کے معنی پوچھے یا کوئی امر تحقیق طلب یا فارسی یا اُردو کا دریافت کیا۔

اُردوئے معلّٰی: (۱۲۸۵ھ، ۱۸۶۹ء)۔ چند شاگردوں اور دوستوں نے جس قدر اُردو کے خطوط اُن کے ہاتھ آئے، ایک جگہ ترتیب دیئے اور اس مجموعے کا نام مرزا نے خود اُردوئے معلّٰی رکھا۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے، گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں، مگر کیا کریں کہ اُن کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی تھیں۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو وہ جانیں، یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "کیا جگر خون کن اتفاق ہے۔ اب در رنگ درزی کی تقصیر معاف کیجئے۔ بس چاہیئے کوئل کی آرامش کا ترک کرنا اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا یہ رتبہ میری اور سُش کے فوق ہے۔ سرمایۂ نازشِ قلمرو ہندوستان ہو۔" بعض جگہ خاص محاورہ فارسی کا ترجمہ کیا ہے، جیسے میرؔ اور سوداؔ وغیرہ استادوں کے کلام میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ اُنہی خطوں میں فرماتے ہیں: "اس قدر عذر چاہتے ہو۔" یہ لفظ ان کے قلم سے اس واسطے نکلا کہ عذر خواستن جو فارسی کا محاورہ ہے، وہ اس باکمال کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ ہندوستانی عذر کرنا یا عذر معذرت کرنی بولتے ہیں۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو تو مجھے اُس شخص سے خس برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں۔ یہ بھی ترجمہ نظر بریں ضابطہ کا ہے۔ "منشی نبی بخش تمہارے خط نہ لکھنے کا گلہ رکھتے ہیں" گلہ داروند و شکوہ دارند فارسی کا محاورہ ہے۔ "کیوں مہاراج کول میں آنا، منشی نبی بخش کے غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا!" یاد آوردن خاص ایران کا سکّہ ہے، ہندوستانی یاد کرنا بولتے ہیں۔ "جو آپ پر معلوم ہے، وہ مجھ پہ مجہول نہ رہے۔" ہرچہ بر شما منکشف است، بر من مخفی نماند۔"

ان خطوں کی طرزِ عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں۔ یہ اُنہی کا ایجاد تھا کہ آپ مزا لے لیا اور اوروں کو لطف دے گئے۔ دوسرے کا کام نہیں۔ اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاقی خیال یا علمی مطالب یا دُنیا کے معاملات خاص میں مراسلے لکھے تو اس انداز میں ممکن نہیں۔ اس کتاب میں چونکہ اصلی خط لکھے ہیں، اس لئے وہ اِن کی ظاہر و باطن کی حالت کا آئینہ ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کے غم و الم ہمیشہ انہیں ستاتے تھے اور وہ علوِ حوصلہ سے ہنسی ہی میں اُڑاتے تھے۔ پورا لطف ان تحریروں کا اس شخص کو آتا ہے کہ جو خود ان کے حال سے اور مکتوب الیہوں کی چال ڈھال

سے اور طرفین کے ذاتی معاملات سے بخوبی واقف ہو، غیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں، اس لئے اگر ناواقف اور بے خبر لوگوں کو اس میں مزہ نہ آئے تو کچھ عجب نہیں۔

اس کتاب میں قلم، التماس کو مونث، بینش، بیداد، بارک کو مذکر فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں، میرا اردو بہ نسبت اوروں کے فصیح ہوگا۔

لطائفِ غیبی۔ اس رسالے میں منشی سعادت علی کی طرف روئے سخن ہے۔ اگرچہ اس کے دیباچے میں سیف الحق کا نام لکھا ہے، مگر انداز عبارت اور عبارت کے چٹکلے صاف کہتے ہیں کہ مرزا ہیں۔ وہ درحقیقت وہی میاں دادخاں ہیں، جن کے نام چند رقعے مرزا صاحب کے "اردوئے معلیٰ" میں ہیں چنانچہ ایک رقعے میں انہیں فرماتے ہیں کہ صاحب میں نے تم کو سیف الحق خطاب دیا، تم میری فوج کے سپہ سالار ہو۔

تیغِ تیز:۔ مولوی احمد علی پروفیسر مدرسۂ ہگلی نے قاطع برہان کے جواب میں مؤید البرہان لکھی تھی۔ اس کے بعض مراتب کا جواب مرزا صاحب نے تحریر فرما کر تیغ تیز نام رکھا۔

ساطع برہان کے اخیر میں چند ورق سید عبداللہ کے نام سے ہیں، وہ بھی مرزا صاحب کے ہیں۔

# تصنیفاتِ فارسی

فارسی کی تصنیفات کی حقیقتِ حال کا لکھنا اور ان پر رائے لکھنی اردو کے تذکرہ نویس کا کام نہیں ہے، اس لئے فقط فہرست لکھتا ہوں۔

قصائد:۔ حمد و نعت میں آئمہ معصومین کی مدح میں، بادشاہ دہلی، شاہِ اودھ، گورنروں اور بعض صاحبانِ عالیشان کی تعریف میں ہیں۔

غزلوں کا دیوان: مع دیوان قصائد کے ۱۸۴۵ء میں مرتب ہو کر نقلوں کے ذریعے سے اہل ذوق میں پھیلا اور اب تک کئی دفعہ چھپ چکا ہے۔

پنج آہنگ: اس میں پانچ آہنگ کے پانچ باب فارسی کے انشا پردازوں کے لئے جو کہ ان کے انداز میں لکھنا چاہیں۔ ایک عمدہ تصنیف ہے۔

۱۸۶۲ء میں قاطع برہان چھپی بعد کچھ تبدیلی کے اسی کو پھر چھپوایا اور درفش کاویانی نام رکھا۔ برہان قاطع کی غلطیاں نکالی ہیں، مگر اس پر فارسی کے دعویداروں نے سخت حملوں کے ساتھ مخالفت کی۔

نامہ غالب: قاطع برہان کے کئی شخصوں نے جواب لکھے۔ چنانچہ میرٹھ میں حافظ عبدالرحیم

نام ایک معلم نابینا تھے، انہوں نے اس کا جواب ساطع برہان لکھا۔ مرزا صاحب نے خط کے عنوان میں حافظ صاحب موصوف کو بطور جواب کے چند ورق لکھے اور ان کا نام نامۂ غالب رکھا۔

مہر نیم روز: حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے تھے۔ انہیں تاریخ کا شوق تھا اور اہل کمال کے ساتھ عموماً تعلق خاطر رکھتے تھے۔ مرزا نے ان کے ایما سے اوّل کتاب مذکور کا ایک حصّہ لکھا۔ اسی کے ذریعے سے ۱۸۵۰ء میں باریاب حضور ہو کر خدمت تاریخ نویسی پر مامور ہوئے اور نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب بہادر نظام جنگ خطاب ہوا چنانچہ پہلی جلد میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال بیان کر کے مہر نیم روز نام رکھا۔ ارادہ تھا کہ اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کا حال دوسری جلد میں لکھیں اور ماہ نیم ماہ نام رکھیں کہ غدر ہو گیا۔

دستنبو: ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک حالِ بغاوت، رودادِ تباہیٔ شہر، اپنی سرگزشت، غرض کل ۱۵ ر مہینے کا حال لکھا ہے۔

سبدِ چین: دو تین قصیدے، چند قطعے، چند خطوط فارسی کے اس میں ہیں کہ دیوان میں درج نہ ہوئے تھے۔

اواخر عمر میں اپنا کلام اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ اردو کی تصنیفات، نواب حسین مرزا صاحب کے پاس رہتی تھیں اور ترتیب کرتے جاتے تھے۔ فارسی نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب کو بھیج دیتے تھے کہ انہیں نیر درخشاں تخلص کر کے اپنا رشید شاگرد اور خلیفۂ اوّل قرار دیا تھا۔ خلیفۂ دوم۔ نواب علاء الدین خاں صاحب تھے۔

ان کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی انشاء پردازی کے شوق کو بڑی کاوش اور عرق ریزی سے نباہتے تھے۔ اسی واسطے مرنے سے ۱۰، ۱۵ برس پہلے ان کی تحریریں اردو میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک دوست کے خط میں خود فرماتے ہیں:

"بندہ نواز! زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاری کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب دوستوں کو، جن سے کتابت رہتی ہے، اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط لکھے اور بھیجے تھے، ان میں سے اِلی الآن موجود ہیں۔ ان سے بھی عندالضرورت اسی زبان مروّج میں

مکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔

"اُردوئے معلّیٰ" میں مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کو تحریر فرماتے ہیں، "میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین ایک میرے دوست تھے۔ انہوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی تشبیہات نظم کیجئے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی اُن سے لی۔

## قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی ۔۔۔ زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے ۔۔۔ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجیے ۔۔۔ خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلیٰ کہیے
حجرالاسودِ دیوارِ حرم کیجیے فرض ۔۔۔ نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
صومعے میں اِسے ٹھیرائیے گر مُہرِ نماز ۔۔۔ میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے ۔۔۔ سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض ۔۔۔ اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

غرض کہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں، بھول گیا۔ نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت اُن کے بیٹے تھے اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے، مگر بادشاہ انہی کی ولی عہدی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ جب اُن کی شادی کا موقع آیا تو بڑی دھوم کے سامان ہوئے۔ مرزا نے یہ سہرا کہہ کر حضور میں گزرانا۔

## سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا ۔۔۔ باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے ۔۔۔ ہے ترے حُسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے، پر اے طرفِ کلاہ ۔۔۔ مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی ۔۔۔ ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی ۔۔۔ تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا ۔۔۔ ہے رگِ ابرِ گُہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک، گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گراں باریِ گوہر سہرا!

ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

مقطع کو سن کر حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں۔ ہم نے شیخ ابراہیم ذوقؔ کو استاد اور ملک الشعرا بنایا ہے، یہ سخن فہمی سے بعید ہے، بلکہ طرفداری ہے۔ چنانچہ اسی دن اُستاد مرحوم جو حسبِ معمول حضور میں گئے تو بادشاہ نے وہ سہرا دکھایا کہ استاد دیکھئے۔ انہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی: پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا کہ اُستاد! تم بھی ایک سہرا کہہ دو عرض کی۔ بہت خوب پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو اور ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا۔ اُستاد مرحوم وہیں بیٹھ گئے اور عرض کیا:

## سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پہ سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُرنور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صلِّ علیٰ، یہ کہے سبحان اللہ
دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ اختر سہرا

تا بنی اور بنے میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہرا

رُوئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئین ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے، دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صدکانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدّھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک — کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا
کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے — دم نظارے ترے، روئے نکو پر سہرا
دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا — واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا
جس کو دعویٰ ہے سخن کا، یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اسی وقت انہیں ملا، شام تک شہر کی گلی گلی کوچے کوچے میں پھیل گیا۔ دوسرے دن اخباروں میں مشتہر ہو گیا۔ مرزا بھی بڑے اداشناس اور سخن فہم تھے سمجھے کہ تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور یہ قطعہ حضور میں گزرانا:

# قطعہ در معذرت

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ؟ ہاں اس سے مدعا — جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا، نہیں جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
قسمت بری سہی، پہ طبیعت بری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

کلکتہ میں بہت سے اہل ایران اور بڑے بڑے علماء و فضلاء موجود تھے، مگر افسوس ہے کہ وہاں مرزا کے کمال کے لئے ایسی عظمت نہ ہوئی جیسی کہ ان کی شان کے لئے شایاں تھی۔ حقیقت میں ان کی عظمت ہونی چاہیئے تھی اور ضرور ہوتی، مگر ایک اتفاقی پیچ پڑ گیا۔ اس کی داستان یہ ہے کہ مرزا نے کسی جلسہ میں ایک فارسی کی غزل پڑھی۔ اس میں ایک لفظ پر بعض اشخاص نے اعتراض کیا

اور اعتراض بموجب اس قاعدے کے تھا، جو مرزا قتیلؔ نے اپنے ایک رسالے میں لکھا ہے۔ مرزا نے سُن کر قتیل کون ہوتا ہے اور مجھ مرزا قتیل سے کیا کام! ایک فرید آباد کا کھتری تھا۔ میں اہل زبان کے سوا کسی کو نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ اکثر مرزا قتیل کے شاگرد تھے، اس لئے آئینِ مہمان نوازی سے آنکھیں بند کرلیں اور جوش وخروش خاص وعام میں پیدا ہُوا۔ مرزا کو تعجب ہُوا اور اس خیال سے کہ یہ فتنہ کسی طرح فرو ہوجائے، سلامت روی کا طریقہ اختیار کر کے ایک مثنوی لکھی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ دادِ سخن وری کی دی ہے۔ معرکے کا سارا ماجرا نہایت خوبی کے ساتھ نظم میں ادا کیا۔ اعتراض کو سند سے دفعہ کیا۔ اپنی طرف سے انکسارِ مناسب کے ساتھ معذرت کا حق پورا کیا، لیکن زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ جب مثنوی حریفوں کے جلسے میں پڑھی گئی تو بجائے اس کے کہ کمال کو تسلیم کرتے یا مہمان سے اپنی زیادتیوں کا عذر کرتے، ایک نے عمداً کہا کہ اس مثنوی کا نام کیا ہے؟ معلوم ہُوا کہ بادِ مخالف، دُوسرے نے گلستاں کا فقرہ پڑھا: یکے از صلحا را بادِ مخالف در شکم پیچید اور سب نے ہنس دیا۔

لطیفہ: دِلّی میں مشاعرہ تھا، مرزا نے اپنی فارسی غزل پڑھی۔ مفتی صدرالدین خان صاحب اور مولوی امام بخش صاحب صہبائی جلسے میں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے جس وقت یہ مصرع پڑھا ع بہ وادیے کہ دراں خضر را عصا خفت است، مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ "عصا خفت است" میں کلام ہے۔ مرزا صاحب نے کہا کہ حضرت! میں ہندی نژاد ہوں، میرا عصا پکڑ لیا، اس شیرازی کا عصا نہ پکڑا گیا ولے بجملۂ اوّل عصائے شیخ بخفت۔ انہوں نے کہا کہ اصل محاورے میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے، کہ مناسب مقام ہے یا نہیں۔

لطیفہ: ایک دفعہ مرزا بہت قرضدار ہوگئے۔ قرض خواہوں نے نالش کردی۔ جواب دہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں گئے، یہ شعر پڑھا:

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا صاحب کو ایک آفتِ ناگہانی کے سبب سے چند روز جیل خانے میں اس طرح رہنا پڑا کہ جیسے حضرت یوسفؑ کو زندانِ مصر میں۔ کپڑے میلے ہوگئے تھے جوئیں پڑھ گئی تھیں، ایک دن بیٹھے اُن میں سے جوئیں چُن رہے تھے۔ ایک رئیس وہیں عیادت کو پہنچا۔ پوچھا، کیا حال ہے؟ آپ نے یہ شعر پڑھا:

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتارِ بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن وہاں سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کُرتا وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا:

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

حسین علی خاں چھوٹا لڑکا ایک دن کھیلتا کھیلتا آیا کہ دادا جان! مٹھائی منگا دو۔ آپ نے فرمایا کہ پیسے نہیں۔ وہ صندوقچہ کھول کر ادھر ادھر پیسے ٹٹولنے لگا۔ آپ نے فرمایا:

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

پنشن سرکار سے ماہ بماہ ملتی تھی۔ بغاوتِ دہلی کے بعد حکم ہُوا کہ ششماہی ملا کرے اس موقع پر ایک دوست کو لکھتے ہیں:

رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

مگر یہ دو شعر حقیقت میں ایک قصیدے کے ہیں، جس کی بدولت بادشاہ دہلی کے دربار سے ششماہی تنخواہ کے لئے ماہواری کا حکم حاصل کیا تھا۔ فارسی کے قصائد میں اس قسم کے عزل و نصب انہوں نے اکثر لکھے ہیں اور یہ کچھ عجیب بات نہیں، انوری وغیرہ اکثر شعرا نے ایسا کیا ہے:

لطیفہ: مولوی فضل حق صاحب مرزا کے بڑے دوست تھے۔ ایک دن مرزا اُن کی ملاقات کو گئے۔ اُن کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالق باری کا یہ مصرع پڑھا کرتے تھے ؎ بیا برادر آورے بھائی! چنانچہ مرزا صاحب کی تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی صاحب کی رنڈی بھی دُوسرے دالان سے اُٹھ کر پاس آن بیٹھی۔ مرزا نے فرمایا: ہاں صاحب اب وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجئے ؎

بنشین مادر بیٹھ ری مائی

لطیفہ: مرزا کی "قاطع برہان" کے بہت شخصوں نے جواب لکھے ہیں اور بہت زبان درازیاں

کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ حضرت آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ لکھا فرمایا، بھائی! اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دو گے!

لطیفہ: بہن بیمار تھیں۔ آپ عیادت کو گئے۔ پوچھا، کیا حال ہے؟ وہ بولیں کہ مرتی ہوں۔ قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لئے جاتی ہوں۔ آپ نے کہا کہ لو! بھلا یہ کیا فکر ہے؟ خدا کے ہاں کیا مفتی صدر الدین خان بیٹھے ہیں، جو ڈگری کر کے پکڑوا بلائیں گے؟

لطیفہ: ایک دن مرزا کے شاگرد رشید نے آکر کہا کہ حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت وبلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھئے تو میں کیسا فصیح ہو گیا۔ مرزا نے کہا کہ ارے میاں! تین کوس کیوں گئے۔ میرے پچھواڑے کے ببول کی پیپلیاں کیوں نہ کھالیں چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

لطیفہ: بعض بعض شاگردوں نے مرزا سے کہا کہ آپ نے حضرت علیؓ کی مدح میں بہت قصیدے اور بڑے بڑے زور کے قصیدے کہے، صحابہ میں سے کسی کی تعریف میں کچھ نہ کہا! مرزا نے ذرا تامل کر کے کہا کہ اُن میں کوئی ایسا دکھا دیجئے تو اس کی تعریف بھی کہہ دوں۔ مرزا صاحب کی شوخیٔ طبع ہمیشہ انہیں اس رنگ میں شور بور رکھتی تھی، جس سے ناواقف لوگ انہیں الحاد کی تہمت لگاتے اور چونکہ یہ رنگ ان کی شکل و شان پر عجیب معلوم ہوتا تھا، اس لئے اُن کے دوست ایسی باتوں کو سُن کر چونکتے تھے۔ جوں جوں وہ چونکتے تھے وہ اور بھی زیادہ چھینٹے اڑاتے تھے۔ اُن کی طبیعت سرورِ شراب کی عادی تھی لیکن اُسے گناہ الٰہی سمجھتے تھے اور یہ بھی عہد تھا کہ محرم میں ہرگز نہ پیتے تھے۔

لطیفہ: غدر کے چند روز بعد پنڈت موتی لعل کہ ان دنوں میں مترجم گورنمنٹ پنجاب کے تھے، صاحب چیف کمشنر پنجاب کے ساتھ دلّی گئے اور حب الوطن اور محبتِ فن کے سبب سے مرزا صاحب کی ملاقات کی۔ اُن دنوں میں پنشن بند تھی۔ دربار کی اجازت نہ تھی۔ مرزا بہ سبب دل شکستگی کے شکوہ شکایت سے لبریز ہو رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ عمر بھر ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں، پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باغی مسلمانوں میں کس طرح شامل سمجھا؟

لطیفہ: بھوپال سے ایک شخص دلّی کی سیر کو آئے۔ مرزا صاحب کے بھی مشتاقِ ملاقات تھے۔ چنانچہ ایک دن ملنے کو تشریف لائے۔ وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت پرہیزگار اور پارسا شخص ہیں۔ اُن سے بہ کمال اخلاق پیش آئے، مگر معمولی وقت تھا۔ بیٹھے سرور

کر رہے تھے۔ گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا۔ اُن بے چارہ کو خبر نہ تھی کہ آپ کو یہ شوق بھی ہے۔ انہوں نے کسی شربت کا شیشہ خیال کر کے ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ کوئی شخص پاس سے بولا کہ جناب یہ شراب ہے۔ بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا کہ میں نے شربت کے دھوکے میں اُٹھایا تھا۔ مرزا نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ رہے نصیب دھوکے میں نجات ہو گئی۔

لطیفہ: ایک دفعہ رات کو انگنائی میں بیٹھے تھے۔ چاندنی رات تھی تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ آپ آسمان دیکھ کر فرمانے لگے کہ جو کام بے صلاح و مشورہ ہوتا ہے، بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ خدا نے ستارے آسمان پر کسی سے مشورہ کر کے نہیں بنائے، جبھی بکھرے ہوئے ہیں۔ نہ کوئی سلسلہ، نہ زنجیر، نہ بیل، نہ بوٹا۔

لطیفہ: ایک مولوی صاحب جن کا مذہب سنت والجماعت تھا۔ رمضان کے دنوں میں ملاقات کو آئے۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی۔ مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے کہا حضرت غضب کرتے ہیں، رمضان میں روزے نہیں رکھتے؟ مرزا نے کہا سنی مسلمان ہوں، چار گھڑی دن سے روزہ کھول لیا کرتا ہوں۔

لطیفہ: رمضان کا مہینہ تھا۔ آپ نواب حسین مرزا کے ہاں بیٹھے تھے۔ پان منگا کر کھا لیا۔ ایک صاحب فرشتہ سیرت نہایت متقی و پرہیز گار اس وقت حاضر تھے۔ انہوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ قبلہ! آپ روزہ نہیں رکھتے؟ مسکرا کر بولے شیطان غالب ہے۔

یہ لطیفہ اہل ظرافت میں پہلے سے بھی مشہور ہے کہ عالمگیر کا مزاج سرمد سے مکدّر تھا، اس لئے ہمیشہ اس کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ قاضی قوی، جو اس عہد میں قاضی شہر تھا، اُس نے ایک موقع پر سرمد کو بھنگ پیتے ہوئے جا کر پکڑا۔ اوّل بہت سے لطائف و ظرائف کے ساتھ جواب سوال ہوئے۔ آخر جب قاضی نے کہا کہ نہیں! شرع کا حکم اسی طرح ہے، کیوں حکم الٰہی کے برخلاف باتیں بناتا ہے؟ اس نے کہا کہ کیا کروں، شیطان قوی ہے۔

لطیفہ: جاڑے کا موسم تھا۔ ایک دن نواب مصطفیٰ خاں صاحب مرزا کے گھر آئے آپ نے اُن کے آگے شراب کا گلاس بھر کر رکھ دیا۔ وہ اُن کا مُنہ دیکھنے لگے۔ آپ نے فرمایا لیجئے۔ چونکہ وہ تائب ہو چکے تھے، انہوں نے کہا کہ میں نے تو توبہ کی۔ آپ متعجب ہو کر بولے کہ ہیں جاڑے میں بھی؟

لطیفہ: ایک صاحب نے اُن کے سُنانے کو کہا کہ شراب پینی سخت گناہ ہے۔ آپ نے ہنس کر کہا گر بھلا جو پیئے تو کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دُعا نہیں

قبول ہوتی۔ مرزا نے کہا کہ آپ جانتے ہیں، شراب پیتا کون ہے؟ اوّل تو وہ کہ ایک بوتل اولڈ ٹام کی باسامان سامنے حاضر ہو، دوسرے بے فکری، تیسرے صحت، آپ فرمائیے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو، اُسے اور چاہیئے کیا، جس کے لئے دُعا کرے؟

مرزا صاحب کو مرنے سے ۱۲ برس پہلے اپنی تاریخ فوت کا ایک مادہ ہاتھ آیا وہ بہت بھایا اور اُسے موزوں فرمایا ؎

# تاریخ فوت

منکہ باشم کہ جاوداں باشم — چوں نظیری نماند و طالب مرد

در بر مسند در کدا میں سال

مُرد غالب؟ بگوکہ "غالب مُرد"

اس حساب سے ۱۲۷۷ھ میں مرنا چاہیئے تھا۔ اسی سال شہر میں سخت وبا آئی۔ ہزاروں آدمی مر گئے۔ ان دلوں دِلّی کی بربادی کا غم تازہ تھا۔ چنانچہ میر مہدی صاحب کے جواب میں آپ فرماتے ہیں: وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر اندازِ قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا پڑا، وبا کیوں نہ ہو! لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام

ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں! ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا کے سمجھ لیا جائے گا۔

# غزلیں

شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے — کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل

کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دلِ گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منّت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے، اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں اک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیمکش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جانگسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اِک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تُو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے گرم خبر اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وُہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مِرا بھلا نہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما
کام گر رک گیا، روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی
داغ دل گر نظر نہیں آتا — بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے، پر نہیں آتی

کعبے کس مُنہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

حُسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے — اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے — وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض — اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا — جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے — کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضر سلطان کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز — شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی — قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی
اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا — گویا ابھی سُنی نہیں آواز صُور کی
آمد بہار کی ہے، جو بُلبل ہے نغمہ سنج — اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیُور کی
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں — کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طُور کی
گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر — کی جس سے بات، اُس نے شکایت ضرور کی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

بلا سے گر مژہ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لیے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے

زمانہ عہد میں اس کی ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

# مرزا سلامت علی دبیر

خاندانی شاعر نہ تھے۔ لڑکپن میں مرثیہ پڑھتے تھے۔ اس شوق نے منبر کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے عرش الکمال پر پہنچا دیا۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے اور کچھ اُستاد سے پایا، اُسے باندا اور روشن کر کے دکھایا۔ تمام عمر میں کسی اتفاقی سبب سے کوئی غزل یا شعر کہا ہو، ورنہ مرثیہ گوئی کے فن کو لیا اور اس درجے تک پہنچا دیا جس کے آگے ترقی کا راستہ بند ہو گیا۔ ابتدا سے اس شغل کو زادِ آخرت کا سامان سمجھا اور نیک نیتی سے اس کا ثمرہ لیا۔ طبیعت بھی ایسی گداز پائی تھی جو کہ اس فن کے لئے نہایت موزوں اور مناسب تھی۔ ان کی سلامت روی، پرہیز گاری، مسافر نوازی اور سخاوت نے صفت کمال کو زیادہ تر رونق دی تھی۔

شاگردانِ الٰہی کی طبیعت بھی جذبۂ الٰہی کا شوق رکھتی ہے۔ بچپن سے دل چونچال تھا۔ ابتدائے مشق میں کسی لفظ پر اُستاد کی اصلاح پسند نہ آئی۔ شیخ ناسخ زندہ تھے، مگر بوڑھے ہو گئے تھے۔ اُن کے پاس چلے گئے۔ وہ اس وقت گھر کے صحن میں مونڈھے بچھائے، جلسہ جمائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے عرض کی کہ حضرت! اس شعر میں میں نے تو یہ کہا ہے اور اُستاد نے یہ اصلاح دی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اُستاد نے ٹھیک اصلاح دی ہے۔ انہوں نے پھر کہا کہ کتابوں میں تو اس طرح آیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، جو تمہارے استاد نے بنایا ہے، وہی درست ہے۔ انہوں نے پھر عرض کی کہ حضرت آپ کتاب کو ملاحظہ تو فرمائیں۔ شیخ صاحب نے جھنجھلا کر کہا، ارے تو کتاب کو کیا جانے؟ ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے؟ ہم کتابیں دیکھتے دیکھتے خود کتاب بن گئے ہیں۔ ایسے غصے ہوئے کہ لکڑی سامنے رکھی تھی، وہ لے کر اُٹھے۔ یہ بھاگے۔ انہیں بھی ایسا جوش تھا کہ دروازے تک اُن کا تعاقب کیا۔

لکھنؤ کے لڑانے اور چمکانے والے غضب تھے۔ آخر مرزا کا عالم شباب تھا اور کمال بھی عین شباب پر تھا کہ جوانی کا بڑھاپے سے معرکہ ہوا۔ نواب شرف الدولہ میر ضمیر کے بڑے قدر دان تھے۔ اُن سے ہزاروں روپے کے سلوک کرتے تھے۔ ابتدا میں ان کے سبب سے اور پھر مرزا کے جوہر کمال کے باعث سے ان کی بھی قدر دانی کرتے تھے۔ ان کی مجلس میں اوّل مرزا، بعد اُن کے میر ضمیر پڑھا کرتے تھے۔

ایک موقع پر مرزا نے ایک مرثیہ لکھا جس کا مطلع ہے ؎

## دستِ خدا کا قوتِ بازو حسین ہے

میر ضمیر کے سامنے جب اصلاح کے لئے پیش کیا تو انہیں اس کے نئے خیالات اور طرزِ بیان اور ترتیب مضامین پسند آئی۔ اسے توجہ سے بنایا اور اسی اثنا میں نواب کے ہاں ایک مجلس ہونے والی تھی۔ رشید شاگرد سے کہا کہ بھئی! اس مرثیے کو اس مجلس میں پڑھیں گے! یہ تسلیم کرکے تسلیم بجالائے اور مرثیہ انہی کو دے دیا۔

گھر میں آئے تو بعض احباب سے حال بیان کیا۔ مسودہ پاس تھا، وہ بھی سنایا۔ کچھ تو یاروں کا چمکانا، کچھ اس سبب سے کہ ذوق شوق کے پھول ہمیشہ شبنم تعریف کے پیاسے ہیں اور نواب کو خبر پہنچ گئی تھی۔ ادھر کے اشاروں میں انعام کی ہوا آئی۔ غرض انجام یہ ہوا کہ استاد مرثیہ صاف کرکے لے گئے کہ وہی پڑھیں گے۔

بموجب معمول کے اوّل مرزا صاحب منبر پر گئے اور وہی مرثیہ پڑھا۔ بڑی تعریفیں ہوئیں اور مرثیہ خوب سرسبز ہوا۔ استاد کہ ہمیشہ شاگرد کے پڑھنے پر باغ باغ ہوا کرتے تھے اور تعریفیں کرکے دل بڑھاتے تھے، اب خاموش بیٹھے ہیں۔ کچھ غصّہ، کچھ بے وفائی زمانہ کا خیال، کچھ اپنی محنتوں کا افسوس اور فکر یہ کہ اب میں پڑھوں گا تو کیا پڑھوں گا اور اس سے بڑھ کر کیا پڑھوں گا، جس میں استادی کا رتبہ بڑھے نہیں تو اپنے درجے سے گرے بھی تو نہیں۔ غرض ان کے بعد یہ پڑھے اور کمال کی دستار صحیح سلامت لے کر منبر سے اترے، لیکن اس دن سے دل پھر گیا۔ یار لوگوں نے شاگرد کو نقطۂ مقابل کرکے بجائے خود استاد بنادیا اور وہی صورت ہوگئی کہ ایک مجلس میں دونوں کا اجتماع موقوف ہوگیا۔ زمانے نے اپنے قاعدے کے بموجب چند روز مقابلوں سے شاگرد کا دل بڑھایا اور آخر بڑھاپے کی سفارش سے استاد کو آرام کی اجازت دی۔ وہ اپنے حریف میر خلیق کے سامنے گوشۂ عزلت کا مقابلہ کرنے لگے اور یہاں میر انیس اور مرزا دبیر کے معرکے گرم ہوگئے۔

دونوں کے کمال نے سخن شناسوں کے ہجوم کو دو حصّوں میں بانٹ لیا۔ آدھے انیسیے ہوگئے۔ آدھے دبیریے۔ ان کے کلام میں محاکمہ کرنے کا لطف جب ہے کہ ہر استاد کے ۴-۴، ۵-۵ مرثیے بجائے خود پڑھو اور پھر مجلسوں میں سن کر دیکھو کہ ہر ایک کا کلام اہلِ مجلس پر کس قدر کامیاب یا ناکام رہا۔ بے اس کے مزہ نہیں۔ میں اس نکتے پر میر انیس کے حال میں کاوش کروں گا، مگر اتنا یہاں بھی کہتا ہوں کہ میر انیس صاحب صفائی کلام، لطف زبان، چاشنی محاورہ، خوبی بندش، حسن اسلوب، مناسبت مقام، طرزِ ادا اور سلسلے کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے اور یہی رعائتیں ان کی کم گوئی کا سبب تھیں۔ مرزا دبیر صاحب شوکتِ الفاظ، مضامین کی

آمد، اس میں جا بجا غم انگیز اشارے درد خیز کنایے، المناک اور دلگداز انداز، جو مرثیے کی غرض اصلی ہے، ان وصفوں میں بادشاہ تھے۔ یہ اعتراض حریفوں کا درست ہے کہ بعض ضعیف روایتیں اور دلخراش مضامین ایسے نظم ہو گئے ہیں جو مناسب نہ تھے، لیکن انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب ایک مقصود کو مدِّ نظر رکھ کر اس پر متوجہ ہوتا ہے تو اور پہلوؤں کا خیال بہت کم رہتا ہے۔ انہیں ایسی مجلسوں میں پڑھنا ہوتا تھا، جہاں ہزار ہا آدمی دوست دشمن جمع ہوتا تھا۔ تعریف کی بنیاد گریہ و بکا اور لطفِ سخن اور ایجادِ مضامین پہ ہوتی تھی۔ کمال یہ تھا کہ سب کو رُلانا اور سب کے مُنہ سے تحسین کا نکالنا۔ اس شوق کے جذبے اور فکر ایجاد کی محویت میں جو قلم سے نکل جائے، تعجب نہیں۔ نکتہ چینی ایک چھوٹی سی بات ہے، جہاں چاہا، دو حرف لکھ دیئے۔ جب انسان تمام عمر اس میں کھپا دے، تب معلوم ہوتا ہے کہ کتنا کہا اور کیسا کہا۔ ایجاد و اختراع کے لفظ پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ اصول فن سے متعلق ہے، اہل ذوق کے ملاحظہ کے لیے لکھتا ہوں:

آتشی لطیفہ: مرزا دبیر کی جوانی تھی اور شاعری بھی عین جوانی پر تھی کہ ایک دھوم دھام کا مرثیہ لکھا۔ اس کا نمودار تمہید سے چہرہ باندھا۔ رزمیہ و بزمیہ مضامین پر خوب زورِ طبع دکھایا۔ تازہ ایجاد یہ کیا کہ لشکرِ شام سے ایک بہادر پہلوان تیار کر کے میدان میں لائے۔ اس کی ہیبت ناک مورت، بدمہورت، آمد کی آن بان، اس کے اسلحۂ جنگ، ان کے خلاف قیاسِ مقادیر و وزن سے طوفان باندھے۔ پہلے اس سے کہ یہ مرثیہ پڑھا جائے، شہر میں شہرہ ہو گیا۔ ایک مجلس قرار پائی۔ اس میں علاوہ معمولی سامعین کے سخن فہم اور اہل کمال اشخاص کو خاص طور پر بھی اطلاع دی گئی۔ روزِ معہود پہ ہجوم خاص و عام ہوا۔ طلب کی تحریکیں اس اسلوب سے ہوئی تھیں، خواجہ آتش باوجود پیری و آزادی کے تشریف لائے۔ مرثیہ شروع ہوا۔ سب لوگ بموجب عادت کے تعریفوں کے غل مچاتے رہے۔ گریہ و بکا بھی خوب ہوا۔ خواجہ صاحب خاموش سر جھکائے دو زانو بیٹھے جھومتے رہے۔ مرزا صاحب مرثیہ پڑھ کر منبر سے اُترے۔ جب دلوں کے جوش دھیمے ہوئے تو خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے اور کہا کہ حضرت! جو کچھ میں نے عرض کیا، آپ نے سنا؟ فرمایا، ہوں، بھئی! سُنا۔ انہیں اتنی بات پہ قناعت کب تھی! پھر کہا، آپ کے سامنے پڑھنا گستاخی، لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ انہوں نے فرمایا، بھئی! سُنا تو سہی، مگر میں سوچتا یہ ہوں کہ یہ مرثیہ تھا یا لندھور بن سعدان کی داستان تھی۔ واہ رے اُستادِ کامل! اتنے سے فقرے میں عمر بھر کے لئے اصلاح دے گیا۔

مرزا صاحب نے ۲۹ر محرم ۱۲۹۲ھ کو ۷۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس مدت میں کم سے کم ۳ ہزار مرثیہ لکھا ہوگا۔ سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔ ایک مرثیہ

یہ لفظ لکھا جس کا مطلع ہے ع

ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا

اس میں اپنا تخلص بجائے دبیر کے عطارد دیکھا ہے اور کچھ شک نہیں کہ ان کے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہوگیا۔ نہ اب ویسا زمانہ آئے گا، نہ ویسے صاحبِ کمال پیدا ہوں گے۔

---

# میر ببر علی انیسؔ

لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی اور ضروریاتِ فن سے آگاہی حاصل کی۔ اپنی خاندانی کمال میں باپ کے شاگرد تھے اور جس طرح عمر میں دونوں بھائیوں سے بڑے تھے، اسی طرح کمال میں بھی فائق تھے۔ ابتدا میں انہیں بھی غزل کا شوق تھا۔ ایک موقع پر کہیں مشاعرے میں گئے اور غزل پڑھی۔ وہاں بڑی تعریف ہوئی۔ شفیق باپ خبر سن کر دل میں باغ باغ ہوا۔ مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کہ کل رات کہاں گئے تھے؟ انہوں نے حال بیان کیا۔ غزل سنی اور فرمایا کہ بھائی! اب اس غزل کو سلام کرو اور اس شغل میں زورِ طبع کو صرف کرو، جو دین، دنیا کا سرمایہ ہے۔ سعادت مند بیٹے نے اسی دن سے اُدھر سے قطع نظر کی۔ غزلِ مذکور کی طرح میں سلام لکھا۔ دنیا کو چھوڑ کر دین کے دائرے میں آگئے اور تمام عمر اسی میں صرف کر دی۔ نیک نیتی کی برکت نے اسی میں دین بھی دیا اور دنیا بھی اس وقت تک یہ اور ان کے ہم عصر اپنے اُستادوں کی اطاعت کو طاعت سمجھتے تھے۔ سلام، مرثیے، نوحے، رُباعیاں کہتے تھے۔ اور مرثیے کی مقدار ۳۵، ۴۰ اور ۵۰ بند تک تھی۔

زمانے کی خاصیتِ طبعی ہے کہ جب نباتات پُرانے ہو جاتے ہیں تو انہیں نکال کر پھینک دیتا ہے اور نئے پودے لگاتا ہے۔ میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ کو بڑھاپے کے پلنگ پر بٹھایا۔ میر انیسؔ کو باپ کی جگہ منبر پہ ترقی دی۔ اُدھر سے مرزا دبیرؔ ان کے مقابلے کے لئے نکلے۔ یہ خاندانی شاعر نہ تھے، مگر میر ضمیرؔ کے شاگرد رشید تھے جب دونوں نوجوان میدان مجالس میں جولانیاں کرنے لگے تو فنِ مذکور کی ترقی کے بادل گرجتے اور برستے اُٹھے اور نئے اختراع اور ایجادوں کے مینہ برسنے لگے۔ بڑی بات یہ تھی کہ بادشاہ سے لے کر امراء اور غرباء تک شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ نوجوانوں کے کمال کو خوش اعتقاد قدردان ملے۔ وہ بزرگوں سے شمار سے زیادہ اور وزن

میں بھاری تھے ۔ کلام نے وہ قدر پیدا کی کہ اس سے زیادہ بہشت ہی میں ہو تو ہو! قدردانی بھی فقط زبانی تعریف اور تعظیم و تکریم میں ختم نہ ہو جاتی تھی، بلکہ نقد و جنس کے گراں بہا انعام تحائف اور نذرانوں کے رنگ میں پیش ہوتے تھے۔ ان ترغیبوں کی بدولت فکروں کی پرواز اور ذہنوں کی رسائی اُمید سے زیادہ بڑھ گئی۔ دونوں باکمالوں نے ثابت کر دیا کہ حقیقی اور تحقیقی شاعر ہم ہیں اور ہم ہیں کہ ہر رنگ کے مضمون، ہر قسم کے خیال، ہر ایک حال کا اپنے الفاظ کے جوڑ بند سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں کہ چاہیں رُلا دیں، چاہیں ہنسا دیں، چاہیں تو حیرت کی مورت بنا دیں۔

یہ دعوے بالکل درست تھے، کیونکہ مشاہدہ ان کی تصدیق کو ہر وقت حاضر رہتا ہے، دلیل کی حاجت نہ تھی۔ "سکندر نامہ"، جس کی تعریف میں لوگوں کے لب خشک ہیں، اس میں چند میدانِ جنگ ہیں، رزمِ زنگبار، جنگِ دارا، جنگِ روس، جنگِ فور، جنگِ فغفور۔ اسی طرح بزم کی چند تمہیدیں اور جشن میں شاہنامہ کے ۶۰ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی ہیں۔ انہوں نے ایجادِ مضمون کے دریا بہا دیئے۔ ایک مقرری مضمون کو سیکڑوں نہیں، ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ ہر مرثیے کا چہرہ نیا، آمد نئی، رزم جدا، بزم جدا اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا، تلوار نئی، نیزہ نیا، گھوڑا نیا، انداز نیا، مقالہ نیا اور اس پر کیا منحصر ہے صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ! رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، مرغزار کی ہوا، شام ہے تو شامِ غریباں کی اداسی، کبھی رات کا سناٹا، کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ رنگ سے دکھایا ہے۔ غرض جس حالت کو لیا ہے، اس کا سماں باندھ دیا ہے۔ آمدِ مضامین کی بھی انتہا نہ رہی۔ جن مرثیوں کے بند ۴۰، ۵۰ سے زیادہ نہ ہوتے تھے وہ ۱۵۰ سے گزر کر ۲۰۰ سے بھی نکل گئے۔ میر صاحب مرحوم نے کم سے کم ۱۰ ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا اور سلاموں کا کیا شمار ہے، رُباعیاں تو باتیں تھیں۔

دونوں اُستادوں کے ساتھ طرفداروں کے دو جتھے ہو گئے۔ ایک انیسیے کہلاتے تھے، ایک دبیریئے۔ اگرچہ ان کے فضول فخریوں اور اعتراضوں نے بے جا تکراریں اور جھگڑے پیدا کیے، مگر بہ نسبت نقصان کے فائدہ زیادہ ہوا، کیونکہ بے حد تعریفوں نے دونوں استادوں کے فکروں کو شوقِ ایجاد اور مشقِ پرواز میں عرش سے بھی اونچا اچھال دیا۔ دونوں اُمتیں، جو اپنے دعووں پر دلیلیں پیش کرتی تھیں، کوئی وزن میں زیادہ ہوتی تھی، کو مساحت میں، اس لئے یک طرفہ فیصلہ نہ ہوتا تھا۔

انیسی اُمت: اپنے سخن آفرین کی صفائیِ کلام حسنِ بیان اور لطفِ محاورہ پیش کر کے نظیر

کی طلب گار ہوتی تھی۔

دبیری اُمّت؛ شوکتِ الفاظ، بلند پردازی اور تازگیٔ مضامین کو مقابلے میں حاضر کرتی تھی۔ اُنیسی اُمّت کہتی تھی کہ جسے تم فخر کا سرمایہ سمجھتے ہو، یہ باتیں دربارِ فصاحت میں نامقبول ہو کر خارج ہو چکی ہیں کہ فقط کوہ کندن اور کاہ برآوردن ہے۔ دبیری اُمّت کہتی تھی کہ تم اسے دشواری کہتے ہو، یہ علم کے جوہر ہیں، اسے بلاغت کہتے ہیں۔ تمہارے سخن آفریں کے بازوؤں میں علم کی طاقت ہو تو پہاڑوں کو چیرے اور یہ جواہر نکالے۔ انیسؔ کے کلام میں ہے کیا؟ فقط باتوں کا جمع خرچ ہے۔

انیسی اُمّت اس جواب پر چمک اُٹھتی تھی، کون سا خیال تمہارے سخن آفریں کا ہے، جو ہمارے معنی آفریں کے ہاں نہیں؟ تم نہیں جانتے جسے باتوں کا جمع خرچ کہتے ہو، یہ صفائیٔ کلام اور قدرتِ بیان کی خوبی ہے، اسے سہل ممتنع کہتے ہیں یہ جوہر خدا داد ہے، کتابیں پڑھنے اور کاغذ سیاہ کرنے سے نہیں آتا۔

دبیریے اس تقریر کو سن کر کسی مرثیے کی تمہید یا میدان کی آمد یا رجز خوانی کے بند پڑھنے شروع کر دیتے، جن میں اکثر آیتوں یا حدیثوں کے فقرے تضمین ہوتے تھے۔

انیسیے کہتے ہیں، اس سے کسی کافر کو انکار ہے، مگر اتنا ہی پڑھیے گا آگے نہ بڑھیے گا۔ دوسرے مطلب کی طرف انتقال کیجیے گا تو سلسلے میں ربط بھی نصیب نہ ہوگا۔ حضرت! فقط لفاظی کی دھوم دھام سے کچھ نہیں ہوتا، ادائے مطلب اصل شے ہے، اس پر گفتگو کیجئے گا تو پوری بات بھی نہ ہو سکے گی، یہ قادر الکلام باکمالوں کا کام ہے جن کو اس فن کے اُصول بزرگوں سے سینہ بسینہ پہنچے ہیں، وہی اس کام کو جانتے ہیں۔

دبیریئے اس کے جواب میں اپنے سخن آفریں کی آمد طبیعت، مضامین کا وفور لفظوں کی بہتات دکھاتے تھے اور جا و بے جا کہتے جاتے تھے کہ دیکھیے، کیا محاورہ ہے! دیکھیے، صاف بول چال ہے۔ ساتھ اس کے یہ بھی کہتے تھے کہ کس کا منہ ہے، جو رات کو بیٹھے اور سو بند کہہ کر اُٹھے؟ برس دن تک خامہ فرسائی کی اور محرم پر ۱۰۔۱۵ مرثیے لکھ کر تیار کئے تو کیا کئے؟ وُہ بھی دوا اور بھائیوں کے مشورے ملا کر اور مباحثوں کے پسینے بہا کر۔

انیسیے کہتے تھے، درست ہے، جو رات بھر میں سو بند کہتے ہیں، وہ بے ربط اور بے اصول ہی ہوتے ہیں اور جب ادائے مطلب پر آتے ہیں تو اتنے بھی نہیں رہتے۔ ساتھ اس کے بعض مصرعے بھی پڑھ دیتے تھے، جن پر بے محاورہ ہونے کا اعتراض ہوتا تھا یا تشبیہیں ناقص ہوتی تھیں یا استعارے بے ڈھنگے ہوتے تھے۔

اعتراضوں کی ردّ و بدل یہاں تک ہوتی تھی کہ دبیر یہ کہتے تھے کہ جو قبولیت خدا نے ہمارے سخن آفرین کو عطا کی ہے، کب کسی کو نصیب ہوتی ہے؟ جس مجلس سے ان کا کلام پڑھا گیا، کہرام ہو گیا۔ کیسے غم انگیز اور درد خیز مضامین ہیں۔ ان کے لفظوں کو دیکھوں، اعتقاد کے آبِ حیات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

انیس یہ کہتے تھے: وہ کیا پڑھیں گے؟ ان کی آواز تو دیکھیے اور انھیں مرثیہ پڑھنا تو آتا ہی نہیں۔ غرض جھگڑالو دعویداروں کو کوئی تقریر خاموش نہ کر سکتی تھی، البتہ مجبوری کہ دونوں کے گلے تھکا کر آوازیں بند کر دیتی تھی اور منصفی بیچ میں آکر کہتی تھی دونوں اچھے۔ کبھی کہتی، وہ آفتاب ہیں، یہ ماہ۔ کبھی یہ آفتاب، وہ ماہ۔

لکھنؤ کے بے فکرے لڑنے میں کمال رکھتے تھے اور تماشے کے عاشق۔ دبیر تو غیر تھے، بھائی کو بھائی سے لڑا دیا۔ مدت تک بگڑی رہی۔ میر انیس کے پاس آتے تو کہتے، حضور! جب تک اصلاحی مرثیے ہیں، پڑھے جائیں، جس دن آپ کا بن دیکھا مرثیہ پڑھا قلعی کھل جائے گی۔ دوسرے بھائی سے کہتے: حضور! عمر کی بزرگی اور شے ہے، لطفِ زبان اور شے ہے، یہ نعمت آپ کا حصہ ہے۔

الغرض یہ پاک روحیں، جن کی بدولت ہماری نظم کو قوت اور زبان کو وسعت حاصل ہوئی صلہ ان کا سخن آفرینِ حقیقی عطا کرے! ہمارے شکریے کی کیا بساط ہے؟ لیکن یہ بات جتلانے کے قابل ہے کہ اقلیمِ سخن میں جو دائرہ ان کے زیرِ قلم تھا، ان کے جوشِ طبع میں اس کا بہت سا حصہ سخن آرائی اور رزم و بزم نے دبا لیا۔ مرثیت کا میدان بہت تنگ رہ گیا اور افسوس کہ اصل مدعا ان کا وہی تھا، جسے آپ کھو بیٹھے۔

جب تک لکھنؤ آباد رہا، جب کسی اور شہر میں جانے کا ذکر ہوتا تو دونوں صاحب یہی فرماتے تھے کہ اس کلام کو اسی شہر کے لوگ سمجھ سکتے ہیں اور کوئی اس کی قدر کیا جانے گا اور ہماری زبان کے لطف کو کیا سمجھے گا؟ لیکن تباہی لکھنؤ کے بعد اول ۱۸۵۸ء میں مرزا دبیر صاحب مرشد آباد بلائے گئے۔ وہ گئے اور ہمیشہ الہ آباد اور بنارس میں جاتے رہے۔ میر انیس مرحوم اول ۱۸۵۹ء اور پھر ۱۸۶۰ء میں نواب قاسم علی خاں کی طلب اور اصرار سے عظیم آباد بھی جاتے رہے پھر ۱۸۷۱ء میں جب کہ ارسطو جاہ غفران پناہ کے خلف الرشید مولوی سید شریف حسین خاں صاحب حیدر آباد میں تھے تو ان کی تحریک سے نواب تہور جنگ بہادر نے میر انیس کو طلب فرمایا۔ اب بھی ان کی پابندیٔ وضع انھیں نکلنے نہ دیتی تھی، مگر مولوی صاحب موصوف کے کہنے کو بھی ٹال نہ سکتے تھے۔ اس لئے مجبور ہو گئے۔ اہلِ حیدر آباد نے ان کے

کمال کی ایسی قدر کی جیسی کہ چاہیئے۔ مجلسوں میں لوگ اس کثرت سے آتے تھے کہ عالی شان مکان کی وسعت بھی جگہ نہ دے سکتی تھی۔ دروازے پر پہرے کھڑے کر دیتے تھے کہ مستند اور سخن فہم لوگوں کے سوا کسی کو آنے نہ دو اور کسی امیر کے ساتھ دو متوسلوں سے زیادہ آدمی نہ آنے پائیں، اس پر بھی لوگ کثرت سے آتے تھے کہ کھڑے رہنے کو غنیمت سمجھتے تھے اور اسی میں خوش تھے کہ ہم نے سُنا تو سہی۔

میر انیس صاحب جب وہاں سے پھرے تو حسب وعدہ الہ آباد میں اُترنا پڑا۔ ایک مجلس بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوئی۔ میرے شفیق مولوی ذکار اللہ صاحب کہ میو کالج میں پروفیسر ہیں، نکتہ فہم و سخن شناس اُن سے زیادہ تر کون ہوگا؟ اس مجلس کا حال خود مجھ سے بیان کرتے تھے کہ خاص و عام ہزاروں آدمی جمع تھے۔ کمال اور کلام کی کیفیت کیا بیان کروں؟ محویت کا عالم تھا۔ وہ شخص منبر پر بیٹھا پڑھ رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جادو کر رہا ہے۔ مقطع کی ٹیپ پڑھتے تھے اور مزے لیتے تھے:

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مدّاحی میں

اُن کی بلکہ اُن کے گھرانے کی زبان اُردوے معلّیٰ کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی اور انہیں بھی اس بات کا خیال تھا، لیکن طبیعت میں نہایت انکسار تھا۔ حُسنِ اخلاق گفتگو میں ان کی تقریر اتنا بچائے ہوئے لے چلتا تھا کہ باتیں خط اعتدال سے بھی نیچے ہی نیچے رہتی تھیں۔ اس پر ایک ایک لفظ کانٹے کی تول۔ کسی جلسے میں اپنا کلام سُناتے تو بعض محاورے پر اتنا کہہ اٹھتے تھے کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضراتِ لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب تک اپنے تئیں لکھنؤ کا باشندہ نہ کہنا چاہتے تھے۔

مولوی شریف حسین حال صاحب کہتے ہیں کہ حیدر آباد میں ایک دن چند معزز اشخاص بیٹھے تھے۔ ایک صاحب اُن کی شاعری کی تعریف کرنے لگے۔ فرمایا! بھئی! شاعر کون ہے؟ مُو کھڑے کا کہنے والا ہوں۔ وہ بھی نہیں معلوم کہ جس طرح چاہیئے، ہوتا ہے یا نہیں۔ میں ۱۸۵۷ء میں خود بھی اُن سے ملا اور لوگوں سے بھی سُنا کم سخن تھے اور بولتے تو وہ فقرہ کہ موتی کی طرح ٹانکنے کے قابل۔ ارسطو جاہ مولوی رجب علی خان بہادر حسب الطلب صاحب چیف کمشنر بہادر لکھنؤ میں تھے۔ ایک دن بعض عمائد شہر موجود تھے۔ میر انیس صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ کہیں سے آم آئے، چونکہ عمدہ تھے، مولوی صاحب ممدوح نے طاسوں میں پانی بھروا کر رکھ دیئے اور سب صاحبوں کو متوجہ فرمایا، ایک حکیم صاحب اسی جلسے میں حرارت کی شکایت کر رہے تھے،

نگہ شریکِ چاشنی ہوئے۔ کسی بزرگ نے کہا: حکیم صاحب! آپ تو ابھی علالت کی شکایت فرماتے تھے۔ حکیم صاحب تو بغلیں جھانکنے لگے۔ میر انیسؔ نے فرمایا: فِعلُ الحکیمِ لا یخلو عَنِ الحکمۃِ۔

جس طرح ان کا کلام لاجواب دیکھتے ہو، اسی طرح اُن کا پڑھنا بھی بے مثال ہی تھا۔ ان کی آواز، ان کا قدوقامت، ان کی صورت کا انداز، غرض ہر شے اس کام کے لئے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی۔ ان کا اور اُن کے بھائیوں کا بھی قاعدہ تھا کہ ایک بڑا آئینہ سامنے رکھ کر خلوت میں بیٹھتے تھے اور مرثیہ پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔ وضع، حرکات، سکنات اور بات بات کو دیکھتے تھے اور آپ اس کی موزونی و ناموزونی کو اصلاح دیتے تھے: ذوقؔ

بنا کے آئینہ دیکھے ہے پہلے آئینہ گر
ہنرور اپنے ہی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

یہ بات درست ہے کہ مرزا دبیرؔ کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ تھی لیکن حسنِ قبول اور فیضِ تاثیر خدا نے دیا ہے۔ اُن کا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تھا تو اکثر رونے رُلانے میں کامیاب ہوتا تھا کہ یہی اس کام کی علتِ غائی ہے۔

---

# خاتمۂ کتاب

پانچواں دَور بھی ہو چکا، مگر سب سوگوار بیٹھے ہیں کہ دَور نہیں ہو چکا، ہندوستانی کی پرانی ہمدم یعنی عاشقانہ شاعری ہو چکی اور اس کی ترقی کا چشمہ بند ہوا۔ اہلِ مشاعرہ نوحہ خوانی کر رہے تھے کہ اے صدر نشینو! تم چلے اور حسن و عشق کے چرچے اپنے ساتھ لے چلے، کیونکہ متاعِ عشق کے بازار تھے تو تمہارے دم سے تھے۔ نگارِ حسن کے سنگار تھے تو تمہارے قلم سے۔ تم ہی قیس و کوہکن کے نام لینے والے تھے اور تم ہی لیلیٰ و مجنوں کے جوبن کو جلوہ دینے والے۔ لیکن اجسامِ فانی کی پرستش کرنے والے ہیں، جو کہتے ہیں کہ تم گئے اور مشاعرے ہو چکے۔ نہیں نہیں، تمہاری تصنیفیں، تالیفیں حکایتیں اور روایتیں جب موجود ہیں، تم آپ موجود ہو۔ تمہارے فخر کی دستاریں ایسے تحسین و آفرین کے پھولوں کے تاجدار ہیں جو ہمیشہ لہلہاتے رہیں گے اور گلے میں اُن سدابہار پھولوں کے ہار ہیں جن تک کبھی خزاں کا ہاتھ نہ پہنچے گا۔

حیاتِ دوام کا خدائی چشمہ جاری ہے، جس کے کنارے پر عہد بعہد پانچوں جلسے جمے ہوئے ہیں۔ آبِ حیات کا دَور چل رہا ہے۔ چشمے کا پانی زمانے کے گزرنے کی تصویر کھینچتا ہے اور موجیں

ظاہری زندگی کو الوداع کہتی چلی جاتی ہیں۔ تمہارے جلسے اپنے اپنے عہد کی حالت خاموشی کی بولی میں بیان کر رہے ہیں۔ تمہارے مقالات وحالات اس زمانے کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویریں گویا بے زبان مورتیں مُنہ سے بول رہی ہیں۔ خیالی صورتیں اپنی چال ڈھال ایسی بے تکلف دکھا رہی ہیں کہ کوئی زندہ انسان اس طرح کُھلے دل سے کام نہیں کرتا۔ تمہاری زندگی عجب لُطف کی زندگی ہے۔ کوئی بُرا کہے تمہیں رنج نہیں۔ اچھا کہے تو خوشی نہیں۔ تمہیں کوئی آزار نہیں دے سکتا۔ تم سے کسی کو رنج نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ اللہ امن وامان کی دنیا کے لوگ ہو کہ چپ چاپ آرام کے عالم میں بجنت گزران کرتے ہو۔ تم میں آواز نہیں، مگر رنگا رنگ کی بولیاں بول رہے ہو۔ تم وُہ ہو کہ نہیں ہو، مگر تم مر گئے ہو، پھر بھی زندہ ہو، اے کاغذی خانقاہوں کے بسنے والو! تمہاری تصنیفات تمہارے گھر آباد ہیں جب آنکھیں کھولتا ہوں تم نقوش وحروف کے لباس پہنے ہنستے بولتے پھرتے چلتے نظر آتے ہو اور ویسے ہی نظر آتے ہو، جیسے کہ تھے۔ زمانہ سالہا سال کی مسافت دور نکل آیا اور سینکڑوں برس آگے بڑھا اور بڑھ جائے گا، مگر تم اپنی جگہ بدستور قائم ہو۔ تمہارے اعمال وافعال کے پُتلے تمہاری تصنیفیں ہیں۔ ان کی زبانی آئندہ نسلوں سے اپنے دل کی باتیں کہتے رہو گے، نصیحتیں کرو گے، سمجھاتے رہو گے، غمگین دلوں کو بہلاؤ گے، مردہ طبیعتوں میں جان ڈالو گے، مدھم آرزوؤں کو چمکاؤ گے، سوتے دلوں میں گُدگُدی کرو گے۔ خوشی کو اُداسی کر دو گے، اُداسی کو خوشی کر دو گے۔

اے با اقبال گداؤ! اے شاہ نشان خاکسارو! تمہاری نیک نیتی اچھے وقت تمہیں لائی، مگر افسوس کہ تمہاری شاعری نے بہت کم عمر پائی۔ قسمت نے تمہیں اچھے سامان اور اچھے قدر دان دیئے جن کی بدولت جوہر طبعی اور جوشِ اصلی کو اپنے اور اپنے شوق کے پورا کرنے کے سامان ملے۔ اب نہ وُہ سامان ہوں گے نہ ویسے قدردان ہوں گے۔ نہ کوئی اس شاخ کو ہرا رکھ سکے گا۔ نہ تم سے بڑھ کر اس میں پھل پھول لگا سکے گا۔ ہاں تمہاری لکیروں کے فقیر تمہارے ہی ہجر و وصل اور خط و خال کے مضمون لیں گے، انہی لفظوں کو الٹیں پلٹیں گے اور تمہارے چبائے ہوئے نوالوں کو مُنہ میں پھراتے رہیں گے۔

تم نے شہرتِ علم اور بقائے دوام کے ایسے عالی شان محل تعمیر کئے ہیں کہ صدہا سال کی مسافت سے دکھائی دیتے رہیں گے۔ وُہ فلک کے صدموں اور انقلاب کے طوفانوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور زمانے کے زلزلوں کو ہنس کر کہتے ہیں کہ بھلا آؤ تو سہی!

اگرچہ زیادہ تر عمارتیں تمہارے حُسن وعشق کے جلوس کے لئے ہیں، مگر اُس میں بھی تم نے ایسے سامان اور مصالح لگا دیئے ہیں کہ آئندہ نسلیں جس غرض سے چاہیں گی، عمارتیں بنائیں گی، اور تمہاری صنعتوں سے بہت کچھ مدد پائیں گی۔ جن پتھروں کو تم نے منبّت اور گلکاری سے تراش

کہ فقط خوشنمائی کے لئے لگایا تھا، ہم اُسے وہاں سے نکال لیں گے۔ شکریے کے ساتھ آنکھوں سے لگائیں گے اور اس سے کسی ایسی محراب کو زینت دیں گے جو اپنی مضبوطی سے ایک ایک ملکی ایوان کو استحکام دے اور دلوں کو خوشنمائی سے شگفتہ کرے، کیونکہ تمہارے لفظوں کی عمدہ تراشیں اور ان کی پسندیدہ ترکیبیں، استعارے اور تشبیہیں اگرچہ عاشقانہ مضامین میں ہوں، پھر بھی ہم سلیقے اور امتیاز سے کام میں لائیں گے تو علوم، فنون، تاریخ وغیرہ عام مطالب میں ہمارے ادائے مقاصد اور انداز بیان کے لئے عمدہ معاون اور کارآمد ہوں گے۔ اے ہمارے رہنماؤ! تم کیسے مبارک قدموں سے چلے تھے اور کیسے برکت والے ہاتھوں سے رستے میں چراغ رکھتے گئے تھے کہ جہاں تک زمانہ آگے بڑھتا ہے، تمہارے چراغوں سے چراغ جلتے چلے جاتے ہیں اور جہاں تک ہم آگے جاتے ہیں، تمہاری ہی روشنی میں جاتے ہیں۔ ذرا ان برکت والے قدموں کو آگے بڑھاؤ کہ میں آنکھوں سے لگاؤں۔ اپنا مبارک ہاتھ میرے سر پر رکھو اور میرے سلام کا تحفہ قبول کرو۔

بابائے اُردو کے بارے میں ہماری اہم کتابیں :

## ذکرِ عبدالحق

— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن —

"ذکرِ عبدالحق" کو دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا معین صاحب نے اُن تمام اُمور کا بڑی خوب صورتی سے احاطہ کیا ہے، جن کے بغیر عبدالحق کی داستان مکمل نہیں ہو سکتی۔

— مشفق خواجہ

ذکرِ عبدالحق کو پڑھا پُرانی یادیں تازہ ہوگئیں، یادوں پر دُکھی ہوا، آپ کے کام پر خوش ہُوا۔ آپ نے بڑا کام کیا ہے اور بہت ہی اچھے پیرائے اور انداز میں کتاب کو تالیف کیا ہے۔

— پیر سید حسام الدین راشدی

## نقدِ عبدالحق

— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن —

سید معین الرحمٰن صاحب نے "نقدِ عبدالحق" مرتب کر کے ادب کی ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ اس کی بدولت بابائے اُردو کی تحقیق، تنقید، سیرت نگاری، نیز اُن کی تحریروں کے ادبی محاسن پر بیک وقت اُردو کے نامور اہلِ قلم کے افکار سے مستفید ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔

— ڈاکٹر عندلیب شادانی

یہ کتاب کیا ہے، مولوی عبدالحق مرحوم کے بارے میں معلومات کا ایک خزانہ ہے!

— ڈاکٹر عبادت بریلوی

## بابائے اُردو : احوال و افکار

— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن —

مولوی عبدالحق پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے یہ تالیف رہنمائے خاص کی حیثیت رکھے گی۔

— نیاز فتح پوری

## فرمودات عبدالحق

— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن —

مولوی صاحب کے فرمودات سے اُن کی سیرت، شخصیت، نقطۂ نظر، وسعتِ علم، اصابتِ فکر اور دوسرے صفات کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں، اور یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ اعلیٰ شخصیت اور اعلیٰ انشاپردازی کس طرح ایک دوسرے سے نشوونما پاتے اور ایک دوسرے کو جلا دیتے ہیں۔

— رشید احمد صدیقی

سنگِ میل پبلی کیشنز ○ چوک اُردو بازار، لاہور